دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماھنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
جون 2013
نگران اعلیٰ
معراج رسول
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول

جلد 43 • شمارہ 06 • جون 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

مدیراعلیٰ

چینی نکتہ چینی

عزیزانِ من... السلام علیکم...

گرمی کی بلندیوں کی طرف گامزن جون کا گرمائی شمارہ آپ کی نذر ہے۔ اپریل کی ان ہی سطور میں اندیشوں کے ہجوم میں اس اُمید کا اظہار کیا گیا تھا کہ انتخابات کے نتائج کو مقابلے کے تمام فریق خوش دلی سے قبول کرلیں گے۔ ہوا یہ ہے کہ امید ہار گئی، اندیشے جیت گئے۔ انتخابات کے بعد تادمِ تحریر احتجاج، جلوس اور دھرنے جاری ہیں۔ دیکھنا ہوگا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ دلی دعا یہ ہے کہ جو کچھ ہو، خیر کے ساتھ ہو... ملک اور عوام کے حق میں ہو۔ قوم نے اپنا لہو پلا کر مراعات یافتہ طبقات کو بہت پال لیا... اب ناتواں قوم کی باری ہے۔ اسے رزق و روزگار، وسائل، ملازمتوں اور شہری سہولتوں مثلاً پانی اور بجلی وغیرہ کی دستیابی کا انتظار ہے۔ آئین و قانون کی خوش نما لفاظی سے پاکستانیوں کو آج تک کوئی سہولت نہیں مل سکی۔ قانون کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، اس پر عمل درآمد نہ ہو تو یہ محض کاغذ کا ایک پرزہ ہوتا ہے اور قانون کیا، ہم تو آئین شکنی میں بھی خاصا کمال رکھتے ہیں۔ گرانی روز بروز ہوش ربا ہوتی جارہی ہے۔ نئی حکومت سے بجا طور پر یہ توقع کی جارہی ہے کہ عوام کو تحریری سبز باغ دکھانے کے بجائے ہمارے گردوپیش میں کچھ نہ کچھ بہتر ہوتا ہوا نظر آئے گا، دستیاب ہوگا۔ ابھی تک ہماری سیاست ادارۂ تحسینِ باہمی کے طور پر چلائی جاتی رہی۔ من ترا ملا بگویم، تو مرا حاجی بگو... اب بات محض باری کی نہیں رہی۔ آنے اور جانے والوں کو ایک دوسرے کے کردہ اور ناکردہ گناہ چھپانے کی ضرورت نہیں کیونکہ حالیہ انتخاب میں تمام تر کمزوریوں کے باوجود عوام نے اپنے شعور کا ثبوت دے دیا ہے، بڑے بڑے کئی بتوں کو گرایا ہے، جماعتوں کو ہرایا ہے... آثار بتا رہے ہیں کہ ELECTABLES کے ساتھ اس بار قدرے مروت سے کام لیا گیا ہے۔ اگلی بار روایت نہیں، کارکردگی کی جیت ہوگی۔ ہمیں مستقبل کے بارے میں خوش گمان رہنا چاہیے کیونکہ جہاں امیدیں دم توڑ دیتی ہیں وہاں سے آگے معدومیت کا بھیانک خلا شروع ہوجاتا ہے... اس خلا سے بچتے بچاتے ہوئے، اب چلتے ہیں آپ کی محفلِ رنگ و شورہا جہاں پرانے ساتھیوں کی نئی نئی باتیں منتظر ہیں۔

مظفر آباد آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کے خدشات ''مئی 2013ء کا جاسوسی اس وقت ہاتھوں میں ہے۔ سرورق کے حوالے سے بتاتا چلوں، سرورق جاسوسی کا اور پستول کا نام و نشان نہیں، عجیب سا لگا۔ حسینہ سرورق کی آنکھوں میں سرمہ ''کحل الجواہر'' کی سلائی پھیری ہوئی تھی اور سر کے بالوں میں قبلہ بڑے حکیم صاحب کا تجویز کردہ خاندانی نسخہ، سیکا کائی، ناگرمو، کنوار گندل، ریٹھا، آملہ سے تیار شدہ تیل لگا ہوا تھا اور کانوں میں دل کی شکل کے بُندے۔ بھئی کوئی کہے یا نہ کہے، میں تو کہوں گا کہ مجموعی طور پر حسینہ سرورق غضب ڈھا رہی تھی۔ احمد اقبال صاحب ہردلعزیز لکھاری ہیں۔ ان کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ واپسی کا سفر انتہائی دلچسپ، سبق آموز تحریر تھی۔ چھوٹے حکیم شرافت علی اسم بامسمیٰ ثابت ہوئے۔ گرداب میری فیورٹ اسٹوری ہے۔ اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے پر تعریف کے لیے الفاظ کم پڑ رہے ہیں۔ کوئی کہے یا نہ کہے، میں تو کہوں گا کہ اسما قادری لکھنے کا حق ادا کررہی ہیں۔ للکار کا ٹیمپو اس بار بہت فاسٹ تھا۔ حسنِ اتفاق ہے یا سوچی سمجھی سازش، گرداب اور للکار کے مرکزی کردار انڈیا میں پہنچا دیے گئے ہیں۔ عمران اور رتالی کو اب واپس پاکستان پہنچا دینا چاہیے۔ للکار میں بعض باتیں عمران کی خود کی ذات تک محدود رکھی گئی ہیں اور بوقتِ ضرورت استعمال میں لائی جاتی ہیں جو کہ مجھے مس فٹ لگتی ہیں۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ زہریلا تریاق امیمہ سلیم جو کہ نیو رائٹر ہیں، نے اچھی اسٹوری لکھی ہے۔ ورائڈ، مریم کے خان کی اسٹوری کچھ خاص تاثر نہیں دے سکی۔ اس کہانی کے اسٹارٹ کی تیسری لائن سے کچھ حصہ مس پرنٹ ہے۔ (جی آپ نے درست نشاندہی کی، چند لائنیں پرنٹنگ پلیٹ بنتے وقت نکل گئیں) شارٹ اسٹوریز پڑھ کر تبصرہ لکھوں گا تو بمشکل ویٹنگ لسٹ میں ہی جگہ ملے گی۔ البتہ تبصروں کو پڑھ کے تبصرہ کردیتا ہوں۔ ایم اے ہاشمی صاحب! ڈبل مبارک ہو۔ آپ کا تبصرہ اچھا تھا، الفاظ کا چناؤ بہترین تھا۔ آصفہ صداقت، عمیر شہزاد بخش، محمد ہمایوں سعید نے تبصرے اچھے تھے۔ سید شکیل حسین کاظمی! آپ محفل میں چھاتے جارہے ہیں اور آپ کی پڑوسن بھی کافی ہٹ ہوتی جارہی ہیں۔ ان کی شہرت میں آپ کا بڑا ہاتھ ہے۔ زویا اعجاز! فیس بک پر آپ نے اپنے تبصرے کی کٹنگ کا افسوس سے اظہار کیا۔ کوئی بات نہیں۔ دل چھوٹا نہ کریں۔ دوبارہ ٹرائی کرلیں۔ مجھے بہتری کی امید لگ رہی ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔ اس سے پہلے کہ آپ کا ہاتھ قینچی کی طرف بڑھے، اجازت چاہوں گا۔''

لاہور سے زویا اعجاز کی شمولیت ''سب ہم وطنوں کو نیا جمہوری اقتدار مبارک۔ مئی کا شمارہ انتہائی صبر آزما انتظار کے بعد تین تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پر براجمان حسینہ کی آنکھوں سے سازش کی جھلک عیاں تھی۔ مجموعی طور پر ٹائٹل قدرے بہتر تھا۔ محفل میں اپنا سنسر شدہ خط پا کر کچھ اطمینان ہوا کہ کفر ٹوٹا خدا خدا کرکے۔ کاظمی صاحب کا تبصرہ حسبِ معمول شاندار تھا۔ کاشف صاحب فیس بک پر سنسر کی قینچی اور ردی کی ٹوکری نہیں ہوتی نا۔ اس لیے وہاں ڈائجسٹ پر دل کھول کر کمنٹس پاس کرتی ہوں۔ کہانیوں کا آغاز حسبِ معمول للکار سے کیا۔ مغلِ اعظم کے قلم کی جولانی عروج پر ہے۔ عمران کی پرائیویٹ آرگنائزیشن کے ساتھ وابستگی پر دلی مسرت محسوس ہوئی۔ اس ماہ کی قسط آؤٹ کلاس تھی۔ جاوا کی بدعہدی متوقع تھی۔ اس کے بعد گرداب میں قدم رکھا جہاں سلو اور شہریار بھارتیوں کے چھکے چھڑا رہے تھے۔ چودھری کا ممبئی جانا یقینی طور پر شہریار سے مڈبھیڑ کا پیش خیمہ ہے جس سے ابھی سے سنسنی محسوس ہورہی ہے۔ سرورق کا پہلا رنگ پرانے موضوع پر تھا۔ اندازِ بیاں میں کئی جگہ جھول نظر آئے۔ آغاز میں ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ تیمور کا کورٹ مارشل محض ڈراما ہے۔ مریم کے خان نے اس دفعہ اچھا رنگ جمایا۔ احمد اقبال کی واپسی کا سفر لاجواب اور سبق آموز کاوش تھی۔ انٹرنیٹ اور فیس بک نوجوانوں کو دیمک کی طرح کھا رہے ہیں۔ جھوٹی حکمت کا پردہ بھی خوب چاک ہوا۔ کہانی نے کئی معاشرتی

حقائق برہنہ کیے۔ کاشف زبیر کی حساب بے باق ذرا اچھکی رہی۔ مترجم کہانیاں بھی قدرے بہتر تھیں۔"

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی لفاظی "شیکسپیئر نے کہا تھا کہ جمہوریت بہترین انتقام ہے۔ اب یہ انتقام کس سے ہے، اس کی وضاحت نہیں کر پایا تھا۔ آیا یہ عوام سے ہے یا پھر حکمرانوں سے۔ خیر اس جمہوری عمل کی تکمیل پر تمام قوم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پانچ مئی کو سیالکوٹ سے واپسی پر جاسوسی خریدا۔ آگے بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگلے پانچ گھنٹے کا سفر کتنی جلدی گزر گیا۔ سرورق بہترین تھا، بس خاتون کی آنکھیں اچھی نہیں لگیں۔ چبھتی نکتہ چینی میں پہنچے تو ایم اے ہاشمی صاحب کو مسند صدارت پر پایا۔ آپ کی غیر حاضری کی وجہ کافی خوب صورت ہے۔ اب دیکھتے ہیں ہمیں ایسی وجہ کب نصیب ہوتی ہے، بہرحال مبارک باد قبول کریں۔ اب آپ خطوط وحدانی میں یہ مت لکھیے گا کہ بڑی جلدی ہے مجھے، اکلوتا ہونے کے فوائد و نقصانات ایسے موقعوں پر آ کر سمجھ آتے ہیں کہ ہر کوئی طلب گار ہو تو فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ تو بھلا ہو میری پڑوسن کا جو میرے حالات کو بہتر سمجھتی اور مناسب مشورے بھی دے دیتی ہے، وہ بات الگ ہے میں کسی پر عمل نہیں کرتا۔ بنوں سے یکے بعد دیگرے دو جاندار تبصرے پڑھنے کو ملے۔ برادر ہمایوں سعید کے تبصرے میں نمک کی مقدار ہمیشہ پھیکی ہوتی ہے اس لیے تبصرہ کافی نمکین محسوس ہوا۔ کوٹ رادھا کشن سے کاشف علی میراں ہمیں چچا کے عہدے پر فائز کر کے اترائے اترائے پھر رہے تھے۔ آپ کو بہت مبارک برادر۔ زویا اعجاز اور سومی خان! آپ دونوں کو محفل میں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ امید ہے آپ آئندہ بھی لکھا کریں گی' صرف فیس بک تک محدود نہیں رہیں گی۔ یاد آیا، ایک عریضہ بخاری ہوا کرتی تھیں، شاید شوہر کو پیاری ہو گئی ہیں۔ اللہ پاک ان کے شوہر کی زندگی آسان کریں۔ بلیک زیرو فرام پاکیشیا کافی جلدی میں تھے اور آتے ہی کافی لوگوں کی کھچائی کر دی۔ چلیں اسی بہانے ہم نے بھی دیکھ لیا، جاسوسی میں تبصرہ لکھنا اور جاسوسیت میں عبور ہونا دو الگ باتیں ہیں۔ للکار اس دفعہ بہت شاندار رہی۔ مجھے لگتا ہے عمران دانش آہستہ آہستہ علی عمران کے کردار میں ڈھلتا جا رہا ہے۔ کسی دن یہ پتا لگے گا کہ اس تنظیم کا سربراہ یہ خود ہی ہے اور دوسری بات کہ احمد اقبال صاحب کی جوادی نے اگر للکار کی جگہ لی تو عمران دانش جیسے کردار کے بغیر جاسوسی سونا سونا لگے گا۔ گرداب میں اس دفعہ کافی ایکشن اور سسپنس دیکھنے کو ملا۔ اندو کا باب جلد بند ہونے پر خوشی ہوئی۔ بات کریں احمد اقبال صاحب کی پہلی کہانی واپسی کے سفر کی تو یہ بے شک ایک شاہکار کہانی تھی۔ انٹرنیٹ، فیس بک اور اسی طرح کے جدید دور کی ایجادات کے نقصانات اور فوائد کا احاطہ کرتی ایک لازوال تحریر تھی۔ یہ ایک سبق ہے کہ سہولیات کو صحیح طریقے سے استعمال کرنا ہی صحت مند اور اچھے ذہن کی نشانی ہے۔ اسی سے کچھ لوگ سنور جاتے ہیں اور کچھ لوگ اپنا سب کچھ برباد کر دیتے ہیں۔ کاشف زبیر کی حساب بے باق پڑھ کر طبیعت شگفتہ و تر و تازہ ہو گئی۔ بہت خوب صورت جملے اور بے ساختہ مزاح پڑھنے کو ملا۔ سرورق کے رنگوں میں امیمہ سلیم کی زہریلا تریاق موضوع کے اعتبار سے بہت اچھی کہانی تھی مگر اس تحریر میں سلیم فاروقی صاحب کا اسلوب غالب تھا جو کہ ان کی اکثر تحاریر کا خاصہ ہے۔ کوئی بھی تحریر شناس آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ مریم کے خان صاحبہ دراڑ کے ساتھ حاضر ہوئیں۔ جاندار پلاٹ اور کردار نگاری کے ساتھ یہ رنگ بازی لے گیا۔ مختصر کہانیوں میں سراغ رساں کمپیوٹر بہت ہی الجھی ہوئی کہانی تھی' بہت مشکل سے پلے پڑی۔ بابر نعیم کی انوکھا مشورہ ایک اچھی کہانی تھی۔ سراغ رساں ایجنسی کے جدید طریقے سے خدمات فراہم کرنے کا انداز پسند آیا۔ بہرحال یہ بھی شادی شدہ لوگوں کے لیے زیادہ متاثر کن ہو گی۔ اس کے سوا سلیم انور کی خوش اسلوب بھی کافی بہتر رہی۔ ڈیٹی بے چارہ غفلت میں مارا گیا۔ مجموعی طور پر اس دفعہ جاسوسی یادگار کہانیوں سے مزین تھا۔"

ناظم آباد کراچی سے ادریس احمد خان کی رائے "بادسموم کے تھپیڑوں کے ساتھ جاسوسی کے مژدہ جاں فزا کی نوید موصول ہوئی۔ الیکشن کے مراحل سر پر ہیں، روز بروز بم دھماکے ہو رہے ہیں مگر پارٹیاں پھر بھی دہشت گردوں کے سامنے سینہ سپر ہی ہوئی ہیں اور الیکشن میں حصہ لینے میں پرعزم ہیں۔ سرورق کے بعد چبھتی نکتہ چینیوں میں ایم اے ہاشمی کو مبارک باد۔ مگر اپنا نام دکھائی نہیں دیا۔ نئے و پرانے دوست شریک تھے۔ سب سے پہلے للکار میں پہنچے جہاں عمران اور تابش دشمنوں سے برسر پیکار ہیں اور واپسی کے سفر پر گامزن ہیں اور پاکستان کی سرحد کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ دوسرا سلسلہ گرداب میں بھی شہریار اور سلو بھی انڈیا میں دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ تیسری کہانی احمد اقبال کی واپسی کا سفر تھی جس میں آج کی نسل کی عکاسی کی گئی ہے کہ کس طرح پرانی قدروں کو آج کی نسل اپنی تضحیک کا نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ شرافت کی زندگی بھی نمونہ عبرت بن گئی جس کی وجہ سے پورا گھر تباہ ہو گیا۔ ماں اور باپ ذہنی مریض بن گئے اور خود بھی نشانِ عبرت بن گیا۔ کھوٹا سکہ بھی خوب تھی جس سے یہ سبق بھی ملا کہ کسی بھی انسان کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ غرور اور تکبر ایسی عادتیں ہیں جو انسان کو خوامخواہ ہی اپنی برتری کا احساس دلاتی ہیں۔ نتیجتاً ذلت اور رسوائی حصے میں آتی ہیں جیسے ویری کے ساتھ ہوا کہ غرور کیا مگر منہ کی کھائی۔ حساب بے باق ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا سبب بنی۔ پاداش بھی بہتر تھی۔ تلاش میں ایک یتیم خانے سے بھاگے ہوئے بچے نے اپنے باپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور وہ تلاش کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا مگر اس کے باپ رک مورفس نے اچھا فیصلہ کیا اور اپنے بیٹے کو اپنی اصلیت نہیں بتائی کہ بیٹا بھی باپ کے راستے پر چلنا شروع کر دیتا۔ خوش اسلوب میں ایک گھاگ مجرم نے ممکنہ گواہ کو مشروب میں زہر ملا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ سراغ رساں کمپیوٹر بھی اچھی لگی۔ انوکھا مشورہ، بدنیت میں بھی دلچسپی سے پڑھنے کا مواد تھا۔ سرورق کی کہانیوں میں زہریلا تریاق اور دراڑ میں دراڑ نے اچھا تاثر دیا جہاں ایک لالچی شوہر نے ڈاکوؤں سے ساز باز کر کے اپنی بیوی کو مروانا چاہا مگر بیوی اور بچے بچ گئے اور شوہر خود ہی اپنے بنائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔"

کھاروے سومی خان کی آمد "اس بار مئی کا جاسوسی حسب معمول تین تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل پیج پر کوئی تبصرہ نہیں کیونکہ مجھے ٹائٹل پیج کا پوسٹ مارٹم کرنا نہیں آتا۔ تبصروں میں اپنا اور زویا کا تبصرہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ 16 مئی کو میرے پیپر ہیں، سب میری کامیابی کے لیے دعا کریں اور ایک بری خبر ہے، وہ یہ کہ کوٹ رادھا کشن سے کاشف علی کے بیٹے شیخ محمد معیز 19 اپریل بروز جمعہ کو اس دنیا فانی کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ کاشف بھائی اور ان کی فیملی کو صبر عطا کرے اور آپ سب بھی ان کے لیے صبر کی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ کاشف بھائی کو اور خوب صورت بچوں سے نوازے، آمین۔ ابھی تک جاسوسی میں صرف للکار پڑھی ہے جو کہ اس ماہ کی بہت ہی اچھی اور فاسٹ قسط تھی اور اب باقی کہانیاں پیپرز کے بعد پڑھوں گی۔" (آپ نے تو بہت دردناک خبر سنائی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو صبر عطا فرمائے)

کوٹلی آزاد کشمیر سے فہد علی جنجوعہ کا خوف "لو بھئی، ایک تو شدید گرمی اوپر سے لوڈ شیڈنگ کا عذاب اور رہی سہی کسر ڈاکٹر انکل کے ٹائٹل نے پوری کر دی۔ ڈاکٹر

انکل نے بھی اس شدید گرمی میں چھوٹی موٹی سی لڑکی کو اونی لباس پہنا دیا اور نیچے ایک ایسا آدمی بنا دیا جس نے تھری پیس سوٹ مع ویسٹ کے پہن رکھا تھا۔ میرے خیال سے ڈاکٹر انکل نے ماہ دسمبر کے لیے بنایا ہوا ٹائٹل ماہ مئی کے لیے بھیج دیا۔ بہرحال، ٹائٹل پر نظر دوڑاتے ہوئے ہم پہنچے اپنی پسندیدہ محفل چبھتی نکتہ چینی میں۔ جہاں چبھتی کم اور نکتے کچھ زیادہ ہی تھے۔ ماہا ایمان ہم نے ایسا کیا سچ کہہ دیا کہ آپ انگارے چبا رہی ہیں، پیچ و تاب کھا رہی ہیں اور کھمبا بھی نوچ رہی ہیں؟ ایم اے ہاشمی صاحب کو کرسی صدارت حاصل کرنے پر مبارک باد۔ لگتا ہے ہاشمی صاحب بھی میری طرح محبت کے مارے ہوئے ہیں تبھی تو وہ ناکام محبت کا درد محسوس کر سکے ہیں۔ آصفہ صاحبہ! اگر آپ تفسیر صاحب کے لیے مکھن بھیج سکتی ہیں تو برائے مہربانی کچھ نظر کرم ہم پر بھی ہو جائے۔ میں تمام دوستوں کا تہ دل سے مشکور ہوں جنہوں نے بندۂ ناچیز کے محبت نامے کو خاص اہمیت دی اور اسے پسند کیا۔ حسب معمول ابتدا للکار سے کی۔ دوستو! دل تھام کے بیٹھ جاؤ کیونکہ اگلی قسط میں جاوا اور تابی اینڈ کمپنی کا فیصلہ کن معرکہ ہوگا۔ خلاف توقع للکار کی اس قسط کا ٹیمپو نہایت تیز تھا۔ گرداب میں شہریار اور سلو ان ایکشن ہیں۔ شہریار اور سلو جب سے انڈیا گئے ہیں، ان کی ایک مشکل ختم نہیں ہوتی کہ دوسری آن موجود ہوتی ہے۔ اب دیکھتے ہیں وہ اس نئی الجھن کو اپنے ناخن تدبیر سے کیسے سلجھاتے ہیں۔ سرورق کا دوسرا رنگ دراڑ نے آخری سطر تک جکڑے رکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رشتے ناتے برف کے گالوں کے مانند نرم و نازک ہوتے ہیں جو چند گرم لفظوں کی آنچ سے پگھل جاتے ہیں اور یہاں تو عدیل نے پورے کا پورا الاؤ ہی جلایا ہوا تھا۔ پھر کیونکر اس کی ازدواجی زندگی اختتام پذیر نہ ہوتی۔ کہکشاں کی ہمت کو داد دینی چاہیے جس نے آخر دم تک امید کا دامن نہ چھوڑا اور سرخرو ہوئی۔ تین ز یعنی زر، زن اور زمین کے موضوع پر مریم صاحبہ کو لکھنے کا عبور حاصل ہے۔ وہ جب بھی اس موضوع پر لکھتی ہیں، لاجواب ہی لکھتی ہیں۔ باقی کا شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے مگر کالی فہرست کے خوف سے تبصرہ جلدی بھیج رہا ہوں۔"

کھاریاں سے بابر عباس کی خوش خبری "جاسوسی کا نیا شمارہ ماہ مئی کی شکل میں حاضر خدمت ہے۔ اس بار جاسوسی پیارا جاسوسی بڑے جاں گسل انتظار کے بعد 6 مئی کو سخت گرمی کی شکل میں ملا۔ سرورق حسب معمول جاسوسی جاسوسی کر رہا تھا۔ کہنے کا مطلب ہے بالکل جاسوسی کی صحیح تفسیر پیش کر رہا تھا۔ سرورق پر موجود شخص اس طرح بھاگ رہا تھا جیسے اس کے پیچھے چڑیلیں لگی ہوئی ہوں جبکہ دوسرا ادبر اور سوبر شخص بھاگتے ہوئے آدمی کی حالت زار پر افسوس کا اظہار کر رہا تھا اسی لیے سوچ میں گم تھا جبکہ حسینہ خوفناک بال بکھیرے ہم قارئین سے یوں مخاطب تھی دیکھو میرے سر میں کتنی جوئیں ہیں۔ سر جی! سرورق کچھ ایویں سا تھا۔ بہرکیف پسند اپنی اپنی۔ شاید صنف نازک کو میری رائے اچھی نہ لگے۔ فہرست کو سرسری انداز میں چیک کیا۔ اس بار کرسی صدارت پر ایک ماہ کے لیے ایم اے ہاشمی صاحب ہی ہی کرتے نظر آئے۔ ہاشمی بھائی! زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں، اسے جمہوریت کہتے ہیں۔ ایک ماہ کے لیے نگراں حکومت مبارک ہو۔ سر جی! ایک خوش خبری میں بھی دینا چاہتا ہوں۔ 28 اپریل کو میں بھی ایک بیٹی کا باپ بن گیا ہوں۔ خدا نے میرے گھر میں بھی بیٹی کی شکل میں اپنی رحمت کی بارش کر دی ہے۔ پہلے دو بیٹے تھے، اب اللہ تعالیٰ نے بیٹی بھی دے دی ہے۔ (بہت بہت مبارک) سر جی دل تو چاہتا ہے سب دوستوں کے خطوط پر تھوڑی سی نوک جھوک کروں لیکن کچھ مصروفیات کی وجہ سے خط ذرا مختصر سا لکھ رہا ہوں۔ کہانیوں میں صرف للکار، گرداب، احمد اقبال صاحب کی واپسی کا سفر، امیمہ سلیم کی زہریلا تریاق اور مریم کے خان کی دراڑ پڑھی ہیں۔ دوسری کہانیاں بھی یقیناً اچھی ہوں گی۔ ایک وہ وقت تھا کہ جاسوسی میں سرورق کے تین رنگ شائع ہوا کرتے تھے۔ عبدالقیوم شاد مرحوم، غلام قادر، سرور اکرام، ابوضیا اقبال، محمود احمد مودی، محی الدین نواب، ایچ اقبال اور بہت سے نامور نام سرورق کے لیے لکھا کرتے تھے اور کیا خوب لکھا کرتے تھے۔ سچ پوچھیں سر جی تو اب سرورق کے رنگوں میں وہ بات نہیں رہی۔ (بس جناب کیا کریں۔ آپ نے جو نام گنوائے ہیں، وہ لوگ وقت کم نکال پاتے ہیں اور کچھ رائٹر انتہائی سست واقع ہوئے ہیں۔ غلام قادر پچھلے دو سالوں سے کہانی لکھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کچھ عرصے سے بہت متاثر ہوں) ہاں ہم نے بیٹی کا نام ماہین بابر رکھا ہے۔" (اللہ بیٹی کے نصیب اچھے کرے، آمین)

ایم اے ہاشمی کی بونیر سے تصحیح "شمارہ 6 تاریخ کو رجسٹرڈ ڈاک سے وصول ہوا۔ سرورق لڑکی بس گزارے لائق تھی۔ چبھتی نکتہ چینی میں صدارتی اسٹینڈ پر اپنا خط دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا اور صدر صاحب کے نام کو استعجابیہ نظروں سے دیکھتا چلا گیا۔ خط ہمارا اور نام کسی اور کا۔ یہ کیا بات۔ بھئی انکل صاحب! ہم "منیر" کب سے ہو گئے؟ آپ نے "ایم اے ہاشمی" کے بجائے "ایم اے منیر" درج کیا تھا۔ کتنے ہی سال بعد صدارت کا موقع ہاتھ آیا لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ وہ بھی آپ نے ہمیں کسی اور تخلص سے نوازا۔ خیر، مجبوری کا نام شکریہ۔ محفل میں خاصی گہما گہمی تھی۔ (اس دل شکنی پر آپ سے معذرت چاہتے ہیں۔ معلوم نہیں اس وقت کون منیر ہمارے سر پر سوار تھے جو آپ کو ہاشمی سے منیر بنا دیا۔ یہ ہمارے کاتب منیر شگفتہ ہوں گے...) ہمایوں تو ایک دم جھگڑے کے موڈ میں تھا۔ پیارے ہمایوں بھائی! آپ کا اندازہ سو فیصد غلط ہے۔ دیکھ لیں آپ کے ریکارڈ۔ پیر بابا سے صبا گل! تم خاصا کسر نفسی سے کام لے رہی ہو۔ یہ بتاؤ تمہیں روکتا کون ہے؟ کہ آج تک اپنی اصلیت چھپا رہی تھیں اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں، بونیر کے پیر بابا کے علاوہ مالاکنڈ ایجنسی میں کوئی اور پیر بابا نہیں۔ آصفہ صداقت جی! ہم سمجھا کہ آپ حسینہ کے نیچے والے مرد کی تعریفوں میں لگی ہوئی ہو لیکن آپ تو حسینہ کے گن گا رہی تھیں۔ توبہ! لڑکی کے منہ سے لڑکی کی اتنی مدح سرائی۔ شکیل کاظمی صاحب کا خطاب سے نایاب تھا، مبارک۔ فہد صاحب! آپ جیسی کیفیت ہماری بھی ہے اس وقت۔ بلیک زیرو ویلکم۔ ماہا جی! آخر یہ خوش فہمی کب تک؟ للکار بڑے نازک موڑ پر آ گئی ہے۔ آرا کوئے نے ایک دنیا تباہ کر ڈالی۔ پتا نہیں یہ آرا کوئے اوٹ پٹانگ ہے یا حقیقت۔ عمران کا دوسرا رخ بھی نظر آیا۔ گرداب بس ٹھیک ہی تھی۔ اسما جی! پلیز کچھ تبدیلی لائیں۔ آپ کی کہانی کے ابتدائی حالات ہمیں بے حد پسند تھے۔ ابتدائی کہانی تو فیورٹ رائٹر کی تھی لیکن پسند بالکل نہیں آئی۔ نو کمنٹس۔ میمونہ کی پاداش اچھی تھی۔ انوکھا مشورہ تو ایک دم بور تھی۔ رنگوں میں دراڑ عمدہ تحریر تھی۔ دولت کی خاطر بیوی بچوں کی زندگیوں سے کھیلنے والے عدیل کو سرِ راہ الٹا لٹکانا چاہیے تھا لیکن مریم صاحبہ نے اس کی سزا ایک گراؤنڈ میں ڈال دی۔ امیمہ سلیم غالباً سلیم فاروقی صاحب کی صاحبزادی ہیں۔ کہانی کا انداز بالکل ان جیسا تھا، اچھی کہانی تھی۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں۔"

فہیم اللہ خان کی بے یقینی "اس دفعہ بک اسٹال سے جاسوسی کے ساتھ ساتھ میں نے پاکستان کا تفصیلی نقشہ بھی لیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ آیا جس علاقے میں، میں ہوں وہ پاکستان میں ہی ہے یا نہیں کیونکہ اس شمارے میں کسی نے بھی یہ شکایت نہیں کی تھی کہ پرچہ لیٹ ملا۔ میں آج کل کرم ایجنسی میں

ہوں اور یہاں پرچہ اسی پرانی تاریخ چھ یا سات کو ملتا ہے۔ پھر بھی شکر ہے کہ ملتا تو ہے، نہ ملتا تو۔۔۔ ان کڑوی باتوں کو چھوڑ کر ٹائٹل پر نگاہ ڈالی۔ ٹائٹل گرل کے شانوں پہ بکھرے بال، کانوں میں دل کی شکل کے جھمکے اچھے لگے۔ نیچے ڈاکر انکل نے صنفِ وجاہت کے ساتھ وہی سلوک کیا تھا جو وہ ہمیشہ سے کرتے چلے آرہے ہیں یعنی ایک کو سوچوں میں غرق کیا تھا تو دوسرے کو بھگا رہے تھے۔ اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے محفلِ یاراں میں پہنچے۔ جہاں بونیر سے ایم اے ہاشمی خوش خبری لیے مسندِ صدارت پر موجود تھے۔ بندۂ ناچیز کی طرف سے دونوں کی مبارک باد قبول فرمائیں۔ ہمایوں سعید بھائی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ چھیڑ خانی تو ماہا ایمان ہی کرتی ہیں۔ جواب تو دینا پڑتا ہے کیونکہ یہ تو صنفِ وجاہت کی وجاہت کا سوال ہے۔ اس کے علاوہ کاشف علی میراں، آصفہ صداقت، عمیر شہزاد بنگش، سید شکیل حسین کاظمی اور دوسرے دوستوں کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ محی الدین اشفاق صاحب! آپ کی بہن کو ایوارڈ ملنے پر مبارک باد۔ تبصرہ جاندار تھا۔ ماہا ایمان صاحبہ! آپ کی اور دوسرے دوستوں کی نوک جھوک کی وجہ سے ہی تو محفل پر رونق ہوتی ہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی۔ یہ دنیا کا واحد گرداب ہے جس میں ہر کوئی راضی خوشی اترتا ہے اور پھر باہر نکل آنے پر خفا بھی ہوتا ہے۔ شہریار عادل کے ساتھ بھی اب ماہ بانو کی طرح واقعات پیش آرہے ہیں۔ اس کے بعد للکار پڑھی۔ ہیرو بھائی اور تابی حسبِ معمول اینڈ پر پھر مشکل میں پڑ گئے ہیں لیکن عمران اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال لے گا۔ پر لگتا ہے کہ ہیرو بھائی بھی اس معرکے میں کام آنے والے ہیں۔ اس کے بعد میرے پسندیدہ رائٹر کاشف زبیر حساب بے باق میں جلیل میاں کے ساتھ حاضر ہوئے۔ اچھی کہانی تھی۔ رنگوں میں دوسرے رنگ نے خوب رنگ جمایا۔ پہلا رنگ اسیمہ سلیم کی اچھی کاوش تھی لیکن کہیں کہیں افسانہ لگتی تھی۔ اس کے بعد مختصر کہانیوں میں کھوٹا سکہ، پاداش، تلاش اور بدنیت اچھی کاوشیں تھیں۔ خوش اسلوب، سراغ رساں کمپیوٹر اور انوکھا مشورہ بور تحریریں ثابت ہوئیں۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کی واپسی کا سفر موجودہ حالات کی عکاسی کرتی زبردست تحریر تھی۔“

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی وضاحت ”جاسوسی اس بار کافی تاخیر سے یعنی 9 تاریخ کو ملا۔ شاید الیکشن کی وجہ سے۔ سرورق کی حسینہ کچھ مغربی سی لگی، سوائے کان کے بندے کی شکل سے جو پانچواں مہینا یعنی مئی ظاہر کرتا تھا اور بھاگتے ہوئے حضرت بھی تھری پیس سوٹ میں ملبوس نظر آئے۔ سب سے پہلے خطوط کی محفل کی طرف۔ بونیر کے ہاشمی صاحب کرسی صدارت پر نظر آئے، مبارک ہو۔ پشاور کے بنگش صاحب کو میری بیزاری نظر آگئی شکریہ۔ ویسے میں تبصرہ مختصر اور جامع ہی رکھتا ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ خطوط شائع ہوسکیں۔ ساتھ ہی فضول لفاظی سے بھی اجتناب کرتا ہوں۔ (یہ آپ اچھا کرتے ہیں) گجرات کے بلیک زیرو صاحب کا بھی شکریہ کہ میرا تبصرہ پسند آیا۔ اب آئیں کہانیوں کی طرف تو میری فرمائش پر جلیل میاں کی کہانی حساب بے باق شائع کرنے کا شکریہ۔ للکار ایک فلمی کہانی کی طرح ہے۔ ہیرو، تابش اور عمران سب کو ختم کرکے ہیروئن ثروت کو لے کر اب پاکستانی بارڈر کے نزدیک ہی آگئے ہیں اور گیسٹ ہاؤس سے بھی بخیر و عافیت نکلنے میں کامیاب ہو کر واپس پاکستان پہنچ جائیں گے۔ دوسری قسط وار کہانی گرداب میں شہریار اور سلو ابھی تک ممبئی ہی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پہلی طویل کہانی واپسی کا سفر شاندار رہی اور امریکا جانے والے غیر قانونی تارکینِ وطن کی حالتِ زار کی صحیح عکاسی کرتی تھی۔ بدیسی کہانیوں میں جمال دستی کی بدنیت سب سے بہتر رہی۔ سرورق کی دوسری کہانی دراڑ اچھی رہی۔ اس بار کنٹریز نہ ہونے کے برابر رہیں۔“

کراچی سے محسن کمال کی کتھا ”جاسوسی اس بار 30 اپریل کو ہی مل گیا، سرورق پر نظر گئی تو میں حیران رہ گیا۔ سرورق کی لڑکی کی آنکھیں مجھے بے ساختہ ان آنکھوں کی یاد دلا گئیں جنھیں میں نے ایک ہفتہ پہلے اتفاق سے دیکھا تھا۔ کیا خوب صورت آنکھیں تھیں۔ نظروں سے ہوتی ہوئی سیدھے دل میں اتر گئیں۔ لڑکی کے بالکل قریب ہی ہمایوں سعید صاحب اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے ریس میں فرسٹ آنا چاہتے ہوں۔ تو ہمایوں سعید صاحب مبارک ہو اگر اس طرح اکیلے ریس میں حصہ لیں گے تو بلاشبہ انعام کے حق دار آپ ہی ٹھہریں گے۔ کرسی صدارت پر ایم اے ہاشمی صاحب بڑی شان و تمکنت سے براجمان نظر آئے، شادی مبارک ہو۔ آپ کے تبصرے کی وہ سطور دل میں اتر گئیں، جس میں فہد علی صاحب نے کہا تھا کہ ناکام محبت بڑی ظالم شے ہے۔ واقعی دوسروں کو اس کا ادراک نہیں ہوتا، تپش وہی جگہ محسوس کرتی ہے جہاں آگ جلتی ہو۔ خیر، یہ تو اپنی اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے۔ ہاشمی صاحب! کہتے ہیں ناکہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اور نوجوانی میں ہر چیز ہی سونا محسوس ہوتی ہے۔ عدنان یوسف شکریہ جاسوسی میں خوش آمدید کہنے کے لیے۔ عمیر شہزاد بنگش صاحب! ہم نے تو اپنی طرف سے اپنے حدود اربع کے ساتھ بھرپور انٹری دی تھی جاسوسی میں، اب کیا کریں انکل کی قینچی نے ہمیں آپ سے کنجوس ہونے کا لقب دلوا ڈالا۔ فہد علی صاحب آپ کا تبصرہ شاندار تھا مگر یہ کیا کہ ایک مہینہ تو صدارت ملی اور اگلے ماہ وزارت تک سے محروم کردیے گئے۔ چچ چچ چچ۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ عمران نے جاوا کو جہاں نقلی آراکوئے دے کر بے وقوف بنایا وہیں اس نے نقلی سرینا عمران کے حوالے کرکے کاری وار کردیا۔ اقبال اور ابرار صدیقی کی زندگی کا چراغ بھی اس ماہ گل ہوگیا۔ گرداب تو لگتا ہے جیسے صرف شہریار اور سلو کے لیے ہی مخصوص ہوگئی ہے۔ اسماجی، ماہ بانو اور کشور بھی اسی گرداب کے کردار ہیں، انھیں کیوں بھول گئی ہیں آپ؟ اسیمہ سلیم کی زہریلا تریاق بور لگی۔“

محسن علی موسم، بالاکوٹ سے لکھتے ہیں ”الیکشن کی گہما گہمی میں جب دوست نے بتایا کہ مئی کا شمارہ مارکیٹ میں آگیا ہے تو جی چاہا کہ اس کا منہ چوم لوں لیکن اس کا منہ دیکھ کر اس بات سے اجتناب کرنا بہتر سمجھا۔ ٹائٹل پر موجود بھاگتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر لگتا ہے جیسے اس نے ماہا ایمان کو دیکھ لیا ہو اور وہ بھی بغیر میک اپ کے۔ ٹائٹل گرل کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہیں گے کہ محفل میں بہت سے اہلِ دل ہیں اور وہی بہتر کمنٹس دے سکتے ہیں۔ محفل میں ایم اے ہاشمی کو سرفہرست پایا۔ ویسے صاحب شادی کے بعد جو کمنٹس آپ نے ٹائٹل گرل کو دیے ہیں، مجھے انتہائی حیرت ہے کہ آپ کا ذوقِ نظر اب بھی زندہ ہے۔ جنوں سے ہمایوں سعید، اپنی خودی کو بلند کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کافی بہتر نظر آئے۔ صبا گل کی گل کاریاں، ویسے وجودِ زن کے ساتھ رنگ کم اور جنگ زیادہ ہے اور اپنی صفات کی خوش فہمی میں مگن رہیے۔ ماہا ایمان مفاہمت کی پالیسی پر گامزن نظر آئیں۔ شاید ان کے ترکش کے سبھی تیر فائر ہوچکے ہیں یا تھوڑی سی ذہانت کسی سے ادھار لی ہے، کیوں ماہاجی؟ کہانیوں میں حسبِ معمول للکار سے آغاز کیا۔ اقبال کی موت نے دکھی کردیا۔ عمران اور تابی ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ گرداب میں شہریار اور سلو خوب ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں اور لگتا ہے ابھی اگلی قسط میں مزید ایکشن دیکھنے کو ملے گا لیکن ایک گزارش ہے کہ ماہ بانو اور کشور کو بھی ٹھیک

طرح سے منظرِ عام پر لایا جائے۔ احمد اقبال صاحب کی واپسی کا سفر میں چھوٹے حکیم صاحب کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہا کہ وہ ایک کے بعد ایک ٹھوکر کھاتے گئے اور پھر بھی نہ سمجھے۔ زہریلا تریاق بھی دلچسپ رہی۔ میجر تیمور نے دماغ کا استعمال کرتے ہوئے ملک دشمن عناصر کے دانت کھٹے کیے، مزہ آگیا۔ حساب بے باق میں جلیل کے نئے ڈرامے نے کافی مزہ دیا اور مرزا جی کو بھی خوب سبق سکھایا، نازو نے بھی بہتر انداز میں حساب بے باق کیا۔“

پنجاب سے ماہا ایمان کی انٹری ”قوم کو چڑھنے والا الیکشن کا بخار میاں نواز شریف کی اینٹی بائیوٹک کھا کر اتر چکا ہے۔ آج کل فی الحال راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔ ہمارا موڈ بھی آج بہت اچھا ہے۔ وجہ ظاہر ہے جاسوسی کا سیر حاصل مطالعہ ہے۔ مئی کا جاسوسی 4 تاریخ کو روشنیاں ساتھ لایا یعنی جاسوسی اور بجلی کی آمد ایک ساتھ ہوئی۔ سرورق حسبِ روایت جاندار تھا۔ فہرست میں نامی گرامی رائٹرز کے نام پڑھے۔ اشتہارات کو سرسری سا دیکھا اور محفلِ گل و گلزار تک پہنچے جہاں ڈسٹرکٹ بونیر سے آئے ایم اے ہاشمی اِدھر اُدھر کی ہانک رہے تھے۔ جناب یہ میرے اپنوں کا فخر میرے الفاظ میں بولتا ہے اور ان پہ اللہ کا رحم و کرم ہی تو ہے جو ہم ان کے حصے میں آئے۔ (سبحان اللہ) ہمایوں سعید آئندہ میرے تبصرے میں تمہارا ذکر تک نہ ہوگا پھر کیا بہانہ بناؤ گے؟ کاشف علی میراں کو میرا بھتیجا مبارک ہو۔ صبا گل روشانے صنم ہماری ایک ساتھی ہوا کرتی تھیں نہ جانے آج کل کہاں مصروف ہیں کہیں بھی نظر نہیں آتیں۔ آصفہ صداقت اویلڈن دن میں تارے دکھا دیے تم نے صنفِ کرخت کو۔ عمیر شہزادہ! آپ لڑکی ہوتے تو ہمایوں سعید اڑ کے آپ سے ملنے پہنچتے۔ اب دیکھو اور اگر آپ اتنے جل ککڑے نہ ہوتے تو پیناڈول کی ضرورت کاہے کو پڑتی۔ احتشام احسان! ہر کوئی ہمارے موصوف کی طرح خوش قسمت تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ ہماری دعائیں البتہ آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا چھوٹا سا شہر ہمارا ددھیالی شہر بھی ہے۔ اکثر آنا جانا رہتا ہے ہمارا۔ آپ کس طرف پائے جاتے ہیں؟ زویا اعجاز اور ایم سعید کا اختصاریہ بھی پسند آیا۔ شکیل کاظمی صاحب! لگتا ہے آپ پڑوسنیں دریافت کرنے اور پھر ان سے روابط بڑھانے اور پھر محفل میں انھیں ڈسکس کرنے کے خاصے شوقین ہیں۔ سو آپ سے محتاط رہنا چاہیے۔ حماد فرہاد آپ کے پرخلوص الفاظ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ بے شک عادت سے مجبور ہو کے آپ اینڈ پہ ہمیں بزرگ بنا گئے۔ محی الدین اشفاق! آپ کی سسٹر مبارک باد کی مستحق ہیں۔ میری وِشز ان تک ضرور پہنچائیے گا۔ اس بار خلافِ معمول للکار سے مطالعے کا آغاز کیا جہاں سنسنی اور تیزی تمام تر ریکارڈ توڑے ہوئے تھی۔ حقیقتاً ہم نے خود کو عمران اینڈ کمپنی کے ساتھ محوِ سفر پایا۔ گرداب اس بار بھی ماہ بانو کے ذکرِ خیر کے بغیر تھی۔ شہریار اور سلو کا بہادری سے را کا ایک اہم اڈا تباہ کرنا کمال کا کارنامہ تھا۔ اینڈ پر دونوں خاصی مشکل میں پھنس چکے ہیں۔ مختصر تحریروں میں سراغ رساں کمپیوٹر الفریڈ ہچکاک سے ایک سائنسی انتخاب ٹھہرا جس میں عمل کے ذریعے اپنی شناخت کی دریافت اور گمشدگی کا احوال مہارت سے بیان کیا گیا۔ انوکھا مشورہ از بابر نعیم۔ ایک روٹین سے قدرے ہٹ کر لکھی گئی تحریر تھی، عمدہ لگی۔ بدنیت از جمال دستی میں سوزن والٹ اور دوستوں کی زندگی میں آنے والے واقعات جہاں خوشیوں میں اچانک ہی جرم کے سنگ ریزے آگئے۔ کاشف صاحب کی حساب بے باق میں جلیل نے سود سمیت نازو کا حساب بے باق کیا۔ راجا کا کردار اس دفعہ محدود تھا اور شنو کا ذکرِ خیر بالکل ہی غائب لیکن تحریر اچھی تھی۔ احمد اقبال صاحب کی پہلی طویل تحریر واپسی کا سفر دورِ حاضر کے تقاضوں اور حالات کی عکاسی تھی۔ کافی تلخ و شیریں واقعات کا مجموعہ جو کہ شرافت کے ساتھ پیش آئے۔ ویسے شرافت کے ساتھ اینڈ میں بہت برا ہوا، صوفیہ کی شکل میں اور بھی برا ہوا۔ آخری سرورق کی تحریروں میں مریم کے خان کو پہلے پڑھا اور ہر سطر میں یوں لگا جیسے میں کاشف زبیر کی کوئی تحریر پڑھ رہی ہوں۔ بہت مماثلت ہے دونوں رائٹرز کے اندازِ تحریر میں۔“

سرگودھا سے وردہ شاہین کی تمنا ”کئی سالوں سے جاسوسی پڑھ رہی ہوں لیکن کبھی خط لکھنے کی ہمت نہیں کی۔ اس دفعہ للکار نے خط لکھنے پر مجبور کردیا۔ (خوش آمدید) صبا گل! مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ثروت خواہ مخواہ ہی یوسف جیسے شخص کے ساتھ وقت ضائع کررہی ہے۔ عدنان یوسف! واقعی لڑکیوں کے منہ بند کروانے کی کبھی کوشش نہ کرنا ورنہ۔۔۔ حیرت ہے آصفہ صداقت آپ کو جنات اچھے لگتے ہیں، کہیں آپ بھی تو۔۔۔ احمد اقبال کی جواری کے اشتہار سے لگتا ہے کہ للکار ہی اختتام پذیر ہوگی لیکن مغل صاحب کے اندازِ بیاں سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب اب ہمارے ہیرو بھائی عمران کے پیچھے ہاتھ پاؤں دھو کر بلکہ نہا دھو کر پڑ گئے ہیں۔ اور مغل صاحب ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے کیونکہ ہم بھی آپ کے ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پلیز! عمران کو کچھ مت کیجیے گا۔ بے شک کہانی کے سب کرداروں کو بم دھماکے سے اڑا دیں، دریا میں ڈبو دیں یا کچھ بھی کریں لیکن عمران کو صحیح سلامت بارڈر پار کروادیں۔ آخر جاوا کا ہیرو بچہ ہے وہ پلیز۔ گرداب بھی اچھی جارہی ہے۔ احمد اقبال تھوڑے عجیب سے رائٹر ہیں۔ اس لیے ان کی کہانی ایسے گزر گئی جیسے۔۔۔ رنگ بہتر تھے۔ مریم کے خان اب رنگوں پر آگئی ہیں اور پھر قسط وار کہانیاں لکھا کریں گی۔ کھوٹا سکہ بھی ٹھیک تھی۔ کاشف زبیر کی کہانی ہو اور وہ بھی جلیل کی تو مزہ آجاتا ہے، سو اس بار بھی یہی ہوا۔ باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے اور ہاں سب قارئین میرے لیے دعا کریں کہ میرے اچھے نمبر آئیں۔ میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہے۔“ (اللہ آپ کی مراد پوری کرے، آمین)

لیہ سے سید محی الدین اشفاق کی افسردگی ”ماہِ مئی بہت اداسیاں اور غمگینیاں دے گیا۔ 3 مئی بہت اذیت ناک دن تھا۔ میرے اور میری پوری فیملی کے لیے۔ ہمارے والد محترم سید عاشق حسین شاہ انتقال کرگئے۔ یکم مئی کو امی جان کی برسی تھی، انھیں اس دنیا سے گئے 12 سال ہوگئے ہیں۔ تب میں بہت چھوٹا تھا اور اب 3 مئی کو امی کی برسی کے دو دن بعد ہی ابو جان کی جدائی جیسا غم برداشت کرنا پڑا۔ کچھ عرصے سے وہ بسترِ علالت پر تھے۔ میرا بہت سا ٹائم ان کے کام کرنے میں ان کے قریب گزرتا۔ مجھے ان کی اتنی عادت ہوگئی تھی کہ ان کے چلے جانے کے بعد لگا کہ میری جاب چلی گئی۔ زندگی کی رونقوں کی طرف لوٹنا بہت مشکل لگ رہا ہے۔ چار سال پہلے انھیں فالج ہوا بائیں سائیڈ پر اور دوسرا اٹیک بھی مئی کو ہوا جس کے ساتھ ہارٹ اٹیک اور برین ہیمبرج اور پھر ہاسپٹل میں وہ میرے اور بھیا کی گود میں لیٹے ہمیں ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ گئے۔ میری ادارے اور تمام قارئین سے اپیل ہے کہ میرے والد صاحب کی مغفرت کے لیے خصوصی دعا کریں اور ہمارے لیے صبر کی۔ میرے ایم اے کے پیپر شروع ہو رہے ہیں، بہت دعا کیجیے گا۔“ (ماں باپ کی رحلت اولاد کے لیے ایک سانحہ ہوتا ہے۔۔۔ آپ کے غم میں ہم دل سے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ والد صاحب کو غریقِ رحمت کرے اور آپ کو جلد سنبھلنے کا موقع دے۔ امتحان کی گھڑیاں گزرتی مشکل سے ہیں مگر۔۔۔ گزر جاتی ہیں)

خرم شہزادو کی خواہش "جاسوسی ڈائجسٹ کا ساڑھے تین سال سے خاموش قاری ہوں اور آج تک خط نہیں لکھا۔ مئی کا شمارہ چار تاریخ کو کافی انتظار کے بعد پندرہ میل دور واقع بک اسٹال سے ملا۔ سب سے پہلے اپنی من پسند اور سنسنی خیز کہانی للکار پڑھی۔ عمران اور تابش زبردست موڈ میں ہیں۔ جگت سنگھ کی دیدہ دلیری پسند آئی۔ للکار کا ہر لمحہ پر لطف ہوتا ہے اور پڑھنے والا اس میں کھو جاتا ہے۔ اس کے بعد گرداب پڑھی، وہ بھی اچھی جا رہی ہے۔ سرورق کی دونوں کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ البتہ واپسی کا سفر گزارہ ہی تھا۔ باقی شمارہ مجموعی طور پر اچھا تھا۔ امید ہے ہماری اس چھوٹی سی کاوش کو آپ ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گے۔" (یقیناً نہیں کریں گے)

کبیر والا سے مہر اختر عباس تھراج اور ظفر اقبال ظفری کی فرمائشیں "جاسوسی اس بار 3 مئی کو عید کا چاند بن کر ہمارے ہاتھوں میں آیا۔ ٹائٹل کو دیکھا۔ ڈاکر انکل کو بے حد سراہا۔ ان کے ہاتھ صنفِ نازک کو بہت پیاری سی صورت میں بناتے ہیں۔ ٹائٹل پہ ہمایوں سعید دوڑتا نظر آیا۔ اس کے پیچھے لگتا ہے ایلیٹ فورس لگی ہوئی ہوگی۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ٹائٹل سے ثقافت جمپ لگائی اور فوراً پہنچے محفلِ دوستاں میں۔ ڈسٹرکٹ بونیر سے ایم اے ہاشمی نے صدارت کی کرسی سنبھالی۔ موصوف نے اچھا تبصرہ لکھا ہے۔ بھائی ہاشمی! یہ ماہا ہے نا ایسی یعنی خود پر فخر کرنے والی اور تو کوئی کام ہوتا نہیں بھئی ان سے۔ بنوں سے عدنان لیونسو! جس اسپیڈ سے آپ کے دل کی دھڑکن جواری کا اشتہار دیکھ کر بڑھی، اس رفتار سے دل کے ایکسیڈنٹ ہونے کا بہت خطرہ ہے۔ اس لیے رفتار آہستہ، آگے آبادی ہے۔ بنوں سے ہی ہمایوں بھائی! آپ کے متعلق صرف اتنا کہوں گا کہ اپنے آپ میں اخلاق پیدا کرو۔ خون کی طرح اس کی بھی بہت کمی ہے آپ میں۔ کوٹ رادھا کشن سے کاشف علی میراں! بہت بہت مبارک ہو، ہم آپ کی وجہ سے چاچو بن گئے ہیں۔ ایک بات تو بتانا جمن شاہ، کوٹ رادھا کشن سے کتنے فاصلے پر ہے؟ کیونکہ ہم آپ کے شہر سے گزر کر ہی جمن شاہ جاتے ہیں۔ صبا گل کی گل کاریاں پسند آئیں۔ آپ کے بقول اگر ماہا ایمان نوشی چودھری تھی تو پھر یہ طے ہے کہ آپ بھی کافی پرانی تبصرہ نگار ہیں۔ کراچی سے محسن کمال آپ کی خوشی بجا ہے۔ پہلی بار خط کو شامل دیکھ کر خوش ہونا بہت اچھا لگتا ہے۔ نیکسٹ ٹائم محفل پر بھی کچھ لکھنا۔ آصفہ صداقت! اس دفعہ آدھا تبصرہ تو آپ نے ٹائٹل پر کر دیا۔ اچھا آصفہ! آپ نے لفظوں کے کھلاڑی کو جو کچھ کہا، اس کا جواب تو آپ کو انکل سے مل گیا۔ اب کی بار ذرا سوچ کر۔۔۔ بیچ جل کرنا، ہاہاہا۔ ہمایوں بے چارے کو تو آپ نے جل ککڑی بنا دیا۔ پشاور سے عمیر شہزاد بنگش آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہی لاجواب ہوتا ہے۔ آپ کی طرح آپ کا انداز بھی کیوٹ سا لگا۔ احتشام احسان! آپ کا تبصرہ پڑھ کے مجھے منصور بنگش کا وہ گانا یاد آ گیا۔ کہوی غلطی ہوئی اے ظالم، کیوں دیرے دور لائے نی۔ یار ایسا بھی کیا ہو گیا تھا، آپ ناراض ہو گئے اور فون پر رابطہ کرنا بھی چھوڑ دیا۔ اسلام آباد سے سید بادشاہ جناب سید شکیل حسین کاظمی صاحب کیسے مزاج ہیں؟ رانا حماد فرہاد سمیت سب کے لیے دعائیں ہیں جو سزائے موت کے قیدی ہیں، وہ بھی بغیر کسی جرم کے ان کو اللہ پاک آزادی نصیب کرے۔ حافظ آباد سے ماہا ایمان آپ کے بارے میں اتنا کہتا ہوں صرف تم سا کوئی پیارا، کوئی معصوم نہیں ہے، کیا چیز ہو تم، خود تمہیں معلوم نہیں ہے۔۔۔ اب کچھ کمنٹس ذرا اسٹوریز پر ہو جائیں۔ ہمارے دلوں کی دھڑکن یعنی للکار مغل انکل آپ کی عظیم، بلند پایہ شخصیت کا قائل تو میں اسی وقت سے ہو گیا تھا جب دیوی پڑھی تھی۔ للکار، دیوی کے مقابل تو نہیں ہو سکتی مگر اس کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ عمران کا کردار بہت بھلا لگتا ہے۔ پہلی کہانی اور سرورق کے رنگ ابھی زیرِ مطالعہ ہیں اور انگلش ترجمے والی کہانیاں مجھے تو بالکل پسند نہیں ہیں۔ کزن ان کے پڑھنے کے شوقین ہیں۔ ایک گزارش ہے، حضورِ والا کوئی قسط وار کہانی ہمارے محبوب مصنف محی الدین نواب سے بھی لکھوا دیں، پلیز، پلیز، پلیز۔"

چکلالہ راولپنڈی سے راحی غارس کی افسردگی "اس بار کا جاسوسی بہت تاخیر سے یعنی 9 تاریخ کو ملا۔ سرورق پر موجود حسین و جمیل خاتون کا جوڑا بہت اچھا لگا اور اس کے نیچے موجود شخص کا پرسوچ انداز کسی گمبھیر صورت حال کا پتا دے رہا تھا اور وہ صورت حال ہمیں للکار میں جا کر معلوم ہوئی۔۔۔۔ بہرحال سرورق کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد بہ ہدایت مدیرِ اعلیٰ پاکستان کا خواب آنکھوں میں لے کر پہنچے اپنی محفل میں۔ تو کرسی صدارت پر ایم اے ہاشمی بیٹھے کوئی خوش خبری دے رہے تھے۔ ہاشمی صاحب آپ کی تعداد ایک سے کیسے متجاوز ہو گئی کہ جاسوسی جیسا مہربان بھی رقیب ٹھہرا۔ بہت سے قارئین کو میرے نام پر حیرانگی ہو رہی ہے تو جناب میرا اصل نام راحیلہ ہے، اسی سے نک نیم راحی رکھا ہے اور غارس عربی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے درخت لگانے والا۔ یہ اسم فاعل ہے یوں میرا مکمل قلمی نام راحی غارس ہے۔ یقیناً بہت سے لوگوں کی تسلی تشفی ہو گئی ہو گی (جی) محمد ہمایوں سعید صاحب! میں ہرگز کسی غار میں نہیں رہتی آپ شرفِ دیدار بخشنے کی زحمت ہرگز مت کیجیے گا۔ (ورنہ واقعی غار میں پہنچ جائیں گی؟) اس دفعہ ڈاکر انکل کے کرامانی ہاتھوں نے آپ کو ہی پرسوچ انداز میں سرورق پر نمایاں کر دیا ہے۔ آپ کا دیدار بھی ہو گیا۔ عدنان یوسف آج کل کے لڑکوں کے منہ بھی ہرگز بند نہیں ہیں۔ سمجھ تو گئے ہوں گے آپ۔۔۔ آصفہ صداقت، واقعی ہمیں صنفِ کرخت کے کھمن کی ہرگز ضرورت نہیں اور جلدی سے بتا دیتی ہوں کہ یہ نک نیم میں نے خود ہی اپنا رکھا ہے۔ اگر تمہیں پسند نہیں تو کوئی اچھا سا خود ہی تجویز کر دو، مجھے قطعی برا نہیں لگے گا۔ تمہارا خط اس دفعہ سب سے عمدہ لگا۔ عمیر صاحب، اسلطانہ تو اب جا چکی، دعا کیجیے ثروت کو تابی پر رحم آ جائے اور وہ اس کی محبت کو سمجھ جائے۔ سید شکیل صاحب! آپ ہر دلنشین لڑکی کو اپنی ہیروئن کیوں سمجھ لیتے ہیں؟ اور اس دفعہ شیکسپیئر کا کوئی قول نہیں بتایا آپ نے؟ اب کچھ تبصرہ اپنی کہانیوں پر۔ ہمیشہ کی طرح ابتدا للکار سے ہی کی۔ اس دفعہ کی قسط ہمیشہ سے زیادہ شاندار، بہترین اور لڑائی بھڑائی و سسپنس سے بھرپور تھی۔ پلیز طاہر انکل! تابی، عمران اور تابی کی جان ثروت کو کچھ بھی مت کیجیے گا۔ سب پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جائے مگر خدارا ان کو خراش بھی مت آنے دیجیے گا ورنہ اگر للکار کا انجام ذرا بھی برا ہوا تو اوروں کا تو پتا نہیں مگر میں ضرور رو رو کے ہلکان ہو جاؤں گی۔ اب کی بار بھی جب پڑھا تو کتنی ہی دیر طبیعت اداس رہی، کسی کام میں دل ہی نہیں لگا۔ اس کے بعد سونے پہ سہاگا جو احمد اقبال کی واپسی کا سفر پڑھ ڈالی تو کیا حالت ہوئی، اتنا برا انجام۔۔۔ شرافت کو تو اپنے کیے کی سزا کے طور پر والدین کا دکھ اور مال و گھر سے محرومی کی صورت میں مل چکی تھی۔ اس پر فیس بک پر بنائی گئی دوست صوفیہ کی چال نے تو گویا اسے زندہ جہنم میں دھکیل دیا۔ احمد صاحب! کیا واقعی فیس بک کا اتنا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے؟ یقین نہیں آتا۔ میں نے بھی نیا نیا فیس بک اکاؤنٹ کھولا ہے آپ نے تو ڈرا ہی دیا ہے۔ ان دو کہانیوں نے ہی ادھ موا کر دیا۔ باقی رسالہ کچھ طبیعت سنبھلنے کے بعد ہی پڑھوں گی۔" (کبھی اتنا حساس و دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ حقیقت کے قریب سہی مگر ہیں تو کہانیاں ہی نا۔۔۔)

جھنگ سے ڈاکٹر عمران فاروق کی کشمکش "جاسوسی کے ساتھ تو ہماری یاری عرصہ پندرہ سال پرانی ہے۔ جاسوسی نشیلی آنکھوں والی حسینہ کے جھمکوں سمیت 5 تاریخ کو ملا۔ نیچے ڈاکر انکل سوچ میں ڈوبے کچھ یہی سوچ رہے ہیں کہ الیکشن کی گہما گہمی ہے کون سی جماعت WIN کرتی ہے یا پھر وہی مخلوط حکومت اور غریب پاکستانی عوام۔ محفلِ یاراں میں ایم اے ہاشمی کو کرسی صدارت کی مبارک باد۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کی تعداد ایک سے دو ہوئی، دو سے چار ہو انشاء اللہ لیکن پھر یہ نہ ہو کہ آپ جاسوسی پڑھنا ہی چھوڑ دو۔ عدنان یوسف لڑکیوں کی زبان بند کرنے کے لیے ہی قینچی ایجاد ہوئی تھی۔ ہمایوں سعید کیا بات ہے آپ کے جوابات کی۔ صبا گل عورتیں خوشامدی اور 313 نخرے والی ہوتی ہیں، نہیں یقین آتا تو آصفہ صداقت کا خط دوبارہ پڑھ کر دیکھ لو۔ احسان سحر! میں بھی آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ جاسوسی میں کہانیاں صرف جاسوسی پر ہی مبنی ہونی چاہئیں۔ منشی رانا حماد فرہاد کا تبصرہ بہت اچھا تھا۔ فہد علی جنجوعہ، اللہ پاک آپ کو کامیابی و کامرانی عطا فرمائے، آمین۔ آئندہ صنفِ نازک کے خطوط اس صورت محفلِ یاراں کی زینت بنیں گے جب سب صنفِ نازک مدیرِ اعلیٰ کی خوشامد کریں گی۔ (یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟) سب سے پہلے للکار پڑھی۔ بہت شاندار فائٹ اور نہ رکنے والا ایکشن چل رہا تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ بقیہ واقعات آئندہ ماہ۔ اوہ، نو۔ گرداب پڑھی۔ ایک آزمائش ختم دوسری شروع۔ شہریار کو پہلا مشن ملا لگتا ہے کہ پہلی قسط ہی پڑھی ہے۔"

حافظ شاہد عمران، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے لکھتے ہیں "اس ماہ کا شمارہ حسبِ معمول 6 مئی کو جیل کی کال کوٹھریوں میں چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا ہوا آیا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سرورق پر حسینہ گم صم اور پریشان، دور سے کسی چیز کو دیکھنے میں مصروف تھی۔ نیچے کسی خونی پارٹی کا بھگایا ہوا شخص اپنی جان بچاتا ہوا نظر آیا، بہرحال سرورق اچھا تھا۔ چینی نکتہ چینی میں ایک بار پھر ہم لوگوں کو اپنے ووٹ کا صحیح استعمال کرنے کی ہدایت کی گئی۔ اس کے بعد سیدھے اپنے پیارے پیارے پھولوں جیسے دوستوں کی محفل میں پہنچے۔ کرسی صدارت پر ایم اے ہاشمی صاحب کو براجمان پایا۔ شاید اگلے ماہ یہ کرسی آپ سے چھن جائے۔ بہرحال، مبارک ہو شاہی کرسی ملنے کی۔ عدنان یوسف بھائی آپ کو مذکر اور مونث کا پتا ہی نہیں چلتا چلو کوئی بات نہیں۔ یقیناً آپ خواجہ سرا کو تو دور سے ہی پہچان لیتے ہوں گے۔ آصفہ صداقت! کیا بات ہے آپ کی شاعری کی۔ اب تو آپ نے خط بھی شعروں میں لکھنا شروع کر دیا ہے (حیرت انگیز ترقی) عمیر شہزاد بنگش! کیا واقعی آپ نے انجینئر ہونے کا ڈراما رچایا ہوا ہے یا آپ انجینئر ہیں؟ ویسے ہمایوں سعید کی بات دل کو لگتی ہے کہ آپ ایف اے کے اسٹوڈنٹ ہیں۔ (کیوں زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں۔ وہ پہلے ہی بھڑکے ہوئے ہیں) شکیل کاظمی صاحب! اس دفعہ کھانس کھانس کر مارگلہ کی پہاڑیاں ہلا رہے تھے اور ٹیکسلا کو زیرِ آب کر رہے تھے۔ محترم اشفاق ترکئی صاحب، آپ نے بھی ماہا ایمان کے ساتھ اپنی دشمنی کا پورا ثبوت دیا ہے۔ ساہیوال جیل سے منشی حماد بھائی بہت خوب کہ آپ واپس دوستوں میں تشریف لائے۔ سرگودھا اور کوٹ لکھپت کے تمام قیدیوں کو سلام اور اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب قیدیوں کو معاف فرمائے۔ (آمین) اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی للکار پر پہنچے۔ کیا بات ہے کہانی کی۔ اس قسط کا مزہ ہی کچھ اپنا تھا۔ اس کے بعد گرداب پڑھی۔ ہمارے شیر شہریار اور سلوان کے گھیرے سے نکل گئے اور "را" والوں کا کافی نقصان بھی کیا لیکن آخر میں اب بری طرح پھنس جانے کی صورت حال بن چکی ہے۔ اگلی قسط میں دیکھیں گے کہ ان کے ساتھ کیا بنتا ہے۔ باقی شمارہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔"

مری سے شہزادہ کوہسار کبیر عباسی کے انکشافات "6 تاریخ کو جاسوسی کا دیدار کرنے میں کامیاب ہوئے، سانولی سلونی بھیگی بھگلن خوب صورت تو نہ تھی مگر معمول کی ٹائٹل گرلز سے کچھ ہٹ کے تھی، چنانچہ پسند آئی۔ نیچے بھاگتے بندے کو ہم نے بڑے تجسس سے دیکھا، البتہ اقبال پوز کے ساتھ رنگین سے بندے کو قدرے بیزاری کے ساتھ دیکھا۔ بات ہو جائے اگر ٹائٹل کے اجزا کی تو حسبِ معمول ایک لڑکی اور دو بھوت نما مرد۔ البتہ ٹائلز والا فرش کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ کلر اسکیم البتہ کچھ ہٹ کے تھی۔ مجموعی طور پر ٹائٹل اوسط سے کچھ بہتر رہا۔ فہرست کا ڈیزائن سادہ سا بس ٹھیک ہی رہا۔ اداریہ پڑھا، ہمارے خیال میں تو ہمارا اوورآل سسٹم ہی خراب ہے۔ اس سسٹم کے ذریعے اول تو مخلص لوگ اوپر جا ہی نہیں سکتے، سوائے اِکا دُکا کے اور اگر چلے بھی جائیں تو ریاست کا صرف ایک ادارہ کوئی خاص تبدیلی نہیں لا سکتا۔ تبدیلی مکمل سسٹم کی تبدیلی سے ہی ممکن ہے جو کوئی تربیت یافتہ جماعت انقلاب کے ذریعے ہی لا سکتی ہے۔ ایم اے ہاشمی، ہمایوں کے اتنے دلچسپ کمنٹس کو آپ نے بے سروپا قرار دے دیا۔ کچھ تو بے چارے کے نازک سے دل کا خیال کیا ہوتا۔ عدنان یوسف زئی" کی "تبصرہ" "پڑھی" ہاہاہا۔۔۔ ہو سکتا ہے انکل ہی انہوں نے تبصرے کو مزاحیہ بنانے کی خاطر مذکر مونث میں ردوبدل کیا ہو مگر آپ نے درستی کر دی۔ صبا گل، ماہا ایمان، بے شمار ناموں کے ساتھ جاسوسی میں تبصرے لکھ چکی ہیں اور یہ سلسلہ 1971ء سے وہ جاری رکھے ہوئے ہیں تا کہ ان کی عمر پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ آصفہ صداقت، جتنا ہم آپ کے تبصرے میں آپ کی حرکتیں دیکھتے ہوئے ہنستے ہیں، اتنی تو ٹام اور جیری کی حرکتیں دیکھتے ہوئے بھی کبھی نہیں ہنسے۔ امید ہے ہمارے اتنے لطیف طنز کو آپ سمجھ نہیں سکیں گی۔ احتشام احسان، کپڑے، جوتے، ڈائجسٹ کے لیے چھوڑ دینے والی لڑکیوں کی تلاش میں رہے تو کنوارے ہی صدائیں دیتے ہوئے گزر جاؤ گے۔ لڑکیاں تو نیا شمارہ لیتے ہوئے نیا ڈریس بھی لیتی ہیں کہ نئے کپڑے پہن کے ڈائجسٹ کا مطالعہ کریں گی۔ (آپ کو تجربہ ہے یا یہ تجزیہ ہے؟) زویا اعجاز! آخر کار آپ کی محنت رنگ لائی اور چینی نکتہ چینی میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ گرداب کی یہ قسط اس کی چند بہترین اقساط میں سے ایک تھی۔ امید ہے اسما قادری اسی طرح آئندہ بھی زیادہ تر قارئین کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے طویل مکالموں سے گریز کریں گی۔ سراغ رساں کمپیوٹر بھی انوکھے طرز کی سسپنس سے بھرپور تحریر تھی۔ گو کہ اینڈ کچھ خاص نہ تھا مگر ہمیں پھر بھی یہ تحریر بہت پسند آئی۔ سلیم انور کی خوش اسلوبی بھی زبردست رہی۔ کترنیں قدرے بہتر تھیں اس دفعہ۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

تابِ گل رانا، راجن پور۔ ملک سعید، چکوال۔ محمد ہمایوں سعید، بنوں۔ اعجاز احمد راحیل، ساہیوال۔ تصویر العین، اوکاڑہ۔ سائرہ غفار، کراچی۔ حماد فرہاد، ساہیوال۔ حسنین ہاشمی، گوجرانوالہ۔ انجینئر عمیر شہزاد بنگش، پشاور۔ عذرا فردوس، کراچی۔ ریاض بٹ، حسن ابدال۔ عاصم خان، کراچی۔ شاہین تبسم، اسلام آباد

قفس گزیدہ

محی الدین نواب

نہ مدعی نہ گواہی حسابِ پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا رزقِ خاک ہوا

آنکھوں میں خواب سجانے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی... مگر ان خوابوں کو تعبیر سے ہمکنار کرنے کی ایک قیمت ضرور ادا کرنی پڑتی ہے... یہ خواب ہی ہیں جو انسان کے اندر شدید طلب اور تمنا کو اُجاگر کرتے ہیں... ایک ایسے ہی نوجوان کی داستان جس نے ہمیشہ بلندیوں پر پہنچنے کے خواب دیکھے تھے... کرکٹ کا میدان... اس کا خواب ہی نہیں... عشق تھا کھیل اور کھلاڑی کے گرد گھومتی ایک تیز رفتار کہانی کے لامتناہی رنگ... اپنی ذات سے محبت... کھیل سے محبت... ریشمیں جذبوں سے محبت... اپنے وطن سے محبت... اور پھر موت سے محبت... حقیقی واقعات اور خوابوں کی تمثیل پر مبنی روح کو تار تار کر دینے والی کہانی کے روپ در روپ...

دیارِ غیر میں اس چشم بینا کا سفر جوزادِ حیات سمیٹے تلاشِ حق میں سرگرداں تھا...

کیا طرفہ تماشا ہے...؟

کہیں ''چھکے'' لگانے کے لیے مہارت ضروری ہوتی ہے اور کہیں ''چھکوں'' کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگی جاتی ہیں۔

دعا کے لیے جذبے کی ضرورت ہوتی ہے تب ہی انسان کی کوئی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ التجا میں تڑپ ہو تو سننے والا تڑپ اٹھتا ہے اور جھولیاں مرادوں سے بھر دیتا ہے۔

وہاں سب کی ایک ہی مراد تھی، ایک ہی ضرورت تھی۔ اور وہ ضرورت تھی صرف ایک ''چھکے'' کی...

''چھکے'' بھیک میں نہیں ملتے۔ ذہانت، حاضر دماغی اور قوتِ بازو سے ملتے ہیں۔

''چھکے'' کی قدر تو کوئی کسی کھلاڑی سے پوچھے۔ اناڑی کیا جانے ''چھکے'' کا نشہ...؟

ایک ہی شاٹ میں بیڑا پار ہو جاتا ہے۔

اور وہاں بیڑا اٹکا ہوا تھا۔ اُف... پسینے چھوٹ رہے تھے۔ پار ہونا تھا... مگر خوار ہونا منظور نہیں تھا۔

سر کا پسینا پیشانی سے رینگتا ہوا آ کر گھرے ابروؤں

میں اٹک گیا تھا۔ چمکیلی دھوپ سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ محبوب خان نے اپنے ہیلمٹ کو ٹھیک کر کے بلّے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر زمین پر یوں بجایا، جیسے کامرانی کے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔

آخری اوور کی آخری گیند اور آخری چانس تھا۔ جب سانسیں آخری ہوں تو زندگی کو جیتنے کے لیے پھیپھڑوں کا پورا زور لگایا جاتا ہے۔ مخالف کے ہدف سے صرف پانچ رنز کی دوری تھی۔ چھکّا بہت ضروری تھا۔ جم کے شاٹ لگانا تھا۔

اس کے حمایتی تماشائی حوصلہ بڑھانے کے لیے پُرجوش نعرے لگا رہے تھے۔ جبکہ مخالفین کے حمایتی ہار جیت کے فیصلے سے پہلے ہی انہیں ناکام ٹیم قرار دے رہے تھے۔ جو اپنے تھے، وہ چھکے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ پرائے کہہ رہے تھے، آخری وقت دعائیں کام نہیں آتیں۔ لازماً دم نکلتا ہے۔ مات ضرور ہوتی ہے۔

چند ہی لمحوں میں ہار کی شرمندگی اور جیت کی واہ واہ ہونے والی تھی۔

محبوب خان نے ایک بار پھر بلّے پر گرفت مضبوط کرتے ہوئے باؤلر کو دیکھا۔ وہ گیند کو صاف کر رہا تھا، رگڑ رہا تھا۔ وہ اسپنر تھا۔ گھما کر گیند پھینکتا تھا اور بلّے باز کو گھما کر رکھ دیتا تھا۔ اُدھر محبوب خان بھی پکّا بازی گر تھا۔ گھومتی ہوئی گیند پر ایسے بلّا گھماتا تھا کہ فیلڈرز دونوں ہاتھ اٹھائے اڑتی ہوئی گیند کو کیچ کرنے کی دعائیں مانگتے رہ جاتے تھے۔

باؤلر نے محبوب کو دیکھا۔ زیرِلب مسکرایا۔ پھر آہستگی سے رن اپ لیتے ہوئے پچ پر آ کر پوری قوت سے گیند اس کی طرف پھینکی۔ محبوب خان کی نگاہیں گیند پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر تیزی سے آتی ہوئی گیند پر ایک زوردار شاٹ لگا۔

تماشائی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوگئے تھے۔ ''آل دی بیسٹ...'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ مخالفین کی طرف سے ''ہائے ہائے...'' کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ تقریباً سب ہی کی نگاہیں گیند پر جم گئی تھیں۔ اُدھر محبوب خان اپنے ساتھی کھلاڑی کے ساتھ رنز بنانے کے لیے دوڑا۔ اس کی تجربہ کار نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ کام بن گیا ہے۔ گیند کی رفتار اور بلندی سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مخالفین کے چھکے چھڑا کر ہی رہے گی۔

اِدھر دو رنز کا اضافہ ہوگیا تھا۔ اسکور بورڈ بڑھ رہا تھا۔ ایسے ہی وقت وہ مقامی اسٹیڈیم تالیوں سے گونج اٹھا۔ جیت کے نعرے لگ رہے تھے۔ ''محبوب اِز دی بیسٹ...''

دوا مجرب ہو تو دعا کو ضرور شرفِ قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے تھے۔

ایک حمایتی نے خوش ہو کر کہا۔ ''جہاں محبوب خان ہو، وہاں جیت نہ ہو... یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔''

کسی نے کہا۔ ''ابھی انڈر نائنٹین ہے۔ دیکھ لینا، پاکستانی ٹیم کو چار چاند لگا دے گا۔''

ایک نے اپنی مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔ ''جیت تو ''خان'' کی سرشت میں شامل ہوتی ہے۔ دنیا گواہ ہے، کرکٹ کے میدان سے لے کر شوبزنس کی رنگینیوں تک یہ ''خان'' جہاں بھی ہیں، کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے ہیں۔''

ایک شخص نے کہا۔ ''ہمارا محبوب خان بھی یقیناً اس ہسٹری میں اپنا نام شامل کر کے ہی دم لے گا۔ ہمارے علاقے کی شان بڑھ جائے گا۔''

''یہ تو ویسے بھی ہمارے علاقے کی شان ہے، جان ہے۔''

محبوب خان دستانے اور ہیلمٹ اتارتا ہوا میدان سے باہر جا رہا تھا۔ چہرے پر فتح مندی کی چمک اور مسکراہٹ صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کھیل میں کامیابی کے لیے اس نے اپنے والد سے ایک شرط لگائی تھی اور اسے پہلی بار میچ کی جیت سے زیادہ اس شرط کے جیت جانے کی خوشی ہو رہی تھی۔ اس نے دائیں طرف تماشائیوں کو دیکھا۔ وہاں ماں باپ اور بھائی بہن ہاتھ لہرا لہرا کر اسے وش کر رہے تھے۔ اس نے بھی جواباً ہاتھ لہرایا۔

اس کی مسکراتی ہوئی نگاہیں باپ کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ ایسے وقت اس نے دیکھا کہ باپ اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکال رہا ہے۔ پھر اس نے وہ ہاتھ بلند کر کے بیٹے کو دکھایا۔ اس میں ایک پاسپورٹ دبا ہوا تھا۔

وہ پاسپورٹ اس کے لیے ورلڈ کپ تھا۔ اسے دیکھتے ہی محبوب خان کی باچھیں کھل گئیں۔ جیسے گرین سگنل ملا تھا۔ اس نے فضا میں ایک مکّا بلند کر کے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ''یا ہُو...!''

☆☆☆

محبوب خان کی تو راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ چھوٹی بہن اس کے کمرے میں آئی تو وہ پاسپورٹ کو سینے سے لگائے نہ جانے کس سوچ میں گم تھا۔ بہن نے بیڈ کے سرہانے کو ایک انگلی سے بجایا۔ ''ٹھک ٹھک...'' کی آواز سن کر وہ چونک گیا۔

وہ بولی۔ ''واہ بھائی جان! بھارت جانے کی ایسی خوشی ہے کہ نہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہیں، نہ باتیں کرتے ہیں۔ بس کھانا کھاتے ہی یہاں آ کر پاسپورٹ اور ویزے کو سینے سے لگا کر لیٹ جاتے ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''ارے میری پگلی بہن! یہ خوشی بھارت جانے کی نہیں ہے بلکہ پاک بھارت لائیو کرکٹ سیریز دیکھنے کی خوشی ہے جو مجھے سونے بھی نہیں دیتی۔ میں کیا بولوں؟ ابو نے میرا ایک بہت بڑا خواب پورا کر دیا ہے۔''

وہ بیڈ کے سرہانے بیٹھ کر بولی۔ ''جانتے ہیں، ابھی میں ابو سے لڑ رہی تھی۔''

''وہ کیوں...؟''

''انہوں نے تین روزہ سیریز کے لیے تیس دنوں کا ویزا کیوں لگوایا؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''یہ ضروری نہیں ہے کہ تیس دنوں کا ویزا ہے تو اتنے ہی دنوں تک وہاں رہوں گا۔ جیسے ہی سیریز ختم ہوگی، چلا آؤں گا۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''سچ...؟ آپ ایک مہینے سے پہلے ہی آ جائیں گے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں کیونکہ تم لوگوں کے بغیر دل نہیں لگے گا اور جب کرکٹ سیریز ہی ختم ہو جائے گی تو وہاں رہ کر کیا کروں گا؟ سارا لالچ، ساری کشش تو اُس میچ کو لائیو دیکھنے کی ہے۔ اُف...! تم سوچ بھی نہیں سکتیں، مجھے تو ابھی سے ممبئی وانکھیڑے اسٹیڈیم نظر آ رہا ہے۔ پاکستانی کھلاڑی تیاریاں کرتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔''

بہن نے شوخی سے کہا۔ ''جب سب کچھ ابھی سے دکھائی دے رہا ہے تو وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہیں سے لائیو میچ کے مزے لے لیں۔''

وہ اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر بولا۔ ''اے لڑکی! تم میرے جذبات کا مذاق اڑا رہی ہو؟''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''نہیں بھائی جان! ہم تو آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ اور یہ بھی نہ بھولیں کہ تمام گھر والے ہامی نہ بھرتے تو شاید ابو آپ کو وہاں جانے کی اجازت نہ دیتے۔ اس فیصلے میں ہماری سفارش شامل ہے۔ بس یہ تیس دنوں کا سن کر مجھے مایوسی ہو رہی تھی مگر اب مطمئن ہوں۔''

وہ شب بخیر کہہ کر مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس نے پاسپورٹ اور ویزے کو دیکھا۔ پھر انہیں دراز میں رکھ کر سائڈ ٹیبل کا لیمپ بجھا دیا۔ پاکستانی کرکٹ ٹیم میں شامل ہونا اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا جو جلد ہی پورا ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ فی الحال وہ انڈر نائنٹین میں کھیل رہا تھا اور اپنے نام کا سکہ جما رہا تھا۔

اس بڑے خواب کے بعد ایک خواب یہ تھا کہ پاک بھارت کرکٹ میچ کو لائیو دیکھے۔ اور اس کی یہ تمنا آنے والے دنوں میں پوری ہونے والی تھی۔

☆☆☆

ایسا ہوتا ہے۔ کبھی کوئی تمنا، کوئی آرزو تکمیل کے مراحل سے گزرنے کے باوجود خواب ہی لگتی ہے۔ پاکستان سے ممبئی ائرپورٹ پہنچنے تک اسے ایسا ہی لگا تھا، جیسے جاگتے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہے۔

پھر امیگریشن کاؤنٹر پر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے پاسپورٹ اور ویزے کو یوں چیک کیا جا رہا تھا جیسے وہ کوئی مشکوک شخص ہو۔ ڈیوٹی آفیسر نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ پھر اس کے پاسپورٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہُوں... پاکستانی...''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے میں یہاں آنے والا پہلا پاکستانی ہوں۔''

وہ ناگواری ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''نہ پہلے ہو، نہ آخری ہو۔ کرکٹ میچ کی وجہ سے یہاں پاکستانیوں کی کھیپ چلی آ رہی ہے۔''

''ٹورازم بڑھ جائے تو یہ کسی بھی ملک کی اکانومی کے لیے خوش آئند بات ہوتی ہے۔''

اس نے طنزیہ انداز میں زیرِلب کہا۔ ''کنگلے ملک کے کنگال لوگ ہمارے دیش کی اکانومی کو کیا بڑھائیں گے؟''

محبوب خان نے پوچھا۔ ''کیا فرمایا آپ نے...؟''

''اجی ہم کیا فرمائیں گے؟ وہ تو تمہارے قائداعظم فرمایا کرتے تھے۔''

''مائنڈ یور لینگویج پلیز... آپ مجھے آپ کہہ کر ہی مخاطب کریں تو بہتر ہوگا۔''

اس نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ ''میری تو زبان اردو نہیں ہے۔ اس لیے میں نہیں جانتا کہ آپ کہنا زیادہ بہتر ہوتا ہے یا تم...؟''

''انجان بننے کا اچھا انداز ہے۔ ورنہ اس فرق کو تو ہندی بولنے والے اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اینی وے... اگر اردو بولنے میں پرابلم ہے تو آپ مجھ سے انگریزی میں بات کر سکتے ہیں۔''

آفیسر کے تیور بگڑ گئے تھے۔ اس نے پاسپورٹ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''نام کے ساتھ خان لگا ہوا ہے۔

نہ لگا ہوتا تب بھی اس گرم مزاجی سے پتا چل جاتا کہ پکے پٹھان ہو۔''

وہ ذرا تن کر بولا۔ ''جی ہاں۔ ہم پاکستانی پٹھان ہیں۔''

وہ اس کے کاغذات کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ محبوب خان نے پوچھا۔ ''کیا ڈاکیومینٹس میں کوئی غلطی ہے؟''

اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔ چند لمحوں بعد محبوب نے بیزار ہو کر پوچھا۔ ''آخر مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ تمہارے ملک کا اور ملکی حالات کا ہے۔ دہشت گرد وائرس کی طرح وہاں پنپتے رہتے ہیں اور پڑوسی دیشوں میں ٹرانسفر ہوتے رہتے ہیں۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''کہنا کیا ہے؟ ہم اپنی ڈیوٹی کررہے ہیں۔''

''اور میرا وقت برباد کررہے ہیں۔''

دوسرے کاؤنٹر پر ایک اور پاکستانی فیملی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک کیا جارہا تھا۔ ڈیوٹی آفیسر نے محبوب سے کہا۔ ''وقت تو ہمارا برباد ہورہا ہے۔ ایک ایک مسافر کے ساتھ سر کھپانا پڑرہا ہے۔ جب سے پاکستانیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا ہے روز ہی دماغ کی دہی بنتی رہتی ہے۔ ڈیوٹی میں ذرا سی بھی کوتاہی ہوگی تو ہماری کھٹیا کھڑی ہوجائے گی۔''

محبوب کو اس کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی ویل ایجوکیٹڈ آفیسر سے نہیں بلکہ سڑک چھاپ موالی سے بات کررہا ہے۔

وہ بولا۔ ''پلیز! میری پرابلم کو سمجھیں۔ یہ شہر میرے لیے اجنبی ہے۔ رات زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ ابھی کسی ہوٹل میں کمرا بھی لینا ہے۔ اگر میرے کاغذات میں کوئی مسئلہ نہیں ہے تو پلیز مجھے جانے دیں۔''

''تم پاکستانی لوگ پلیز بہت بولتے ہو۔ اُدھر دیکھو! وہ فیملی بھی پلیز بول بول کر نہیں تھک رہی ہے۔ سارا دن یہی سننا پڑتا ہے۔''

وہ سر جھٹک کر پھر سے کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ ''باپ کا نام کیا ہے؟''

محبوب نے جھنجلا کر کہا۔ ''ڈاکیومینٹس میں لکھا ہوا ہے۔''

''تمہیں یاد نہیں ہے؟''

وہ غصے سے بولا۔ ''یہ کیسا سوال ہے؟''

''سیدھے سوال کا ٹیڑھا جواب دو گے تو ایسے ہی سوال سنو گے۔ باپ کا نام بولو؟''

وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''شمشیر خان...''

''دادا کا نام...؟''

وہ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔ ''جلال خان...''

''ہُوں... شمشیر خان... جلال خان... بڑے جلالی نام ہیں۔ پھر تمہارا نام اتنا رومانٹک کیوں ہے؟ محبوب خان... لڑکیاں پکارتی ہوں گی تو بڑا اچھا لگتا ہوگا؟''

اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔ وہ چند لمحوں تک کاؤنٹر پر کہنی ٹکیے اس کے کاغذات کو دیکھتا رہا۔

وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یا خدا! میں کہاں پھنس گیا؟''

ڈیوٹی آفیسر نے کاغذات اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پھنسے نہیں ہو۔ نکل گئے ہو۔'' پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''بی کیئر فل... اوکے؟''

وہ پلٹتے ہوئے بولا۔ ''جی... مشورے کا شکریہ...''

اس نے لگیج سے سامان لے کر ایک ٹرالی میں رکھا پھر عمارت سے باہر آگیا...... ٹیکسی کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔ پارکنگ ایریا کے دائیں بائیں دور تک ہری بھری کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کیاریوں میں خوبصورت پودے لگے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ کالی سڑک ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہاں سے متعدد گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ لوگ اپنے پیاروں کو خوش آمدید کہنے اور رخصت کرنے آئے تھے۔

وہ سڑک عبور کرکے ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت اس کی نگاہیں ایک کیاری کی طرف اٹک کر رہ گئیں۔ وہاں نیم تاریکی میں کسی موبائل فون کی اسکرین روشن ہوئی تھی۔ اس کی روشنی نے محبوب خان کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ سڑک پار کرتے کرتے رک گیا۔ اگرچہ اس طرف روشنی کم تھی مگر یہ واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ کوئی شخص ایک پودے کی اوٹ میں بیٹھا ہوا ہے۔ بیٹھنے کا انداز ایسا تھا جیسے چھپا ہوا ہو۔

درجنوں افراد فلائٹ کا انتظار کرتے ہوئے ائرپورٹ کی عمارت کے باہر کھلی فضا میں وقت گزارنا پسند کرتے ہیں۔ یہ معمولی سی بات تھی۔ اور ایسی غیر اہم بات کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ نہیں کرتی۔ محبوب خان محض یہ دیکھ کر نہیں رکا تھا کہ کوئی شخص اس نیم تاریکی میں ایک

پودے کے پیچھے کیوں چھپا ہوا ہے؟ اس کے ٹھٹکنے کی وجہ تو وہ ہتھیار تھا جو اس شخص کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ ائرپورٹ کے احاطے میں ایسے مسلح اور مشتبہ شخص کی موجودگی ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ یہ سیدھی سی بات دماغ میں آرہی تھی کہ یقیناً وہ ائرپورٹ کی سیکیورٹی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہاں تک پہنچا ہوگا۔

اس نے فون پر مختصر سی بات کرکے اسے جیب میں رکھ لیا تھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے ریوالور کو تھام کر نشانہ سیٹ کرنے لگا۔ محبوب خان نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ ایک کلرڈ شیشوں والی بلیک کار دور سے آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اس شخص کی نگاہیں اس گاڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جیسے جیسے اس کے قریب آتی جارہی تھی' ویسے ویسے وہ شخص الرٹ ہوتا جارہا تھا۔

اِدھر محبوب خان کے اندر کھلبلی مچ گئی تھی۔ صاف سمجھ میں آرہا تھا کہ اس مشتبہ شخص کا شکار اس گاڑی میں ہے اور وہ جو کوئی بھی ہے جیسے ہی دروازہ کھول کر باہر نکلے گا' یہ اس کا نشانہ لے کر فائر کردے گا۔

محبوب خان کبھی گاڑی کو اور کبھی اس شخص کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ سیکیورٹی کو انفارم کرنے میں وقت ضائع ہوسکتا تھا۔ پھر یہ کہ وہ خبردار ہوکر وہاں سے فرار ہوسکتا تھا۔ محبوب خان کو اس کا چہرہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اگر وہ فرار ہوکر وہاں موجود لوگوں کے درمیان گم ہوجاتا تو محبوب اسے پہچان نہ پاتا۔

وہ گاڑی اس سے ذرا دور ایک جگہ آکر رک گئی۔ محبوب کا دل کررہا تھا کہ وہ گاڑی والے سے چیخ کر کہہ دے۔ ''خبردار! باہر نہ نکلنا۔ تمہاری جان کو خطرہ ہے...''

اس کے دونوں ہاتھ ٹرالی کے ہینڈل پر جمے ہوئے تھے۔ وہاں اس کی گرفت ایسے مضبوط ہوگئی تھی جیسے وہ اس گاڑی کے دروازے کو کھولنے سے روک رہا ہو۔ اس کے اندر گرمی سی بھر گئی تھی۔ کچھ کرنا تھا... کچھ تو کرنا ہی تھا...

اُدھر ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی دباؤ ڈالنے کے لیے تیار تھی۔ اِدھر محبوب خان ٹرالی کو چھوڑ کر دھیرے دھیرے گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔

اُدھر وہ حملہ آور سوچ نہیں سکتا تھا کہ کیا ہوسکتا ہے؟

اور وہ گاڑی والا تو شاید بالکل ہی بے خبر تھا۔ اس نے تو سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ گاڑی کا نہیں بلکہ اپنی شامت کا دروازہ کھولنے والا ہے۔

مقدر کے ہیر پھیر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ قسمت کی ڈوری کہاں پہنچ کر کس اجنبی کے ساتھ الجھنے والی ہے؟ وہاں تین انجان افراد بے خبری میں ایک دوسرے سے الجھنے والے تھے۔ محبوب خان اس انجانے ملک میں پہنچتے ہی عجیب سی صورتِ حال سے دوچار ہورہا تھا۔ خطرہ مول لے رہا تھا۔ نہ جانے اس کا انجام کیا ہونے والا تھا؟ مگر دل میں ایک جذبہ تھا' ایک عزم تھا کہ کسی کی جان بچانی ہے۔

مگر کس کی جان بچانی ہے؟

کلرڈ شیشوں کے پیچھے وہ کون ہوسکتا تھا؟ یہ تو دروازہ کھلنے کے بعد ہی معلوم ہونے والا تھا۔

اور دروازہ کھل گیا۔

محبوب خان کی توقع کے خلاف پچھلے دروازے سے ایک زنانہ پاؤں باہر آیا۔ ایک اونچی ایڑھی کی سینڈل نے فرش پر قدم جمایا۔ پھر دروازے کے پیچھے سے وہ رخِ روشن یوں ابھرا جیسے پہاڑوں کی اوٹ سے چاند ابھر رہا ہو۔ پھر پورا کا پورا چاند نکل آیا۔ اس نے ذرا گھوم کر گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ گھومنے کی ادا ایسی تھی جیسے سمندر کی موجیں موج میں آگئی ہوں' جیسے ریشمی ڈور لہرا گئی ہو۔ محبوب خان کی نگاہیں اس ریشمی نظارے میں الجھ کر رہ گئیں۔ پھر اس نے ٹھٹک کر کیاری کی طرف دیکھا۔ اِدھر بھی قیامت تھی' اُدھر بھی قیامت تھی...

محبوب خان کے جسم میں لہو کی روانی تیز ہوگئی تھی۔ اُدھر ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھ گیا۔ سوچنے اور جھجکنے کا وقت نہیں تھا۔ ان لمحات میں جان کی امان ضروری تھی۔ وہ بڑھتی ہوئی دھڑکنوں کے ساتھ تقریباً دوڑتا ہوا اُس حسینہ کی طرف لپکا۔

وہ سر جھکائے اپنے ہینڈ بیگ میں کچھ تلاش کررہی تھی۔ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پلک جھپکتے ہی کیا سے کیا ہوجائے گا؟ محبوب خان بجلی کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکا تھا پھر اسے دونوں بازوؤں میں جکڑتا ہوا' اسے لیتا ہوا کھردری سڑک پر آگیا۔

جو ہوا' آناً فاناً ہوا۔ کسی کو کچھ سوچنے کا موقع نہ ملا۔ ٹریگر پر دباؤ پڑا تھا۔ سائیلنسر لگے ہوئے ریوالور سے گولی چلی تھی۔ اس حسینہ کو محبوب نے بچا لیا تھا۔ مگر ایسا ہوتا ہے' کسی کی آئی کسی اور کو آجاتی ہے۔ نشانہ چوک گیا تھا' گاڑی کے دوسری طرف سے کئی افراد گزر رہے تھے۔ اس خاموش گولی نے بڑی خاموشی سے ایک کا کام تمام کردیا۔

اُدھر ایک لاش گری تھی۔ اِدھر یہ دونوں گرے ہوئے

تھے۔

اُدھر لوگوں کے درمیان شور مچ گیا تھا۔ اِدھر دھڑکنیں شور مچا رہی تھیں۔

ائرپورٹ کی انتظامیہ اور سیکیورٹی والے جائے وقوعہ کی طرف دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔

اُدھر افراتفری پھیل گئی تھی۔ اِدھر دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

محبوب خان کچھ اس انداز میں اس کے اوپر آیا تھا کہ حسینہ کو اپنے سینے پر ہاتھوں کی قینچی بنانے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ دھڑکنوں سے دھڑکنیں یوں مل گئی تھیں کہ ان کے درمیان سے ہوا بھی گزر نہیں سکتی تھی۔ محبوب نے گرنے سے پہلے اسے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ وہ بازو نازک سی کمر کے نیچے تھے اور اسے سڑک کے کھردرے پن سے بچا رہے تھے۔

دوسری طرف حملہ آور کو دوبارہ فائر کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ کسی کی گرفت میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا ناکامی کے بعد وہاں سے فرار ہوگیا تھا۔

اِدھر حسینہ نے مچل کر پوچھا۔ ”کون ہو تم...؟ اور یہ کیا حرکت ہے؟“

ہائے... شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو...!

وہ پہلی بار گویا ہوئی تھی۔ گویا سات سُروں کا سرگم گونج اٹھا تھا۔ وہ بولا۔ ”میں دشمن نہیں ہوں، دوست ہوں۔ آپ کا دشمن اس کیاری کے پیچھے تھا۔ آپ کی جان لینا چاہتا تھا۔ میں نے تو آپ کی جان بچائی ہے۔“

ایسے ہی وقت اس حسینہ کے ڈرائیور نے آکر انہیں دیکھا۔ وہ دوسری طرف ایک لاش دیکھ کر آیا تھا۔ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی میڈم سے دشمنی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر وہ سڑک پر نہ گرتی تو وہ گولی اس کا کام تمام کر چکی ہوتی۔ وہ اس اجنبی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس نے میڈم کی جان بچائی تھی مگر خود اس کی جان سے چپک کر رہ گیا تھا۔ ڈرائیور نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”میڈم کو چھوڑو۔“

وہ دھکا کھا کر اس کے اوپر سے لڑھک کر سڑک پر آگیا۔ عجیب بات ہے... تحفظ دینے والے کو دھکے مل رہے تھے۔ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ایسے ہی وقت ایک لڑکی اور چار افراد دور سے دوڑتے ہوئے ان کی طرف آتے ہوئے بولے۔ ”ارے کلپنا میڈم! یہ کیا ہوا؟“

”میڈم! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟“

آنے والوں میں تین افراد پرسنل باڈی گارڈز تھے۔ انہوں نے وہاں آتے ہی کلپنا کو تحفظ دینے کے لیے اسے گھیر لیا تھا۔ محبوب خان بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کی نگاہیں کیاری کی طرف بھٹک رہی تھیں۔ اگرچہ وہ حملہ آور کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر محبوب کو ڈر تھا کہ کہیں وہ چھپ کر دوبارہ حملہ نہ کردے۔

دوسری طرف جو شخص بے موت مارا گیا تھا، اس کے لیے ایمبولینس آگئی تھی۔ لوگوں کے درمیان خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ ائرپورٹ کی انتظامیہ اور سیکیورٹی والے سب کو پُرامن رہنے کی ہدایات دے رہے تھے۔ وہاں موجود رہنے والی پولیس فورس نے جائے وقوعہ کو چاروں طرف سے گھیرنا شروع کردیا تھا۔

ایک اور بھاری بھرکم جسامت کا شخص تیزی سے چلتا ہوا کلپنا کے پاس آگیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں موبائل فون تھا۔ وہ فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے کلپنا کی خیریت معلوم کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”آپ چنتا نہ کریں میڈم! میں ابھی سیکیورٹی ہائی الرٹ کرتا ہوں اور اس معاملے کی کارروائی شروع کرواتا ہوں۔ ابھی یوں چٹکیوں میں معلوم پڑ جائے گا کہ کس نے دشمنی کی ہے؟“

ڈرائیور نے اس کا ہینڈ بیگ اٹھا کر اسے دیا۔ آنے والی لڑکی اس کا لباس جھاڑ رہی تھی۔ کلپنا نے غصے سے کہا۔ ”دشمنوں کا تو بعد میں معلوم ہوگا۔ مگر ابھی یہ معلوم ہوگیا ہے کہ آپ کی سیکیورٹی بہت ہی کمزور ہے اور میں کمزور لوگوں کے ساتھ کام نہیں کرتی۔ شوٹنگ ہمیشہ کے لیے کینسل سمجھیں مسٹر چوہان...!“

وہ کمرشل ڈائریکٹر تھا۔ اس کا نام نائیک چوہان تھا۔ وہ فوراً ہی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ”یہ غضب نہ کریں۔ میں ڈوب جاؤں گا۔ اس ایک کمرشل کے لیے میرا پورا فیوچر داؤ پر لگا ہوا ہے۔“

”لیکن میں اپنی جان کو داؤ پر لگا کر کوئی کام نہیں کرتی۔“

وہ بولا۔ ”یہ ائرپورٹ والے اصولوں کے بڑے پکے ہیں۔ عمارت کے اندر اسلحہ لے جانے کی اجازت ہی نہیں دیتے۔“

وہ بولی۔ ”میں اندر کی نہیں، باہر کی سیکیورٹی کی بات کر رہی ہوں۔ آپ کے گارڈز کو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔“

ایک نے کلپنا کی کہنیوں کو دیکھ کر کہا۔ ”اوہو۔ میڈم زخمی ہوگئی ہیں۔ فوراً فرسٹ ایڈ باکس منگواؤ۔“

وہ غصے سے ڈپٹنے کے انداز میں بولی۔ ”مجھے کسی ایڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ جسٹ لیو می...!“

محبوب انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سب آپس میں الجھ رہے تھے۔ وہ انہیں چھوڑ کر اپنی ٹرالی کی طرف جانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت کسی نے پیچھے سے آکر اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ وہ ایک دم سے چونک گیا۔ پلٹ کر دیکھا، دو سپاہیوں نے اسے جکڑ لیا تھا۔ ایک انسپکٹر قریب آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”اسے پکڑ کے رکھو۔ بھاگنے نہ پائے۔“

محبوب نے کہا۔ ”بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے... ارے جس کو پکڑنا تھا، وہ تو بھاگ چکا ہے۔“

انسپکٹر نے اپنی اِسٹک کو اس کے سینے پر بجاتے ہوئے کہا۔ ”بھاگا نہیں ہے۔ بھاگنے سے پہلے پکڑا گیا ہے۔“

کلپنا نے اُدھر دیکھا۔ جس نوجوان نے اس کی جان بچائی تھی، پولیس والے اسے کسی مجرم کی طرح پکڑ کر تفتیش کر رہے تھے۔ وہ باڈی گارڈز وغیرہ کو ہٹاتی ہوئی انسپکٹر کے پاس آکر بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ چھوڑیں انہیں...“

باڈی گارڈز فوراً ہی سیکیورٹی دینے کے لیے کلپنا کے دائیں بائیں اور پیچھے آکر کھڑے ہوگئے۔ دوسرے افراد بھی اس کے قریب آگئے۔

انسپکٹر نے کہا۔ ”میڈم! آپ پر گولی چلائی گئی ہے۔“

”وہ تو میں بھی سمجھ گئی ہوں مگر جس نے جان بچائی ہے، آپ اسے کیوں پکڑ رہے ہیں؟“

وہ محبوب کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مجرموں کے ناٹک آپ نہیں سمجھیں گی۔ اکثر جان کے دشمن تفتیش کا رخ موڑنے کے لیے محافظ بننے کا ڈراما شروع کردیتے ہیں۔“

پھر انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ محبوب خان کے لباس کی تلاشی لی جائے۔ کلپنا نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔ ”آپ ان کی تلاشی نہیں لے سکتے کیونکہ مجھے ان پر کوئی شبہ نہیں ہے۔“

”آپ سمجھ نہیں رہی ہیں میڈم! معاملہ بہت سنگین ہے۔“

”دشمنی مجھ سے کی گئی ہے۔ میں معاملے کی سنگینی کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ اگر یہ بروقت آکر میری جان نہ بچاتے تو ابھی یہ سڑک میرے لہو سے رنگین ہو رہی ہوتی۔ پلیز... آپ جا کر اصل مجرموں کا سراغ لگائیں۔ انہیں تنگ نہ کریں۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”سراغ لگانے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ آپ پر جان لیوا حملہ ہونے والا ہے؟ یقیناً انہوں نے دشمن کو دیکھا ہوگا۔“

وہ بولی۔ ”تو پھر سوالات کریں لیکن مجرموں کی طرح پکڑ کر تفتیش نہ کریں۔“

انسپکٹر نے گہری سانس لے کر سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے محبوب خان کو چھوڑ دیا۔ انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ ”تم ہو کون؟“

وہ بولا۔ ”میرا نام محبوب خان ہے۔ میں پاکستان سے آیا ہوں۔“

انسپکٹر نے کلپنا کو اور دوسرے افراد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پاکستانیوں کی آمد شروع ہوتے ہی دہشت گردی کی وارداتیں شروع ہوگئیں۔“

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ محبوب خان نے انسپکٹر سے پوچھا۔ ”کیوں، کیا ہمارے آنے سے پہلے یہ ملک امن کا گہوارہ تھا؟ یہاں ٹارگٹ کلنگ، گینگ ریپ اور اسٹریٹ کرائمز کی وارداتیں نہیں ہوتی تھیں؟ یہاں کے لوگ گولی کی ٹھائیں ٹھائیں سے ناواقف ہیں؟“

وہ بولا۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔“

وہ ذرا جھنجلا کر بولا۔ ”تو پھر یہ کیسی باتیں ہیں؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے امیگریشن والوں کا رویہ مجھ سے ایسا تھا جیسے میں کوئی مشتبہ شخص ہوں اور اب آپ بھی اسی انداز میں پیش آرہے ہیں۔ میں نے آپ کے ایک شہری کی جان بچائی ہے اور آپ مجھ پر ہی شبہ کر رہے ہیں؟“

انسپکٹر نے کہا۔ ”دیکھو مسٹر! شک کرنا قانون کی گھٹی میں پڑا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ کلپنا میڈم کا معاملہ ہے۔ تم انہیں جانتے بھی ہو؟ یہ ہمارے دیش کی سپر ماڈل ہیں۔ دنیا بھر کے شوبزنس والے ان کے آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ ان جیسی شخصیات ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں۔“

محبوب نے کلپنا کی طرف دیکھتے ہوئے انسپکٹر سے کہا۔ ”میں انہیں اور اِن کے معاملات کو نہیں جانتا۔ میں نے تو بس ایک انسانی جان کو بچایا ہے۔“

نائیک چوہان نے کہا۔ ”صرف انسانی نہیں، ایک بہت ہی قیمتی جان کو بچایا ہے۔“

انسپکٹر نے محبوب سے اس کے کاغذات مانگے۔ پھر انہیں چیک کرنے کے بعد واپس کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تم نے اُس حملہ آور کو دیکھا تھا؟“

”جی ہاں۔ میں اپنے سامان کی ٹرالی لے کر باہر آیا

تھا۔ تب اس پر نظر پڑی تھی۔ وہ وہاں اُس کیاری میں ایک پودے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔"

اس نے جگہ کی نشاندہی کی۔ انسپکٹر نے سوچتی ہوئی نظروں سے اُدھر دیکھا۔ پھر دونوں سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ وہ اُدھر جا کر اس کیاری کو چیک کرنے لگے۔ انسپکٹر نے کہا۔ "پھر تو اس کی صورت بھی پہچانتے ہو گے؟"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں' اُس طرف روشنی بہت کم ہے۔ مجھے اس کی صورت دکھائی نہیں دی تھی۔"

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ "اُدھر نیم اندھیرا ہے۔ توجہ سے دیکھنے پر ہی وہاں کسی کی موجودگی کا پتا چل سکتا ہے۔ تمہاری توجہ اس طرف کیسے چلی گئی تھی؟"

"اس کے موبائل فون کی روشنی نے مجھے متوجہ کیا تھا۔ اس کے بعد ریوالور پر نظر پڑی تھی۔"

"تم یہ کیسے سمجھ گئے کہ وہ میڈم پر ہی فائر کرنے والا ہے؟"

"کیونکہ اس نے فون پر بات کرنے کے بعد ان کی گاڑی کو ٹارگٹ بنایا تھا۔"

انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا پھر کہا۔ "ذرا سوچ کر بتاؤ' کیا تم اسے بالکل بھی پہچان نہیں سکتے؟ میرا مطلب ہے' کوئی ایسی بات یا پہچان جو اس کی نشاندہی کر سکے؟"

اس نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "میں نے عرض کیا نا، وہ اندھیرے میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔"

کیاری کی طرف جانے والے سپاہی واپس آ گئے تھے۔ حملہ آور نے اپنے قدموں کے نشان بھی نہیں چھوڑے تھے۔ انسپکٹر نے کلپنا سے پوچھا۔ "میڈم! آپ کو تو کچھ اندازہ ہو گا' یہ دشمن کون ہو سکتا ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "دشمن تو بہت ہیں مگر یہ سوچنا ہو گا کہ جانی دشمنی کون کر سکتا ہے؟ فی الحال میں کوئی اسٹیٹمنٹ نہیں دے پاؤں گی۔"

وہ سپاہیوں کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کلپنا سے بولا۔ "میں نے ائرپورٹ کے داخلی اور خارجی راستوں پر چیکنگ شروع کروا دی ہے۔ جیسے ہی کوئی انفارمیشن ملے گی' میں آپ کو انفارم کر دوں گا۔ سیکیورٹی سخت کر دی گئی ہے۔ اب آپ بے فکر ہو کر اپنی شوٹنگ اسٹارٹ کروا سکتی ہیں۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ ڈائریکٹر چوہان فون پر مصروف تھا۔ پھر رابطہ ختم کر کے کلپنا سے بولا۔ "اب چلیں میڈم... شوٹنگ کا ٹائم نکلا جا رہا ہے۔"

وہ بولی۔ "شوٹنگ کا ٹائم تو نکل ہی چکا ہے۔ اب آپ پیک اپ کروا دیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "یہ... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"آسان ہندی میں بات کر رہی ہوں۔ آپ کو سمجھ جانا چاہیے۔"

محبوب خان ان کی بحث سننے کے لیے وہاں رک نہیں سکتا تھا۔ وہ پلٹ کر اپنی ٹرالی کی طرف جانے لگا۔ کلپنا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے پکارا۔ "محبوب خان...!"

اس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ کلپنا نے وہاں موجود افراد سے کہا۔ "پلیز... آپ سب جائیں۔"

ڈائریکٹر چوہان نے گڑگڑانے کے انداز میں کہا۔ "فار گاڈ سیک میڈم! میری پریشانی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"میں بہت اَپ سیٹ ہوں۔ کیمرے کو فیس کرنا نہیں چاہتی۔ پلیز... کوئی بحث نہ کریں۔ ابھی میں واپس جانا چاہتی ہوں۔"

ڈائریکٹرز کو اکثر ہی نمبرون ہیروئن اور سپر ماڈلز کے نخرے سہنے پڑتے ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ رہی تھی کہ کلپنا کی نہ ہاں میں بدلنے والی نہیں ہے۔ چوہان نے بے بسی سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "کوئی اگلی ڈیٹ تو دے دیں۔"

"ابھی میں کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی۔ آپ پلیز جائیں۔"

اس نے ان کی طرف سے منہ پھیر کر محبوب کو دیکھا۔ پھر اس کے قریب آ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا اتنا بڑا احسان کر کے مجھ سے بات کیے بغیر ہی جا رہے تھے؟"

"اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ میں نے تو صرف آپ کی مدد کی ہے۔"

"صرف مدد نہیں کی' نیا جیون دیا ہے۔"

"زندگی دینا تو اوپر والے کا کام ہے۔"

"بے شک۔ اوپر والے نے رکھشا کی ریکھا کھینچنے آپ کو بھیجا ہے۔ موت میری طرف آنے کے لیے آپ کی ریکھا کو پار نہ کر سکی۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "اور سلامتی کی لکیر کھینچنے والے کو بڑی دور سے بھیجا ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ یا خدا...! کسی کی ہنسی میں ایسا جادو بھی ہو سکتا ہے۔ وہ سحر پھونک رہی تھی اور وہ سحر زدہ سا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ بایاں ہاتھ ہونٹوں کے قریب لا کر ہنسنے کی ادا ایسی تھی کہ اس سے نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ دل کر

رہا تھا' وہ اسی ادا سے ہنستی رہے اور وہ اسے تکتا رہے۔ اس کے ترنم میں ڈوبتا ابھرتا رہے۔

ڈائریکٹر چوہان مایوس ہو کر سیکیورٹی گارڈز وغیرہ کے ساتھ وہاں سے چلا گیا تھا۔ کلپنا نے محبوب سے کہا۔ "میرا اندازہ غلط نہ ہو تو آپ کرکٹ میچ کے لیے یہاں آئے ہیں؟"

"آپ کا اندازہ غلط نہیں ہے۔ میں لائیو کرکٹ دیکھنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

وہ خوش ہو کر بولی۔ "او آئی لو کرکٹ... اور جہاں پاک بھارت کی بات ہو تو میں بھی اسے لائیو دیکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں۔"

وہ مسکرا کر بولا۔ "یہی کوشش مجھے انڈیا لے آئی ہے۔"

"مجھے تو یہ آپ کی دیوانگی لگتی ہے۔"

"ہاں۔ اصل میں تو ایسا ہی ہے۔"

وہ خوشی سے کھل گئی۔ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "اسی بات پر ہاتھ ملائیں کیونکہ میں بھی کرکٹ کی دیوانی ہوں۔"

اس نے مسکرا کر اس کے نازک سے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر اسے تھام لیا۔ خدا جانے اس ہاتھ میں ہڈیاں بھی تھیں یا نہیں...؟ نرم ملائم تھا پھر وہ اس کی گرفت سے پھسل گیا۔ وہ ہوا سے اٹھلاتی ہوئی زلفوں کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ "ویسے صرف دیکھتے ہیں یا کھیلنے کا شوق بھی ہے؟"

"ابھی تو انڈر نائنٹین میں کھیلتا ہوں۔ مگر بہت جلد اپنی قومی ٹیم کو جوائن کرنے والا ہوں۔"

وہ خوشی سے چہک کر بولی۔ "ارے واہ... یعنی پاکستانی ٹیم کے اَپ کمنگ کھلاڑی سے ملاقات ہو رہی ہے۔ یہ تو میرے لیے اعزاز کی بات ہے۔"

پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو کوئی ریسیو کرنے نہیں آیا؟ کیا یہاں کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں۔ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں اور آتے ہی مایوس ہو رہا ہوں۔ کیا آپ لوگ ہم پاکستانیوں کو پسند نہیں کرتے؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "ایسی بات نہیں ہے۔"

"ابھی تک تو ایسی ہی باتیں سامنے آئی ہیں۔ وہاں وہ کاؤنٹر آفیسر اور یہاں وہ پولیس انسپکٹر ان کے رویوں سے اور باتوں سے تو ایسا ہی تاثر ملا ہے۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "اور میں... میرے رویے سے کیسا تاثر مل رہا ہے؟"

اس نے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھا۔ وہ ابھی اس کی حرارت سے متعارف ہو کر آیا تھا۔ اس نے مسکرا کر اسے مٹھی بناتے ہوئے کہا۔ "آپ کی بات الگ ہے۔"

"الگ اس لیے ہے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ جہاں بُرے لوگ ہوتے ہیں' وہاں اچھے بھی ہوتے ہیں۔ بھارت ہو یا پاکستان... دونوں ہی ملکوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت کے جذبات بھی ہیں اور نفرت کی آگ بھی ہے۔ ہم دونوں نے ہاتھ ملایا، گویا نفرت کی آگ پر پانی ڈال دیا۔ یہاں اور بھی بہت سے ہندوستانی ایسا ہی کر رہے ہوں گے۔"

اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ "میں آپ کو اپنے دیش میں ویلکم کہتی ہوں۔ آپ کا سواگت کرتی ہوں اور وہ کیا کہتے ہیں... ہاں، خوش آمدید کہتی ہوں۔"

اس کی بات سن کر وہ ہنس پڑا۔ وہ بھی ہنسنے لگی۔ محبوب نے کہا۔ "آپ یہاں کی سپر ماڈل ہیں۔ شوبزنس کی دنیا کا بڑا نام ہیں۔ لوگ انٹرنیشنل لیول پر آپ کو جانتے ہیں۔ دراصل میں ٹی وی بہت کم دیکھتا ہوں۔ سوری! اسی لیے آپ کو پہچان نہیں پایا۔"

"تو اس میں سوری بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ کو عجیب سا لگا ہو گا؟"

"سچ پوچھیں تو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ مجھے نہیں جانتے۔"

"کمال ہے۔ اس میں خوش ہونے کی کیا بات ہے؟"

"باتیں تو بہت سی ہو سکتی ہیں مگر یہاں کھڑے کھڑے نہیں کر سکیں گے۔ وہ ٹرالی آپ کی ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ کلپنا نے ڈرائیور سے کہا۔ "محبوب صاحب کا سامان ڈکی میں لا کر رکھو۔"

محبوب نے کہا۔ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ میں ٹیکسی لے کر کسی ہوٹل کی طرف جاؤں گا۔"

ڈرائیور اپنی مالکن کے حکم کے مطابق ٹرالی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ بولی۔ "آپ میرے محسن بھی ہیں اور مہمان بھی ہیں۔ یہاں آتے ہی آپ کو تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ میں اپنی مہمان نوازی سے ان تلخیوں کو ختم کرنا چاہوں گی۔ آخر ہم یونہی تو نہیں کہتے کہ انڈیا اِز دی بیسٹ..."

ڈرائیور ٹرالی لے آیا تھا۔ پھر ڈکی کھول کر سامان رکھنے لگا۔ محبوب نے ہچکچا کر کہا۔ "آپ تکلف کر رہی ہیں۔"

"میں کچھ نہیں کر رہی ہوں۔ سب کچھ خود بخود قدرتی طور پر ہو رہا ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ حادثہ مجھے مستقبل کے ایک کرکٹر سے ملانے والا ہے۔"

"اور میں بھی نہیں جانتا تھا کہ شو بزنس کی دنیا کے ایک روشن ستارے کو بچا رہا ہوں۔ لیکن میں آپ کے کسی کام آیا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کی جان کو ہی آجاؤں۔"

ڈرائیور نے ڈگی بند کر کے گاڑی کی پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ کلپنا نے محبوب کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بولا۔ "مجھے یہاں کے ہوٹلز وغیرہ کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ اس لیے یہ بھی نہیں بتا پاؤں گا کہ کہاں جانا ہے؟ بس اتنی مہربانی کریں، مجھے وانکھیڑے اسٹیڈیم کے قریب ہی کسی ہوٹل تک پہنچا دیں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "آپ گاڑی میں تو بیٹھیں۔ منزل تک بھی پہنچ ہی جائیں گے۔"

وہ پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ کلپنا ڈرائیور کو کچھ ہدایت دے کر دوسری طرف سے محبوب کے برابر آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہو کر ائرپورٹ کے احاطے سے باہر جانے لگی۔ انسپکٹر سریش چوپڑا کی گہری سوچتی ہوئی نگاہیں دور جاتی ہوئی گاڑی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک گہری سانس کھینچی۔ پھر دائیں طرف ذرا فاصلے پر کھڑی ہوئی پولیس وین کو دیکھا۔ وہاں تین سپاہی پچھلی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

سریش چوپڑا نے ان کے پاس آ کر سپاہیوں کے درمیان بیٹھے ہوئے شخص کو گھورتے ہوئے کہا۔ "کچھ اندازہ بھی ہے، تم نے کیسا سنہری موقع گنوا دیا ہے؟"

وہ بولا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔ وہ تو اُس..."

سریش نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔ "تم نے کچھ کیا ہی تو نہیں ہے۔ اب کیا رپورٹ دو گے پجاراجی کو...؟ تمہارے ساتھ ساتھ ہماری بھی کھال کھنچے گی۔"

وہ مٹھیاں بھینچ کر دانت پیس کر بولا۔ "نہ جانے وہ سالا کہاں سے ٹپک پڑا تھا؟ ورنہ پجاراجی جانتے ہیں، میرا نشانہ کبھی چوکتا نہیں ہے۔"

"اسی لیے انہوں نے تمہیں بھیجا تھا۔ مگر ساری محنت پر پانی پھر گیا۔ تمہیں یہاں سپاہی بنا کر لانے کے معاملے میں رسک ہی رسک تھا۔ پکڑے جاتے تو میری ہی بیلٹ اترتی۔"

"اسی لیے میں نے وہاں چھپے رہنے کی حماقت نہیں کی۔ دوسری گولی نہیں چلائی۔ اگر کوئی اور جگہ ہوتی تو سالی کو نرک میں پہنچا کر ہی دم لیتا۔"

"اب بیلٹ اترے گی یا نہیں مگر ہم سب پر پجاراجی کا غصہ ضرور اترے گا۔ آتش فشاں کی طرح پھٹیں گے وہ..."

ان کے درمیان تھوڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر سریش نے کہا۔ "وہ تو شکر کرو، اس چھوکرے نے تمہاری صورت نہیں دیکھی۔ نہ یہ دیکھ سکا کہ تم وردی میں تھے۔ اور تمہیں وردی میں اسی لیے رکھا گیا تھا کہ کوئی دیکھے گا تو یہی سمجھے گا، سپاہی ہو۔ پہرے داری کر رہے ہو۔"

پھر اس نے ذرا جھنجلا کر کہا۔ "کلپنا پر جان لیوا حملہ ہوا ہے۔ وہ بھی میری ڈیوٹی کے وقت... بات بہت دور تک جائے گی۔ بڑے بڑے افسر حرکت میں آ جائیں گے۔ کام ہو جاتا، کم سے کم پجاراجی خوش ہو جاتے تو خیر تھی۔ انہوں نے مجھ سے تعاون کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس ناکامی کا سن کر تو وہ آگ بگولا ہو جائیں گے۔ میں تو ہر طرف سے مارا جاؤں گا۔"

اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ "پجاراجی کی کال آئی؟"

حملہ آور نے انکار میں سر ہلایا۔ انسپکٹر نے ایک گہری سانس لے کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر ایک مخصوص انداز میں گاڑی پر اسٹک بجاتا ہوا اگلی سیٹ کی طرف آ گیا۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور نے فوراً ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ وہ دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "پجاراجی کی طرف چلو۔"

ڈرائیور گیئر بدل کر گاڑی کو آگے بڑھانے لگا۔

دوسری طرف کلپنا کی گاڑی ایک سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی۔ محبوب نے کہا۔ "مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں بولنا تو نہیں چاہیے۔ مگر پھر بھی یہ تجسس ہے کہ کوئی آپ کی جان کیوں لینا چاہتا ہے؟"

وہ مسکرا کر بولی۔ "ہم جیسے لوگوں کا کوئی معاملہ ذاتی نہیں ہوتا۔ ہماری ایک ایک بات، ایک ایک مسئلہ اشتہار بنتا ہے اور کیش ہوتا ہے۔ میرا یہ معاملہ صبح تک اخبارات میں اور ابھی آدھے گھنٹے کے اندر مختلف نیوز چینلز پر خبر بن جائے گا۔ سب ہی کو تجسس ہوگا کہ حملہ کس نے کیا؟ کیوں کیا؟ ان سوالوں کے جواب حاصل کرنے کے لیے گھر کے فون چیخ رہے ہوں گے۔ اسی لیے میں نے اپنا موبائل فون آف کر دیا ہے۔"

"آپ کو تجسس نہیں ہے؟"

"کس بات کا...؟"

"یہی کہ کون آپ کی جان لینا چاہتا ہے؟"

وہ مسکرا کر کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ "ظاہر ہے، کوئی دشمن ہی ہوگا۔"

"آپ خلافِ توقع بہت مطمئن دکھائی دے رہی ہیں۔ جبکہ تھوڑی دیر پہلے جان لیوا حملے سے بال بال بچی ہیں۔"

"میں صرف مطمئن نہیں، خوش بھی ہوں۔"

"کیا یہ جاننے کا تجسس نہیں ہے کہ وہ دشمن کون ہو سکتا ہے؟ وہ دوبارہ بھی تو حملہ کر سکتا ہے۔ آپ کو محتاط رہنا چاہیے۔"

"محتاط ہوں اسی لیے تو شوٹنگ کینسل کر کے گھر جا رہی ہوں۔"

"نہیں، میرا مطلب ہے میں نے بڑی بڑی سپر اسٹارز کو دیکھا ہے، وہ اپنی حفاظت کے لیے باڈی گارڈز رکھتی ہیں۔ کیا آپ ایسا نہیں کرتیں؟"

"میرے چار باڈی گارڈز ہیں۔ کبھی انہیں ساتھ رکھتی ہوں کبھی ان کی موجودگی سے بیزار ہو جاتی ہوں تو صرف ڈرائیور کے ساتھ باہر نکلتی ہوں... اور کبھی تو اس سے بھی الجھن ہونے لگتی ہے۔"

وہ بول کر مسکرانے لگی۔ محبوب نے کہا۔ "بے شک... پابندی سے بیزاری ہوتی ہے مگر اپنے تحفظ کے لیے ایسی پابندیاں برداشت کرنی ہی پڑتی ہیں۔"

"ہاں۔ آج سزا بھی مل گئی۔ یہ شہرت تو دولت سے بھی بُری شے ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ شہرت اور نیک نامی تو رحمت کی طرح ہوتی ہے۔"

"یہ رحمت کبھی کبھی زحمت بن جاتی ہے۔ جب آپ اپنی قومی ٹیم کے کھلاڑی بن کر شہرت حاصل کریں گے، تب بہت سی جگہوں پر آپ کو میری یہ بات ضرور یاد آئے گی۔"

وہ زیرِ لب مسکرانے لگا۔ پھر ونڈ اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بائی دا وے، ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ "گھر..."

محبوب نے چونک کر پوچھا۔ "گھر...؟ کس کے گھر؟ مجھے تو کسی ہوٹل میں جانا ہے۔"

"تو سمجھیں ہوٹل کی طرف ہی جا رہے ہیں۔"

اس نے ذرا الجھ کر اسے دیکھا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی یہ ادا ایسی تھی کہ وہ سحر زدہ سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ کلپنا نے کہا۔ "کیوں... گڑبڑا گئے؟ ارے میں آپ کو اپنے گھر لے جا رہی ہوں۔ میرا خیال ہے، وہاں آپ کو کسی بھی ہوٹل سے بہتر سروس ملے گی۔"

"نہیں کلپنا جی! آپ نے اپنی گاڑی میں لفٹ دی، یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کے گھر نہیں جاؤں گا۔ پلیز! مجھے کسی ہوٹل تک پہنچا دیں۔"

"میرا خیال ہے، آپ کو میری آفر بُری نہیں لگنی چاہیے۔"

وہ سنجیدگی سے بولا۔ "بات اچھے یا بُرے کی نہیں ہے۔ دراصل آپ کے ایسے رویّے سے مجھے یہی محسوس ہو رہا ہے جیسے آپ میری مدد کو احسان سمجھ رہی ہیں اور کسی بھی طرح اسے اتارنا چاہتی ہیں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "یہ درست ہے کہ آپ میرے محسن ہیں۔ مگر آپ نے جو احسان کیا ہے، اسے تو میں اتار ہی نہیں سکتی اور یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔"

"تو پھر پلیز... کسی تکلف میں نہ پڑیں۔"

"تکلف تو آپ کر رہے ہیں۔ میں تو بڑی اپنایت سے آپ کو اپنے گھر لے جا رہی تھی اور اپنایت کی حد یہ ہے کہ بنا بتائے لے کر جا رہی تھی... کیونکہ مجھے یقین تھا، آپ انکار نہیں کریں گے۔"

انکار تو وہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا ساتھ اچھا لگ رہا تھا۔ عجیب سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے رویّے میں، اس کی باتوں میں ایسی اپنایت تھی کہ دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اجنبی شہر کے اجنبی ماحول میں وہ اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ اس کا ساتھ چھوڑنے کو جی نہیں کر رہا تھا مگر ساتھ رہنے میں جھجک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کی مدد کرنے کے بعد اس کے سر پر مسلط نہیں رہنا چاہتا تھا۔

وہ ہچکچا کر بولا۔ "مجھے افسوس ہے، شاید میں انکار کر کے آپ کا دل دُکھا رہا ہوں۔"

"آپ ہاں بول کر اس دُکھی دل کو خوش بھی کر سکتے ہیں۔"

"لیکن میرا آپ کے گھر جانا مناسب نہیں ہے۔"

"مناسب نہ ہوتا تو کیا میں ایسا کرتی؟"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ "نہیں کلپنا جی! آپ پلیز ڈرائیور کو کہیں گاڑی کسی ہوٹل کی طرف لے چلے۔"

"یہ گاڑی آپ کو ہوٹل تک بھی لے جا سکتی ہے۔ مگر ابھی تو آپ وہاں جائیں گے، جہاں میں لے جاؤں گی۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، وہ بولی۔ "آپ نے بن بلائے مہمان تو سنیں ہوں گے۔ مگر زبردستی کے میزبان نہیں دیکھے ہوں گے۔"

"لیکن..."

وہ بولی۔ "اصولاً تو مجھے آپ کی بات مان لینی چاہیے۔ مگر کیا کروں' فطرتاً ضدی ہوں۔ جو ٹھان لیتی ہوں' وہ کر کے ہی دم لیتی ہوں۔ چاہے نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔"

وہ بولا۔ "سوچ لیں۔ کہیں میری میزبانی کر کے بھی کوئی نقصان نہ اٹھانا پڑ جائے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ زیرلب مسکرانے لگی۔ عجب جادوگری تھی۔ کوئی کسی کے ساتھ زبردستی کرے تو وہ جھنجلاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی اپنائیت بھری زبردستی اچھی لگ رہی تھی۔ جیسے کوئی اپنی ملکیت پر حق جتاتا ہے' ایسے ہی وہ اُس پر حق جتا رہی تھی۔ اَن دیکھی زنجیر سے باندھ کر پوچھ رہی تھی... "کیا دامن چھڑا کر بھاگ سکتے ہو...؟"

محبوب کو اُس کی ضد پر پیار آرہا تھا...

وہ سوچتے سوچتے چونک گیا۔ "پیار...؟"

اس نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا پھر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں آپ کی ضد کا بھرم رکھ لیتا ہوں۔ مگر وعدہ کریں' کل اس سلسلے میں کوئی ضد نہیں کریں گی۔ مجھے میری مرضی کے مطابق کسی بھی ہوٹل میں جانے دیں گی۔"

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ بظاہر ہنس بول رہی تھی' خوش اور مطمئن دکھائی دے رہی تھی مگر اندر ہی اندر اپنے حالات پر غور کر رہی تھی۔ کسی نے اس کی جان لینا چاہی تھی۔

کس نے لینا چاہی تھی؟

اس کے دماغ میں مختلف افراد کے نام گھومنے لگے۔ کینہ اور بغض رکھنے والے ہر پروفیشن میں ہوتے ہیں۔ اس کے آس پاس بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو اوپر جانے والوں کی ٹانگ کھینچ کر خود ان سے آگے نکل جانا چاہتے ہیں۔ کلپنا کو جیسے جیسے شہرت اور کامیابی نصیب ہو رہی تھی' ویسے ویسے حاسدوں کی فہرست میں بھی اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو دشمن بہت سے تھے۔ مگر سوال یہ پیدا ہو رہا تھا کہ جان لیوا دشمنی کون کر سکتا ہے؟

اس "کون" کے پیچھے بہت سے چہرے تھے' بہت سے نام تھے۔ ان میں ایک نام ایس کے پچارا کا بھی تھا۔ اسے اس شہر کی بزنس کمیونٹی کا اہم ستون مانا جاتا تھا۔ وہ ایک ملٹی پروڈکٹ کمپنی کا مالک تھا۔ تیل' گھی، صابن اور شیمپو وغیرہ سے لے کر ہر طرح کے کاسمیٹکس اور انڈر گارمنٹس تک ایس کے پچارا کا نام ہی کوالٹی کی ضمانت تھا۔ جس چیز پر اس کے نام کی چھاپ ہوتی تھی' لوگ اسے آنکھ بند کر کے خرید لیتے تھے۔

وہ ایک شاطر سیاست دان بھی تھا۔ اس کے علاوہ شہر بھر کے پوش علاقوں میں اس نے کیسینو بار' کافی بار اور اسنوکر کلب قائم کیے ہوئے تھے۔ اپنی کامیابی کو اور بزنس کو مزید عروج دینے کے لیے شہر کی مصروف ترین مارکیٹ میں ایس کے پچارا کے نام سے ایک انٹرنیشنل لیول کا شاپنگ مال بھی تعمیر کرایا تھا۔

کامیابی کی ایسی بلندیوں کو چھونے کے بعد وہ جسے چاہتا تھا' اسے اپنے قدموں میں جھکنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ اس وقت وہ اسنوکر ڈیسک پر جھک کر ایک گیند کو ٹارگٹ بنا رہا تھا۔ اس دوران اسنوکر اسٹک اس کے ہاتھوں میں ہولے ہولے آگے پیچھے ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو تاڑ کر نشانہ لینا چاہتا ہو۔

اسنوکر ڈیسک کے دوسری طرف ایک حسینہ بڑی ادا سے بل کھا کر یوں کھڑی ہوئی تھی کہ خوبصورت بدن کا انگ انگ واضح ہو رہا تھا مگر ایس کے پچارا کی نگاہیں مطلوبہ گیند پر جمی ہوئی تھیں۔ حسینہ نے اس کے سامنے ڈیسک پر جھک کر اس سفید گیند کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ٹارگٹ مشکل ہے۔"

وہ بڑی خود اعتمادی سے بولا۔ "ایس کے پچارا کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔"

"تو ہٹ کرو۔"

اس نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر نشانہ لیتے ہوئے اسٹک سے ایک گیند کو ہٹ لگائی۔ وہ سفید گیند سے ٹکرائی پھر دونوں گیندیں دائیں بائیں لڑھکتی ہوئی ڈیسک کے دو اطراف جا کر رک گئیں۔ شکار جیسے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس نے ناگواری سے سفید گیند کو دیکھا۔ پھر اسٹک کو ڈیسک پر پھینکتے ہوئے کہا۔ "سالی بچ گئی..."

ایسے ہی وقت انسپکٹر سریش اس حملہ آور کے ساتھ اندر آیا تھا۔ پچارا کی بات سن کر ٹھٹک گیا۔ اس نے پوچھا۔ "آپ کو کس نے خبر دی؟"

پچارا نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ "کیسی خبر...؟"

"کلپنا جی کے بچ جانے کی..."

وہ تیز لہجے میں بولا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟"

"یہ بکواس نہیں ہے۔ وہ بچ گئی ہے۔"

پچارا نے اپنے آلۂ کار کو سوالیہ نظروں سے گھورا۔

"کیسے بچ گئی؟ کیا تمہارے ریوالور میں گولیاں نہیں تھیں؟"

وہ ہچکچا کر بولا۔ "وہ... گولیاں تو تھیں..."

پچارا نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "کیا ٹریگر دبانے کی طاقت نہیں تھی؟"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "ٹریگر تو دبایا تھا..."

"تو کیا گولی نے چلنے سے انکار کر دیا تھا؟"

"گولی بھی چلی تھی..."

"نشانہ خطا ہو گیا؟"

"میرا نشانہ کبھی چوکتا نہیں ہے۔ دراصل وہاں اچانک ہی معاملہ بگڑ گیا تھا۔"

پچارا نے انسپکٹر کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری موجودگی میں معاملہ کیسے بگڑ گیا؟"

انسپکٹر بولا۔ "ایک چھوکرے نے اسے تاڑ لیا تھا۔ اُسی نے کلپنا جی کی جان بچالی۔"

"کون چھوکرا...؟"

"کیا بتاؤں؟ ایسا لگتا ہے' وہ اس کی مدد کے لیے آسمان سے ٹپکا تھا۔ کوئی پاکستانی تھا۔ اپنا سامان لے کر باہر آرہا تھا' اسی وقت اِس پر نظر پڑ گئی۔ کچھ لوگوں کو دوسروں کے معاملے میں کودنے کا شوق ہوتا ہے۔ وہ بھی کود پڑا۔ یہ پروا کیے بغیر کہ گولی اسے بھی لگ سکتی تھی۔"

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "آج کے زمانے میں جان کا رسک کون لیتا ہے؟"

وہ بولا۔ "دنیا میں ابھی ایسے جیالوں کی کمی نہیں ہے۔"

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ "بے شک، کمی نہیں ہے اور ایسے جیالے پیسوں سے خریدے جاتے ہیں جو باڈی گارڈ بن کر رہتے ہیں۔ وہ کلپنا کا کوئی خفیہ باڈی گارڈ ہو سکتا ہے۔"

انسپکٹر نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ "میں نے اس کا پاسپورٹ اور دوسرے ڈاکومینٹس چیک کیے تھے۔ وہ پی آئی اے کی فلائٹ سے اسی وقت وہاں پہنچا تھا۔ ویسے اس ساری گڑبڑ کے بعد چوہان کی شوٹنگ کینسل ہو گئی ہے۔ کلپنا جی بہت گرمی دکھا گئی ہیں۔"

پچارا نے ہاتھ مسل کر کہا۔ "اس کی گرمی نے ہی تو میرا دماغ گرم کر کے رکھا ہے۔ بہت تیور دکھائے تھے مجھے۔ صرف ایک ڈریس کی وجہ سے میرے پروجیکٹ پر تھوک کر چلی گئی تھی۔ سالی نہ جانے کس کس کے ساتھ لمحے گزارتی ہوں گی اور میرے کمرشل میں ایک بکنی پہننے سے انکار کر رہی تھی۔

بڑی پارسا بنتی ہے۔"

پھر وہ اپنے آلۂ کار کو دھتکارنے کے انداز میں بولا۔ "تم کیا سر جھکائے کھڑے ہو؟ جاؤ، دفع ہو جاؤ۔"

اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔ حسینہ نے فوراً ہی قریب آ کر ایک لائٹر کے ذریعے اسے شعلہ دکھایا۔ وہ ایک دو کش لینے کے بعد بولا۔ "ان عورتوں کا یہی وتیرہ ہوتا ہے۔ جب کچھ نہیں ہوتیں' تب بہت کچھ بننے کے لیے ہم جیسے سرمایہ داروں کے آگے پیچھے دوڑتی ہیں۔ ایک ایک کمرشل کے لیے' ایک بار اپنا چہرہ ٹی وی پر دکھانے کے لیے بھیک کی طرح چانس مانگتی ہیں اور پھر جب کچھ بن جاتی ہیں تو ایسے نخرے اور پارسائی دکھاتی ہیں' جیسے دودھ کی دھلی ہوں۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "بے شک۔ شوبزنس میں ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ مگر کلپنا جی کے بارے میں تو سنا ہے' انہوں نے لندن سے ماڈلنگ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ مقابلۂ حسن جیتنے کے بعد وہ اپنے سرٹیفکیٹ کے ذریعے شوبزنس میں..."

وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ "ارے یہ سب دکھاوا ہوتا ہے۔ تم نہیں جانتے' ان عورتوں نے اپنے بھاؤ بڑھانے کے نئے نئے طریقے نکال لیے ہیں۔ یہ ماڈلنگ کی تعلیم' ٹریننگ' مقابلۂ حسن... یہ سب ڈراما ہے۔ ہم جیسے سرمایہ دار پیسا لگاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں' ان تماشوں کے پیچھے کیا چلتا رہتا ہے؟"

اس حسینہ نے ایک پیگ بنا کر پچارا کی طرف بڑھایا۔ وہ اسے لے کر ایک ہی گھونٹ میں ختم کرتے ہوئے بولا۔ "تم کیا سمجھتے ہو' وہ پارسا ہے؟"

اس حسینہ نے گلاس واپس لے کر دوسرا پیگ بنایا۔ انسپکٹر نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم پچارا جی! ان باتوں کو آپ ہی بہتر جانتے ہوں گے۔ مجھے تو صرف اتنا معلوم ہے کہ کلپنا جی کا کوئی اسکینڈل نہیں ہے۔"

وہ حسینہ سے دوسرا پیگ لیتے ہوئے بولا۔ "کچھ عورتیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ اپنے سائے کو بھی معلوم نہیں ہونے دیتیں کہ کس کا ساتھ قبول کر رہی ہیں؟"

"مگر میڈیا والے تو بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ بند کمروں کی خبریں بھی باہر نکال لاتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو..."

وہ سگریٹ فرش پر پھینک کر غصے سے بولا۔ "تو تم کیا سمجھ رہے ہو' میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ بکواس کر رہا ہوں؟"

”نہیں پچارا جی! میں تو...“

”کیا میں تو...؟ جب سے آئے ہو، اس سالی کی حمایت کیے جارہے ہو۔“

وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔ ”اُس کی اتنی طرف داری نہ کرو کہ مجھے تمہاری طرف سے غداری کا شبہ ہونے لگے۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”مجھ پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے تو اپنی نوکری کو خطرے میں ڈالتے ہوئے آپ کا کام کیا ہے۔“

”اور کام کے صلے میں دام بھی ملے ہیں۔ تم نے کوئی احسان نہیں کیا ہے۔“

وہ پیگ خالی کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میرا تو وقت بھی ضائع ہوا اور پیسا بھی... وہ چڑیا تو پھر ہو گئی۔“

”قسمت کی دھنی ہے۔ ورنہ آپ کے آلۂ کار کو میں نے جہاں پہنچایا تھا‘ وہاں سے وہ کلپنا جی کو اوپر پہنچا کر ہی واپس آنے والا تھا۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا پھر بولا۔ ”ایسی بھی کیا خوش نصیبی؟ ہم نے کئی دنوں میں یہ منصوبہ بنایا تھا اور چند سیکنڈ میں سب چوپٹ ہو گیا۔“

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے انسپکٹر کو دیکھا۔ ”بات حلق سے اتر نہیں رہی ہے۔ ایسا حقیقت میں کہاں ہوتا ہے؟ یہ تو کچھ فلمی سچویشن لگ رہی ہے کہ ہیرو نے آتے ہی بڑے ڈرامائی انداز میں ہیروئن کو بچالیا۔“

اس نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”جب کلپنا وہاں سے چلی گئی تو تم نے اس پاکستانی کے بارے میں معلوم کیا‘ وہ کہاں گیا؟“

”وہ تو میڈم کے ساتھ ہی گیا ہے۔“

اس نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔ ”کیا...؟“

”ہاں۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ہی میں آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”وہ اسے کہاں لے گئی ہے؟ کیا اس کے کسی عزیز رشتے دار کے گھر یا پھر کسی ہوٹل میں...؟“

”معلوم نہیں۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”بہت ہی احمق ہو تم... اس کا پیچھا کرکے یہ اہم معلومات حاصل کرنے کے بجائے میرے سامنے دُم ہلانے چلے آئے۔“

سریش چوپڑا نے ہچکچا کر ایک طرف کھڑی ہوئی حسینہ کو دیکھا۔ وہ زیرِلب مسکرا رہی تھی۔ وہ بولا۔ ”میرا خیال ہے ان کا پیچھا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔“

پچارا نے کہا۔ ”اپنے خیالات اپنے پاس ہی رکھو۔ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ وہ نوجوان اچانک ہی آسمان سے نہیں ٹپکا تھا۔ کلپنا کا اس سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔“

”یہ ضروری نہیں ہے۔ اس نے کلپنا جی کی مدد کی تھی۔ انہوں نے اسے لفٹ دی ہوگی۔“

”میں نے کہا نا، اپنے اندازوں کی کڑیاں نہ ملاؤ۔ جا کر معلوم کرو‘ کلپنا نے اسے کہاں پہنچایا ہے؟“

وہ تائید میں سر ہلا کر وہاں سے جانے لگا۔ پچارا نے کہا۔ ”مجھے فون پر انفارمیشن دینا۔ بار بار اپنی پولیس موبائل لے کر یہاں نہ آیا کرو۔“

”جی بہتر...“

وہ پلٹ کر چلا گیا۔ پچارا سوچتی ہوئی نظروں سے دروازے کو دیکھتا ہوا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسے اپنی ناکامی پر غصہ آرہا تھا۔ حسینہ ایک پیگ بنا کر اسے دیتے ہوئے اس کے برابر میں ایسے بیٹھ گئی‘ جیسے گود میں بیٹھنا چاہتی ہو۔ پھر اس سے اور لگتے ہوئے بولی۔ ”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا کہ کلپنا کو جان سے مارنے والے ہو؟“

”کچھ معاملات راز میں رکھنے پڑتے ہیں۔“

وہ اس سے ذرا اور لگتے ہوئے بولی۔ ”کیا میں تمہاری ہم راز نہیں ہوں؟“

وہ ایک گھونٹ حلق سے اتار کر ناگواری سے بولا۔ ”پلیز آشا! میرا موڈ آف ہے۔“

وہ اس کے چہرے پر ایک انگلی پھیرتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے موڈ کو سمجھ رہی ہوں‘ اسی لیے اس معاملے پر بات کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ سر جھٹک کر بولا۔ ”ایسا لگ رہا ہے‘ وہ مجھے ٹھینگا دکھا کر چلی گئی ہے۔ واقعی قسمت کی دھنی ہے۔ موت کے جبڑوں سے بچ کر نکل گئی۔“

”کیا تمہیں انتقام لینا نہیں آتا؟“

اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔ ”کیا مطلب...؟“

”انتقام کا مطلب موت نہیں ہوتا بلکہ دشمن کو موت سے بدتر زندگی دے کر سسک سسک کر جینے کے لیے چھوڑ دینا اصل میں انتقام کہلاتا ہے۔ تم تو اسے چند سیکنڈ میں ہی دنیا کے درد و غم سے رہائی دینے والے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ بچ گئی۔“

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے آشا کو دیکھا۔ ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ کھل کر کہو۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”میں نے اور کلپنا

نے ایک ساتھ اس انڈسٹری میں قدم رکھا تھا مگر وہ ماڈل گرل بن گئی اور میں آج بھی کال گرل ہی ہوں۔ اس کی کامیابی اور میری مسلسل ناکامی نے مجھے حسد اور جلن میں مبتلا کر دیا ہے۔“

پچارا نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی۔ آشا اسے شعلہ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”تم نے بھی کبھی میرا ساتھ نہیں دیا۔ اگر اپنی کمپنی کی مہنگی پروڈکٹ میں مجھ سے ماڈلنگ کراتے تو شاید میرا ستارہ بھی چمک جاتا مگر...“

وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ”یہ فضول بحث ہے۔ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں‘ اپنی ہر اہم پروڈکٹ کے کمرشل کے لیے مجھے بڑے بڑے ناموں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مہنگی مہنگی ماڈل گرلز کو ہائر کرتا ہوں کیونکہ بزنس کو سمجھتا ہوں‘ لوگوں کی نفسیات سے کھیلتا ہوں... دیکھنے والے متاثر ہو کر اور یہ سوچ کر وہ چیز ضرور خریدتے ہیں کہ فلاں سپر ماڈل بھی وہی پروڈکٹ استعمال کرتی ہے۔“

وہ طنزیہ انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”جبکہ ایسا ہوتا نہیں ہے۔ کوئی بھی سپر ماڈل یا ایکٹریس لوکل چیز استعمال نہیں کرتی۔“

”کوئی اندر کی بات نہیں جانتا۔ جو دکھتا ہے‘ وہی بکتا ہے۔“ وہ ایک گہرا کش لینے کے بعد بولا۔ ”تم کلپنا کے بارے میں کچھ کہنے والی تھیں؟“

وہ بولی۔ ”یہاں سب ہی اپنا بزنس چمکا رہے ہیں۔ کوئی اپنی ذہانت کو کیش کراتا ہے اور کوئی اپنی خوبصورتی کو... ذرا سوچو! اگر تم سے تمہارا یہ کاروباری دماغ چھین لیا جائے تو تم کیا رہ جاؤ گے؟“

وہ شہادت کی انگلی کو اور انگوٹھے کو جوڑ کر دائرہ بناتے ہوئے بولا۔ ”زیرو...“

وہ اس کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اور اس زیرو کے ساتھ آخری سانس تک جینا پڑے تو کیسا لگے گا؟“

”میں ایسی ناکام زندگی جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“

”کلپنا کے پاس اس کی خوبصورتی اس کا بلینک چیک ہے جسے وہ خوب کیش کر رہی ہے۔ تم تو بزنس مین ہو۔ کیا اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ کسی کی کمزوری سے کھیلنے میں جو خوشی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے‘ وہ جان سے کھیلنے میں نہیں ہوتی۔“

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے آشا کو دیکھا۔ وہ بولی۔ ”کلپنا کی زندگی کو نہیں‘ اس کی خوبصورتی کو چھینو۔ اس کے بغیر وہ زیرو ہو کر رہ جائے گی۔ اسے جان سے مارنے کا خیال دل سے نکال دو۔ اسے عبرت کا نشان بنا کر زندہ رکھو۔“

اس کی باتیں سنتے ہی کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

شہرت ہو یا دولت... دشمنی کے لیے دونوں ہی چیزیں بھری ہوئی بندوق کی طرح ہوتی ہیں۔ کلپنا کو اندازہ نہیں تھا کہ ایک کمرشل کو ٹھکرانے کا انجام کس حد تک سنگین ہو سکتا ہے؟ دشمن سامنے آکر‘ ڈنکے کی چوٹ پر دشمنی کرے تو اس سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر چھپ کر اچانک ہی وار کرنے والوں سے نمٹنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے میں صرف خوش قسمتی ہی کام آتی ہے۔

محبوب خان قسمت سے اس کی زندگی میں آیا تھا اور وہ خوش قسمتی سے اس وقت سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے گھر پہنچ کر ڈرائیور سے کہا۔ ”محبوب صاحب کا سامان انیکسی میں لے جاؤ اور کسی ملازم سے کہو‘ وہاں کی صفائی کر دے۔“

پھر محبوب سے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ آئیں۔“

وہ اس کے پیچھے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا۔ وہ ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ یہاں بیٹھیں۔ میں ابھی آئی۔“

وہ چلی گئی۔ اس نے چاروں طرف گھوم کر ڈرائنگ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں ایک دیوار پر کلپنا کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اس تصویر پر ٹک کر رہ گئیں۔ ایسی کشش کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی دل ربائی سے ہنس رہی تھی۔ نہ جانے اس انداز میں کیسا سحر تھا؟ وہ جب بھی ایسے ہنستی تھی تو دل اس کی طرف کھنچنے لگتا تھا۔

ان لمحوں میں بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ کھنچتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ ایک ہاتھ سے اسے چھو کر دیکھنے لگا۔ اسے کلپنا کی قربت یاد آنے لگی۔ وہ چند لمحوں کے لیے اس کی گرفت میں آئی تھی پھر نکل گئی تھی۔ لیکن جیسے سینے سے دل نکال کر لے گئی تھی۔

محبوب کے سینے میں ایسے جذبات اور احساسات پہلے کبھی نہیں تھے۔ نوجوانی کی یہ پہلی دستک تھی جو دل میں بج رہی تھی۔

پہلے کوئی لڑکی اس طرح آکر نہیں لگی تھی بلکہ وہ جا کر اس سے لگا تھا۔ عجیب سا تجربہ تھا کہ آگ سے لپٹ کر گلزار ہو رہا تھا۔

وہ سوچتے سوچتے ٹھٹک گیا۔ تصویر سے چند قدم پیچھے ہو کر دھڑکتے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنے لگا۔ ’میں کلپنا جی کے بارے میں ایسا کیوں سوچ رہا ہوں؟ کیوں اتنی

کشش محسوس کر رہا ہوں؟“

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”شاید اس لیے کہ زندگی میں پہلی بار پھول بدن کی نرمی گرمی اور اس کے گداز سے آگہی ملی ہے۔ جبکہ وہ ایک حادثاتی قربت تھی۔ مجھے اس حوالے سے زیادہ سوچنا نہیں چاہیے۔ یہ غلط بات ہے‘ میں نے اُن کی مدد کی ہے۔ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر لے آئی ہیں۔ مجھے ایسے خیالات سے پرہیز کرنا چاہیے۔‘

مگر پرہیز کیسے کیا جائے؟ کھلتے ہوئے پھول کی خوشبو تو نہ چاہتے ہوئے بھی سانسوں میں جذب ہوتی رہتی ہے۔ کیا وہ سانسیں لینا چھوڑ دیتا؟ سانس لینے سے انکار کرنا‘ گویا فنا کو گلے لگانا ہے۔ ان لمحات میں جانے کیوں ایسا ہی لگ رہا تھا کہ وہ گلے لگا چکا ہے اور فنا ہوتا جا رہا ہے۔

اپنی ذات سے دور اور اُس کی ذات میں محو ہوتا جا رہا ہے۔ اب اس سے نظریں نہیں چرا سکے گا۔ آنکھوں میں نور ہو تو نظاروں سے نظریں چرائی نہیں جاسکتیں۔

ایسے وقت کلپنا نے وہاں آتے ہوئے کہا۔ ”سوری، آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ بس تھوڑی دیر میں کھانا تیار ہو جائے گا۔ انیکسی کی صفائی ہو رہی ہے۔ کھانے کے بعد آپ اطمینان سے وہاں آرام کر سکیں گے۔ کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔“

”میرا خیال ہے‘ ڈسٹرب تو میں آپ کو کر رہا ہوں۔ آپ تھکی ہوئی آئی ہیں لیکن میری وجہ سے...“

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”ارے میں نے کون سا باہر جا کر پہاڑ توڑے ہیں۔ ایک کمرشل کی شوٹنگ کے لیے گئی تھی‘ وہ بھی حادثے کی نذر ہو گئی تو تھکن کیسی؟“

محبوب نے اس کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے دیکھنے کے بعد لگ رہا ہے‘ میں نے آپ کو اسکرین پر کہیں دیکھا ہے۔ بہت خوبصورت تصویر ہے۔“

”شکریہ...!“

پھر وہ ڈرائنگ روم کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے گھر میں بہت سناٹا ہے۔ میرا مطلب ہے‘ کوئی چہل پہل نہیں ہے۔ آپ کی فیملی...؟“

”میری فیملی نہیں ہے۔ صرف پاپا ہیں۔ وہ لندن میں رہتے ہیں۔ وہاں رہ کر یہاں سیاست کرتے ہیں۔ میں پہلے ان کے ساتھ لندن میں ہی رہتی تھی۔ پھر اپنے دیش کی کشش یہاں کھینچ لائی۔ اگر دو افراد کو فیملی کہا جاتا ہے تو اس چھوٹی سی فیملی کا بھی بٹوارا ہو گیا ہے۔“

”اور آپ کی والدہ...؟“

”اُن کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔ پاپا نے دوسری شادی نہیں کی۔ یوں میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔“

ایسے ہی وقت گھر کے کسی حصے سے ٹیلی فون کی گھنٹی چیخنے لگی۔ پھر چند لمحوں تک چیختے رہنے کے بعد چپ ہو گئی۔ محبوب نے کہا۔ ”تھوڑی دیر پہلے بھی ٹیلی فون بجتا رہا تھا۔“

”میں نے بتایا تھا نا کہ اب اخبار والے اور مختلف نیوز چینل والے پریشان کرتے رہیں گے۔ میں کسی کے سوالوں کا جواب دینا نہیں چاہتی اسی لیے اٹینڈ نہیں کر رہی ہوں۔“

وہ جواباً کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اسی وقت کال بیل سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم نے آکر کلپنا سے کہا۔ ”انسپکٹر سریش چوپڑا آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

وہ ذرا بیزاری سے بولی۔ ”اُس حادثے نے جان نہیں لی ہے مگر اب یہ لوگ میری جان کے پیچھے پڑ جائیں گے۔“

محبوب نے کہا۔ ”ممکن ہے‘ انہیں دشمن کا کوئی سراغ مل گیا ہو۔“

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”آپ کی اور ہماری پولیس کی صرف وردیوں میں فرق ہے لیکن کارکردگی ایک جیسی ہے۔ یہ لوگ صرف کارروائیاں کرتے ہیں‘ کارنامے نہیں دکھاتے۔“

پھر اس نے ملازم سے کہا۔ ”تم جاؤ اور انہیں اندر بھیج دو۔“

ملازم جانے لگا۔ کلپنا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”بلکہ رکو۔ انہیں لان میں بٹھاؤ۔ میں آتی ہوں۔“

ملازم نے باہر آکر انسپکٹر کو کلپنا کا پیغام دیا۔ وہ لان میں ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی کلپنا وہاں آگئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”سوری، آپ کو ڈسٹرب کر رہا ہوں۔ اصل میں تفتیش کچھ ادھوری تھی‘ اسی لیے آنا پڑا۔ آپ تو سمجھ ہی سکتی ہیں۔ کارروائی شروع کرنی ہے۔“

”جی میں سمجھ رہی ہوں۔“

”مجھے اُس پاکستانی نوجوان کے بارے میں پوچھنا تھا‘ وہ کہاں ہے؟ میرا مطلب ہے‘ وہ آپ کے ساتھ ائرپورٹ سے رخصت ہوا تھا۔“

”مجھے قتل کرنے کی سازش کی گئی ہے۔ کسی دشمن نے مجھ پر گولی چلائی ہے اور آپ اس اہم معاملے کو چھوڑ کر اس نوجوان کے بارے میں جاننے آئے ہیں؟“

”کیونکہ اُس کا اس معاملے سے گہرا تعلق ہے۔“

”اُس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”تو آپ نے اسے صرف لفٹ دی تھی؟“

”آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟“

”یہی کہ آپ نے اسے کہاں پہنچایا ہے؟“

”کیا وہاں جا کر تفتیش کریں گے؟“

”ہم نے کہاں جا کر کیا کرنا ہے‘ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ مجھے ہوٹل کا نام بتا دیں۔“

”تاکہ آپ ایک بے گناہ کے پیچھے پڑ جائیں۔ اس کی نیکی کو اس کے لیے عذاب بنا دیں۔ ہے نا...؟“

”آپ ناراض نہ ہوں۔ تفتیش کرنا ہماری مجبوری ہے اور پھر وہ پردیسی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پاکستانی ہے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتیں‘ یہ لوگ یہاں آکر کیسے کیسے کرائم کرتے ہیں۔ دیش کے امن و امان کے لیے ہمیں ان پر کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اس سے چند سوال کرنے ہیں اور بس...“

کلپنا نے سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ایک ملازم کو بلا کر کہا۔ ”ڈرائنگ روم میں جو صاحب بیٹھے ہیں‘ انہیں یہاں بھیج دو۔“

سریش چوپڑا بیٹھتے بیٹھتے ذرا ٹھٹک گیا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کو بلا رہی ہے؟ وہ اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تو اب شرمندگی ہو رہی ہے۔ وہ شخص یہاں کرکٹ میچ دیکھنے اور انجوائے کرنے آیا ہے اور ہم اسے کیسے سنگین معاملے میں الجھا رہے ہیں؟“

”الجھنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے...“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ سامنے سے محبوب خان آتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”یہ یہاں ہے؟“

وہ بولی۔ ”جی۔ ایک رات کے مہمان ہیں۔ کل ہوٹل میں شفٹ ہو جائیں گے۔“

اس نے قریب آکر انسپکٹر سے مصافحہ کیا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سریش نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ تمہارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے کہ تم کلپنا جی کے مہمان بن گئے ہو۔ لوگ تو ان کی ایک جھلک دیکھنے کو ترستے ہیں اور تم ان کے ساتھ پوری ایک رات گزارنے والے ہو۔“

”کیا آپ یہی بتانے آئے ہیں؟“

”نہیں۔ میں تو تفتیش کے لیے آیا تھا۔ لیکن اب دیکھ رہا ہوں‘ کلپنا جی تم پر اتنا اعتماد کر رہی ہیں۔ اپنے گھر لے آئی

ہیں۔ اب یہ ان کا پرسنل معاملہ ہو گیا ہے۔ میں تمہارے سلسلے میں اور کیا کہہ سکتا ہوں؟“

پھر وہ کلپنا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن پلیز... آپ ہم سے تعاون کریں۔ اُن لوگوں کے نام نوٹ کروائیں جن پر شبہ ہے کہ وہ آپ سے جان لیوا دشمنی کر سکتے ہیں۔“

”میں کسی کا نام نہیں لوں گی۔ آپ اپنے طور پر انکوائری کریں۔“

”بغیر کسی نام کے‘ کسی شک و شبہے کے ہم کیسے انکوائری کر سکتے ہیں؟ آپ کو ایف آئی آر تو درج کروانی ہی ہوگی۔“

”میں کوئی ایف آئی آر درج کروانا نہیں چاہتی۔“

”گویا قانون کی مدد لینا نہیں چاہتیں؟“

”یہی سمجھ لیں۔“

”معاملہ بہت گمبھیر ہے۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں‘ آپ اسے بہت معمولی سمجھ رہی ہیں۔“

اس نے ایسا کہتے ہوئے محبوب کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدگی سے سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ انسپکٹر نے کلپنا سے کہا۔ ”اگر آپ جیسی معزز شخصیات قانون سے تعاون نہیں کریں گی‘ دشمنوں کی نشاندہی کر کے انہیں ان کے بُرے انجام تک نہیں پہنچائیں گی تو...“

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”یہ قانون سے تعاون ہی ہے کہ میں بے وقت آپ سے ملاقات کر رہی ہوں۔ اپنے معزز مہمان کو تفتیش کے لیے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔“

”مگر کوئی بیان نہیں دے رہی ہیں۔ کسی کا نام نہیں لے رہی ہیں۔“

”میں بیان نہیں دوں گی‘ تب بھی صبح تک خبروں میں بہت کچھ آجائے گا۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے تو میں چلتا ہوں۔ ویسے آپ چاہیں تو میں آپ کے گھر کے باہر سیکیورٹی الرٹ کروا سکتا ہوں۔“

”تھینکس... اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سیکیورٹی کے لیے میرے گارڈز کافی ہیں۔“

اس نے محبوب خان کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”گارڈز کے معاملے میں آپ کی چوائس بہت زبردست ہے۔ ان کے سامنے تو بندوق سے نکلی گولی بھی ہار جاتی ہے۔“

محبوب خان نے جواباً کچھ نہ کہا۔ وہ مصافحہ کر کے

رخصت ہو گیا۔ کلپنا نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ ''میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ یہ بدھو آپ کو میرا کوئی خفیہ باڈی گارڈ سمجھ رہا ہے۔''

وہ بول کر مسکرانے لگی۔ مگر محبوب سنجیدہ تھا' کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ کلپنا نے پوچھا۔ ''آپ کو کیا ہوا؟ اتنے گم صم کیوں بیٹھے ہیں؟''

''آپ نے اپنی ضد پوری کر لی' مجھے اپنے گھر لے آئیں۔ لیکن میری مہمان نوازی آپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔''

''وہ کیسے...؟''

''کیا آپ نے محسوس نہیں کیا' میرے یہاں ایک رات رکنے کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے اس کا انداز کتنا بے ہودہ تھا؟ مجھے اس کا لہجہ' اس کی باتیں اچھی نہیں لگیں۔''

''کسی بات کا اثر نہ لیں۔ دنیا والوں کا کام ہے بولنا' انہیں بولنے دیں۔''

''مگر کسی کو کچھ بولنے کا موقع کیوں دیا جائے؟ اگرچہ آپ میری اپنی نہیں ہیں... پرائی ہیں' انجانی ہیں لیکن اپنے پرائے سے کیا ہوتا ہے؟ کسی بھی خاتون کی عزت اور اس کا وقار میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ میری وجہ سے آپ کی نیک نامی پر کوئی حرف بھی آئے۔''

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی' بڑی لگن سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر جیسے خیالوں سے چونک کر بولی۔ ''ویسے میں کسی کی پروا نہیں کرتی۔''

''لیکن مجھے آپ کی پروا ہے۔ پلیز... مجھے کسی ہوٹل میں جانے دیں۔''

''پروا ہے تو جانے کی باتیں نہ کریں اور انسپکٹر کی باتوں کو اتنی اہمیت نہ دیں۔ دراصل وہ میرے معاملے کو ہینڈل کر کے نام کمانا چاہتا ہے۔ میں میں کوئی بیان نہیں دے رہی ہوں' کسی دشمن کی نشاندہی کر کے ایف آئی درج نہیں کرائی ہے۔ اسی لیے وہ تلملا رہا ہے۔ خوامخواہ آپ کو اس معاملے میں الجھانا چاہتا تھا۔ لیکن اب اس کی تسلی ہو گئی ہے۔''

وہ تھوڑی دیر تک لان میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک ملازمہ نے آ کے بتایا کہ کھانا لگایا جا چکا ہے۔ وہ دونوں ڈائننگ ہال میں آ گئے۔

دوسری طرف یہ خبر ایس کے پجارا تک پہنچائی جا چکی تھی کہ محبوب خان کلپنا کے گھر میں ہے۔ وہ فون پر بولا۔ ''پہلے صرف شک تھا لیکن اب یقین ہو گیا ہے' کلپنا کا اس سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔ تم نے کہا تھا چو پڑا... آج تک کلپنا کا کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا... مگر اب آئے گا۔ وہ بھی ایک مسلمان کے ساتھ... اور سونے پہ سہاگا یہ کہ وہ پاکستانی ہے۔ یہ اسکینڈل صرف اس کے قدردانوں میں ہی نہیں' سیاستدانوں میں بھی ہلچل مچا دے گا۔''

ایک چھوٹی سی بات سے معاملات کیسے الجھنا اور بگڑنا شروع ہوتے ہیں' یہ پہلے معلوم نہیں ہوتا۔ پھر دھیرے دھیرے اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ کلپنا اپنے دشمنوں کے عزائم سے فی الحال ناواقف تھی۔

کھانے کے بعد محبوب انیکسی میں آ گیا۔ پھر موبائل نکال کر نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہونے پر چھوٹی بہن کی آواز سنائی دی۔ ''آپ کی فلائٹ تو دو گھنٹے پہلے وہاں پہنچ گئی تھی۔ پھر اتنی دیر بعد فون کیوں کر رہے ہیں؟ کہاں تھے؟ کب سے انتظار کر رہی تھی؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''جانتا ہوں۔ اسی لیے فرصت ملتے ہی فون کر رہا ہوں۔''

''پتا ہے' امی ابو اور بھائی بھابھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے ہیں۔ ایک میں ہی انتظار میں جل رہی تھی۔ اور وہ دیکھیں! دونوں کمروں کے دروازے کھل گئے ہیں۔ وہاں سے ں اور یہاں سے بھائی جان برآمد ہو رہے ہیں۔''

اسے ماں کی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ''کیا محبوب کا فون ہے؟ لا... مجھے بات کرنے دے...''

محبوب نے مسکرا کر بہن سے کہا۔ ''امی کو فون دے دو۔ ہم دونوں بعد میں اطمینان سے باتیں کریں گے۔''

اس نے فون ماں کو دے دیا۔ وہ ریسیور کو چوم کر بڑے جذبے سے بولی۔ ''کیسے ہو میرے بچے...؟ خیریت سے پہنچ گئے ہونا؟''

''جی امی! میں بالکل خیریت سے ہوں۔ بس آپ کی فکر تھی۔ مجھے گھر سے رخصت کرتے ہوئے بہت رو رہی تھیں اور لگتا ہے' اب بھی رو رہی ہیں؟''

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''نہ میری جان! میں رو نہیں رہی ہوں۔ تیری آواز سن کر خوش ہو رہی ہوں۔ تیرے بغیر یہ گھر تو سونا ہو گیا ہے۔ تو جلدی آئے گا نا؟''

باپ کی آواز سنائی دی۔ ''کیا کرتی ہو؟ آج تو وہ وہاں پہنچا ہے اور تم واپسی کی باتیں کر رہی ہو؟ لاؤ' فون مجھے دو۔''

''کیوں دوں؟ اتنی دیر بعد تو بیٹے کی آواز سن رہی ہوں۔ مجھے بات کرنے دیں۔''

''تم بات نہیں کر رہی ہو۔ آنسو بہا کر اسے پریشان کر رہی ہو۔''

''کوئی ماں اپنے بچے کو پریشان نہیں کرتی بلکہ اس کی پریشانیاں دور کرنے کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہے۔''

''ہاں۔ اسی لیے جائے نماز سے نہیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر اب تو اس کی خیریت کا فون آ گیا ہے۔ اس سے اچھی اچھی باتیں کرو۔ یہ رونا دھونا کس بات کا ہے؟''

محبوب نے کہا۔ ''ابو ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ روتی رہیں گی تو یہاں میرا دل نہیں لگے گا۔''

''تو اپنے شوق کی تکمیل کے لیے انڈیا گیا ہے۔ تیرا دل تو وہاں لگ ہی جائے گا۔ مگر تیرے آنے تک میرا جی یہاں نہیں لگے گا۔ میچ ختم ہوتے ہی آ جانا...''

باپ نے ریسیور اُچک کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری ماں ان باتوں سے باز نہیں آئے گی۔''

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ کر لو اپنی من مانی۔ میں بعد میں خود ہی نمبر ملا کر اپنے بیٹے سے جی بھر کر باتیں کروں گی۔ پہرے دار کی طرح سر پر کھڑے ہیں۔ ارے ماں ہوں' کیا اپنے بیٹے کی جدائی میں رو نہیں سکتی' کچھ بول نہیں سکتی؟''

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ بیٹی نے روکنا چاہا۔ وہ بولی۔ ''اس کی خیریت کے لیے نفل مانے تھے۔ پڑھنے جا رہی ہوں۔''

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ محبوب نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ نے امی کو ناراض کر دیا۔''

''تم انہیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ' کس ہوٹل میں ٹھہرے ہو؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ہوٹل میں نہیں ہوں۔ انیکسی میں ہوں۔''

''انیکسی میں...؟''

''جی... ایک چھوٹا سا حادثہ مجھے ائرپورٹ سے یہاں لے آیا ہے۔''

پھر وہ مختصراً اسے سارا واقعہ سنانے لگا۔ وہ اس کی باتیں سن کر بولا۔ ''یہ تم کیسے جھمیلے میں الجھ گئے ہو؟ تمہیں وہاں کسی کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''میرے سامنے کوئی ایک خاتون کو گولی مارنا چاہتا تھا' اس کی جان لینا چاہتا تھا تو کیا میں تماشائی بن کر تماشا دیکھتا رہتا؟''

''جان بچانے کا یا کسی کی مدد کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے گھر تک پہنچ جاؤ۔''

''میں آپ کو بتا چکا ہوں' کلپنا جی نے بے حد اصرار کیا تھا' اس لیے صرف ایک رات گزارنے یہاں آ گیا ہوں۔''

''اور تم بتا رہے ہو کہ انسپکٹر تمہیں ڈھونڈتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا تھا؟''

بڑے بیٹے نے ٹھٹک کر سوالیہ نظروں سے باپ کو دیکھا۔ دوسری طرف سے محبوب نے کہا۔ ''وہ معاملہ تو اب کلیئر ہو گیا ہے۔ وہ میری طرف سے مطمئن ہو کر گیا ہے۔''

باپ نے ذرا پریشانی سے بڑے بیٹے کو دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ ''تم پاکستان اور بھارت کے تعلقات کو اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ لوگ رائی کا پربت بنانے میں دیر نہیں کرتے۔ خدا کے لیے اُس لڑکی سے اور اس کے معاملات سے دور رہو۔ اس گھر سے نکلو اور کسی ہوٹل میں جا کر کمرا لو۔''

''اب تو صبح ہی جا سکوں گا۔''

بڑے بیٹے نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''آخر بات کیا ہے ابو؟ محبوب وہاں خیریت سے تو ہے نا؟''

اس نے ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی بتاتا ہوں۔''

پھر فون پر کہا۔ ''صبح زیادہ سے زیادہ دس گیارہ بجے تک مجھے فون کر کے بتاؤ کہ کس ہوٹل میں کمرا لیا ہے؟ رات گزارنے کا مطلب' صرف رات ہی ہونی چاہیے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی وہاں سے نکلو۔ ورنہ میں تمہیں واپس بلا لوں گا اور تمہیں باپ کا حکم ماننا پڑے گا۔''

''وانکھیڑے اسٹیڈیم میں پاک بھارت میچ دیکھنے کا خواب پورا ہونے والا ہے۔ میں تعبیر کے اتنے قریب پہنچنے کے بعد ایسا سنہری موقع گنوانا نہیں چاہوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

باپ نے ذرا مطمئن ہو کر ریسیور بڑے بیٹے کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''کیا بات ہے محبوب؟ کیا تم وہاں کسی پریشانی میں گھر گئے ہو؟''

''نہیں بھائی جان! کوئی پریشانی نہیں ہے۔ ابو آپ کو تفصیل سے بتائیں گے تو ساری بات سمجھ میں آ جائے گی۔''

دونوں بھائیوں کے درمیان تھوڑی دیر تک باتیں ہوئیں۔ پھر ریسیور بہن کے ہاتھ میں آ گیا۔ وہ جلدی جان چھوڑنے والی نہیں تھی۔ لیکن بھائی کی سفری تھکن کا خیال تھا۔ لہٰذا تھوڑی دیر تک باتیں کرنے کے بعد ان کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

☆☆☆

دوسری صبح تھکن کے باوجود وہ جلد ہی بیدار ہوگیا۔ باپ کی طرف سے ملنے والی مہلت سے پہلے ہی کلپنا کے گھر سے نکل جانا چاہتا تھا۔ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ والد صاحب اپنی دھمکی پر عمل درآمد کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ واپس بلائیں گے تو اسے ہر حال میں ان کی بات ماننی پڑے گی۔

وہ فریش ہوکر واش روم سے باہر آیا تو بیڈ کے سرہانے والی میز پر جوس کے گلاس کے ساتھ انگریزی اخبار رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر سرسری انداز میں دیکھنے لگا۔ اسے خبروں سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اسپورٹس نیوز کا صفحہ تلاش کرنے لگا۔ مگر دو صفحات پلٹتے ہی ٹھٹک گیا۔ وہاں کلپنا کی تصویر کے ساتھ کل رات کے واقعے کی خبر شائع کی گئی تھی۔ یہ ایک متوقع بات تھی۔ سپر ماڈل کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا' اسے خبر تو بننا ہی تھا۔ مگر ٹھٹکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تصویر کے ساتھ ہی محبوب خان کی تصویر بھی شائع کی گئی تھی۔

وہ خبر کی تفصیلات پڑھنے لگا۔ الف سے یے تک پورا واقعہ بیان کیا گیا تھا۔ لیکن آخری پیراگراف نے محبوب خان کو الجھا دیا۔ وہاں لکھا تھا۔ ''کلپنا جی اپنے پاکستانی محسن کو مہمان بنا کر اپنے گھر لے گئی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ مہمان نوازی کتنے دنوں تک جاری رہے گی؟ یہ خیال بھی قائم کیا جارہا ہے کہ وہ پاکستانی نوجوان ان کا کوئی خفیہ باڈی گارڈ ہوسکتا ہے۔ اس خیال کے پیچھے کئی سوالات جنم لیتے ہیں۔ کیا ہمارے دیش میں جان پر کھیل جانے والے انگ رکھشک جیالوں کی کمی ہے؟ اگر نہیں ہے تو کلپنا جی نے پڑوسی ملک کے شخص کو باڈی گارڈ کیوں بنایا؟

''وہ پاک بھارت کرکٹ سیریز دیکھنے کے لیے انڈیا آیا ہے اور خود بھی کرکٹر ہے۔ انڈر نائنٹین میں کھیلتا ہے۔ جلد ہی اپنے ملک کی ٹیم میں شامل ہونے والا ہے اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ کلپنا جی کرکٹ کی دیوانی ہیں۔

''ان کڑیوں کو ملانے سے کلپنا جی کے ایکسیڈنٹ کا معاملہ کچھ الجھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ حادثہ اتفاقی تھا۔ مگر اس پاکستانی نوجوان کی بروقت آمد اتفاقی نہیں تھی۔ سچ اور جھوٹ کا پردہ نہیں اٹھ رہا ہے کیونکہ کلپنا جی کوئی بھی بیان دینے سے صاف انکار کررہی ہیں۔ ہماری نیوز ٹیم اور دیگر چینلز کے افراد انٹرویو لینے ان کے گھر گئے تھے۔ مگر انہوں نے کسی کا سامنا نہیں کیا۔ حتیٰ کہ قانون سے بھی تعاون نہیں کیا۔ شاید کلپنا جی اپنے مہمان کی مہمان نوازی میں بہت مصروف ہیں۔ ایسے تمام حقائق بہت کچھ سوچنے پر مجبور کررہے ہیں۔''

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہاں اس کی پاسپورٹ والی تصویر کو اِن لارج کرکے شائع کیا گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کلپنا کے حادثے والے معاملے کو اس انداز سے پیش کیا جائے گا؟ بات کا بتنگڑ بنایا جارہا تھا۔

اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ایسے وقت ایک ملازم نے وہاں آکر پوچھا۔ ''ناشتا یہیں کریں گے یا ڈائننگ ہال میں آئیں گے؟''

اس نے پوچھا۔ ''میڈم جاگ گئی ہیں؟''

''جی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں ہیں۔''

''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟''

''انہوں نے کہا ہے' اگر آپ ڈائننگ ہال میں آنا چاہیں گے تو وہ آپ کے ساتھ ہی ناشتا کریں گی۔''

''ٹھیک ہے' تم جاؤ۔ میں چینج کرکے آتا ہوں۔''

ملازم چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیار ہوکر ڈائننگ ہال میں پہنچا تو کلپنا میز پر اس کی منتظر تھی۔ سادگی میں تو اور بھی پُرکشش لگ رہی تھی۔ وہ دھلی دھلائی' نکھری نکھری سی تھی۔ مگر چہرے پر تھکن کے آثار نمایاں تھے جیسے رات کو ٹھیک سے سو نہ پائی ہو۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''گڈ مارننگ...!''

محبوب خان نے ''مارننگ'' کہہ کر وہ اخباری صفحہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی ضد نے دیکھیں کیا کیا ہے؟''

وہ اخبار پڑھ چکی تھی۔ اس صفحے کو ایک طرف کرتے ہوئے بولی۔ ''میری ضد...؟''

''ہاں۔ اگر آپ مجھے لفٹ نہ دیتیں' یہاں نہ لاتیں اور کسی ہوٹل میں جانے دیتیں تو ان لوگوں کو ایسی الٹی سیدھی خبر شائع کرنے کا موقع نہ ملتا۔''

کلپنا نے ایک گہری سانس لے کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ محبوب نے پوچھا۔ ''کیا رات کو پریس والے آئے تھے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں... لیکن میں نے ملاقات نہیں کی۔''

''آپ کا یہ طریقۂ کار سراسر غلط ہے۔ آپ نے پولیس والوں سے تعاون نہیں کیا۔ کم از کم پریس والوں سے تو ملاقات کرنی چاہیے تھی۔ آپ کی خاموشی سب ہی کو شکوک و شبہات میں مبتلا کررہی ہے۔''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اس معاملے کو اس طرح اُچھالیں گے۔ معاملے کا تمام رُخ آپ کی طرف موڑا

جارہا ہے۔''

''مجھے تو اس بات پر شدید حیرت ہورہی ہے کہ انہوں نے راتوں رات میرے بارے میں یہ تمام معلومات کیسے حاصل کرلیں؟''

''یقیناً آپ کے سلسلے میں اچھی خاصی چھان بین کی گئی ہوگی۔''

وہ دونوں ذرا دیر چپ رہے پھر کلپنا نے کہا۔ ''دو گھنٹے بعد میں نے پریس کانفرنس کال کی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ میں کیسا انکشاف کرتی ہوں؟ یہ لوگ چاہتے ہیں' میں دشمن کی نشاندہی کروں تو کروں گی۔ پھر دیکھوں گی' کیا کارروائی کی جائے گی؟''

وہ کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں پندرہ بیس منٹ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا پھر دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میرا خیال ہے' آپ ڈر گئے۔''

''ہاں۔ میں ڈر گیا ہوں۔ ڈر گیا ہوں آپ کی بدنامی سے... آپ نے باتوں باتوں میں ذکر کیا تھا کہ آج تک آپ کا کوئی اسکینڈل نہیں بنا۔ اور آج یہ لوگ آپ کو مشتبہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ الٹے سیدھے سوالات جنم لے رہے ہیں۔ میرے اور آپ کے بارے میں معنی خیز باتیں کی جارہی ہیں۔ کیا آپ کو بُرا نہیں لگ رہا ہے؟ آپ کی صاف ستھری پروفیشنل لائف کو داغ دار کیا جارہا ہے۔''

وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔ ''ہم جس سے ہاتھ ملاتے ہیں' جسے اپنا دوست مانتے ہیں تو اس کی عزت کو بھی اپنی عزت سمجھتے ہیں۔ آپ بہت اچھی ہیں۔ یقین جانیں' اس اجنبی ملک کے اجنبی لوگوں میں آپ مجھے اپنی اپنی سی لگی ہیں۔ اور اپنوں کی عزت پر کوئی حرف آئے تو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ رات انسپکٹر کی باتوں نے ہی سمجھا دیا تھا کہ میرا آپ کے ساتھ رہنا مناسب نہیں ہے۔ لیکن پھر آپ نے اطمینان دلایا کہ ایسا کچھ ہونے والا نہیں ہے۔''

وہ بڑی توجہ سے اسے دیکھ رہی تھی' سن رہی تھی۔ ان لمحوں میں جیسے دنیا کی تمام آوازیں ختم ہوگئی تھیں۔ بس وہ سنائی دے رہا تھا۔ جی چاہتا تھا' وہ بولتا رہے۔ اس کے بارے میں بہت کچھ بولتا رہے اور وہ اسی طرح سنتی رہے۔ وہ اس کے لیے فکرمند تھا' اس کی بدنامی پر جھنجلا رہا تھا۔ اسے بڑی اپنائیت سے اپنا کہہ رہا تھا۔

وہ اسے سنتے ہوئے خود کو ٹٹول رہی تھی۔ اس نے جس راستے پر چل کر اپنی نیک نامی کو بحال رکھتے ہوئے شوبزنس کی فیلڈ میں نام کمایا تھا' اسے محبوب خان کے نام کے ساتھ بدنام کیا جارہا تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ کلپنا کو وہ صدمہ نہیں پہنچ رہا تھا جو پہنچنا چاہیے تھا۔

وہ سوچتے سوچتے چونک گئی۔ محبوب ٹیبل کو دستک دینے کے انداز میں بجاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ''آپ سن رہی ہیں نا' میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں' سن رہی ہوں۔ ٹھیک ہے' آپ اپنا سامان پیک کریں۔ میری گاڑی آپ کو کسی بھی ہوٹل تک پہنچا دے گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔''

''میں آپ کی بات مان رہی ہوں' زبردستی روک نہیں رہی۔ اس لیے آپ کو بھی میری بات ماننی پڑے گی۔ سامان پیک کریں۔ میں ملازم کو کہتی ہوں' وہ اسے گاڑی میں رکھ دے گا۔''

وہ کچھ بولنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت کلپنا کے موبائل فون نے مخاطب کیا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ایکسکیوزمی! ڈیڈ کال کررہے ہیں۔ سی یو لیٹر...''

وہ کال اٹینڈ کرکے باپ سے باتیں کرتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر ذرا چونک گیا۔ فوراً ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا انیکسی میں آیا۔ پھر چارجر سے لگے ہوئے فون کو اٹھا کر زیرِلب بڑبڑایا۔ ''اسے تو آن کرنا ہی بھول گیا۔''

اس نے فون کو آن کرکے ایک طرف رکھا۔ پھر ضرورت کے لیے جو سامان نکالا تھا' اسے بیگ میں رکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ایک ملازم وہاں آکر اس کا سامان لے گیا۔ محبوب خان انیکسی سے نکل کر کوٹھی کے اندرونی حصے کی طرف جانے لگا پھر ایک ملازمہ سے کہا۔ ''مجھے میڈم سے ملنا ہے۔''

وہ بولی۔ ''وہ اندر نہیں ہیں' اپنی گاڑی میں ہیں۔''

محبوب خان پورچ کی طرف آیا۔ ملازم ڈکی میں سامان رکھ رہا تھا اور کلپنا اسٹیئرنگ سیٹ پر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گاڑی کے قریب آکر تعجب سے بولا۔ ''آپ یہاں...؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''ہاں... کیوں؟ میں یہاں نہیں ہوسکتی؟ گھبرائیں نہیں۔ ڈرائیونگ جانتی ہوں' اسی لیے اسٹیئرنگ سنبھالا ہے۔ آپ اندر تو آکر بیٹھیں۔''

وہ دوسری طرف سے آکر اس کے برابر والی سیٹ پر

بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن میں ڈرائیور کے ساتھ جاسکتا تھا۔ دو گھنٹے بعد آپ کی پریس کانفرنس ہے۔ آپ کو گھر پر رہنا چاہیے۔“

وہ مسکرا کر کار اسٹارٹ کر کے اسے آگے بڑھاتے ہوئے احاطے سے باہر آگئی پھر بولی۔ ”ڈرائیور نے آج چھٹی کی ہے۔“

”آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں ٹیکسی سے چلا جاتا۔“

وہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ مگر آپ سے کہہ چکی تھی کہ میری گاڑی میں جائیں گے۔ اس لیے خود ہی ڈرائیور بن گئی۔“

وہ بول کر مسکرانے لگی۔ محبوب نے کہا۔ ”پلیز کلپنا جی! مجھے مین روڈ پر اتار دیں۔ میں ٹیکسی رکشا سے چلا جاؤں گا۔ آپ میری وجہ سے کوئی تکلیف نہ اٹھائیں۔“

”میں گھر سے نکل چکی ہوں، اب تو آپ کو منزل تک پہنچا کر ہی دم لوں گی۔“

”میڈیا والے آپ کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کوئی دیکھ لے گا تو اس بات کو بھی اشتہار بنا دے گا۔ کم از کم آپ کو ان حالات میں تو احتیاط برتنی چاہیے۔“

”آپ دیکھ رہے ہیں، میری گاڑی کے شیشے کلرڈ ہیں۔ پھر بھی یہ پریس، میڈیا کے لوگ قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ کہیں سے بھی کوئی بھی تاڑ سکتا ہے۔ لیکن مجھے پروا نہیں ہے۔ میں نے آپ کو اپنا مہمان بنایا ہے۔ مہمان داری سے باز نہیں آؤں گی۔“

پھر وہ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے اپنا موبائل فون تھام کر بولی۔ ”چھوڑیں ان باتوں کو... اپنا نمبر بولیں۔“

”میرا نمبر...؟“

”اصولاً تو آپ کو میرا نمبر مانگنا چاہیے تھا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی الٹی گنگا بھی بہتی ہے۔ جلدی بولیں۔ میں اپنے پاس سیو کروں گی۔“

اس نے اپنا موبائل نمبر بتایا۔ وہ اسے سیو کر کے ڈائل کرتے ہوئے بولی۔ ”میں مس کال کر رہی ہوں۔ میرا نمبر سیو کرلیں۔“

چند لمحوں بعد ہی محبوب کے فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو گھر سے فون ہے۔“

وہ اسے کان سے لگا کر بولا۔ ”ہیلو...!“

دوسری طرف سے باپ کی آواز سنائی دی۔ ”کہاں ہو تم؟“

وہ سلام کرنے کے بعد بولا۔ ”میں راستے میں ہوں۔ ابھی ہوٹل پہنچتے ہی آپ سے رابطہ کروں گا۔“

”اچھی بات ہے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔“

اس نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ ایسے ہی وقت دوبارہ ٹون سنائی دی۔ اجنبی نمبر سے کال تھی۔ کلپنا نے کہا۔ ”یہ میرا نمبر ہے۔“

محبوب خان نے اسے کلپنا کے نام سے سیو کرلیا۔ پھر ذرا ہچکچا کر کہا۔ ”میں نے نمبر تو محفوظ کرلیا ہے لیکن آپ کی نیک نامی کی خاطر چاہوں گا کہ ہم ایک دوسرے سے رابطہ نہ رکھیں۔“

”کس کو کس سے ملنا ہے، کس سے بچھڑنا ہے اور کس سے ملتے رہنا ہے؟ یہ سب تو اوپر والا طے کرتا ہے۔ اسی نے ہمیں ملایا ہے۔ ہم سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک دوسرے کے جیون میں نہیں آئے۔ اوپر والے نے راہیں ہموار کی ہیں۔ اسے منظور ہوگا تو آئندہ بھی ملنے کے راستے ہموار کرتا رہے گا۔“

وہ قائل ہونے کے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔ کلپنا نے پوچھا۔ ”کیا آپ اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ اوپر والا جو کرتا ہے، اچھے کے لیے کرتا ہے؟“

”بے شک۔ اس حقیقت پر تو ایمان کی حد تک یقین رکھتا ہوں۔“

”تو پھر اچھے کو اچھا جانو۔ انسان کی سوچ مثبت ہو تو زندگی کی ہر ادا، ہر رنگ اچھا لگتا ہے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولی۔ ”میں کہتی ہوں، ہمیں دنیا والوں سے نہیں، صرف اوپر والے سے ڈرنا چاہیے۔ انسان کے اختیار میں اگر کچھ ہوتا تو مجھ سے دشمنی کرنے والے کل میری سانسیں چھین چکے ہوتے۔ لیکن اوپر والے نے نہیں چاہا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ میری سانسیں بچانے کے لیے آپ کو وسیلہ بنا کر بھیج دیا۔“

”آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔“

”میرا یہی ماننا ہے۔ ایشور چاہے گا تو باڈی گارڈز کی بھیڑ میں بھی مجھے اپنے پاس بلا لے گا۔“

وہ قائل کر دینے والی باتیں کر رہی تھی۔ اس کی ایک ایک بات دل میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کلپنا نے گاڑی کو ایک ہوٹل کے سامنے روکتے ہوئے کہا۔ ”یہ فائیو اسٹار ہے۔ وانکھیڑے اسٹیڈیم سے بھی نزدیک ہے اور

میرے گھر سے بھی... آپ جا کر روم وغیرہ دیکھ لیں۔ میں یہاں انتظار کروں گی۔ پسند نہ آئے تو کہیں اور چلیں گے۔“

”نہیں۔ اب آپ کوئی تکلیف نہ کریں۔ میں یہیں اسٹے کروں گا۔“

وہ اس سے رخصت ہو کر اپنا سامان لے کر ہوٹل کی عمارت کی طرف جانے لگا۔ کلپنا اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

محبوب خان کو اپنے روم میں آئے پندرہ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ فون پر اپنے والد سے باتوں میں مصروف تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ کس ہوٹل میں رہائش اختیار کی ہے؟ باپ مطمئن ہو گیا تھا اور ادھر محبوب اس بات پر مطمئن ہو رہا تھا کہ گھر والوں کو کلپنا کے اور اس کے اسکینڈل کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہے۔ وہ دیارِ غیر میں تھا، یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہاں کی الٹی سیدھی خبریں ان کے کانوں تک پہنچیں اور باپ پریشان ہو کر فوراً ہی اسے واپسی کا حکم سنا دے۔ اس نے سوچ لیا تھا، کرکٹ سیریز ختم ہوتے ہی اپنے ملک روانہ ہو جائے گا۔

دستک دوبارہ سنائی دی۔ اس نے فون بند کر کے دروازہ کھولا تو ایک دم سے چونک گیا۔ کھلے ہوئے دروازے پر انسپکٹر سریش چوپڑا دکھائی دے رہا تھا۔ محبوب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ یہاں...؟“

”یہی سمجھانے آیا ہوں کہ میں کہیں بھی پہنچ سکتا ہوں۔“

”کیا آپ میرا پیچھا کر رہے تھے؟“

”معاملہ اچھوتا اور حیرت انگیز ہو تو اس کی گہرائی تک پہنچنے کا تجسس رہتا ہے۔ بہت تعجب ہوا یہ دیکھ کر کہ کلپنا جی ڈرائیور بن کر تمہیں یہاں تک پہنچانے آئی تھیں۔“

”اوہ... تو آپ واقعی میرا پیچھا کر رہے تھے۔“

”جب تک سچائی معلوم نہیں ہوگی، تب تک پیچھے پڑا رہوں گا۔“

”آپ خوامخواہ اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔“

”میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں۔“

”کلپنا جی کے کسی دشمن کو چھوڑ کر میرے پیچھے پڑے ہیں، یہ کیسی ڈیوٹی ہے؟“

”یہی تو جاننا ہے کہ دشمن کون ہے؟“

”اس معلومات کے لیے میڈم کے پاس جائیں۔ وہ آج پریس کانفرنس میں کوئی انکشاف کرنے والی ہیں۔ ممکن ہے، کسی دشمن کی نشاندہی کریں۔ لیکن میرا اُن کے کسی بھی معاملے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ پلیز، مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔ میں یہاں کھیل انجوائے کرنے آیا ہوں اور آپ دیکھیں گے کہ کرکٹ سیریز ختم ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔“

”اخباروں میں اور نیوز چینل پر کلپنا جی کے ساتھ تمہارا نام آرہا ہے۔ تم تو یہاں قدم رکھتے ہی خبر بن گئے ہو۔“

”اسے میں خبر نہیں، افواہ کہوں گا اور افواہیں پانی کے بلبلے جیسی ہوتی ہیں۔“

”دیکھتے ہیں، تمہارا بلبلہ کب پھوٹتا ہے؟ اب میں چلتا ہوں۔ مگر آتا جاتا رہوں گا۔“

محبوب نے جواباً کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ انسپکٹر سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پولیس اپنے وطن کی ہو یا پرائے ملک کی، بات کا بتنگڑ بنانے اور معمولی سے معاملے کو الجھا کر بڑا مسئلہ بنانے میں دیر نہیں کرتی۔ اس نے سوچ لیا تھا، اسی طرح حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے کلپنا کے معاملات سے لاتعلق ہوتا چلا جائے گا تو تمام تر افواہیں دم توڑ دیں گی۔

اس نے انڈیا کے تاریخی اور اہم مقامات پر جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ آگرہ جا کر تاج محل کی شان و شوکت بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر ماں نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ کہیں جائے یا نہ جائے، خواجہ صاحب کے دربار پر حاضری دینے ضرور جائے۔ اس نے سوچا تھا، تین دنوں تک میچ انجوائے کرنے کے بعد آرام سے انڈیا گھومے گا۔ مگر اب حالات سمجھا رہے تھے کہ سیریز ختم ہوتے ہی وہاں سے کوچ کر جانا بہتر ہوگا اور وہ یہی کرنے والا تھا۔

مگر فی الحال میچ شروع ہونے تک وہ ہوٹل کے کمرے میں قیدی بن کر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے سوچا تھا، لنچ کے بعد کہیں باہر نکلے گا۔ اس نے ٹی وی آن کیا۔ کلپنا کی پریس کانفرنس سننے کی بے چینی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد وہ ایک نیوز چینل پر دکھائی دی۔ کل رات کا واقعہ بیان کرتے ہوئے محبوب خان کے بارے میں بہت کچھ بول رہی تھی۔ یہ واضح کر رہی تھی کہ اس محسن کے بارے میں غلط افواہیں پھیلا کر لوگوں کا دھیان بانٹنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور ایسا یقیناً اس کا دشمن ہی کر رہا ہوگا۔

ایک صحافی نے سوال اٹھایا۔ ”سب یہی جاننا چاہتے ہیں کہ وہ دشمن کون ہو سکتا ہے جس نے آپ کی جان لینا چاہی؟“

وہ بولی۔ ”اس سوال کا جواب صرف ایک نام ہے۔

لیکن میں وہ نام ابھی نہیں لوں گی۔“
”کیا آپ دشمن کو پوشیدہ رکھنا چاہتی ہیں؟“
”ہرگز نہیں... مگر اس نام کو زبان پر لانے سے پہلے آپ سے اور اپنے دیش کی پولیس سے پوچھنا چاہتی ہوں... یہ سند لینا چاہتی ہوں کہ کیا میرے دشمن کے بارے میں جانتے ہی آپ لوگ اسے گرفتار کرسکیں گے؟ گرفتاری نہ سہی اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرسکیں گے؟“
”شرپسند عناصر کو ان کے بُرے انجام تک پہنچانا پولیس کا کام ہے۔ اس سلسلے میں میڈیا بھی تعاون کرے گا۔ دشمن کوئی بھی ہو اس کے خلاف ایکشن ضرور لیا جائے گا۔ آپ ہمارے دیش کا قیمتی سرمایہ ہیں، آپ کی حفاظت ہر حال میں ضروری ہے۔“
وہ مسکرا کر بولی۔ ”اور میرا دشمن اس دیش کے لیے مجھ سے بھی زیادہ ضروری ہے۔“
”مگر ہے تو شرپسند... اسے سزا ضرور ملے گی۔ آپ نام بتائیں؟“
”سوچ لیں! آپ کے یہ وعدے، یہ دعوے ساری جنتا سن بھی رہی ہے اور دیکھ بھی رہی ہے۔“
اس نے جیسے حاضرین کے تجسس کو بھڑکا دیا تھا۔ گھروں میں بیٹھ کر دیکھنے والے ناظرین بھی اس دشمن کا نام سننے کے لیے بے چین ہوگئے تھے۔ محبوب خان بھی متجسس تھا۔
کلپنا چند لمحوں تک خاموش رہی۔ پھر بڑی ہی نفرت سے بولی۔ ”میرے اس دشمن کا نام ایس کے پجارا ہے۔“
اس نے نام نہیں لیا تھا جیسے دھماکا کیا تھا۔ حاضرین ایک دم سے ٹھٹک کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اُدھر ایس کے پجارا اچھل کر رہ گیا۔ غصے سے ریموٹ کنٹرول کو ایک طرف پھینکتے ہوئے زیرِلب بڑبڑایا۔ ”اس کتیا کی ہمت تو دیکھو... کھلے عام میرا نام لے رہی ہے۔ لوگوں کو میرے خلاف بھڑکانا چاہتی ہے۔“
اِدھر ایک صحافی نے کہا۔ ”مسٹر ایس کے پجارا کا نام بہت بڑا ہے۔ وہ ہمارے دیش کی معزز شخصیت ہیں۔ اس ملک کی بزنس کمیونٹی میں ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں۔ مشہور و معروف سیاستدان بھی ہیں۔ وہ آپ کی جان کیوں لینا چاہیں گے؟“
”بڑے نام ہی بڑے بڑے کام کرتے ہیں۔ میں نے کہا تھا نا، میرا دشمن اس دیش کے لیے مجھ سے بھی زیادہ ضروری اور اہم ہے۔“
ایک اور صحافی نے سوال اٹھایا۔ ”کوئی بھی شخص ثبوت کے بغیر کسی دوسرے پر الزام نہیں لگا سکتا۔ آپ کے پاس اپنی سچائی ثابت کرنے کا کیا ثبوت ہے؟“
وہ بولی۔ ”ثبوت تو اس بات کا بھی کوئی نہیں تھا کہ وہ پاکستانی نوجوان میرا مہمان ہے۔ مگر دوسری صبح اخبارات نے بے بنیاد خبریں شائع کرتے ہوئے اسے نہ صرف میرا مہمان بنا دیا بلکہ اسے میرا خفیہ باڈی گارڈ بھی کہا گیا۔ میں چونکہ کرکٹ کی دلدادہ ہوں اور وہ انڈر نائنٹین کا کھلاڑی ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے بھی اسکینڈل بنایا گیا۔ کیا آپ لوگوں نے یہ تمام خبریں شائع کرنے سے پہلے کوئی ثبوت حاصل کیا تھا؟ یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ حقیقت کیا ہے؟“
”حقیقت جاننے کے لیے ہم آپ کے دروازے پر گئے تھے۔ مگر آپ نے ملاقات سے انکار کردیا تھا۔“
وہ بولی۔ ”انکار کردیا تھا، اس لیے جو جی میں آیا وہ چھاپ دیا؟ پہلے میں خاموشی سے صورتِ حال کا جائزہ لے رہی تھی، سوچ سمجھ رہی تھی کہ مجھے اپنے دشمن کے سلسلے میں کیا کرنا ہے؟ اب میں نہ صرف ایس کے پجارا کے خلاف بلکہ نیوز پرنٹ میڈیا کی ان نامور شخصیات کے خلاف بھی قانونی کارروائی کروں گی جنہوں نے میرے بارے میں ایسی بے بنیاد خبریں شائع کی ہیں۔“
وہاں کی ایک نامی گرامی نیوز ایجنسی کے ایجنٹ نے کہا۔ ”خبریں بالکل ہی بے بنیاد نہیں ہیں۔ بے شک، محبوب خان آپ کا مہمان نہیں تھا۔ مگر تب تک، جب تک آپ اسے اپنا محسن مان کر اپنے گھر نہیں لے گئی تھیں۔ کم از کم اتنی خبر تو جھوٹ نہیں ہے کہ کل رات اس نے آپ کے گھر میں گزاری اور پھر آج صبح آپ نے خود اسے ایک ہوٹل میں پہنچایا۔“
”یہ سو فیصد درست خبر ہے۔ مگر جس طرح جنتا کے سامنے پیش کی جا رہی ہے، وہ طریقہ اور انداز سراسر غلط ہے۔“
ایک اور صحافی نے کہا۔ ”فی الوقت اس پاکستانی نوجوان کے معاملے کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم آپ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ مسٹر ایس کے پجارا کا نام کس بنیاد پر لے رہی ہیں؟ کوئی ٹھوس ثبوت آپ کے پاس ہے؟“
”ثبوت بھی بہت جلد پیش کروں گی۔“
ایک اور نے کہا۔ ”اگلے ماہ الیکشن ہونے والے ہیں۔ آپ کے فادر مسٹر میش مکرجی پردیس میں بیٹھ کر یہاں اپنی پارٹی کو سپورٹ کرتے ہیں۔ اس بار بھی وہ الیکشن لڑ رہے ہیں اور یہ سب ہی جانتے ہیں کہ مسٹر ایس کے پجارا اپوزیشن

میں ہیں۔ سیاست کے میدان میں سب ہی ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔ کہیں الیکشن کے دور میں آپ کا یہ بیان سیاسی دشمنی کا شاخسانہ تو نہیں ہے؟“
وہ بولی۔ ”میں جانتی تھی، ایس کے پجارا کا نام سنتے ہی ایسا ردِعمل سامنے آئے گا اسی لیے خاموش تھی۔ کوئی بھی بیان دینے سے کترا رہی تھی مگر حقیقت یہی ہے کہ کل رات مجھ پر جان لیوا حملہ ایس کے پجارا نے ہی کرایا ہے۔“
ایک صحافی نے کہا۔ ”میڈم! کیا آپ اس دشمنی کا بیک گراؤنڈ واضح کرنا چاہیں گی؟“
دوسرے نے کہا۔ ”شک ایک الگ بات ہے مگر آپ تو پورے یقین سے ایس کے پجارا کا نام لے رہی ہیں۔ پلیز! اس یقین کی وجوہات کو کھل کر بیان کریں۔“
صحافیوں کی طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ وہ جوابات دیتے ہوئے انہیں بتانے لگی کہ ایس کے پجارا نے دشمنی کی شروعات کب اور کن حالات میں کی؟
دوسری طرف ایس کے پجارا غصے سے سلگ رہا تھا۔ ایسے وقت موبائل فون نے اسے پکارا۔ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ اس نے ٹی وی کا والیم بند کرتے ہوئے فون کو کان سے لگایا۔
”ہیلو... ایس کے پجارا بول رہا ہوں۔“
دوسری طرف سے بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ”میرا خیال ہے، مجھے نام بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ آواز سے پہچان رہے ہوگے؟“
وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں دشمنوں کے لب و لہجے کو خوب یاد رکھتا ہوں مسٹر میش مکرجی...!“
”ہم دشمن نہیں تھے، ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ دشمنی کی ابتدا تم نے کی ہے۔“
”اور انتہا بھی میں ہی کروں گا۔“
”ہاں، کیوں نہیں۔ کسی بھی فلم کا کلائمیکس ایک ولن اپنی موت سے یا پھر اپنے بُرے انجام سے ہی کرتا ہے۔“
وہ اسکرین پر کلپنا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ تو وقت بتائے گا کہ کون ہیرو ہے اور کون زیرو ہے؟ فی الحال تمہاری کم ظرفی دیکھ رہا ہوں، بیٹی کو مہرہ بنا کر چال چل رہے ہو۔“
”یہ نہ دیکھو، کیسی چال چل رہا ہوں... یہ دیکھو، کس وقت چل رہا ہوں؟ اور یہ بھی سمجھو کہ اتنا شاندار موقع تم نے خود ہی مجھے دیا ہے۔ الیکشن کے سیزن میں پھونک پھونک کر قدم رکھے جاتے ہیں۔ یہ تمہاری بدبختی ہے کہ میری بیٹی سے دشمنی کرنے کے لیے تمہیں یہی وقت ملا تھا۔“
”نشانہ ایک بار ہی خطا ہوتا ہے۔ میری عارضی ناکامی

کو اپنی کامیابی سمجھنے کی بھول نہ کرنا۔ تمہاری بیٹی کی قسمت اچھی تھی لیکن ہمیشہ اچھی نہیں رہے گی۔ وہ سنا تو ہوگا کہ سو دن چور کے اور ایک دن شاہ کا...''

وہ ایک ذرا ہنس کر بولا۔ ''کیا تم سمجھ رہے ہو، تم سے جو خطا ہو چکی ہے، وہ تمہاری کامیاب زندگی کے خطوط بگاڑ سکتی ہے؟''

''میں اتنا کمزور نہیں ہوں کہ کسی کے بگاڑنے سے بگڑ جاؤں گا۔ کمزور اور بزدل تو تم ہو۔ پردیسیوں کی گود میں بیٹھ کر یہاں سیاسی گیم چلتے ہو۔ یہاں تمہارے مہرے ہیں اور وہاں تم کسی اور کے مہرے بنے ہوئے ہو۔ اس دیش کی سیاست میں گھس کر غیروں کو فائدہ پہنچا رہے ہو۔ ان کی کٹھ پتلی بنے ہوئے ہو۔''

''تم میرے خلاف اکثر ایسے بیانات دیتے رہتے ہو اور میں پھر سمجھاتا ہوں کہ یہ دنیا ایک گورکھ دھندا ہے۔ جہاں اپنا فائدہ نظر آتا ہے، وہاں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔ یقین نہ آئے تو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، تمہاری سیاسی ہی نہیں، کاروباری کامیابی کے پیچھے بھی یہودیوں کے ناموں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ یہ وہ نام ہیں جو ہماری جڑوں میں ہم سے بھی زیادہ گہرائی تک اتر جانا چاہتے ہیں اور تم انہیں شہ دیتے ہو۔ یوں دیکھا جائے تو ہم دونوں ہی اپنے دیش کے لٹیرے ہیں۔ بس لوٹنے کا ڈھنگ الگ الگ ہے۔''

''کیا یہی بکواس کرنے کے لیے فون کیا ہے؟''

''نہیں۔ یہ بتانے کے لیے تمہیں یاد کیا ہے کہ میری بیٹی کا بیان بدل بھی سکتا ہے۔ ابھی وہ دشمن کے طور پر تمہارا نام لے رہی ہے۔ آئندہ اسی بیان کی اصلاح کرتے ہوئے اپنے دشمن کا نام بدل دے گی۔ لوگوں کو بتائے گی کہ تمہارے بارے میں اس کی رائے غلط تھی۔ تم نے اس سے دشمنی نہیں کی ہے۔''

''اوہ تو یوں بولو نا کہ سودا کرنا چاہتے ہو۔''

''اگر بدنامی سے اور قاتل کہلائے جانے سے بچنا چاہتے ہو تو مجھ سے سودا کرنا پڑے گا۔''

ایس کے پچارا نے طنزیہ انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ ''اچھا تو بیان بدلنے کی قیمت کیا ہوگی؟''

''اپوزیشن میں نہ بیٹھو۔''

''فار یور کائنڈ انفارمیشن مسٹر مکر جی! کسی بھی الزام کو ثابت کرنے کے لیے ثبوت اور گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہاری بیٹی مجھ پر الزام تو لگا سکتی ہے مگر اسے ثابت نہیں کر سکتی۔ میں تم باپ بیٹی کی گیدڑ بھبکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔''

''تم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ ثبوت اور گواہ کہاں سے پیدا ہو جاتے ہیں، یہ پہلے پتا نہیں چلتا۔ اچانک ہی گواہوں کے دھماکے ہوتے ہیں۔ شواہد کے انبار لگ جاتے ہیں۔''

''میں تمہاری دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ تم اپنی بیٹی کے ساتھ مل کر میرے خلاف پروپیگنڈا کرو۔ میں اپنا بچاؤ کرنا جانتا ہوں۔''

اس نے بٹن دبا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ فون کو ایک طرف پھینک کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کلپنا کی پریس کانفرنس ختم ہو چکی تھی۔ ایک نیوز ریڈر کلپنا، ایس کے پچارا اور رمیش مکر جی کے بارے میں بہت کچھ بتا رہی تھی۔ پچارا اور مکر جی کا سیاسی بیک گراؤنڈ پیش کیا جا رہا تھا۔ کلپنا کے ساتھ ہونے والے حادثے کو اب سیاسی رنگ میں ڈھالا جا رہا تھا۔

اس نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ محبوب خان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اسے اس معاملے سے دور رکھا جائے مگر اس کے باوجود کلپنا کے ساتھ اس کا نام آ رہا تھا۔ اگرچہ ان کے تعلق کی گونج ابھی دبی دبی سی تھی۔ مگر دبی ہوئی چنگاری ہی کبھی کبھی بڑے دھماکوں کا سبب بنتی ہے۔

☆☆☆

صبح کا اجالا پوری آب و تاب کے ساتھ پھیل چکا تھا۔ دیارِ غیر میں رہو تو وہاں کے صبح و شام بھی اجنبی اجنبی سے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہی سورج ہوتا ہے، وہی چاند ہوتا ہے، وہی ستارے ہوتے ہیں مگر پرائے پرائے سے لگتے ہیں۔

اس نے ایک ذرا آنکھیں کھول کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پھر وال کلاک میں وقت دیکھ کر کروٹ بدل لی۔ صبح کے دس بجے تھے۔ وہ ابھی اور سونا چاہتا تھا مگر فون کی کالنگ ٹون نے نیند کا خمار ہوا کر دیا۔ اس نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ ننھی سی جلتی بجھتی اسکرین پر کلپنا کا نام چھب دکھا رہا تھا۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ ''ہیلو...!''

اس کی چہکتی... دل میں اترتی ہوئی سی شکایت سنائی دی۔ ''یہ کیا؟ اتنا اجنبی سا ہیلو...؟ اس کا مطلب ہے، آپ نے میرا نمبر سیو نہیں کیا ہے۔''

وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کا نمبر میرے پاس سیو ہے۔''

''جو چیز سیو ہوا سے لوز بھی کیا جاتا ہے۔''

''سوری۔ میں کل آپ سے رابطہ نہ کر سکا۔''

وہ کھنکتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''سوری نہ بولیں۔ میں شکایت نہیں کر رہی ہوں، یونہی مذاق کر رہی تھی۔''

''میں نے کل آپ کی پریس کانفرنس سنی تھی۔''

اس نے شوخی سے پوچھا۔ ''اچھا؟ صرف سنی تھی، دیکھی نہیں تھی؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ہاں۔ میرا مطلب ہے، دیکھی بھی تھی۔ آپ نے جیسا گرما گرم بیان دیا ہے، اس کے بعد میں سمجھتا ہوں، آپ کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔''

''کس حوالے سے...؟''

''اپنے دشمن کے حوالے سے، میرے حوالے سے۔ دراصل میں آپ سے فاصلہ رکھ کر تمام تر افواہوں کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔''

''دشمن، دشمنی کرتا ہے اور دوست، دوستی نبھاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دشمن تو دشمنی کرے گا، اس سے باز نہیں آئے گا۔ لیکن آپ پیچھے ہٹ کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہماری دوستی سے زیادہ مستحکم اس کی دشمنی ہے جسے وہ ہر حال میں جاری رکھ سکتا ہے۔ مگر ہم اپنی دوستی کو دیرپا نہیں بنا سکتے۔''

''بات صرف دوستی کی نہیں ہے۔ نیک نامی اور بدنامی کی ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ میرے حوالے سے کوئی آپ پر کیچڑ اچھالے۔''

''کنول تو کیچڑ میں ہی کھلتے ہیں۔''

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ''ہمارا تعلق، ہماری جان پہچان کنول کا پھول نہیں ہے۔ لیکن ہاں، لوگ اسے ببول کا کانٹا ضرور بنا دیں گے۔''

''پھول توڑتے ہوئے کانٹے تو چبھتے ہی ہیں۔ میں لوگوں کے خوف سے دوستی کے ایسے انمول پھول کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔ اس کی خوشبو سے محروم نہیں ہونا چاہتی۔''

وہ پھر چپ رہا۔ کیا جواب دیتا؟ وہ سوال نہیں کر رہی تھی، بول رہی تھی۔ مگر انداز ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہی ہو۔ ''کیا تم اس پھول کو چھوڑ سکتے ہو؟''

محبوب کے دل سے جواب آیا۔ ''نہیں۔''

''جب تک سانس رہتی ہے، تب تک آس رہتی ہے۔ اس نئے نویلے رشتے کی خوشبو تمہارے آس پاس پھیل رہی ہے۔ کیا تم جیتے جی سانس روک کر اسے محسوس کرنے اور سونگھنے سے انکار کر سکتے ہو؟''

جواب آیا۔ ''نہیں۔ میں منکر نہیں بننا چاہتا۔''

''تو پھر اقرار کرو۔''

''ہمارے اقرار سے یہ دنیا بے قرار ہو جائے گی۔ میرے نام سے تمہیں بدنام کرے گی۔''

''بدنام نہ ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا...؟ مجنوں کے نام سے لیلیٰ کا نام ہے۔ رانجھا کے نام سے ہیر کا نام ہے۔ پنوں کے نام سے سسی کا نام ہے۔ میں بھی نام کمانا چاہتی ہوں۔ سورج سے چاند کو روشنی ملتی ہے۔ میں روشن ہونا چاہتی ہوں۔''

وہ چند لمحوں تک فون پر خاموش رہے۔ مگر خاموشی کی زبان سے بولتے رہے، ایک دوسرے کو نہ سنتے ہوئے بھی سنتے رہے۔ پھر محبوب خان نے کہا۔ ''یہ سچ ہے، میں آپ کے ملک اور آپ کے شہر میں رہتے ہوئے آپ جیسی ہستی سے لاتعلقی نہیں برت سکوں گا۔''

''تو پھر فاصلوں کی بات نہ کریں۔''

''مگر ملنے جلنے کے معاملے میں ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔''

''یعنی...؟''

''یعنی یہی کہ کسی کی نظروں میں نہ آئیں۔ اسکینڈل اچھالنے والوں کو موقع نہ دیں۔''

''یعنی پردے میں رہ کر ملاقات کیا کریں؟ برقع وغیرہ پہن کر...؟''

وہ اپنی ہی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بات ایسی تھی کہ وہ بھی ہنس پڑا۔ وہ بولی۔ ''آپ کے وہاں پردے کا رواج ہے نا؟ مجھے بھی باپردہ بنا دیں۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا، زیرلب مسکرانے لگا۔ اس نے کہا۔ ''اینی وے۔ ابھی تو میں آپ کی نیند خراب کر چکی ہوں۔ اب بولیں... کیا کرنا ہے؟''

''کیا مطلب کیا کرنا ہے؟''

''مطلب یہ کہ آج کی مصروفیت کیا ہے؟ کہیں جانا ہے؟''

''دیارِ غیر میں مصروفیت کیا ہو سکتی ہے؟ ابھی سو کر اٹھا ہوں۔ فریش ہو کر ناشتا کروں گا۔ پھر سوچوں گا، کہاں جانا چاہیے۔''

''مگر مجھے جہاں آنا تھا، میں وہاں پہنچ چکی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا، دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے بستر سے اترتے ہوئے فون پر کہا۔ ''ہولڈ آن... کوئی آیا ہے۔''

وہ دھیرے سے بولی۔ ''ذرا دیکھیے تو کون آیا ہے؟''

اس نے دروازے کے قریب آ کر اسے کھولا تو حیران

رہ گیا۔ وہ فون کان سے لگائے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی حیرانی دیکھ کر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ وہی دل ربا انداز تھا۔

وہ بے یقینی سے بولا۔ ”آپ یہاں...؟“

وہ فون کا بٹن دبا کر کال ڈراپ کرتے ہوئے بولی۔ ”بن بلائے مہمان ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اچانک ہی آ دھمکتے ہیں۔ ویسے اپنے فون کو کان سے ہٹالیں۔ اب میں وہاں نہیں یہاں ہوں۔ آپ کے سامنے...“

وہ ٹھٹک کر فون والا ہاتھ نیچے کرتے ہوئے بولا۔ ”اوہ... اصل میں... آپ نے واقعی مجھے حیران کر دیا ہے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے تو سرپرائز دیا ہے۔ اب کیا سزا کے طور پر یہیں کھڑے رہنا ہوگا؟“

وہ فوراً ہی ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔ ”ارے نہیں۔ آئیں، اندر آئیں۔“

وہ کمرے کا جائزہ لیتی ہوئی اندر آ گئی۔ محبوب خان نے دروازے کو پوری طرح بند نہیں کیا۔ اسے ادھ کھلا چھوڑ کر اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ”آنے سے پہلے بتا دیتیں تو...“

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”تو آپ مجھے منع کر دیتے۔“

اس نے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ میں منع تو نہیں کرتا۔“

وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ انگلیوں سے بال درست کرتا ہوا اس کے سامنے بیڈ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ کلپنا نے کہا۔ ”آپ فریش ہو جائیں۔ میں انتظار کرلوں گی۔“

”ہاں۔ میں ابھی جاتا ہوں۔ پہلے یہ بتائیں، آپ کے لیے کیا منگواؤں؟ چائے، کافی یا ٹھنڈا...؟“

”میں نے ناشتا نہیں کیا ہے۔ اسی لیے بول رہی ہوں، آپ فریش ہونے جائیں پھر ایک ساتھ ناشتا کریں گے۔“

ایسے ہی وقت ادھ کھلا دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ انہوں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ ایک آدمی کیمرا لیے مووی بناتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دو اور افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں مائک تھا اور دوسرا کچھ کاغذات لیے ہوئے تھا۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی نیوز چینل کی ایک چھوٹی سی ٹیم ہے۔

محبوب خان اور کلپنا اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ محبوب نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ”یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟“

مائک والے نے ایک نیوز چینل کا نام بتاتے ہوئے اپنا تعارف کرایا۔ پھر کہا۔ ”ہم لوگوں کو باخبر رکھنے کے لیے خبریں اکٹھا کر رہے ہیں۔“

”مگر یہ کیا طریقہ ہے؟ آپ کو اجازت لے کر اندر آنا چاہیے تھا۔“

کیمرا مین اپنے کیمرے کو کبھی کلپنا کی طرف، کبھی محبوب خان کی طرف اور کبھی کمرے کے مختلف حصوں کی طرف گھما کر ریکارڈنگ کر رہا تھا۔ کلپنا نے کیمرے پر ایک ہاتھ مارا۔ اگر کیمرا مین فوراً ہی اسے نہ سنبھالتا تو وہ زمین پر گر پڑتا۔ وہ غصے سے بولی۔ ”پہلے اسے بند کرو پھر بات کرو۔“

مائک والے نے کہا۔ ”میڈم! آپ غصہ نہ کریں۔ ہم ابھی اسے آف کر دیں گے۔“

وہ بولی۔ ”کر دیں گے نہیں... ابھی کرو۔“

مائک والے نے کیمرا مین کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اسے آپریٹ کرنے لگا پھر بولا۔ ”یہ لیں۔ آف ہو گیا۔“

کیمرے کا رخ اب بھی کلپنا کی طرف تھا۔ وہ اسے چھینتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بیوقوف بنا رہے ہو؟ کیا چاہتے ہو، اسے زمین پر پٹخ کر توڑ ڈالوں؟“

وہ کیمرے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”ایسا ظلم نہ کریں میڈم! یہ ہماری روٹی روزی ہے۔“

وہ اسے چیک کر رہی تھی۔ پھر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اسے آف کیا جا چکا ہے۔ مائک والا محبوب خان سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ کلپنا نے کیمرا اس آدمی کو تھما کر اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”جس کھلے ہوئے دروازے سے اندر آئے تھے، اسی دروازے سے باہر چلے جاؤ۔“

پھر مائک مین کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”گیٹ آؤٹ!“

”پر میڈم! میری بات تو سنیں۔“

”میں کچھ کہنا سننا نہیں چاہتی۔ چلو نکلو یہاں سے...“

اس نے بازو سے پکڑ کر اسے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے اس کے دونوں ساتھیوں کو گھورا۔ ”منہ کیا تک رہے ہو؟ نکلو باہر...“

مائک مین انٹرویو کی التجا کرتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر آ گیا۔ کلپنا نے دروازے کو ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے لاک کر دیا۔ محبوب خان بڑی خاموشی سے اور گہری سنجیدگی سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ پاؤں پٹختی ہوئی ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گئی۔ محبوب نے اسے دیکھا۔ پھر

دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کو یقین ہے، وہ چلے گئے ہوں گے؟“

”یہ پریس والے بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ نہ باتوں سے مانتے ہیں، نہ لاتوں سے مانتے ہیں۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹیلی فون کے پاس آئی۔ ریسیور اٹھا کر نمبر پنچ کرتے ہوئے بولی۔ ”میں ہوٹل کی انتظامیہ سے بات کرتی ہوں۔“

محبوب خان پریشان ہو گیا تھا، سوچ میں پڑ گیا۔ ادھر وہ انتظامیہ کو باتیں سنا رہی تھی۔ ہوٹل منیجر نے معذرت کرتے ہوئے یقین دہانی کرائی تھی کہ پریس میڈیا والے وہاں سے جا چکے ہیں۔ اس نے ریسیور پٹخ کر رابطہ ختم کر دیا۔ محبوب خان کچھ سوچ کر دروازے کے پاس آیا۔ پھر اسے ایک جھٹکے سے پوری طرح کھول دیا۔ باہر کوریڈور ویران تھا۔ کلپنا نے کہا۔ ”وہ لوگ جا چکے ہیں۔“

اس نے دروازے کو اسی طرح کھلا چھوڑ کر پلٹتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ کسی مشہور چینل کے نمائندے تھے؟“

”الیکٹرونک میڈیا پر نیوز چینل کی بھرمار ہوتی جا رہی ہے۔ جس کے پاس چار پیسے آتے ہیں، وہ چینل لانچ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ پھر اسے چلانے کے لیے الٹے سیدھے طریقوں سے الٹی سیدھی خبریں سمیٹتا پھرتا ہے۔ نان سینس... یہ بھی ایک ایسے ہی گھٹیا چینل کے نمائندے تھے۔“

پھر وہ اس کی صورت دیکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ جا کر فریش ہو جائیں۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔“

اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر جھجکتے ہوئے کہا۔ ”مائنڈ نہ کریں تو ایک بات کہوں؟“

”ہاں... بولیں؟“

”یہ ابھی جو کچھ ہوا، کیا اس کے بعد ہمارا ایک ساتھ رہنا مناسب ہے؟“

”دل میں چور نہ ہو تو دنیا کا ڈر نہیں ہوتا۔ پریس والے جو کچھ کر رہے ہیں، جھوٹ کی بنیاد پر کر رہے ہیں اور جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔ یہ زیادہ دور تک نہیں جاتا۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا سوچ رہے ہیں؟“

”سوچ رہا ہوں، جھوٹ آخر کو دم توڑ جاتا ہے۔ لیکن جاتے جاتے اپنے پیچھے بہت سے نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ آپ سمجھ نہیں رہی ہیں یا پھر جانتے بوجھتے انجان بن رہی ہیں۔ اس وقت آپ کا دشمن آپ کے فادر کو سیاست میں اور آپ کو آپ کے پروفیشن میں نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اب جبکہ عوام کے سامنے آپ اس کا نام لے چکی ہیں تو ذرا سوچیں، کیا وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرنے کے لیے آپ پر دوبارہ پلٹ کر حملے نہیں کرے گا؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ”کم از کم ابھی نہیں کرے گا کیونکہ ابھی مجھے ایک ذرا بھی نقصان پہنچے گا تو سارا کا سارا الزام اسی کے سر آئے گا اور وہ اتنا بیوقوف نہیں ہے۔“

”حملے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ پھر آپ کو ٹارگٹ بنا کر شوٹ کروائے گا۔ دشمنی کے اور بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔ اوّل تو میں سمجھتا ہوں، آپ نے یوں سرِعام اس کا نام لے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ کیا ایسا بیان دینے سے پہلے آپ نے اپنے فادر سے مشورہ کیا تھا؟“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”دراصل ان کے کہنے پر ہی میں نے پریس کانفرنس کی تھی۔ ایس کے پجارا کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے ہم سے دشمنی کی انتہا کر کے صرف کاروباری اعتبار سے ہی نہیں، سیاسی اعتبار سے بھی خود کو نقصان میں ڈال دیا ہے۔“

محبوب کو اس کی باتیں سن کر ذرا تعجب ہوا۔ وہ بولی۔ ”میرے ڈیڈ سب سنبھال لیں گے۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟“

”مجھے آپ کے معاملات میں اتنا بولنا تو نہیں چاہیے پھر بھی یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ اس دشمن کی دشمنی اپنی جگہ... مگر آپ کم سے کم پریس والوں کو اپنا مخالف نہ بنائیں۔“

وہ سر جھکا کر بولی۔ ”آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر... مگر ابھی اس سر کا کیا کروں، جو بھوک کے مارے دُکھنے لگا ہے؟“

اس نے کلپنا کو ایسے دیکھا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن ہچکچا رہا ہو۔ وہ بولی۔ ”ڈرنا منع ہے... میں کسی کے ڈر سے ایک اچھے شخص کا ساتھ چھوڑ نہیں سکتی۔ آپ میرے لیے اچھے ہیں اور اچھے انسان بہت مشکل سے ملتے ہیں۔ لہٰذا اب آپ کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔“

وہ ضدی تھی، اپنی ضد پوری کروا کر ہی دم لیتی تھی۔ اس کے لیے چاہے کتنا ہی بڑا نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ محبوب خان کو دوسری ملاقات میں اس کا مزاج تھوڑا اور سمجھ میں آ رہا تھا۔ ویسے محبوب کے اندر بھی چور تھا۔ اس کے ہونٹوں پر نہ تھی لیکن دل میں ہاں تھی۔

نفرت کا جواب نفرت سے دینا لازمی نہیں ہوتا۔ لیکن

محبت کا جواب محبت سے دیا جاتا ہے۔ وہ محبت سے اس کی طرف آرہی تھی، کون کافر تھا جو منہ پھیرتا؟
وہ بولا۔ ”ٹھیک ہے میں اعتراض نہیں کروں گا۔ لیکن آپ کو بھی میری ایک بات ماننی ہوگی۔“
”وہ کیا؟“
”بُرا نہ مانیں... مگر آپ نیچے ریسٹورنٹ میں جاکر میرا انتظار کریں۔ مجھے صرف دس منٹ لگیں گے۔“
وہ مسکرانے لگی پھر اٹھتے ہوئے بولی۔ ”اچھی بات ہے۔ لیکن میں ریسٹورنٹ میں نہیں، وزیٹرز لابی میں رہوں گی۔“
”کیوں؟ ناشتا نہیں کریں گی؟“
”ناشتا تو کرنا ہے اور آپ کے ساتھ ہی کرنا ہے مگر یہاں نہیں۔“
”تو پھر کہاں؟“
وہ جاتے ہوئے بولی۔ ”جہاں دانہ پانی لے جائے۔ آجائیں، میں انتظار کررہی ہوں۔“
وہ باہر جاکر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ چند لمحوں تک ادھر دیکھتا رہا۔ پھر دروازے کو لاک کرکے واش روم میں چلا گیا۔ دیکھا جائے تو تھوڑی دیر پہلے ایک زبردست شاک لگا تھا۔ پریس میڈیا کی طرف سے اچانک ہی حملہ ہوا تھا۔ فی الحال کلپنا کو کوئی رسک نہیں لینا چاہیے تھا۔ احتیاط برتنی چاہیے تھی۔
مگر وہ ضد کی پکّی تھی اور محبوب خان کچھ الجھا ہوا تھا۔ اگرچہ ہر بار اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتا تھا۔ لیکن یہ حقیقت بھی سمجھ میں آتی تھی کہ پرائے دیس میں اپنے لیے مسائل پیدا کررہا ہے۔ وہ یہی سوچتا تھا کہ اگلی بار کلپنا کو سمجھائے گا، اسے خود سے دور رکھے گا۔ لیکن فاصلے تھے کہ بڑھنے کے بجائے سمٹتے چلے جارہے تھے۔ وہ گریز کرنا چاہتا تھا اور وہ ناگزیر ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاتا ہے۔ کلپنا نے اینٹ ماری تھی، ایس کے پچارا جواباً پتھر مارنا جانتا تھا۔ دوسرے روز مختلف چینلز پر اس کی جوابی پریس کانفرنس کی گونج سنائی دی۔ کلپنا نے جو الزامات لگائے تھے، وہ ان کی تردید کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”رمیش مکرجی میرا دشمن نہیں ہے۔ لیکن سیاست کے میدان میں ہم ایک دوسرے کے مخالف ضرور ہیں۔ یہ حقیقت پوری دنیا جانتی اور مانتی ہے کہ دو سیاستدانوں کے درمیان ہمیشہ سیاسی جنگ جاری رہتی ہے جس کے نتیجے میں سیاسی عداوتیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یقیناً میرے اور مکرجی کے درمیان بھی ایسی سیاسی کشیدگی قائم رہتی ہے۔
”کلپنا میرے مخالف کی بیٹی ہے۔ اب آپ لوگ مجھے بتائیں، جب میری اور مکرجی کی بنتی ہی نہیں تو میں اس کی بیٹی کو اپنی کسی اشتہاری فلم کی آفر کیوں کروں گا؟“
ایک صحافی نے پوچھا۔ ”یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے کلپنا جی کو اپنی پروڈکٹ کے لیے ماڈلنگ کی آفر نہیں کی تھی؟“
وہ انکار میں سر ہلاکر بولا۔ ”کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں۔ پورا دیش جانتا ہے، کلپنا کو میں نے کبھی اپنی کسی بھی پروڈکٹ کے لیے ماڈل کے طور پر پیش نہیں کیا۔ اور جو کام پہلے کبھی نہیں کیا، وہ اب کیوں کروں گا؟“
وہ ذرا ٹھہر کر بولا۔ ”نہ میں نے اسے کوئی آفر کی، نہ اس نے رد کی، نہ ہمارے درمیان اس سلسلے میں کوئی کشیدگی پیدا ہوئی۔ مگر ایک رات پہلے کلپنا کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس معاملے کو میرے سر تھوپنے کے لیے وہ باپ بیٹی یہ الٹا ہتھکنڈا استعمال کررہے ہیں۔ جو کہ بالکل ہی بے بنیاد ہے اور اگر اس میں ایک ذرا بھی سچائی ہے تو وہ ثابت کریں کیونکہ میں کسی ثبوت کے بغیر اپنی ذات پر کوئی الزام برداشت نہیں کروں گا بلکہ ہتک عزت کا دعویٰ کروں گا۔ وہ الیکشن کے دنوں میں ایسی اوچھی حرکتیں کرکے، مجھے الجھا کر میرا قیمتی وقت برباد کرنا چاہتے ہیں۔“
ایک صحافی نے کہا۔ ”ذرا اس بات پر روشنی ڈالیں کہ رمیش مکرجی سیاسی جنگ میں اپنی بیٹی یعنی کلپنا جی کو کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ آپ پر الزام لگانے کے لیے ان کا شانہ کیوں استعمال کررہے ہیں؟“
وہ بولا۔ ”اس دنیا میں عورتوں کے شانے استعمال کرکے اپنے مقاصد حاصل کرنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ رمیش چونکہ اس دیش میں نہیں رہتا، غیروں کی گود میں بیٹھ کر سیاسی چالیں چلتا ہے۔ لہٰذا اس بار وہ ہماری معصوم جنتا کو اپنا حمایتی بنانے اور میرے خلاف اکسانے کے لیے اپنی بیٹی کو مہرہ بنارہا ہے۔ وہ یہاں کی سپر ماڈل ہے، لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے اور رمیش ان دلوں کو اپنی مٹھی میں لے کر اپنے سیاسی کیریئر کی سانسیں بحال کرنا چاہتا ہے۔ اپنا ووٹ بینک بڑھانا چاہتا ہے۔“
وہ ذرا دیر کے لیے چپ ہوا۔ پھر جوشیلے انداز میں بولا۔ ”رمیش جیسے لوگ ہی آج کے راون ہیں جو شری رام کو

پھانسنے کے لیے اپنی بہنوں اور بیٹیوں کا استعمال کرتے پھرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے کرتوتوں سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ راون ابھی تک مرا نہیں ہے، زندہ ہے اور جب راون زندہ ہے تو...“
اس نے سینہ ٹھونکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔ ”تو رام بھی زندہ ہے۔“
ایسے وقت ایک صحافی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اس کے ڈیسک کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”سب ہی لوگ آئینے میں اپنی صورت دیکھتے ہیں۔ میں ایک آئینہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں، ذرا اس میں جھانک کر تو دیکھیں...“
اس نے قریب آکر ایک منی ٹیپ ریکارڈر اس کے مائک کے پاس رکھ دیا۔ ایس کے پچارا نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“
وہ بولا۔ ”آپ کے سوال کا جواب یہ خود اپنی زبان سے دے گا۔“
اس نے ایک بٹن دبا کر اسے آن کردیا۔ ایس کے پچارا کبھی اس ریکارڈر کو اور کبھی اس صحافی کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے اپنی ہی آواز سنائی دی۔ مائک کے ذریعے وہ آواز سب ہی سننے لگے۔ لائیو پریس کانفرنس تھی، لہٰذا گھر بیٹھے ناظرین بھی سن رہے تھے۔
وہ فون پر کسی سے بول رہا تھا۔ ”ہیلو۔ ایس کے پچارا بول رہا ہوں۔“
دوسرا لہجہ سنائی دیا۔ ”میرا خیال ہے، مجھے نام بتانے کی ضرورت نہیں پڑے گی، آواز سے پہچان رہے ہوگے؟“
ایس کے پچارا کی آواز سنائی دی۔ ”میں دشمنوں کے لب و لہجے کو خوب یاد رکھتا ہوں مسٹر رمیش مکرجی...!“
رمیش کی آواز سنائی دی۔ ”ہم دشمن نہیں تھے، ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ دشمنی کی ابتدا تم نے کی ہے۔“
پچارا کی آواز سنائی دی۔ ”اور انتہا بھی میں ہی کروں گا۔“
ایس کے پچارا نے فوراً ہی بٹن دبا کر ریکارڈر کو بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ... یہ کیا بکواس ہے؟“
وہ بولا۔ ”یہ آپ کی باتیں ہیں۔“
”لگتا ہے، تم صحافی کے بھیس میں اپوزیشن کے بندے ہو۔“
وہ بولا۔ ”نہ میں اپوزیشن کا بندہ ہوں، نہ آپ کا... میں صرف ایشور کا بندہ ہوں۔ یہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے آیا ہوں۔ اپنا فرض نبھانے آیا ہوں۔“
”تم فرض نبھانے نہیں، لوگوں کو میرے خلاف بھڑکانے آئے ہو۔“
وہ بولا۔ ”جھوٹ بھڑکاتا ہے اور سچ پانی ڈالتا ہے۔ آپ ریکارڈر کو آن کریں تاکہ سچائی سب کے کانوں تک پہنچ سکے۔“
”یہ سچائی نہیں ہے، سازش ہے۔“
”یہ سازش نہیں ہے، آپ کی اور رمیش مکرجی کی ٹیلی فونک گفتگو ہے۔“
وہاں موجود صحافی اور دیگر افراد مطالبہ کرنے لگے کہ ریکارڈر کو آن کیا جائے۔ آخر سنا تو جائے کہ وہ صحافی اس ریکارڈنگ کے ذریعے کون سے پردے اٹھانے آیا ہے؟ سب ہی کے اندر تجسس بھڑک رہا تھا۔
ایس کے پچارا یہ اچھی طرح سمجھ رہا تھا کہ ریکارڈر آن ہوتے ہی ڈھول کا پول کھل جائے گا۔ اس نے رمیش سے فون پر جو باتیں کی تھیں، وہ سب اس کے دماغ میں گونج رہی تھیں۔
رمیش نے کہا تھا۔ ”یہ نہ دیکھو، کیسی چال چل رہا ہوں؟ یہ دیکھو، کس وقت چل رہا ہوں؟ اور یہ بھی سمجھو کہ اتنا شاندار موقع تم نے خود ہی مجھے دیا ہے۔ الیکشن کے سیزن میں پھونک پھونک کر قدم رکھے جاتے ہیں۔ یہ تمہاری بدبختی ہے کہ میری بیٹی سے دشمنی کرنے کے لیے تمہیں یہی وقت ملا تھا۔“
اس نے جواباً کہا تھا۔ ”نشانہ ایک بار ہی خطا ہوتا ہے۔ میری عارضی ناکامی کو اپنی کامیابی سمجھنے کی بھول نہ کرنا۔ تمہاری بیٹی کی قسمت اچھی تھی۔ لیکن ہمیشہ اچھی نہیں رہے گی۔ وہ سنا تو ہوگا کہ سو دن چور کے اور ایک دن شاہ کا...“
اس کے جواب سے واضح ہورہا تھا کہ کلپنا پر جان لیوا حملہ اسی نے کروایا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اس کنورسیشن کو عوام تک پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ رمیش نے موقع تاک کر حملہ کیا ہے۔ وہ ذرا گڑبڑایا تھا لیکن پھر سنبھل گیا تھا۔ سیاسی زندگی میں بارہا مخالفین کی طرف سے ایسے حملوں کا سامنا کرتا رہا تھا۔
اس نے حاضرین سے کہا۔ ”میں اس ریکارڈر کو آن نہیں کروں گا کیونکہ یہ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ یہ ریکارڈنگ ایڈیٹنگ کے بعد یہاں پہنچائی گئی ہے۔ اور یہ تو آپ سب ہی جانتے ہیں کہ ایڈیٹنگ کے بعد کوئی بھی چیز، کوئی بھی بات اپنی اصلی شکل میں نہیں رہتی۔ اس کیسٹ میں

یقیناً میری باتوں کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہوگا۔''

اس صحافی نے کہا۔ ''اس کیسٹ میں آواز آپ کی ہے' لہجہ آپ کا ہے' الفاظ بھی وہی ہیں جو آپ نے ادا کیے۔''

''آپ کے بولنے سے میں ماننے والا نہیں ہوں۔ اپنی اس نوٹنکی کے ساتھ یہاں سے چلے جائیں یا پھر میں اپنی پریس کانفرنس ختم کرتا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''آپ سچائی کو روک نہیں سکتے۔ اس ریکارڈر کو آف کرکے یہ نہ سمجھیں کہ سچائی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ایک باڈی گارڈ نے فوراً ہی آگے بڑھ کر وہ ریکارڈر اپنے قبضے میں لے لیا۔ پھر تمام مسلح باڈی گارڈز اپنے آقا کو حصار میں لے کر کانفرنس ہال سے باہر لے جانے لگے۔

ایسے وقت تمام صحافی بھی ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چل رہے تھے۔ ان کی طرف سے سوالات کی بوچھاڑ ہورہی تھی۔ مختلف چینلز کے نمائندے اور کیمرا مین اس سے سوالات کرنے اور اس کی فوٹیج بنانے کی کوششوں میں ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ مسلح باڈی گارڈز اسے سب سے بچاتے ہوئے بڑی حفاظت کے ساتھ گاڑی تک لے آئے۔

وہ ایک گارڈ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوکر آگے بڑھنے لگی۔ سوال کرنے والے صحافیوں کا ہجوم پیچھے رہ گیا۔ نیوز چینلز کے کیمرے دور جاتی ہوئی گاڑی کی ویڈیو بنا رہے تھے اور ان کے نمائندے مائک ہاتھوں میں لیے ایس کے پچارا کی ادھوری پریس کانفرنس کے بارے میں بہت کچھ بول رہے تھے اور گھر بیٹھے ناظرین یہ تمام حالات لائیو دیکھ رہے تھے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے' ایسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں' جب بڑے بڑے سیاستدان سچائی سے نظریں چرا کر منہ چھپا کر مسلح باڈی گارڈز کی فوج کے ساتھ عوام کے سامنے سے... رفوچکر ہوجاتے ہیں۔ وہ جاتے جاتے اس ریکارڈر کو بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی تمام کیمرے اور مائک اس شخص کی طرف مڑ گئے جس نے ریکارڈر پیش کیا تھا۔ اس سے پوچھا جارہا تھا کہ آخر اس کیسٹ میں کیسے حقائق چھپے ہوئے تھے؟

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''مسٹر پچارا سمجھ رہے ہیں کہ وہ سچائی کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں جبکہ وہ اس دیش کے تمام چینلز پر سنائی جانے گی۔ ہر گھر میں گونجے گی اور پچارا جی کی

کو خاموش نہیں کرا سکیں گے۔''

تھوڑی دیر بعد ہی تمام چینلز پر بریکنگ نیوز نشر ہونے لگی۔ ہر چینل سے رمیش مکرجی اور ایس کے پچارا کی ٹیلی فونک گفتگو سنائی جارہی تھی۔

دوسری طرف رمیش مکرجی اپنے ٹی وی اسکرین پر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ اس نے واقعی موقع تاک کر حملہ کیا تھا۔ اپنی اور پچارا کی وہ باتیں لوگوں کے کانوں تک پہنچا رہا تھا جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ پچارا نے ہی اس کی بیٹی سے دشمنی کی تھی۔ باقی تمام اہم سیاسی باتیں ایڈٹ کر دی گئی تھیں۔ یوں وہ خود کسی کی گرفت میں نہیں آسکتا تھا۔ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے موبائل فون کو دیکھا۔

اُدھر گاڑی میں کالنگ ٹون نے پچارا کو پکارا۔ اس نے فون نکال کر نمبر دیکھے۔ کوئی اجنبی کال کررہا تھا۔ اس نے کال اٹینڈ کرکے بڑی حقارت سے کہا۔ ''میں سمجھ گیا' یہ تم ہی ہو رمیش مکرجی... آگ لگا کر ہاتھ تاپنے آئے ہو؟''

دوسری طرف سے کسی نے رعب دار لہجے میں کہا۔ ''وہ بلڈی رمیش تمہارے سر پر سوار ہوگیا ہے۔ یہ میں بول رہا ہوں... سر جیسل مونٹڈ...''

وہ نام سنتے ہی سنبھل گیا۔ پہلو بدل کر بولا۔ ''بات یہ نہیں ہے۔ دراصل حالات ایسے ہیں کہ وہ مجھ سے رابطہ کرسکتا ہے۔ اسی لیے...''

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''یہ حالات نہیں ہیں' تماشا ہے۔ آخر تم یہ کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''ابھی تو پریس کانفرنس کرکے آرہا ہوں۔''

''ذرا ٹی وی آن کرکے دیکھو اور سنو... تم نے اپنی بیوقوفی سے جو چنگاری سلگائی ہے' رمیش اسے بھڑکا کر شعلہ بنا رہا ہے۔''

''ابھی میں راستے میں ہوں۔ آپ بتائیں' وہ کیا کر رہا ہے؟''

جیسل نے کہا۔ ''دشمنوں سے بات کرتے ہوئے ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے۔ تم نے اس کی بیٹی پر حملہ کرنے کے بعد ٹیلی فون پر جو باتیں کی ہیں' وہ ہم سب آن ایئر سن رہے ہیں۔ وہ تمہاری احمقانہ دشمنی کو ہتھیار بنا کر تم پر ہی وار کر رہا ہے۔''

اس نے پریشان ہوکر پہلو بدلا پھر کہا۔ ''مجھے کچھ تو اندازہ ہوگیا تھا کہ ایسا ہونے والا ہے۔''

''ہمیں تعجب ہے۔ تم الیکشن کی تیاری کرنے کے بجائے اس سے دشمنی کر رہے ہو اور اس سلسلے میں ہم سے

مشورہ کرنا بھی گوارا نہ سمجھا؟''
''کچھ معاملات میرے ذاتی بھی تو ہو سکتے ہیں۔''
''ذاتی...؟ اپوزیشن کی لڑکی پر حملہ کروایا' یہ تمہارا ذاتی معاملہ تھا؟''
کلپنا پر کیا جانے والا حملہ گلے کی ہڈی بن رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس معاملے میں ایسے الجھ کر رہ جائے گا۔ پھر بھی' بگڑتی ہوئی بات کو کسی نہ کسی صورت سنبھالنا ہی تھا۔
جیسل نے ایک ذرا ٹھہر کر کہا۔ ''بے شک۔ تم ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہو مگر یہ مت بھولو کہ ہمارے ہاتھوں کی کٹھ پتلی ہو۔ تمہارا ہر معاملہ ہماری ڈور سے بندھا ہے۔ ہم تمہیں نادانیوں کی اجازت نہیں دیں گے۔ رمیش کے معاملے کو کسی بھی طرح سنبھالنے کی کوشش کرو۔''
اس کی گاڑی محل نما کوٹھی کے احاطے میں پہنچ کر رک گئی۔ وہ اپنے گارڈز کے ساتھ گاڑی سے اتر کر اندر جاتے ہوئے بولا۔ ''فکر نہ کریں۔ میں اس گفتگو کو کبھی تسلیم نہیں کروں گا۔ ابھی اپنی پریس کانفرنس میں بھی کہا تھا' آئندہ بھی یہی کہوں گا کہ اسے ایڈٹ کیا گیا ہے۔''
''دشمن کسی بھی معاملے کو اسی وقت اچھالتا ہے' جب کوئی سودا کرنا چاہتا ہے۔ اس سے پوچھو وہ کیا چاہتا ہے؟''
''وہ چاہتا ہے' میں اپوزیشن میں نہ رہوں۔''
''یہ تو کبھی ہو نہیں سکتا۔ تم ہمارے ریس کے وہ گھوڑے ہو جس پر ہم نے اندھا دھند رقم لگائی ہے۔ دوڑنا تو تمہیں پڑے گا۔ اسے کسی اور سودے پر راضی کرو۔ سمجھوتے کی کوئی راہ نکالو۔''
''اس کا ایک ہی مطالبہ ہے۔''
جیسل ذرا دیر چپ رہا پھر بولا۔ ''ہماری کمزوریوں سے دشمنوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ تم اس کی کوئی کمزوری تلاش کرو۔ اسے کسی ایسے معاملے میں الجھاؤ کہ وہ منہ کے بل گر پڑے۔''
وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''تمہاری بھول' تمہاری نادانی صرف رمیش کی طرف سے ہی نہیں' ہماری طرف سے بھی تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جو غلطی کر چکے ہو' اس کا جلد از جلد ازالہ کرو۔ ورنہ ہم دیکھتے ہیں' ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''
دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ایک غلط فیصلے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اُدھر رمیش کی طرف سے حملے ہو رہے تھے اور اِدھر یہودی آقاؤں کی ناراضی خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ وہ بُری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ جی تو کر رہا تھا کہ ان باپ بیٹی کو گولیوں سے بھون ڈالے۔ ان کا قصہ ہی پاک کر دے۔ مگر ابھی جوش سے نہیں' ہوش سے کام لینا تھا۔
فون کی کالنگ ٹون نے پھر مخاطب کیا۔ وہ بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''ہیلو...؟''
دوسری طرف سے رمیش کی آواز سنائی دی۔ ''لگتا ہے' بہت مصروف ہو گئے ہو۔ کافی دیر سے ٹرائی کر رہا تھا۔ تمہارا فون انگیج مل رہا تھا۔''
وہ ناگواری سے بولا۔ ''تمہاری اُس جعلی گفتگو کی گونج سن رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں' وبا اور افواہ اسی طرح پھیلتی ہے۔''
وہ مسکرا کر بولا۔ ''تم کچھ بھی کہو۔ بس یہ دیکھتے رہو کہ ثبوت اور گواہ کیسے پیدا ہوتے ہیں؟''
''من گھڑت قصے اچھے تو لگتے ہیں مگر پائیدار نہیں ہوتے۔ تم جو چال چل رہے ہو' وہ جلد ہی بگڑ جائے گی۔''
''فی الحال تم اپنی بگڑی کو بناؤ۔''
''تم اپنی بیٹی کے حوالے سے جو کیچڑ مجھ پر اچھال رہے ہو' اسے تمہارے منہ کی کالک نہ بنا دیا تو میرا نام بھی ایس کے پجارا نہیں۔ میں ثابت کر دوں گا کہ تم باپ بیٹی فراڈ ہو۔ سیاہ کو سفید کرنے میں ماسٹر ہو اور...''
وہ اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ارے ارے۔ اتنا زہر نہ اُگلو۔ یہ گفتگو ریکارڈ نہیں کی جا رہی ہے۔''
''تم نے بے مقصد تو میرا نمبر نہیں ملایا ہو گا۔''
''ہاں۔ مقصد ہے نا... وہی ایک مطالبہ... تم نے کلپنا سے جو دشمنی کی ہے' میں اسے بھول سکتا ہوں اگر تم اپوزیشن میں نہ رہو تو...''
''یہ مطالبہ نہیں' تمہارا خواب ہے۔''
''ہم خواب دیکھتے ہیں' تب ہی تعبیریں ملتی ہیں۔ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ میرا ووٹ بینک بڑھ رہا ہے اور دیکھ لو' حقیقتاً ایسا ہی ہو رہا ہے۔''
وہ اپنی جگہ پر کسمسا کر رہ گیا پھر بولا۔ ''کوئی اور سمجھوتا کرنا چاہتے ہو تو بولو؟''
''تم نے میرے مطالبے کو خواب کہا ہے۔ میں اس کی تعبیر حاصل کر کے ہی دم لوں گا۔ تم میرے خوابوں کو روک سکتے ہو تو روک لو یا میری آنکھیں پھوڑ ڈالو۔''
اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ ایس کے پجارا بڑی دیر تک اپنے فون کو گھورتا رہا' سوچتا رہا۔ اس کے دماغ میں...

جیسل کی باتیں گونج رہی تھیں۔ اب ٹھنڈے دماغ سے سمجھنا تھا کہ رمیش مکرجی کی کمزوری کیا ہو سکتی ہے؟ یا پھر اسے ایسے کون سے معاملے میں الجھایا جا سکتا ہے کہ وہ اوندھے منہ گر پڑے۔
بلاشبہ ان دو سیاست دانوں کے دماغ الگ الگ تھے۔ مگر ان شاطر دماغوں میں شیطانی ہیرا پھیریاں اور مکاریاں پیدا کرنے والا شیطان ایک ہی تھا۔ اور شیطان کا کام یہی ہوتا ہے' مکاری کی بساط پر کبھی ایک کو آگے بڑھاتا ہے تو دوسرے کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ ایک کو زبر کرتا ہے تو دوسرے کو زیر کر دیتا ہے۔ فی الحال ایس کے پجارا زیر ہو رہا تھا مگر آئندہ زبر بھی ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

ایک طرف سیاسی کشمکش جاری تھی تو دوسری طرف محبت کی کشش پیدا ہو رہی تھی۔ محبوب خان اور کلپنا ایک دوسرے کی طرف یوں کھنچتے تھے جیسے مقناطیس اپنی جانب کھینچتا ہے۔
ایسی کھینچا تانی میں ان کے اسکینڈل کی بازگشت اور گہری ہوتی جا رہی تھی۔ بس یہی ایک بات تھی جس سے محبوب خان کو جھجک ہوتی تھی۔ وہ سوچتا تھا' کاش کلپنا مشہور ماڈل گرل نہ ہوتی۔ ایک عام سی لڑکی ہوتی تو دنیا والوں کی نظروں میں نہ آتی۔ اس کی کوئی بات خبر نہ بنتی۔ وہ ہر ملاقات کو آخری ملاقات بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر نئی ملاقات کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔
کرکٹ سیریز شروع ہو چکی تھی۔ وہ پہلے دن کا میچ دیکھنے کے بعد ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرکٹ کے بارے میں گرماگرم بحث ہو رہی تھی۔ پھر بات نکلی ہندوستان کے علاقوں کے بارے میں تو کلپنا نے کہا۔ ''ذرا یہ سیریز ختم ہو جائے پھر میں آپ کو شملہ لے کر جاؤں گی۔''
وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''نہیں کلپنا جی! میں سیریز ختم ہوتے ہی واپس چلا جاؤں گا۔''
واپسی کا سنتے ہی اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ وہ تو شاید یہ بھول ہی گئی تھی کہ محبوب خان ایک پردیسی ہے اور پردیسیوں کو ایک نہ ایک دن اپنے دیس لوٹنا ہی پڑتا ہے۔ وہ چند لمحوں تک خاموش رہی پھر بولی۔ ''کیا ہندوستان نہیں دیکھیں گے؟''
''دیکھنا تو بہت کچھ تھا۔ بہت سی جگہوں پر جانے کا پروگرام بنا کر آیا تھا لیکن...''
''لیکن کیا...؟''
''مجھے لگتا ہے' یہاں رُکنا مناسب نہیں ہو گا۔''
''فار گاڈ سیک۔ اسکینڈل کی وجہ سے جانے کی بات نہ کریں۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''
''فرق تو پڑ رہا ہے۔ آپ کے اکثر مداح مجھے آپ کے ساتھ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ میں خبروں کے ذریعے ان کا ری ایکشن دیکھ رہا ہوں۔ ایک پاکستانی نوجوان سے آپ کا میل جول انہیں پسند نہیں آ رہا ہے۔ میں نے آپ کے بارے میں بھی انہیں الٹے سیدھے انٹرویوز دیتے ہوئے سنا ہے۔''
''آپ جنہیں دیکھ رہے ہیں جنہیں سن رہے ہیں' وہ متعصب ہیں۔ مگر ایسے بھی تو ہیں جو آپ کو میرا محسن مانتے ہوئے آپ کی قدر کرتے ہیں۔ کیا آپ ان کی باتیں نہیں سنتے؟ ان کا پازیٹو ری ایکشن نہیں دیکھتے؟''
''میں بہت کچھ سن رہا ہوں' بہت کچھ دیکھ رہا ہوں۔''
ایسے ہی وقت کلپنا کے فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ اس نے نمبر دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''ڈیڈ کال کر رہے ہیں۔''
پھر فون کو کان سے لگا کر چہک کر بولی۔ ''ہیلو ڈیڈ! کیسے ہیں آپ...؟''
''پہلے یہ بتاؤ' تم کہاں ہو؟''
وہ ٹھٹک کر بولی۔ ''میں... میں ایک ریسٹورنٹ میں ہوں۔''
''کس کے ساتھ...؟''
''ڈیڈ! یہ کیسا سوال ہے؟''
رمیش نے کہا۔ ''جو پوچھ رہا ہوں' اس کا جواب دو۔''
''آپ نے پہلے تو کبھی یہ حساب نہیں مانگا۔ کبھی ایسے سوال نہیں کیے پھر آج کیوں...؟''
وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''تم یقیناً اب تک اس پاکستانی لڑکے کے ساتھ ہی ہو۔''
''اب تک کا مطلب...؟''
''میں ابھی ٹی وی پر لائیو کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ تم اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں اور کیمرا گھوم پھر کر تم دونوں کی ہی وڈیو بنا رہا تھا۔''
''تو کیا ہوا ڈیڈ...!''
''میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا۔ بے شک وہ ہمارا محسن ہے لیکن تم اس کے ساتھ زیادہ وقت نہ گزارا کرو۔''
اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''آپ بھی دوسرے لوگوں کی طرح بات کر رہے ہیں۔''

''مجھے یہ سب کہنا پڑ رہا ہے۔ تم جانتی ہو میں کیسے حالات سے گزر رہا ہوں؟ کس طرح دشمن سے نمٹ رہا ہوں؟ اپنا ووٹ بینک بڑھانے کے لیے کیسی کیسی چالیں چل رہا ہوں۔ اس وقت مجھے لوگوں کی حمایت کی ضرورت ہے، مخالفت کی نہیں۔ تم اس سے ملتی رہو گی تو مجھے نقصان پہنچے گا۔''

اس نے محبوب خان کی طرف دیکھا پھر فون پر پوچھا۔ ''اس کا آپ کی سیاست سے کیا تعلق؟''

''کیسی نادانوں والی بات کر رہی ہو؟ ہم نے پجارا کی ایک غلطی کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کو اپنا حمایتی بنا لیا ہے۔ مگر تم اس پاکستانی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ناراض کر رہی ہو۔ اس وقت ہندوستان کا ایک ایک فرد میرا ووٹ ہے۔ میں کسی کی مخالفت یا ناراضی مول لے کر اپنا ووٹ بینک گھٹانا نہیں چاہتا۔ الیکشن ہوجانے دو پھر اس سے ملتی رہنا۔ میں منع نہیں کروں گا۔''

''الیکشن کے بعد...؟ اس میں تو ابھی ایک ماہ باقی ہے۔''

''الیکشن سے پہلے ایک ایک لمحہ سیاست دانوں کے لیے امتحان جیسا ہوتا ہے۔ میں جس طرح پجارا پر حملے کر رہا ہوں' یقیناً وہ بھی جوابی حملے کرے گا۔ عین ممکن ہے' وہ لوگوں کا ری ایکشن دیکھتے ہوئے اس پاکستانی لڑکے کو ایشو بنا لے۔''

''مثلاً کیسا ایشو...؟''

''وہ تمہارے اسکینڈل کو مزید اچھال کر لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکا سکتا ہے۔ تم پاک بھارت تعلقات کو تو اچھی طرح سمجھتی ہو۔ اگر ہمارے ملک کے پچاس فیصد لوگ پاکستانیوں کو پسند کرتے ہیں تو پچاس فیصد ان سے نفرت بھی کرتے ہیں۔ تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''یس ڈیڈ! سمجھ رہی ہوں۔ آپ متعصب لوگوں کی پروا کر رہے ہیں۔ لیکن میں کسی کی پروا نہیں کرتی۔''

''تم صرف اپنے باپ کے ووٹ بینک کی پروا کرو۔ اس سے دور رہنے کی کوشش کرو۔ الیکشن کے بعد کوئی پابندی نہیں رہے گی۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے محبوب خان کو دیکھا پھر فون پر کہا۔ ''اچھا۔ میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں۔ ابھی کے لیے بائے...''

اس نے فون بند کر دیا۔ محبوب خاموش نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کلپنا نے کہا۔ ''پوچھیں گے نہیں' ڈیڈ کیا بول رہے تھے؟''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''بات سمجھ میں آجائے تو پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''ان کا کہنا بھی ٹھیک ہی ہے۔ اس وقت سیاسی کشمکش جاری ہے۔ ڈیڈ کے لیے مجھے محتاط ہونا پڑے گا۔''

پھر اس نے چند لمحوں بعد کہا۔ ''آپ کے ویزے کے مطابق ایک ہفتہ گزر چکا ہے۔ تین ہفتے باقی ہیں اور جب تک الیکشن ہوں گے' آپ اپنے وطن لوٹ چکے ہوں گے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پھر تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ محبوب خان بھی کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ کلپنا نے کرسی پر پہلو بدل کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے۔''

''جی... بولیں۔''

''میں آپ کو روکنا چاہتی ہوں۔''

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے دیکھا۔ ''جی...؟''

''اچھے دوست' اچھے ساتھی قسمت سے ہی ملتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں' الیکشن کے بعد آپ کے ساتھ کچھ وقت گزاروں۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''اس وقت تک میرے ویزے کا ٹائم پورا ہو چکا ہوگا۔''

''یہ تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ آپ اسے بڑھوا سکتے ہیں۔''

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ انڈیا آنے سے پہلے اس نے بہن سے کہا تھا کہ شاید ویزے کے پورے تیس دنوں تک وہاں رُک نہیں سکے گا۔ اپنوں کی کشش اور محبت اسے جلد ہی واپس کھینچ لائے گی۔

مگر اب حالات بدل رہے تھے۔ کلپنا اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ ہندوستان پہنچتے ہی اس خوبصورت سی زنجیر میں جکڑ گیا تھا۔ خود کو چھڑا کر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن جانا ضروری بھی تھا۔

اُف...! کسی مرنے والے کو اپنی آخری سانسوں میں زندگی اتنی ہی خوبصورت اور پُرکشش لگتی ہوگی۔ سانس کا ساتھ چھوڑنے کو' آخری ہچکی لینے کو جی نہیں کرتا ہوگا۔

''کاش...! کوئی آکسیجن ماسک لگا دے' ایک بار سانس لینے کا' زندگی کی رعنائیوں میں پلٹنے کا موقع دے دے کہ میں جینا چاہتا ہوں... ابھی اور جینا چاہتا ہوں۔''

کلپنا نے ٹیبل پر ایک انگلی بجا کر پوچھا۔ ''ہیلو...! کیا ہوا؟ خاموش کیوں ہیں؟''

وہ ٹھٹک کر بولا۔ ''کچھ نہیں۔ آپ نے جو مشورہ دیا' اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ویزے میں توسیع کروانا مشکل نہیں ہے۔ لیکن گھر والوں کو راضی کرنا ذرا مشکل ہوگا۔''

''اور آپ میری خاطر اس مشکل کو آسان کر ہی لیں گے۔''

اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔ زیر لب مسکرانے لگا۔ وہ اس کے دل کی بات کہہ رہی تھی اور بڑے دعوے سے کہہ رہی تھی۔ لیکن مقدر کی بات کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ اپنے حساب سے سوچ رہے تھے اور مقدر کا حساب کچھ اور تھا۔

☆☆☆

موبائل فون کی کالنگ ٹون چیخ رہی تھی۔ ایس کے پجارا نے اٹھا کر اسے دیکھا۔ آشا کال کر رہی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ''ہاں، بولو... کیا ہو رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''تمہارے ہی کام سے بھٹک رہی تھی۔ ہوٹل کا منیجر کچھ اڑیل تھا۔ دام بڑھانے پر رام ہوا۔ ماسٹر کی دینے کے لیے بڑی ماسٹری دکھا رہا تھا۔''

''کام کا بتاؤ' ہوا یا نہیں؟''

''کام تو ہوگیا۔ تمہاری دی ہوئی دستاویزات اپنے ہاتھوں سے اُس کے روم میں چھپا کر آئی ہوں۔''

''یقین تو ہے نا' وہ محبوب خان کا ہی کمرا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی اور روم میں...''

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''کیسی باتیں کر رہے ہو؟ کیا میں کوئی نادان بچی ہوں جو ایسی غلطی کروں گی؟''

''غلطی کی گنجائش ہے بھی نہیں۔''

''ہائے بے چارہ محبوب خان... دو سیاست دانوں کے بیچ مفت میں سینڈوچ بن رہا ہے۔ ابھی نہ جانے کلپنا کے ساتھ کہاں گھوم پھر رہا ہوگا؟ یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کیسے اُس کی دنیا گھومنے والی ہے۔''

''رمیش کو شہ مات دینے کے لیے اس چھوکرے کو پھنسانا ضروری تھا۔ ہم نے جو ڈاکیومینٹس اس کے روم میں چھپائے ہیں' ان کے ذریعے وہ نوجوان پاکستانی جاسوس ثابت ہوگا اور اِدھر میں رمیش پر یہ الزام لگاؤں گا کہ محبوب خان سے اس کے گہرے تعلقات ہیں۔ رمیش کو ملک دشمن ثابت کرنے کے لیے اس چھوکرے کو پھنسانا ضروری تھا۔''

''ویسے تمہارا گیم بہت زبردست ہے۔ اسے اور پاور فل بنانے کے لیے میرے پاس ایک سرپرائز ہے۔''

''کیسا سرپرائز...؟''

''تم گھر پر ہی ہو نا؟''

''ہاں۔ تم کہاں ہو؟''

''تمہاری طرف ہی آرہی ہوں۔ راستے میں ہوں۔ فون بند کرو۔ سمجھو پہنچ ہی گئی۔''

وہ فون بند کر کے انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ آکر گلے کا ہار بن گئی۔ وہ اسے الگ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم کس سرپرائز کی بات کر رہی تھیں؟''

''پہلے سودا کرو۔''

''کام کی چیز ہوگی تو سودا ہوگا۔''

''کام کی چیز ہے' تب ہی دام مانگ رہی ہوں۔''

اس نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک یو ایس بی نکالی۔ پھر اسے دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ ننھی سی پین ڈرائیو بڑے کام کی ہے۔''

''کیا ہے اس میں...؟''

''تم نے ابھی میرے ذریعے جو تحریری دستاویزات اور آڈیو ویڈیو کیسٹس محبوب خان کے روم میں پہنچائی ہیں' وہ اسے پاکستانی جاسوس ثابت کرنے والی ہیں۔ اور اس یو ایس بی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کلپنا کے اس سے کتنے گہرے تعلقات ہیں؟ یہ ان باپ بیٹی کے خلاف ایک طرح کا ٹھوس ثبوت ہے اور تمہیں اس وقت ایسی چیزوں کی بہت ضرورت ہے۔''

پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا لیپ ٹاپ کہاں ہے؟''

اس نے ایک ملازم کے ذریعے اپنا لیپ ٹاپ منگوایا۔ پھر اسے آن کر کے یو ایس بی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا اس میں تصویریں ہیں؟''

''نہیں۔ ایک چھوٹی سی ویڈیو ہے۔ ایک نیوز چینل کے نمائندے نے اسے اُس وقت ریکارڈ کیا تھا جب کلپنا محبوب خان سے ملنے کے لیے ہوٹل کے روم میں گئی تھی۔ بات معمولی سی تھی مگر تم تو جانتے ہو، جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ایک عام سی بات کو بہت خاص بنا دیا جاتا ہے۔ اسے بھی کچھ اسی انداز میں ایڈٹ کیا گیا ہے۔''

وہ یو ایس بی اس سے لے کر سسٹم سے منسلک کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ ننھی سی یو ایس بی مجھے کافی مہنگی پڑی ہے۔ اب یہ نہ پوچھنا کہ اُس نمائندے کو کتنی رقم دی؟ بس اتنا جان لو کہ جتنی بھی دی' اُس کا ڈبل لوں

گی۔“

”تم بہت گہری ہو۔ مجھے وہ نمائندہ تمہارا ہی کوئی بندہ لگ رہا ہے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”تم ہی تو کہتے ہو، آم کھاؤ، پیڑ نہ گنو۔ میں تمہارے ساتھ رہ کر بہت کچھ سیکھتی رہتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ میں پیڑ نہیں گنوں گا۔ کل تم نوٹ گن لینا۔“

اس نے یوایس بی لے کر لیپ ٹاپ سے منسلک کی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اسکرین پر ایک ویڈیو کلپ آنے لگا۔ وہ اسی دن کی ویڈیو تھی جب نیوز چینل کے تین نمائندے بنا اجازت لیے محبوب خان کے کمرے میں گھس گئے تھے اور مووی بناتے رہے تھے۔ ایسے وقت کلپنا نے انہیں دھکے دے کر باہر نکالا تھا۔

اب ایڈیٹنگ کے بعد اس ویڈیو کو دیکھنے سے یہی تاثر مل رہا تھا جیسے کلپنا اور محبوب خان کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں۔

اسے دیکھنے کے بعد آشا نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیوں؟ کام کی چیز ہے نا؟“

”گڈ جاب... پاکستانی جاسوس ثابت ہونے کے بعد اس سے اتنے گہرے تعلقات منظرِ عام پر آئیں گے تو پورا کا پورا ہندوستان ان باپ بیٹی کے خلاف ہو جائے گا۔“

”اس سے صرف رمیش کا ہی نہیں، کلپنا کا کیریئر بھی تباہ ہو جائے گا۔“

”تم بہت چالاک ہو۔ لگے ہاتھوں کلپنا کا کیریئر بھی داؤ پر لگا دیا۔“

”یہ گر بھی تم سے ہی سیکھا ہے۔ اب بتاؤ، کب کرو گے یہ دھماکے...؟“

وہ شیطانی انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آج کی رات انہیں چین سے سونے دو۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ کل صبح کا سورج ان کے لیے کیسے مصائب اور جھمیلے لے کر اُبھرنے والا ہے؟“

☆☆☆

محبوب خان کا موبائل فون گنگنا رہا تھا، اسے پکار رہا تھا۔ اس نے واش روم سے باہر آ کر اسے اٹھایا۔ پھر زیرِ لب مسکرانے لگا۔ فون کے ذریعے کلپنا پکار رہی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ گنگناتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ ”کیسے ہیں آپ...؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں جدا ہوئے آدھا گھنٹا بھی نہیں گزرا ہے اور آپ ایسے خیریت دریافت کر رہی ہیں جیسے بہت دن گزر گئے ہیں۔“

”بہت دن تو نہیں گزرے مگر بہت دنوں کے لیے جدا ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ آج کی ملاقات آخری تھی۔“

اس نے تڑپ کر کہا۔ ”آخری نہ کہیں۔ الیکشن تک میں اپنے ویزے میں توسیع کروا لوں گا۔ ہم پھر ملیں گے۔“

”آپ کے حساب سے ہم ایک ماہ بعد ملیں گے لیکن مجھے کل صبح ہی آپ سے ملنا ہوگا۔“

”آپ نے اپنے ڈیڈ سے وعدہ کیا ہے۔ کیا وعدہ خلافی کریں گی؟“

”مجبوری ہے۔ ملنا بہت ضروری ہے۔“

اس کے لہجے میں شوخی تھی۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اچھا۔ اچانک ہی کونسی ضرورت پڑ گئی؟“

”بس یوں سمجھیں کہ آپ کا دل میری مٹھی میں ہے۔ اگر واپس نہ کیا تو آپ کی دھڑکنیں رک جائیں گی۔“

وہ اس کی بات سن کر ذرا سنجیدہ ہو گیا پھر بولا۔ ”دل جسم کا وہ حصہ ہے جسے ہم نکال کر کسی کو نہیں دیتے۔ لیکن پھر بھی کوئی جانے انجانے میں اسے چرا کر لے جاتا ہے۔ اگر میرا دل آپ کے پاس ہے تو اُسے لوٹانے کے بجائے اپنا دل مجھے دے دیں۔“

کلپنا کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ پہلو بدل کر بولی۔ ”ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”پوچھیں...؟“

”شاید یہ آپ کی زندگی کا سب سے اہم سوال ہوگا اور مجھے یقین ہے اب تک کسی نے آپ سے پوچھا نہیں ہوگا۔“

”آپ پوچھ سکتی ہیں۔“

وہ چند لمحوں تک خاموش رہی۔ پھر دھیرے سے بولی۔ ”ڈو یو لو می...؟“

اس نے ایک گہری سانس ایسے کھینچی جیسے اسے اپنے اندر اتار لینا چاہتا ہو۔ ”آپ نے دل کی بات کی ہے تو بولنے کا حوصلہ مل رہا ہے۔ ورنہ یہی سوچ رہا تھا کہ آپ کیا سوچیں گی؟ میری میزبان بن رہی ہیں اور میں...“

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”ڈو یو لو می...؟“

”یہ سچ ہے، یہ سوال مجھ سے آج تک کسی نے نہیں کیا۔ آپ کر رہی ہیں تو جواب بھی ضرور دوں گا۔“

ان کے درمیان کچھ دیر تک خاموشی رہی۔ وہ لمحاتی انتظار بہت ہی غضب ناک تھا۔ کلپنا کو اپنی ہی دھڑکنیں سنائی

دے رہی تھیں۔ مگر وہ اسے سننا چاہتی تھی۔ پھر وہ گہری سرگوشی میں بولا جیسے سیدھا دل میں اتر گیا۔ ”یس... آئی لو یو...“

کلپنا نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے دل میں اترنے والے کو اپنے اندر... اور اندر چھپا لینا چاہتی ہو۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ہاتھ میں دبے ہوئے سبز پاسپورٹ کو دیکھا۔ وہ محبوب خان کا پاسپورٹ تھا جسے اس نے کلپنا کے بیگ میں رکھوایا تھا۔ یہی سوچا تھا کہ ہوٹل جاتے ہوئے واپس لے لے گا۔ مگر جدائی کے لمحات ایسے تھے کہ وہ دونوں ہی بھول گئے۔

کلپنا نے اس بھول کو یاد دلانے کے لیے اس وقت فون کیا تھا۔ شوخی میں اس پاسپورٹ کو محبوب کا دل کہا تھا۔ کیا معلوم تھا کہ مذاق مذاق میں بات سچ مچ دل تک ہی پہنچ جائے گی۔

وہ اتنے دنوں تک ملاقاتیں کرتے رہے، ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے چراتے رہے۔ کبھی محبت کا اظہار نہ کیا اور کیا بھی تو تب، جب اُن کے درمیان جدائی کا ایک مہینا حائل ہونے والا تھا۔ سچ ہی کہا جاتا ہے کہ خوشی کے ساتھ غم اور ملن کے سنگ جدائی ہوتی ہے۔ اب یہ جدائی اور کشش بڑھا رہی تھی۔

محبوب نے پوچھا۔ ”آپ خاموش کیوں ہیں؟“

”آپ نہ کہو... تم کہو۔“

”آپ نے... میرا مطلب ہے... تم... تم نے سوال کیا، میں نے جواب دیا۔ کیا مجھے کوئی جواب نہیں ملے گا؟“

وہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔ ”تم نے کوئی سوال نہیں کیا ہے۔“

”میری دھڑکنیں سوالی ہیں۔“

”اگر دھڑکنوں کی بولی سمجھتے ہو تو جواب سن لو...“

اس نے اپنا موبائل فون سینے سے لگا لیا۔ محبوب کے کانوں تک اس کی دھڑکنیں پہنچنے لگیں۔ وہ دھڑکنیں الفاظ سے محروم تھیں۔ مگر اس نامحرم کو محرم بنا رہی تھیں۔

چند لمحوں بعد اس نے فون کو کان سے لگا کر کہا۔ ”میں صبح تمہارے پاس آؤں گی۔“

”جذباتی نہ بنو۔ یہ مناسب نہیں ہوگا۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”تمہارا پاسپورٹ میرے پاس ہے۔ میرے خیال سے یہ مناسب نہیں ہوگا۔“

وہ ٹھٹک کر بولا۔ ”پاسپورٹ...؟ اوہ تو... وہ تمہارے بیگ میں تھا؟“

”اب میرے ہاتھ میں ہے۔“

”او گاڈ...! میں اسے کیسے بھول گیا؟“

”تمہاری یہ بھول ہم دونوں کو زندگی بھر یاد رہے گی۔ یہ سچ میں گرین سگنل ثابت ہو رہا ہے۔“

وہ تھوڑی دیر تک ایک دوسرے سے بولتے رہے۔ پھر کلپنا نے کہا۔ ”اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ صبح ملتے ہیں۔“

ان کے درمیان رابطہ ختم ہو گیا۔

کبھی کبھی کسی رات کی صبح نہیں ہوتی۔ بظاہر دن نکل آتا ہے مگر ایسا لگتا ہے جیسے اُس اُجالے میں گزشتہ رات کی سیاہی ملی ہوئی ہے۔

فون کی گھنٹی چیخ رہی تھی۔ وہ گہری نیند میں تھی۔ ابھی جاگنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کسمسا کر کروٹ بدل لی۔ مگر اندازہ ہو رہا تھا کہ فون کے ذریعے پکارنے والا اسے جگا کر ہی دم لے گا۔

اس نے بیزار ہو کر دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ صبح کے سات بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے زیرِ لب بڑبڑائی۔ ”او گاڈ...! اتنی صبح صبح کون گھنٹیاں بجا رہا ہے؟“

پھر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر بولی۔ ”ہیلو کون...؟“

”میں بول رہا ہوں۔“

”اوہ ڈیڈ...! اس وقت کال کر رہے ہیں۔ کیا بھول گئے کہ یہاں ابھی صبح ہوئی ہے؟“

”ابھی اسی وقت ٹی وی آن کرو۔“

اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔ ”ٹی وی...؟“

اس کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”ہاں، ٹی وی... ٹیلی ویژن... کیا بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟“

”تو آپ ڈانٹ کیوں رہے ہیں؟“

”ڈانٹ نہیں رہا ہوں۔ جو بول رہا ہوں، وہ کرو۔“

وہ سائڈ ٹیبل پر رکھے ریموٹ کنٹرول کو اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”آخر بتائیں تو کیا بات ہے؟ اتنی صبح صبح کیا دکھانا چاہتے ہیں؟“

”انڈین نیوز چینل لگاؤ۔“

اس نے ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبایا۔ بیڈ کے سامنے رکھے ہوئے ٹی وی کی بڑی سی اسکرین روشن ہو گئی۔ وہ چینل بدلتے ہوئے بولی۔ ”ڈیڈ! پلیز... سسپنس ختم کریں۔ بولیں کیا بات ہے...؟“

”تمہارے اُس محبوب خان کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

''کیا...؟'' وہ اچھل کر رہ گئی۔ ''محبوب کو گرفتار کیا گیا ہے؟ مگر کیوں؟ کس جرم میں...؟''

ایک چینل پر بریکنگ نیوز آ رہی تھی کہ محبوب خان نامی ایک پاکستانی جاسوس کو گرفتار کیا گیا ہے۔ کلپنا نے شدید پریشانی سے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے ڈیڈ...؟''

''یہ ہوا نہیں ہے، کروایا گیا ہے۔ ایس کے پچارا اسے پاکستانی ایجنٹ ثابت کر رہا ہے۔''

''مگر پچارا کا محبوب سے کیا لینا دینا؟''

''کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اُس کا ٹارگٹ میں ہوں' وہ جوابی حملہ کر رہا ہے۔ مجھ پر الزام لگانا چاہتا ہے کہ میں پاکستانی ایجنٹوں سے تعلقات رکھتا ہوں۔ اسی لیے اس چھوکرے کو مہرہ بنا رہا ہے۔ اور یہ موقع تم نے اُسے دیا ہے۔''

''میں نے...؟''

''ہاں۔ پورے انڈیا میں تم دونوں کے اسکینڈل کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ وہ اسی پوائنٹ کو اچھال رہا ہے۔ اس نے ثبوت کے طور پر تمہارا اور محبوب کا ایک ویڈیو کلپ بھی آن ائر پیش کیا ہے۔ یہ الزام بہت بڑا ہے۔ کیا تم اس کی سنگینی کو سمجھ رہی ہو؟ را والے پیچھے پڑ جائیں گے۔ محبوب کی تو کھال ادھیڑی ہی جائے گی' ہمارا احتساب بھی شروع ہو جائے گا۔''

را کا نام سنتے ہی وہ لرز کر رہ گئی۔ جرم ثابت ہونا تو دور کی بات ہے، وہ لوگ کسی کو شبہے کی بنیاد پر بھی پکڑتے ہیں تو اسے رہائی کے قابل نہیں چھوڑتے۔ خاص طور پر پڑوسی ملک کا کوئی جاسوس یا ایجنٹ پکڑا جاتا ہے تو اسے عبرت کا نشان بنا دیا جاتا ہے۔

وہ بولا۔ ''جس دن محبوب نے اس دھرتی پر قدم رکھا' اس روز سے تم اس کے ساتھ دیکھی جا رہی ہو۔ سمجھاتا تھا کہ اس پاکستانی سے راہ و رسم نہ بڑھاؤ۔ مگر تمہاری سمجھ میں بات نہیں آتی تھی۔ نہ جانے وہ بدبخت کون ہے؟ اس کے پاس تو پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔''

وہ ایک دم سے ٹھٹک کر بولی۔ ''پاسپورٹ...؟ اس کا پاسپورٹ تو میرے پاس ہے۔''

''تمہارے پاس...؟''

وہ بستر سے اتر کر اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''یس ڈیڈ! وہ بھول گیا تھا۔ مجھے ابھی اس کے پاس جانا ہوگا۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ وہاں پاسپورٹ دینے جاؤ گی تو را والے تمہاری گردن دبوچ لیں گے۔ کوئی یہ لحاظ نہیں کرے گا کہ تم سپر ماڈل ہو۔ بس یہ دیکھا جائے گا کہ اس پاکستانی جاسوس کا پاسپورٹ تمہارے پاس سے برآمد ہوا ہے۔''

وہ الجھ کر بولی۔ ''وہ جاسوس نہیں ہے ڈیڈ...!''

''اس کے کمرے سے کچھ ایسی دستاویزات اور آڈیو ویڈیو کیسٹس برآمد ہوئی ہیں جن کے ذریعے شبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ...''

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہ مصیبت میں ہے اور مجھے ہر حال میں اس کی مدد کرنی ہوگی۔ یہ ٹی وی پر دیکھیں... سلائڈ چل رہی ہے۔ پولیس تفتیش کر رہی ہے' را والے اس سے پاسپورٹ مانگ رہے ہیں۔ مجھے جانا ہوگا ڈیڈ...!''

''جذباتی مت بنو کلپنا... بس اتنا سمجھو کہ تم وہاں دشمنوں کے درمیان ہو۔''

''سوری ڈیڈ! میں فون بند کر رہی ہوں۔ بعد میں بات کروں گی۔''

اس نے کوئی جواب سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔ وہ نائٹ ڈریس میں تھی۔ حلیہ بدلنے کا وقت نہیں تھا۔ دل اپنے محبوب کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ وہ سلیپر پہن کر ہینڈ بیگ اٹھا کر دیوانوں کی طرح دوڑتی ہوئی اپنی گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے بنگلے سے باہر نکل گئی۔

صبح صبح کا وقت تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا۔ وہ آندھی طوفان کی رفتار سے ڈرائیو کر رہی تھی۔ روڈ سگنل کی بھی پروا نہیں تھی۔ پروا تھی تو صرف اپنے محبوب کی... وہ پاسپورٹ کے ذریعے اس پر آئی مصیبت کو کسی حد تک ٹال سکتی تھی اور یہ جذبہ اسے دوڑائے چلا جا رہا تھا۔

اس کی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ ایسے ہی وقت جیسے پر کٹ گئے... زوردار آواز کے ساتھ گاڑی کے پچھلے دو پہیے برسٹ ہوئے تھے۔ اس نے فوراً ہی بریک لگائے۔ گاڑی کو سڑک کے کنارے روک کر باہر آ کر دیکھا۔ دونوں پہیے ناکارہ ہو چکے تھے۔ وجہ جاننے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ جلدی میں تھی' یہ دیکھ نہیں پائی کہ وہ پہیے خود بخود برسٹ نہیں ہوئے تھے بلکہ انہیں فائر کر کے ناکارہ بنایا گیا تھا۔ یقیناً سائیلنسر لگے ہتھیار سے گولیاں چلائی گئی تھیں' اسی لیے فائرنگ کی آواز نہیں گونجی تھی۔

وہ تیزی سے پلٹ کر اگلی سیٹ کی طرف آئی۔ پھر ہینڈ بیگ اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ دور فٹ پاتھ کے قریب ایک ٹیکسی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی اس کی طرف

جانا چاہتی تھی۔ مگر ایسے ہی وقت کسی نے پیچھے سے آ کر اسے دبوچ لیا۔ گرفت بہت مضبوط تھی۔ وہ پھڑپھڑا کر رہ گئی۔ ایک ذرا گردن گھما کر دیکھنے کی کوشش کی۔ نہ جانے وہ کون اجنبی تھا؟ کیوں اس کا راستہ روک رہا تھا؟

وہ چیخنا چاہتی تھی مگر اس سے پہلے ہی اس کے منہ پر ایک رومال جما دیا گیا۔ بے ہوشی کے اندھیروں میں ڈوبتے دل نے تڑپ کر اپنے محبوب کو پکارا۔ وہ اسے بچانا چاہتی تھی مگر خود ڈوب گئی تھی۔ اسے رہائی دلوانا چاہتی تھی مگر خود جکڑی گئی تھی۔

ایک رات پہلے محبوب کا پاسپورٹ اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ فون پر محبوب سے بول رہی تھی۔ ''بس یوں سمجھیں کہ آپ کا دل میری مٹھی میں ہے۔ اگر واپس نہ کیا تو آپ کی دھڑکنیں رک جائیں گی۔''

ہائے میرے محبوب! تیری آزادی کا گرین سگنل میرے پاس ہے۔

وہ گرین سگنل اب سرخ ہو گیا تھا۔ محبوب خان جہاں جا کر پھنسا تھا' وہاں سے زندگی کی طرف کوئی راستہ پلٹ کر نہیں آتا تھا۔

☆☆☆

محبوب کو گرفتار کرتے ہی اسے سیدھا ایک ٹارچر سیل میں پہنچایا گیا تھا۔ سب سے پہلے سوال کیا گیا۔ ''تم کون ہو؟ انڈیا کیسے آئے ہو؟ کس راستے سے آئے ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں باقاعدہ پاسپورٹ اور ویزا حاصل کر کے یہاں آیا ہوں۔''

''ہوٹل کے کمرے میں تمہارا جو سامان تھا' اسے ضبط کیا گیا ہے۔ اس میں تمہارا پاسپورٹ نہیں ہے۔ تم یقیناً کسی چور راستے سے ہمارے دیش میں آئے ہو۔''

اس نے کہا۔ ''میرا پاسپورٹ غلطی سے کلپنا جی کے پاس رہ گیا تھا۔ آپ ابھی انہیں کال کریں۔ وہ ابھی پاسپورٹ یہاں لے آئیں گی۔''

اسے کال کی گئی۔ معلوم ہوا' فون بند ہے۔ حکم صادر کیا گیا کہ کلپنا نے پاکستانی جاسوس کو پناہ دی تھی۔ اس کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی رہی تھی۔ لہٰذا اسے بھی گرفتار کیا جائے۔

را کے کارندوں نے اس کے گھر کا محاصرہ کیا۔ پتا چلا' وہ موجود نہیں ہے۔ اسے ان مقامات پر ڈھونڈا گیا' جہاں وہ وقت گزارا کرتی تھی لیکن وہ کہیں نہیں تھی۔ یہ حقیقت کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔

سب کو یقین ہو گیا کہ وہ گرفتاری کے خوف سے روپوش ہو گئی ہے اور محبوب چور راستے سے ہندوستان آیا ہے۔

تب اس پر تشدد کا آغاز ہوا۔ پہلے تو عام طریقے سے لاتوں سے' ہاتھوں سے' ڈنڈوں سے پٹائی کی گئی۔ اس سے کہا گیا کہ وہ پاکستانی جاسوس ہونے کا اعتراف کرے۔

مگر وہ خوانخواہ ایک مجرم ہونے کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ وہ قسمیں کھا کر کہتا رہا کہ اپنے وطن سے کرکٹ میچ دیکھنے آیا ہے۔ جاسوس' دہشت گرد یا تخریب کار نہیں ہے۔

اس کے ہر انکار کے بعد تشدد میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسے بھوکا رکھا گیا۔ الٹا لٹکا کر ڈنڈوں سے ہڈیوں پر اور بدن کے جوڑوں پر ضربیں لگائی گئیں۔ ایسا ظلم ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ چیختا چلاتا رہتا تھا۔ لیکن کوئی اس کی آہ و بکا سننے والا' اسے ظلم و ستم سے نجات دلانے والا نہیں تھا۔

اس کی چیخیں کلپنا تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ کہاں ہے؟ ایک نیم تاریک کمرے میں سونے، لیٹنے اور بیٹھنے کے لیے بیڈ اور کرسیاں تھیں۔ کھڑکیاں اور دروازے باہر سے بند رہتے تھے۔ اسے چیخنے چلانے کے قابل نہیں رکھا گیا تھا۔ پہلے تو وہ بے ہوشی کے باعث کچھ کمزور ہوئی تھی۔ پھر اسے اعصابی کمزوری کا ایک انجکشن لگایا گیا تھا۔ وہ بستر پر پڑی رہتی تھی۔

ایک نوجوان دو وقت آ کر کھانا رکھ جاتا تھا۔ اسے بڑی حسرت سے دیکھتا رہتا تھا۔ وہ کھاتی پیتی تھی' باتھ روم تک جاتی تھی۔ پھر کمزوری سے ہانپتی ہوئی بستر پر گر جاتی تھی۔ باہر تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے اس کے پاس فون نہیں تھا۔ بس ایک امید تھی کہ باپ اس کی عدم موجودگی سے پریشان ہو کر اسے تلاش کرے گا۔ پھر اپنے وسیع ذرائع اور اختیارات استعمال کرتے ہوئے اپنی بیٹی کو ڈھونڈ نکالے گا۔

ہوٹل کے کمرے سے جو دستاویزات ملی تھیں' ان میں ایک خط تھا۔ کسی نے محبوب خان کو لکھا تھا۔ ''جیسا کہ طے ہو چکا ہے' تم کرکٹ میچ دیکھنے کے بہانے آؤ گے۔ یہاں کلپنا کے ساتھ تمہاری رہائش کا جواز پیدا کیا جائے گا۔

''جب تم ائرپورٹ سے باہر آؤ گے تو کلپنا پر قاتلانہ حملے کا ڈراما پلے کیا جائے گا۔ تم ایک ہیرو کی طرح اسے قاتلانہ حملے سے بچاؤ گے۔ حملہ آور ہمارا آدمی ہوگا۔ کبھی گرفتار نہیں ہوگا۔ سیاسی نیتا ایس کے پچارا پر قاتلانہ حملے کا الزام لگایا جائے گا اور اس کی سیاسی ساکھ کو گرایا جائے گا۔''

اس خط کی تحریر سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ محبوب خان باقاعدہ پلاننگ کے مطابق کلپنا سے ڈرامائی انداز میں دوستی

کر کے اس کے ساتھ رہنے آیا ہے اور کلپنا محبوب کے ساتھ راتیں کالی کرتے ہوئے ایس کے پجارا کے سیاسی کیریئر کو تباہ کرنے والی ہے اور اس طرح اس کے باپ رمیش مکرجی کی سیاسی پوزیشن مضبوط ہونے والی ہے۔

کچھ روز پہلے کلپنا اور محبوب خان ہوٹل کے کمرے میں تھے۔ ایسے وقت ایک چینل کی ٹیم ان کی مووی بناتی ہوئی اچانک ہی آدھمکی تھی۔ اس ویڈیو میں یہ دیکھا گیا کہ کلپنا ان کی آمد پر اور ویڈیو بنانے پر اعتراض کر رہی ہے۔ یعنی یہ بھید کھل رہا تھا کہ وہ پاکستانی جاسوس کے ساتھ تنہائی میں رنگین لمحات گزارتی رہتی ہے۔

وہ تمام ثبوت محبوب خان کے خلاف تھے۔ یہ ثابت ہو رہا تھا کہ اس کے تعلقات کلپنا سے بہت پہلے سے تھے۔ اس بار الیکشن سے پہلے ایس کے پجارا کو سیاسی طور پر کمزور بنانے کے لیے اس پاکستانی کو کلپنا اور اس کے باپ رمیش مکرجی نے ڈرامائی انداز میں وہاں بلایا ہے۔

ایسے تمام شواہد کے پیش نظر محبوب خان پر تھرڈ ڈگری کے حربے آزمائے گئے۔ اس کی انگلیوں کو آہنی شکنجے میں کس کر پلاس نما آلے سے ناخن اکھاڑے گئے۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیختے چیختے بے دم ہو جاتا تھا۔ اس سے پوچھا جاتا تھا کہ اس کے ساتھ اور کتنے جاسوس اور تخریب کار پاکستان سے آئے ہوئے ہیں؟ وہ ان کے نام بتائے ورنہ مارا جائے گا۔

نہ وہ جاسوس تھا' نہ کسی تخریب کار کو جانتا تھا۔ اپنی بے گناہی کی قسمیں کھانے کے سوا اور کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ اذیتیں پہنچانے کی انتہا کر رہے تھے۔ اسے بجلی کے جھٹکے پہنچا رہے تھے۔ ایسی درندگی اور ناقابل برداشت اذیتوں کے باعث وہ نیم پاگل ہو گیا تھا۔ بہت کم ہوش و حواس میں رہتا تھا۔ اپنے آپ کو اور دنیا کو رفتہ رفتہ بھولتا جا رہا تھا۔

اس کی حالتِ زار پوچھ رہی تھی کہ دو پڑوسی ممالک ایک دوسرے پر اعتبار کیوں نہیں کرتے؟ خصوصاً ہندوستانیوں کو کب تک اس بات کا غصہ رہے گا کہ مسلمانوں نے بھارت کے ٹکڑے کر کے پاکستان بنایا ہے؟ یہ لوگ پاکستان کو کب تسلیم کریں گے؟

اور جب تک تسلیم نہیں کریں گے' تب تک وہ محبت سے آنے والے اور کھیل تماشوں میں حصہ لینے والے پاکستانیوں پر جھوٹے الزامات عائد کر کے انہیں جیل میں ڈالتے رہیں گے... بڑی درندگی سے ٹارچر کرتے ہوئے اپنا غصہ اتارتے رہیں گے۔

محبوب خان بلک بلک کر کہتا رہا کہ پاکستانی سفارت خانے سے معلومات حاصل کی جائیں گی تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ جاسوس اور تخریب کار نہیں ہے۔ ایک پُرامن شہری ہے۔ اس کے پاسپورٹ اور ویزا کا ریکارڈ سفارت خانے سے حاصل ہو جائے گا۔ لیکن انہوں نے سفارت خانے کو یہ خبر تک نہ ہونے دی کہ ایک پاکستانی نوجوان کو جاسوسی کے الزام میں قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔

کلپنا ایک نیم تاریک کمرے میں اپنے محبوب کو یاد کرتی رہتی تھی۔ بھگوان سے پرارتھنا کرتی تھی کہ محبوب خان گرفتاری کے بعد کسی مصیبت میں نہ پڑے۔ راوالے اس پر ظلم نہ کریں۔ وہ بس یونہی اپنے دل کو تسلیاں دیتی رہتی تھی۔

اور محبوب تو ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ کبھی ہوش میں رہتا تو گھر کے ایک ایک فرد کو یاد کرتا۔ پھر کلپنا اس کے خیالوں میں آجاتی۔ اس سے پوچھتی۔ "یہ انسان سرحدیں کیوں بناتا ہے؟ تم نے اپنے ملک کی سرحد پار کی۔ میرے پاس آئے۔ میں نے اپنے دھرم کی سرحد پار کی اور ہندو ہو کر مسلمان کی دھڑکنوں سے لگ گئی۔

"اب دو ملکوں کی بنیادی نفرت ہمیں جدا کر رہی ہے۔ یہ لوگ سیاسی انتقام لینے کے لیے دلوں کا خون کیوں کرتے ہیں؟ میرے محبوب! کیا ہم کبھی مل پائیں گے؟"

وہ روز صبح اپنے گھر والوں سے فون پر باتیں کیا کرتا تھا۔ دوسری صبح اس کی کال نہیں آئی تو باپ نے اس کے فون نمبر پنچ کیے۔ تب یہ معلوم ہوا کہ اس کا نمبر آف ہے۔

باپ اور بھائی کو تشویش ہوئی۔ انہوں نے کئی بار نمبر پنچ کیے۔ ہر بار وہی ریکارڈنگ سنائی دیتی رہی۔ چھوٹی بہن نے تڑپ کر پوچھا۔ "ابو! بھائی کہاں ہیں؟ ان کا فون بند کیوں ہے؟ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ کسی طرح ان کی آواز سنیں۔ معلوم کریں' وہ خاموش کیوں ہیں؟"

انہوں نے سفارت خانے کے دفتر میں پہنچ کر کہا۔ "ہمارا بیٹا محبوب خان کرکٹ میچ دیکھنے انڈیا گیا ہے۔ آج صبح سے اس کی کوئی خبر نہیں مل رہی ہے۔ فون بند ہو گیا ہے۔ ہم اس کی خیریت معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پلیز... کسی طرح اس سے رابطہ کرائیں۔"

سرکاری دفاتر میں بے حسی عام ہو گئی ہے۔ انسانی جذبات کو اور رشتوں کی اہمیت کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس دفتر سے جواب ملا۔ "ہم کیا جانیں' آپ کا بیٹا انڈیا جا کر کہاں عیاشی کرتا پھر رہا ہے؟ آج کل کے نوجوان بے پروا ہوتے ہیں۔ گھر سے نکلتے ہی والدین کو بھول جاتے ہیں۔

آپ انتظار کریں۔ آج اس نے فون نہیں کیا ہے تو کل کرلے گا۔"

انہوں نے صبر کیا۔ رات سے صبح ہو گئی۔ بیٹے کی طرف سے کوئی فون کال نہیں آئی۔ وہ دوسرے دن پھر سفارت خانے پہنچے تو پوچھا گیا کہ وہ کب انڈیا گیا ہے؟ اس کا پاسپورٹ' ویزا اور دیگر متعلقہ کاغذات کی فوٹو کاپیاں لائی جائیں۔ پھر کچھ معلوم کیا جائے گا۔

انہیں بھارتی سفارت خانے سے بھی یہی جواب مل رہا تھا۔ ایک ملک سے دوسرے ملک جانے والے اپنے سفری کاغذات کی فوٹو کاپیاں اپنے گھروں میں چھوڑ کر نہیں جاتے۔ ان کا ریکارڈ دو ممالک کے سفارت خانوں میں ہوتا ہے۔ لیکن وہ فائلیں ڈھونڈ کر اپنے فرائض انجام دینے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ دیارِ غیر جانے والوں کے مسائل حل کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ کوتاہی برتی جاتی ہے۔

انہوں نے تیسرے دن ایک مشہور و معروف ٹی وی چینل سے رابطہ کیا۔ انہیں اپنا دکھڑا سنایا تو دوسرے دن دنیا والوں کے سامنے یہ بات آئی کہ ایک پاکستانی نوجوان انڈیا جا کر لاپتا ہو گیا ہے اور متعلقہ ادارے اس کا کھوج نہیں لگا رہے ہیں۔ تب دونوں ملکوں کے سفارت خانے حرکت میں آگئے۔ انہوں نے انکوائری کی تو معلوم ہوا کہ محبوب خان گم نہیں ہوا ہے۔ وہ قانونی گرفت میں ہے۔

اس پر یہ الزام تھا کہ وہ جاسوس اور تخریب کار ہے۔ اگرچہ باقاعدہ پاسپورٹ کے ذریعے آیا تھا لیکن یہاں آتے ہی تخریبی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے اپنا پاسپورٹ کہیں پھینک کر روپوش ہو گیا تھا۔ اسے ایک خفیہ پناہ گاہ سے گرفتار کیا گیا ہے۔

پاکستان کی طرف سے اسے ایک پُرامن شہری کہا جا رہا تھا۔ اسکول سے لے کر کالج اور کھیل کے میدان تک اس کی نیک نامی کا ریکارڈ پیش کیا جا رہا تھا۔

اس کے جواب میں بھارتی پولیس اور انٹیلی جنس کہہ رہی تھی کہ محبوب خان کے خلاف آڈیو' ویڈیو اور تحریری دستاویزات ٹھوس ثبوت کے طور پر موجود ہیں۔ بھارتی عدالت میں اس کا مقدمہ چلے گا اور بھارتی قانون کے مطابق اسے سزا دی جائے گی۔

یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ قانونی فیصلے سے پہلے ہی اس پاکستانی سے غیر انسانی سلوک کیا گیا ہے اور انتہائی درندگی سے نیم پاگل بنا دیا گیا ہے۔

رمیش مکرجی کو دیر سے اطلاع ملی کہ اس کی بیٹی لاپتا ہو گئی ہے۔ وہ لندن میں تھا۔ اس نے فون پر ایس کے پجارا کو غصہ دکھایا۔ اس سے پوچھا۔ "میری بیٹی کہاں ہے؟"

اس نے کہا۔ "تمہاری بیٹی گھر میں ہوگی یا اس مسلمان کے ساتھ کہیں منہ کالا کر رہی ہوگی۔"

"بکواس مت کرو۔ پہلے تم نے اس پر قاتلانہ حملہ کروایا' اب اغوا کرایا ہے۔ اگر اس کے بدن پر ہلکی سی بھی خراش پڑے گی تو میں تمہاری بیٹیوں کا حشر کر دوں گا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "غصے میں انسان اسی طرح چیلنج کرتا ہے اور بے تکی باتیں کرتا رہتا ہے۔ میری بیٹیوں پر آنچ نہیں آئے گی۔ تم اپنی بیٹی کا ماتم کرتے رہو۔"

"میں جانتا ہوں' تم فون پر سچ بولنے کی غلطی نہیں کرو گے۔ کہیں ملاقات کرو۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے آرہا ہوں۔"

"ہزار بار آؤ۔ میں خود تمہیں ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ آؤں گا۔ آخر ہم اس دیش کے نیتا ہیں۔ مل بیٹھ کر دیش کی بھلائی کے لیے کچھ کریں گے۔"

رمیش مکرجی ایک طویل سیاسی جنگ لڑنے کے بعد ایس کے پجارا سے ہار ماننے والا تھا۔ بیٹی جب تک واپس نہ ملتی' تب تک وہ اس کے خلاف کوئی چال نہیں چل سکتا تھا۔

وہ اپنے دیش سے بہت دور لندن میں تھا۔ اس کے پی اے نے کلپنا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی۔ رمیش کے آدمی اسے تلاش کر رہے تھے۔ وہ صبح کی فلائٹ سے وہاں پہنچا تو ائرپورٹ پر پجارا نے اسے ویلکم کہا۔ بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ وہ پجارا کی ائرکنڈیشنڈ کار میں آکر بیٹھ گیا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ دروازے اندر سے لاک کر دیے گئے۔

پجارا نے کہا۔ "ہماری باتیں کوئی نہیں سن سکتا۔ میں اعتراف کرتا ہوں' تمہاری بیٹی میرے پاس ہے۔"

رمیش نے بے بسی سے دیکھا۔ وہ بولا۔ "اطمینان رکھو۔ وہ آرام سے ہے۔ اگرچہ میں عیاش ہوں اور تمہاری بیٹی حسن و شباب کا چلتا پھرتا جادو ہے۔ اس کے باوجود میں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا ہے۔"

"میں کیسے یقین کرلوں؟"

"میں عورت سے زیادہ سیاست کو اہمیت دیتا ہوں۔ سیاسی عروج حاصل ہوتا رہے تو دنیا کی حسین ترین عورتیں میسر آتی رہتی ہیں۔"

"میں بیٹی سے بات کروں گا' تب یقین کروں گا۔"

پجارا نے اپنے فون پر نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا

پھر رابطہ ہونے پر کہا۔ ”بیٹے اجے! اونٹ پہاڑ کے نیچے آگیا ہے۔ کلپنا کے پاس جاؤ اور فون اسے دو۔“

رمیش بڑی بے چینی سے فون کو دیکھ رہا تھا۔ پچارا نے کہا۔ ”وہ میرے بیٹے کی نگرانی میں ہے۔ ابھی اس سے بات کر سکو گے۔“

پھر اس نے کلپنا کی آواز سن کر کہا۔ ”اپنے باپ سے بات کرو۔“

اس نے فوراً ہی فون لے کر کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”کلپنا! میری جان... میں بول رہا ہوں۔ تم کیسی ہو بیٹی!“

باپ کی آواز سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بولی۔ ”میں جیسی بھی ہوں، محبوب کہاں ہے؟“

”محبوب کو نرک میں جانے دو۔ اپنی بات کرو۔“

”میں بھی نرک میں جاؤں گی۔ اسے خیر خیریت سے دیکھوں گی پھر آپ سے اپنی بات کروں گی۔“

”تمہیں اب بھی عقل نہیں آئی۔ میں نے سمجھایا تھا' اس پاکستانی سے دور رہو مگر تم نے بات نہیں مانی۔ اب دیکھو! تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

”ڈیڈ! میں چشم تصور سے دیکھ رہی ہوں۔ محبوب کے ساتھ ٹارچر سیل میں کیا ہو رہا ہوگا...؟“

”بھگوان کے لیے تم اپنی فکر کرو کہ ابھی تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟“

”میں اپنے دیش میں' اپنی دھرتی پر ہوں۔ وہ پردیس میں ہے۔ پڑوسی ہونے کے ناتے ہمارا مہمان ہے اور آپ اچھی طرح سمجھ رہے ہیں' وہ میرے دل کا ارمان ہے۔ میری جان ہے۔ میں اس کے ساتھ جیوں گی' ورنہ مر جاؤں گی۔“

باپ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”اوہ گاڈ! تم تو اس کے لیے پاگل ہو رہی ہو۔ ابھی اتنا بتا دو کہ کسی نے بُری نیت سے تمہیں ہاتھ تو نہیں لگایا ہے؟“

”نہیں۔ پچارا کا بیٹا اجے یہاں آتا رہتا ہے۔ اگرچہ یہ باپ بیٹے دشمن ہیں مگر شرافت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ اپنے تمام ذرائع اور اختیارات کام میں لا کر محبوب کو رہا کرائیں۔“

پچارا نے کہا۔ ”بات مختصر کرو۔“

وہ بیٹی سے بولا۔ ”ابھی میں تمہاری رہائی کے لیے سودا کر رہا ہوں۔ زیادہ بات نہیں کر سکوں گا۔ جلد ہی ہماری ملاقات ہوگی۔“

پچارا نے اس سے فون لے کر اسے بند کر دیا پھر پوچھا۔ ”بولو... ! بیٹی کی رہائی کے لیے کیا کرو گے؟“

اس نے پوچھا۔ ”تم کیا چاہتے ہو؟“

”تم میرے علاقے سے الیکشن نہیں لڑو گے۔ باقی دوسرے امیدواروں کو میں آسانی سے مات دے سکوں گا۔“

رمیش مکرجی اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولا۔ ”اس پہلو سے سوچو کہ بیٹی ایک مسلمان کے ساتھ بدنام ہو رہی ہے۔ ہندو ناراض ہیں' اس بار تمہیں کم سے کم ووٹ ملیں گے۔“

وہ تائید میں سر ہلا کر بولا۔ ”بیٹی کی نادانی مجھے کمزور بنا رہی ہے۔“

پچارا نے کہا۔ ”اب اس کی گمشدگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس نے ایک پاکستانی جاسوس کو اپنے گھر میں رکھا تھا اور گرفتاری کے خوف سے کہیں روپوش ہو گئی ہے۔“

”مانتا ہوں' تم نے اسے اغوا کر کے میری سیاسی پوزیشن بہت کمزور کر دی ہے۔ پھر بھی میں دوسرے علاقے سے الیکشن لڑوں گا۔ تمہارے مقابل نہیں رہوں گا۔ کلپنا کو واپس کر دو۔“

”کیا مجھے نادان بچہ سمجھتے ہو؟ بیٹی کو حاصل کرتے ہی پھر سے اڑ جاؤ گے۔ صرف تین ماہ کی بات ہے۔ الیکشن کا نتیجہ برآمد ہوتے ہی' کامیابی ملتے ہی اسے تمہارے گھر بھیج دوں گا۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو؟ کیا وہ تین ماہ تک تمہاری قید میں رہے گی؟“

”مجبوری ہے۔ میں تم پر بھروسا نہیں کروں گا۔“

وہ کار کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”اب یہاں سے جاؤ۔ میرے خلاف زہر اگلو گے تو بیٹی کی لاش بھی نہیں ملے گی۔ میرے مقابل نہیں آؤ گے تو وہ گھر آجائے گی۔ تین ماہ تک کیلنڈر دیکھتے رہو۔“

”میں بہت مجبور ہو کر تمہاری بات مان رہا ہوں۔ مگر اتنی سہولت دو کہ فون پر بیٹی سے بات کرتا رہوں۔ اسے بھی اطمینان ہوگا کہ تین ماہ بعد رہائی پانے والی ہے۔“

”تین ماہ میں تین بار اس سے بات کر سکو گے۔ اب جاؤ، مجھے اور بھی مصروفیات ہیں۔“

وہ سر جھکا کر کار سے باہر آگیا۔ انہوں نے کلپنا کی سلامتی اور رہائی کی باتیں کی تھیں۔ ان کی نظروں میں محبوب خان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اسے سیاسی بساط پر ایک مہرے کی طرح چلا گیا تھا اور بساط کے خانے میں مات کھانے کے

لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔

مگر کلپنا اسے چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اگرچہ اپنے محبوب کی سلامتی اور رہائی کے لیے کچھ کر نہیں سکتی تھی لیکن اس کی محبت سے باز آنے والی بھی نہیں تھی۔ پچارا کا بیٹا اجے کھڑکی کھول کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اب سے پہلے بھی بارہا دیکھ چکا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ اس کے دل میں دھڑکتی رہتی تھی اور وہ اسے نظر انداز کر کے اپنے دل پر جبر کرتا آرہا تھا۔

اس لیے جبر کر رہا تھا کہ باپ کی نیت کو سمجھتا تھا۔ اس نے بیٹے سے کہا تھا۔ ”خبردار! اسے ہاتھ نہ لگانا۔ میں نے اسے اپنے لیے رکھا ہے۔ الیکشن تک پرہیز کرتا رہوں گا۔ اس کا باپ مکرجی اس سے فون پر باتیں کرتا رہے گا اور وہ کہتی رہے گی کہ پچارا شرافت کا ثبوت دے رہا ہے۔ مگر الیکشن میں کامیابی کے بعد میں اپنی بات اور شرافت سے پھر جاؤں گا۔ اس خوبصورت بلا نے اپنے پیچھے بہت دوڑایا ہے۔ پریس کانفرنس میں میرے خلاف زہر اگلتی رہی ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں... اس کی بوٹی بوٹی سے کھیلتا رہوں گا۔“

اجے اسے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”یہ مجھے کیوں نہیں مل سکتی؟ میں جوان ہوں۔ یہ میرے برابر کی ہے۔ پتا جی کو اپنا بڑھاپا کیوں دکھائی نہیں دیتا؟“

کلپنا نے سر اٹھا کر دیکھا تو کھڑکی پر نظر پڑتے ہی چونک گئی۔ وہاں اجے کھڑا اسے تک رہا تھا۔ کوئی کسی کے اندر کی بات نہیں جانتا۔ لیکن لڑکیاں آنکھ ملتے ہی دیکھنے والے کے ارادوں کو بھانپ لیتی ہیں۔ کلپنا نے سوچا' باپ بیٹے کی نظریں ایک جیسی ہیں۔ دونوں ہی ہوس کے کاسے میں جوانی کی بھیک مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس آکر بولی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا دروازہ کھول کر نہیں آسکتے؟“

”پتا جی نے کہا ہے' میں دور ہی دور سے تمہاری نگرانی کروں۔“

”کیا نزدیک آؤ گے تو جل جاؤ گے؟“

”دل کی بات بولوں؟“

”ہاں۔ بولو؟“

”جل رہا ہوں۔ تمہیں چھو کر راکھ ہو جانا چاہتا ہوں۔“

”میں نے آج تک کسی کو چھونے کی اجازت نہیں دی۔“

”وہ دن آئے گا' جب پتا جی تمہیں چھونے کی حد سے گزر جائیں گے۔“

”اور تم کھڑکی سے دیکھتے رہ جاؤ گے؟“

اس نے طنز کا نشتر چبھویا تھا۔ وہ بے چین ہو کر بولا۔ ”میرا دل تمہیں پانے کی ضد کر رہا ہے۔ میں سوچتا رہ جاتا ہوں کہ کیا کروں؟“

”سوچتے ہو کہ باپ کے رقیب بنو گے تو وہ گھر سے نکال دے گا۔ اس کی دولت اور جائداد دوسرے بھائیوں کو ملے گی۔“

”ہاں۔ یہی ہوگا۔“

”میرے ڈیڈی تمہارے باپ سے زیادہ دولت مند ہیں اور میں ان کی اکلوتی اولاد ہوں۔ جو میرا دل جیت لے گا' وہ ان کی تمام دولت اور جائداد کا مالک بن جائے گا۔“

”کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟“

”جو جیالا ہوگا' محبوب خان کو قانون کے شکنجے سے نکالے گا، میں اس سے شادی کروں گی۔“

”تم فون پر اپنے ڈیڈی سے بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ وہ محبوب خان کو رہائی دلائیں۔ تمہارا دل اس مسلمان پر اٹکا ہوا ہے۔ پھر مجھ سے شادی کیسے کرو گی؟ کرو گی بھی تو دل سے نہیں کرو گی۔“

”محبوب کو نئی زندگی ملے گی۔ وہ اپنے وطن واپس چلا جائے گا تو میں دل سے تمہاری قدر کروں گی۔ دلوں میں تعصب رکھنے والے افسران اس پر ظلم کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ ثابت کرنا چاہیے کہ تمام ہندوستانی ظالم نہیں ہیں۔ وہ پاکستان سے آنے والوں کو مہمان سمجھ کر انہیں مان دیتے ہیں اور اپنی دھرتی پر تحفظ فراہم کرتے ہیں۔“

”تم درست کہہ رہی ہو۔ ہم سچے ہندوستانی کی طرح محبوب خان کو جھوٹے الزام سے بری کرا سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں' پتا جی نے تمہیں اس کے ساتھ بدنام کرنے کے لیے کیسی کیسی چالیں چلی ہیں اور اسے کس طرح پاکستانی جاسوس اور تخریب کار ثابت کیا ہے؟“

وہ کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کے اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”بھگوان کے لیے' کسی طرح ثابت کر دو کہ وہ تمام ثبوت جھوٹے ہیں۔“

کلپنا نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تھا۔ فاصلہ مٹ گیا تھا۔ اجے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی نرمی اور گرمی کو دور تک محسوس کرنے لگا۔

☆☆☆

محبوب خان پر جھوٹے الزامات اور گرفتاری کوئی نئی

بات نہیں تھی۔ اب سے پہلے بھی کئی بار پاکستانیوں کو جاسوس اور تخریب کار کہہ کر ان پر مقدمہ چلائے بغیر مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ ٹارچر سیل میں ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا گیا ہے۔

کتنے ہی پاکستانی وہاں کی جیلوں میں مارے گئے۔ سفارتی سطح پر بارہا احتجاج کیا گیا۔ دونوں ملکوں کے درمیان قیدیوں کے تبادلے بھی کیے گئے۔ لیکن بے گناہ پاکستانی جب بھارتی جیل سے رہا ہو کر آئے تو وہ اپنی صحت اور سلامتی ہار چکے تھے۔ بیمار اور ہڈیوں کے ڈھانچے بن چکے تھے۔

محبوب خان کی رہائی کے لیے سفارتی سطح پر معاملات طے نہیں ہو رہے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ وہ مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس کے خلاف ٹھوس ثبوت ہیں۔ لہٰذا اسے رہا نہیں کیا جائے گا۔ اس کی رہائی کے لیے پاکستان قانونی جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔

اور کلپنا ہر قیمت پر اسے ظالموں سے نجات دلانے کا عزم کر چکی تھی۔ اسی لیے اس نے پچارا کے بیٹے کو اپنی قیمت اور اہمیت بتائی تھی۔ وہ باپ سے بغاوت کر کے اسے حاصل کر سکتا تھا اور اس کے باپ کی دولت و جائداد میں حصے دار بن سکتا تھا۔

یہ بہت بڑی آفر تھی۔ دولت بھی ملنے والی تھی اور جوانی کی سوغات بھی... اس رات کلپنا کی نگرانی کے لیے اجے کے بڑے بھائی کی ڈیوٹی تھی۔ وہ سب ہی بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ نیند کے وقت جاگتے نہیں تھے۔ فرائض کی ادائیگی کے لیے ملازموں پر بھروسا کرتے تھے۔ وہ معمول کے مطابق امپورٹڈ وھسکی پی کر سو گیا اور ملازم چوکیدار جاگتا رہا۔

اجے اپنے بھائی کی عادت جانتا تھا کہ وہ عیاش اور آرام طلب ہے۔ کلپنا ان کے باپ کا مال تھی۔ اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ اس لیے حلق تک بھر کر سو گیا تھا۔

تب آدھی رات کے بعد اجے نے چوکیدار پر پیچھے سے حملہ کیا۔ وہ چکرا کر گر پڑا۔ جواباً حملہ نہ کر سکا۔ یہ نہ دیکھ سکا کہ کس نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر قیامت ڈھائی ہے؟ اس طرح وہ کلپنا کو وہاں سے نکال کر لے گیا۔

دوسری صبح ایس کے پچارا کو معلوم ہوا کہ اس کا ووٹ بینک بڑھانے والی چڑیا پنجرے سے اڑ گئی ہے۔ اس نے بڑے بیٹے کو گالیاں دیں، اسے جوتے مارے پھر گھر سے نکال دیا۔ لیکن جو نکل گئی تھی، وہ اس کے ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔

کلپنا نے فون کے ذریعے اپنے باپ کو اطلاع دی کہ وہ ایس کے پچارا کی قید سے آزاد ہو گئی ہے۔

رمیش نے پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟ فوراً گھر آؤ۔''

اس نے کہا۔ ''میری قبل از وقت گرفتاری ضمانت حاصل کریں۔ عدالت میں اس الزام کو غلط ثابت کریں کہ میں نے ایک پاکستانی جاسوس کو پناہ دی تھی اور اس کے لیے لازمی ہے کہ محبوب خان پر عائد کیے گئے جھوٹے الزامات کو بھی غلط ثابت کیا جائے۔ میں الزامات سے بری ہونے کے بعد منظرِ عام پر آؤں گی۔''

رمیش برسرِ اقتدار پارٹی کا لیڈر تھا۔ اس نے اپنے اختیارات اور ذرائع استعمال کیے۔ بیٹی کو قانونی تحفظ فراہم کیا۔ ایس کے پچارا کے خلاف مقدمہ دائر کیا کہ اس نے کلپنا کو اغوا کیا ہے اور اسے کہیں حبسِ بے جا میں رکھا ہے۔

کلپنا ایک مکان میں اجے کے ساتھ تھی۔ وہ چھپ کر اس سے ملنے آتا تھا اور یہ بتاتا رہتا تھا کہ محبوب خان کے خلاف جو ثبوت ہیں، انہیں غلط ثابت کرنے کے لیے وہ کیا کر رہا ہے؟ اسے اپنے باپ کا اعتماد حاصل تھا۔ وہ گھر کا بھیدی تھا۔ یہ جانتا تھا کہ محبوب کو جاسوس ثابت کرنے کے لیے اس کے باپ پچارا نے وہ خط لکھوایا تھا اور وہ جعلی خط کس نے لکھا تھا...؟

اجے دل و جان سے کلپنا کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس نے کلپنا کے باپ کو اس جعلی خط لکھنے والے کے پاس پہنچا دیا۔ جب اس جعلساز پر تھرڈ ڈگری کے حربے استعمال کیے گئے تو اس نے اپنی جعلسازی کا اعتراف کر لیا۔ یہ ٹھوس گواہی مل گئی کہ وہ خط محبوب خان کے خلاف ایک گہری سازش تھی۔

جو لوگ ہوٹل کے کمرے میں اچانک گھس آئے تھے، کلپنا اور محبوب کی ویڈیو فلم اتار رہے تھے، اجے نے انہیں بھی بے نقاب کیا کہ ان کا تعلق کسی ٹی وی چینل سے نہیں تھا۔ وہ ایس کے پچارا کی آشنا نامی ایک داشتہ کے زرخرید آلۂ کار تھے۔

کئی ماہ کی جدوجہد کے بعد محبوب خان کے خلاف کیس کمزور ہو گیا۔ بھارتی پولیس اور انٹیلی جنس والے اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ قیدیوں کا تبادلہ کیا جائے۔ پاکستان ایک بھارتی قیدی کو ان کے حوالے کرے۔ اس کے بدلے وہ محبوب کو بارڈر پر پہنچا دیں گے۔

یہ اتنی بڑی کامیابی تھی کہ کلپنا خوشی سے چیخیں مارتی ہوئی اجے کے قدموں میں گر پڑی۔ اس کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ محبوب کی رہائی کے لیے جی جان سے کوششیں کرتی رہی تھی۔ یہ یقین نہیں تھا کہ اسے ٹارچر سیل کی

دلدل سے نکال سکے گی۔ اجے کی دیانت داری اور جدوجہد نے ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا۔

وہ رات کو چھپ کر اس سے ملنے آیا تھا۔ اس نے کلپنا کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں خوشخبری سنانے آیا ہوں۔ محبوب خان کو رہائی ملے گی، تم اسے دیکھ سکو گی، اس سے مل سکو گی۔ اب چھپنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ڈیڈی کے پاس جاؤ، وہ تمہیں محبوب سے ملائیں گے۔''

کامیابی و کامرانی اور مسرت آسانی سے نہیں ملتی۔ ان کے حصول تک کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اچانک ہی رات کے سناٹے میں فائر کی آواز گونجتی ہوئی آئی۔ اس کے ساتھ ہی اجے کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ ایک گولی اس کی ٹانگ میں آ کر لگی تھی۔

کلپنا نے سہم کر دیکھا۔ دروازے پر ایس کے پچارا کھڑا ہوا تھا۔ وہ بیٹے کو غصے اور نفرت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''آستین کے سانپ! تُو نے باپ کو راج نیتی کی اونچائی سے ذلت کی پستی میں گرا دیا۔ آج میں تیرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں تو یہ بھید کھل رہا ہے۔ تھو ہے تجھ پر... ایک عورت نے تجھے الو بنا دیا۔''

اجے نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''عورت کی ہوس نے مجھ سے زیادہ آپ کو الو بنایا ہے۔ اسے بیٹی یا بہو بنانا چاہیے لیکن آپ کی برہنہ آنکھیں اسے بے لباس دیکھتی ہیں۔ اگر میں کہتا کہ اسے گھر کی عزت بنانا چاہتا ہوں تو آپ کبھی راضی نہ ہوتے۔ جس طرح بھیا کو گھر سے نکالا ہے، مجھے بھی نکال دیتے۔''

''میں ابھی اس دنیا سے تجھے نکال سکتا ہوں مگر نہیں... آخر بیٹا ہے۔ جان سے نہیں ماروں گا۔ اپاہج بنا کر، گھر کا کتا بنا کر رکھوں گا۔''

وہ کلپنا کو نشانے پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''مرنا تو تجھے چاہیے۔ تو نے مجھے بہت دوڑایا ہے۔ بہت ذلیل کیا ہے۔ چل یہ کپڑے اتار... ماڈلنگ کی دنیا میں تیرے حسن و شباب کی بڑی چکاچوند ہے۔ جاتے جاتے میرے بیٹے کو بھی دکھا دے، اسے جتا دے کہ جس سندرتا کی خاطر باپ سے غداری کی ہے، اسے دیکھتا ہی رہ جائے گا۔ حاصل نہیں کر پائے گا۔''

وہ کلپنا کے سامنے آ کر ڈھال بن کر بولا۔ ''پتا جی! شرم کرو۔ جسے آپ کی بہو بنانا چاہتا ہوں، اسے بے لباس ہونے کو کہہ رہے ہو۔ کیا ہمارے خاندان میں تہذیب، شرافت اور شرم و حیا نہیں ہے؟ آپ جانور کیوں بن رہے ہیں؟''

اس نے اجے کے پیروں کے پاس گولی چلائی پھر کہا۔ ''دوسری گولی ہمیشہ کے لیے تیرا منہ بند کر دے گی۔ اس نے تجھے الو بنا کر میرا سیاسی کیریئر ختم کر دیا۔ تو سامنے سے نہیں ہٹے گا تو میں تم دونوں کو نرک میں پہنچا دوں گا۔''

اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا ہے۔ ڈسنے سے باز نہیں آئے گا اور بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کلپنا کی موت اٹل تھی۔ اسے بچانے کی صورت میں اجے بھی موت کے گھاٹ اترنے والا تھا۔

جب موت آتی ہے تو آ ہی جاتی ہے۔ کوئی ٹال نہیں سکتا۔ ٹالنے والا تو بس وہی ایک محافظ اور پروردگار ہے۔ وہ نہ چاہے تو حیرت انگیز طور پر بازی پلٹ جاتی ہے۔

اچانک ہی بجلی چلی گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پچارا نے تاریکی میں اندھی گولی چلائی۔ پھر اس کے پاؤں زمین سے اکھڑ گئے۔ بیٹے نے اس پر چھلانگ لگائی تھی۔ وہ دونوں فرش پر گرے۔ ایک ریوالور دونوں کی گرفت میں تھا۔ وہ تاریکی میں ایک دوسرے کو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ان لمحات میں صرف ریوالور اہم تھا... بہت اہم تھا اور ان کے درمیان اپنی اہمیت جتا رہا تھا۔

کلپنا تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی ناکام کوششیں کر رہی تھی۔ اسے صرف ان کے ہانپنے کی اور چیزیں گرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ ایک دم سے سہم کر اچھل پڑی۔

گولی چلنے کی آواز نے چیخ کر کہا کہ کام تمام ہو چکا ہے۔

گہری خاموشی چھا گئی۔ تاریکی اور سناٹے میں وہ اپنے دل کی دھڑکنیں سن رہی تھی۔ ''کیا ہوا...؟''

''کون گیا...؟ کون رہ گیا...؟''

ان میں سے ایک ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا تھا اور دوسرا ہانپ رہا تھا۔ کلپنا نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے پکارا۔ ''اجے!''

جواب میں رونے کی آواز سنائی دی۔ شاید باپ پچھتا رہا تھا۔ بیٹے کو کھو کر رو رہا تھا یا بیٹا اپنے باپ کی میت پر آنسو بہا رہا تھا۔

کلپنا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پھر آواز دی۔ ''اجے...!''

تب اس نے بڑے کرب سے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔ میں زندہ ہوں۔ ہے بھگوان! یہ کیا ہو گیا۔ میں نے پتا جی کو مار ڈالا... میں کیا کرتا؟ مجبور ہو گیا تھا۔ ایسا نہ کرتا تو وہ تمہیں مار ڈالتے۔ جاؤ کلپنا! فوراً یہاں سے جاؤ۔ پولیس کی

وقت بھی یہاں آجائے گی۔"

وہ آواز کی سمت دونوں ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتی ہوئی اس کے قریب آئی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "کوئی بات نہ کرو۔ کسی پر اپنی موجودگی ظاہر نہ کرو۔ فوراً یہاں سے جاؤ۔ میں تمہاری بات مانتا رہا، اب تم مانو۔ جاؤ یہاں سے..."

"میرا دل نہیں مانتا۔ تمہیں چھوڑ کر کیسے جاؤں؟"

"میں تم سے ملوں گا۔ وعدہ کرتا ہوں کل تم سے ملوں گا۔ بھگوان کے لیے میری بات مانو۔ یہاں سے چلی جاؤ۔"

اس نے دوسرے دن ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ مکان سے نکل گئی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ جو سوچا نہیں تھا، وہ ہوگیا تھا۔ ویسے ایک بدترین بلا ٹل گئی تھی۔

☆☆☆

نئی زندگی اور نئی مسرتوں کا سورج طلوع ہوا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ سینٹرل جیل میں آئی۔ جیلر کے آفس میں محبوب خان کی رہائی کے کاغذات پر دستخط ہو رہے تھے۔ پاکستانی سفارت خانے کا ایک عہدے دار قانونی کارروائیوں پر عمل کر رہا تھا۔

کلپنا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ محبوب کسی بھی لمحے آہنی سلاخوں سے نکل کر نگاہوں کے سامنے آنے والا تھا۔

انتظار کے لمحات خواہ کتنے ہی طویل ہوں، گزر ہی جاتے ہیں۔ جب وہ نگاہوں کے سامنے آیا تو کلپنا کا کلیجا دھک سے رہ گیا۔

وہ اپنے پیروں سے چل کر نہیں آرہا تھا۔ ایک معذور کی طرح اسٹریچر پر پڑا ہوا تھا۔ اسے اٹھا کر لایا جا رہا تھا۔

وہ دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ قریب سے دیکھا تو ایک دم سے چیخ مار کر رونے لگی۔ محبت کا وہ تاج محل ایک کھنڈر بن چکا تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا لگ رہا تھا۔

چہرہ بھی بدل سا گیا تھا۔ اس قدر اذیتیں پہنچائی گئی تھیں۔ اتنی بار بجلی کے جھٹکے دیے گئے تھے کہ سر کے بال اڑ گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں .... ابھر گئی تھیں۔ ہونٹ سوکھ کر پپڑی ہوگئے تھے۔ چھکے مارنے والا انڈر ناٹنٹین کا کھلاڑی کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے تاج محل کے دیس میں آیا تھا اور عبرت کا نشان بن کر جا رہا تھا۔

کلپنا نے روتے ہوئے آواز دی۔ "محبوب... میرے محبوب! تمہاری کلپنا آئی ہے۔ آنکھیں کھولو۔"

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ ہرے رام ہرے کرشنا کی نگری میں ایک محبت کی ماری نظر آئی۔ اس کی محبت، اس کی میزبانی بہت مہنگی پڑی تھی۔

اس بیچاری نے پیار کا حق ادا کیا تھا۔ لیکن ادائیگی ناحق گئی تھی۔ محبوب کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اسے پہچان رہا ہے مگر زبان سے کچھ بولنے کے قابل نہیں رہا ہے۔

اس نے ایک بار آنکھیں بند کیں پھر کھولیں۔ پلک جھپکانے کے اس انداز سے خدا حافظ کہا پھر آنکھیں بند کرلیں۔

سپاہی اسٹریچر اٹھا کر لے گئے۔ جیل کے باہر ایک گاڑی میں اسے پہنچا دیا گیا۔ کلپنا دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اور کیا کر سکتی تھی؟ آنسو تو بہتے ہی رہتے ہیں۔ کارواں تو گزرتا ہی رہتا ہے۔

واہگہ بارڈر پر اس کے والدین اسے لینے آئے تھے۔ انہوں نے بھی بیٹے کو اسٹریچر پر دیکھا تو لرز کر رہ گئے۔ باپ تڑپ کر آگے بڑھا۔ ماں صدمے کی حالت میں زمین پر گر پڑی۔ بیٹی زار و قطار روتی ہوئی اس بدنصیب ماں کو سنبھالنے لگی۔ اسٹریچر کو سرحدی لائن پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہاں سے پاکستان شروع ہوتا تھا۔

باپ اور بھائی اسٹریچر کو اٹھانے والے تھے۔ ایسے ہی وقت محبوب کا ایک ہاتھ اٹھ گیا۔ وہ اشارے سے منع کر رہا تھا۔ اسٹریچر سے اٹھنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ باپ اور بھائی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر کھڑا ہوا پھر ایک ایک قدم آگے بڑھا کر پاکستان پہنچ گیا۔ جہنم سے نکل کر جنت میں آگیا۔ فرطِ عقیدت سے جھکتا چلا گیا۔

باپ اور بھائی نے اسے تھام رکھا تھا۔ وہ سجدے میں پہنچ گیا۔ "اے ارضِ وطن! تجھے سلام... تیری کشش نیم مردوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔"

باپ اور بھائی نے اسے سجدہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا کہ نماز اور سجدوں کو سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لیے
بادلوں ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لیے...

سجدہ طویل ہوگیا۔

آہ...! وہ سجدہ ہی کیا، جو منک جائے...

اس کا اختتام نہیں تھا۔

اے لوگو! کیا ایسی میت بھی ہوتی ہے جسے سجدے کی حالت میں اٹھایا جاتا ہے؟

روایت

تنویر ریاض

وضع دار... ملنسار اور روایتوں کے امین جیسے لوگ اب رفتہ رفتہ عنقا ہوتے جا رہے ہیں... ڈھونڈے سے بھی اب ان کے نشاں نہیں ملتے... جدیدیت نے قدیم چیزوں اور رسومات کو طاقِ نسیاں کر دیا ہے... ایسے ہی ایک وضع دار اور روایت پرست شخص کا قصّہ جو اپنی زندگی کے شب و روز میں بیتے ہوئے وقت کی یادوں کو تازہ رکھتا تھا...

تہوار کے دن رونما ہونے والے ایک قتل کی تفتیش کا دلچسپ ماجرا...

پیٹر ڈائمنڈ کنجوس شخص نہیں تھا لیکن کرسمس کے موقع پر اس کی پریشانی بڑھ جاتی تھی۔ جب سے اس کی بیوی اسٹیفی کا انتقال ہوا تھا، اس کے رشتے داروں اور دوستوں کی ہمدردی اور مہربانیاں بڑھ گئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پیٹر اس تہوار کے موقع پر خود کو تنہا محسوس کرے اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ ان کے ساتھ کرسمس منائے۔ ان لوگوں میں اس کی سالی انجیلا اور ہم زلف مارون پیش پیش تھے۔ انجیلا اسے ہر سال لیورپول آنے اور فیملی پارٹی میں

شرکت کی دعوت دیتی لیکن وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتا۔ سب جانتے تھے کہ وہ ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہے اور اسے کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے چھٹی کے دنوں میں بھی گھر پر موجود ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ وہ پیٹر کو اپنی پالتو بلی ریفل کی بھی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر کیسے جاسکتا تھا لیکن انجیلا کے نزدیک یہ عذر قابلِ قبول نہ تھا۔ وہ جب بھی ریفل کی بات کرتا تو انجیلا یہی کہتی۔ ''تم اسے بھی کسی ٹوکری میں ڈال کر اپنے ساتھ لے آؤ۔ ہم اس کا بھی تمہاری طرح خیال رکھیں گے۔'' لیکن پیٹر کی خودداری یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ وہ بلی کو ساتھ لے جا کر ان لوگوں کو مشکل میں ڈالے۔

اس سال انجیلا نے ایک مختلف حکمتِ عملی اپنائی۔ وہ جانتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی پیٹر کوئی نہ کوئی عذر پیش کردے گا لہٰذا اس نے دسمبر کے دوسرے ہفتے میں پیٹر کو فون کر کے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں کیا کہنے والی ہوں اور مجھے تمہارا جواب بھی معلوم ہے۔ لہٰذا اس بات کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر تم ہماری کرسمس پارٹی میں شریک نہیں ہوسکتے تو اس بار یہ پارٹی تمہارے گھر پر ہوگی۔ ویسے بھی ہمیں تمہارے شہر آئے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔ اب تو کافی کچھ بدل گیا ہوگا۔ اس لیے ہمارا خیال ہے کہ کرسمس کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی تفریح بھی کرلی جائے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کچن میں سنبھال لوں گی اور باقی انتظامات مارون دیکھ لے گا۔''

''انتظامات؟'' پیٹر کے ہاتھ سے ریسیور گرتے گرتے بچا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''انتظامات سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''تمہاری عقل کو کیا ہوگیا ہے پیٹر؟'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ ''پارٹی ہوگی تو اس میں مختلف کھیل بھی ہوں گے۔ ایک دن پکنک پر بھی جانے کا پروگرام ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں ان کاموں کا کوئی تجربہ نہیں ہے اس لیے مارون نے یہ ذمے داری اپنے سر لے لی ہے۔''

پیٹر نے اپنا سر تھام لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں کو آنے سے کس طرح روکا جائے لیکن اسے کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی۔ انجیلا نے اسے مزید سوچنے کا موقع نہیں دیا اور بولی۔ ''بس تو پھر طے ہوگیا۔ ہم لوگ کرسمس سے پہلے آنے والے سنیچر کو پہنچ رہے ہیں اور نیا سال شروع ہونے تک تمہارے پاس ہی رہیں گے۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ پولیس والوں کے پاس آرام کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔ ہمیں چھٹیوں کے دوران میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ میری غیر موجودگی میں تم لوگ بور ہوجاؤ گے۔''

''رہنے دو۔ کیا میں جانتی نہیں کہ تم کوئی چھوٹے موٹے افسر نہیں بلکہ اپنے محکمے کے باس ہو۔ تمہیں کون ڈسٹرب کرسکتا ہے؟''

''اگر کوئی بڑا واقعہ پیش آجائے تو مجھے خود دیکھنا پڑتا ہے۔'' پیٹر مسلسل اسے ٹالنے کی کوشش کررہا تھا لیکن انجیلا اپنے پروگرام سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ وہ ڈھیٹ بنتے ہوئے بولی۔ ''کچھ نہیں ہوتا۔ کم از کم کرسمس پر تو کچھ نہیں ہوگا۔ بس تم ہمارے استقبال کی تیاری کرو۔ ہم لوگ آرہے ہیں۔''

پیٹر کا کوئی بہانہ کام نہیں آیا۔ وہ لوگ اپنے پروگرام کے مطابق لدے پھندے آن پہنچے۔ ان کے سامان میں بھاری سوٹ کیسوں کے علاوہ پلاسٹک سے بنا ہوا کرسمس ٹری بھی تھا۔ ان کے آجانے سے پیٹر کا گھر چھوٹا لگنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کی بلی ریفل کو بھی الماری میں پناہ لینا پڑی۔

انجیلا کا خیال تھا کہ اس کا بہنوئی بڑا پولیس افسر ہے اس لیے خوب ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہوگا لیکن پیٹر کا گھر دیکھ کر اسے بڑی مایوسی ہوئی اور وہ سوچنے لگی کہ اس کی بہن نے کس طرح اس شخص کے ساتھ گزارہ کیا ہوگا۔ اسے ایک کامیاب سراغ رساں سمجھا جاتا تھا لیکن گھر کے معاملات میں وہ بے حد بدسلیقہ اور پھوہڑ تھا۔ لگتا تھا کہ مکان خریدنے کے بعد اس کی دیواروں پر ایک مرتبہ بھی رنگ و روغن نہیں کیا گیا۔ کھڑکیوں کی بھی عرصے سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔ باغ میں جگہ جگہ بے ترتیبی سے گھاس اُگ آئی تھی اور پیٹر کے پاس شاید اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس جانب توجہ دیتا۔ اسے اپنی بلی کے ساتھ کھیلنے اور تاش کھیلنے کے دوران بے ایمانی کرنے کے سوا کچھ نہیں آتا تھا۔

کرسمس کی شام بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ لوگ تاش کھیلنے میں مصروف تھے اور پیٹر اپنی عادت کے مطابق مسلسل بے ایمانی کررہا تھا جس پر انجیلا نے کئی مرتبہ احتجاج بھی کیا لیکن پیٹر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے کھیل جاری رکھنے پر آمادہ کرلیتا۔ اسی دوران میں پولیس اسٹیشن سے کال آئی تو پیٹر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ دوسری جانب سے سی آئی ڈی کا چیف بول رہا تھا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ چھٹی کے دوران میں تمہیں پریشان کررہا ہوں لیکن مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے۔''

''کوئی بات نہیں، کیا تمہیں میری ضرورت ہے؟''

''بظاہر یہ ایک سیدھا سادہ کیس ہے لیکن ہمیں شبہ ہے کہ مرنے والا طبعی موت نہیں مرا بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں پہنچ رہا ہوں۔'' پیٹر نے سرشاری کے عالم میں کہا۔ چیف کی باتوں سے اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ ایک مشکل کیس ہوگا جو اس کے لیے ایک چیلنج بھی ہوسکتا ہے۔

انجیلا اور مارون بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ پیٹر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''معاف کرنا، ایک قتل ہوگیا ہے۔ مجھے فوری طور پر جانا ہوگا۔ تم لوگ انجوائے کرو۔ میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔''

''کیا میں تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں؟'' مارون نے کہا۔ شاید وہ اسے ایک تفریح سمجھ رہا تھا۔

''نہیں، تم جیسے خوش ذوق انسان کے لیے کسی لاش کو دیکھنا خوفناک ہوگا۔ بہتر ہوگا کہ تم گھر پر رہ کر کرسمس ٹری کو دوبارہ سے سجاؤ کیونکہ انجیلا سمجھتی ہے کہ میں نے اس کام میں بھی اناڑی پن دکھایا ہے۔''

پچھتر سالہ فلیچر میری مین کی موت پولیس کے لیے معما بن گئی تھی۔ وہ میری مین اینڈ پالمر نامی ایک چھوٹی سی اکاؤنٹنٹ فرم کا سینئر پارٹنر تھا جس کا دفتر گے اسٹریٹ میں واقع ایک دکان کی بالائی منزل پر تھا۔ اس کی موت دو ہفتے قبل حرکتِ قلب بند ہوجانے کی وجہ سے رائل یونائیٹڈ اسپتال میں ہوئی تھی۔

''اس کی موت کے بارے میں کچھ شبہات ہیں۔'' اسسٹنٹ چیف ماریا ڈیلی مور نے بتایا۔ ''وہ دل کی تکلیف کی وجہ سے اسپتال میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ دفتر میں ہونے والی پارٹی کے دوران میں اس کے پیٹ میں تکلیف شروع ہوگئی تھی اور ڈاکٹر اسی کا علاج کررہے تھے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دل کا دورہ اسے بعد میں پڑا۔''

''تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ اس کی موت زہر خورانی کی وجہ سے ہوئی؟'' پیٹر نے پوچھا۔

''پوسٹ مارٹم واضح نہیں ہے۔ کسی عام زہر کی علامت نہیں پائی گئی۔ وہ دل کا مریض تھا اور باقاعدگی سے دوائیں استعمال کررہا تھا۔ اس کے معدے میں ان دواؤں کے مختلف اجزا کی نشاندہی ہوئی ہے لیکن وہ مہلک نہیں ہیں۔''

''پھر کیا مسئلہ ہے؟ تم لوگوں کو یہ شک کیوں ہورہا ہے کہ وہ طبعی موت نہیں مرا؟''

''یقین کرو ہمارا مقصد تمہارا وقت ضائع کرنا نہیں ہے۔ کچھ ایسے حقائق سامنے آئے ہیں جن سے اس شبہے کو تقویت ملتی ہے۔ درحقیقت وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے اور اس بات کے امکانات ہیں کہ پارٹی میں موجود ہر شخص اس کی موجودگی کو پسند نہیں کررہا تھا۔''

''پارٹی میں اس کے علاوہ کتنے لوگ تھے؟'' پیٹر نے پوچھا۔

''وہ تو بہت کم تعداد ہے۔ اسے پارٹی کہنا بھی عجیب سا لگتا ہے۔''

''ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی اور یہ کام کرسمس کی چھٹیوں کے بعد بھی ہوسکتا ہے لیکن تم کہہ چکے تھے کہ اگر چھٹیوں کے دوران کوئی سنجیدہ نوعیت کا کیس سامنے آئے تو تمہیں اس بارے میں فوراً مطلع کیا جائے۔''

''بالکل، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میرا کرسمس اس کام کی نذر ہوگیا تو میں اس کے بدلے بعد میں چھٹی کرلوں گا۔''

''جب تمہارے مہمان جاچکے ہوں گے؟''

پیٹر کھسیانا ہوگیا لیکن اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ماریا نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

اس نے فلیچر کے پارٹنر موریس پالمر سے رابطہ کیا تو وہ فوری طور پر ملنے کے لیے تیار ہوگیا اور کہا کہ وہ اپنے دفتر میں اس کا انتظار کرے گا۔ پیٹر وقت ضائع کیے بغیر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے انٹر کام کا بٹن دبایا تو جواب میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ پیٹر نے اپنا نام بتایا اور اندر داخل ہوگیا۔ استقبالیہ کمرے میں ایک خوش شکل اور نوجوان لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کی عمر بیس بائیس برس ہوگی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہوگئی اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''سلویا اسمتھ..... میں یہاں جونیئر اکاؤنٹنٹ ہوں۔'' اس کی سیاہ آنکھوں سے ذہانت ٹپک رہی تھی۔ وہ برابر والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''تمہارا انتظار ہورہا ہے۔''

پیٹر کا دل چاہا کہ اس کی تعریف میں کوئی خوب صورت سا جملہ بول دے لیکن وہ اس معاملے میں بھی اناڑی تھا۔ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''مجھے حیرت ہورہی ہے کہ تم کرسمس کے روز بھی یہاں موجود ہو۔''

''کچھ ضروری کام نمٹانا تھے اس لیے آنا پڑا۔'' وہ دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ٹھیک ہے۔ تمہیں کچھ دیر رکنا پڑے گا۔ میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

اسی اثنا میں برابر والے کمرے کا دروازہ کھلا اور پالمر مسکراتا ہوا باہر آیا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے سیاہ سوٹ کے ساتھ دھاری دار ٹائی لگا رکھی تھی اور دیکھنے سے ہی لگتا تھا کہ اسے ٹیکس انسپکٹروں سے نمٹنے کا تجربہ ہے۔ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو پیٹر بولا۔

"تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ میرے آنے سے تمہارے پروگرام پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

"میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں جو کچھ بھی پوچھنا ہے، ابھی پوچھ لو۔ آج رات کی فلائٹ سے میں مینیرف جا رہا ہوں۔"

پیٹر سوچنے لگا کہ اسپین میں واقع اس جزیرے میں پالمر کو کیا کام ہو سکتا ہے؟ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "کیا وہاں بھی تمہارا کوئی کلائنٹ ہے؟"

"نہیں، میں سردیوں کی دھوپ کا مزہ لینے جا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بار چھٹیاں وہیں گزاروں۔"

پیٹر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا جہاں کئی الماریاں اور چند کمپیوٹر رکھے ہوئے تھے پھر بولا۔ "کیا اسی کمرے میں پارٹی ہوئی تھی؟"

"نہیں، یہاں تو خواتین بیٹھتی ہیں۔" پالمر نے کہا۔ "پارٹی میرے کمرے میں ہوئی تھی۔" وہ برابر والا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

اس کا کمرا قیمتی فرنیچر سے آراستہ تھا۔ قیمتی قالین، ماربل سے بنا آتش دان اور چھت کے درمیان لٹکا ہوا دیدہ زیب فانوس... یہ تمام چیزیں کمرے کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ وسط میں ایک بڑی میز تھی جس کے ایک طرف عالی شان کرسی اور دوسری جانب چار چھوٹی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کمرے کو دیکھ کر فرم کی حیثیت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔

"فلیچر **2001**ء میں ریٹائر ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کئی سالوں تک یہ کمرا اس کے استعمال میں رہا۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی جانب بڑھا اور سلویا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "اگر کام ختم ہو گیا ہے تو تم جا سکتی ہو۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔

"مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ اس عمر میں بھی مسٹر فلیچر پارٹی میں چلے آئے۔"

"وہ ہر سال آیا کرتا تھا۔ اس نے یہ روایت ڈال دی تھی۔ حالانکہ وہ وھیل چیئر استعمال کرتا تھا لیکن دسمبر کے مہینے میں کسی روز اچانک آ کر ہمیں حیران کر دیتا۔ یہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ پارٹی کا پورا سامان بھی لے کر آتا۔ شیری کی تین بوتلیں، ایک درجن قیمہ بھرے پیٹیز اور ایک بڑی سی آکاس بیل کی شاخ۔"

"اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟ تم ابھی کہہ چکے ہو کہ یہ اس کی روایت تھی۔"

"دراصل ہمیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس دن آ سکتا ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہ لوگوں کو حیران کر کے خوش ہوتا تھا تاکہ اس کی طبیعت بہلی رہے۔"

"تمہارا اشارہ اس کی بیماری کی طرف ہے۔ ہاں وہ دل کا مریض تھا اور اسے بہت محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اس کے دل کی دو شریانیں بند ہو چکی تھیں اور ریٹائر ہونے کے بعد اس نے اپنے آپ کو کاروبار سے بالکل الگ کر لیا تھا۔ کئی سالوں سے میں ہی تمام معاملات دیکھ رہا ہوں۔"

"اس کے باوجود وہ سینئر پارٹنر تھا؟"

"اسے غیر حاضر پارٹنر کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔"

"کیا اب بھی وہ منافع میں حصے دار تھا؟" پیٹر نے پوچھا۔

"اس کا منافع میں آدھا حصہ تھا کیونکہ ہم ابھی تک میری مین اینڈ پالمر کے نام سے کام کر رہے ہیں جس کی شہر میں بہت اچھی ساکھ ہے۔ اس کا نام نکال دینے سے کمپنی کی شہرت متاثر ہو سکتی تھی۔ ویسے بھی اس نے کئی سال اس کمپنی کے لیے کام کیا۔ اس کا کچھ نہ کچھ صلہ تو ملنا چاہیے تھا۔"

"اس کے مرنے کے بعد فیملی کو بھی یہ منافع ملتا رہے گا؟"

"اس کی فیملی نہیں ہے۔ وہ کافی عرصے سے تنہا زندگی بسر کر رہا تھا۔"

"گویا اب سارا منافع تمہاری جیب میں جائے گا؟"

پالمر کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اسے پیٹر کی یہ بات اچھی نہیں لگی تاہم اس نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، جب تک میں کسی دوسرے پارٹنر کو اپنے ساتھ شامل نہ کر لوں۔"

"کیا تمہیں دوسرے پارٹنر کی ضرورت ہے؟"

"ہاں، ایک سے دو اچھے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی اس کام میں دوسرے ساتھی کی موجودگی سے بڑی مدد ملتی ہے۔"

پیٹر نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور بولا۔ "یہ بتاؤ پارٹی کیسی رہی؟ خوب ہلا گلا ہوا ہوگا؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا، یہ کوئی باقاعدہ پارٹی نہیں تھی۔"

"وہ شیری کی تین بوتلیں لے کر آیا تھا۔ کیا سب ختم ہو گئی تھیں؟"

"نہیں، میرا خیال ہے کہ کچھ شراب بچ گئی تھی۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شراب تازہ تھی؟"

"ہاں، اس نے براڈ اسٹریٹ پر واقع ایک بڑے اسٹور سے وہ بوتلیں خریدی تھیں۔"

"ان بوتلوں کو کس نے کھولا تھا؟"

"فلیچر نے... اور وہ خود ہی گلاسوں میں ڈال کر ہمیں دے رہا تھا۔ دراصل وہ جتانا چاہ رہا تھا کہ یہ شراب وہی لے کر آیا ہے۔"

"کیا تمہارے پاس کوئی بچی ہوئی بوتل ہے؟"

"نہیں، وہ ساری بوتلیں اس کے ساتھ ہی بھیج دی گئی تھیں۔" پالمر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"وہ اپنے ساتھ آکاس بیل کی شاخ بھی لایا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کرسمس پارٹی میں لوگ اس کے نیچے کھڑے ہو کر بوسہ بازی کرتے ہیں۔ کیا یہاں بھی ایسا کچھ ہوا تھا؟"

پالمر نے دروازے کی طرف دیکھا اور آواز نیچی کرتے ہوئے بولا۔ "تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں کہ وہ بوڑھا پرانے وقتوں کا آدمی تھا اور روایت پر عمل کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ امید ہے کہ تم میرا اشارہ سمجھ گئے ہو گے۔"

"کیا تم روایت پسند نہیں ہو؟" پیٹر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"مجھے ایسے مواقع کم ہی ملتے ہیں۔"

"یہ بتاؤ کہ تم نے پیٹیز کھائے تھے؟"

"ہاں، وہ اتنے مزے دار تھے کہ میں اپنے حصے کے تینوں پیٹیز کھا گیا۔ وہ پیٹیز ہمیشہ میسیز سے خریدتا تھا جو شہر کی بہترین بیکری ہے۔"

"ان پیٹیز کو کھانے کے بعد تمہاری طبیعت تو خراب نہیں ہوئی؟"

"نہیں، البتہ فلیچر کے پیٹ میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ گھر جانا چاہتا ہے چنانچہ ہم نے اسے ٹیکسی کے ذریعے روانہ کر دیا۔ دوسری صبح معلوم ہوا کہ وہ اسپتال میں ہے اور چند گھنٹوں بعد اسے دل کا دورہ پڑا جس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ یہ خبر غیر متوقع نہیں تھی کیونکہ وہ دل کا مریض تھا۔"

"تمہیں اس کے مرنے کا افسوس تو ہوا ہوگا؟" پیٹر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بزنس پارٹنر کے طور پر وہ ایک مشکل شخص تھا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ مجھے اس کے مرنے کی خواہش ہو۔"

پیٹر کے پاس مزید پوچھنے کے لیے کچھ نہیں تھا لہٰذا اس نے پالمر سے کہا کہ وہ سلویا کو اندر بھیج دے۔ وہ اس سے کچھ سوالات کرنا چاہتا ہے۔

"اس کمرے میں؟" پالمر نے حیرت سے کہا۔

"ہاں کیونکہ پارٹی اسی کمرے میں ہوئی تھی اس لیے اس سے پوچھ گچھ کے لیے یہی جگہ مناسب رہے گی۔"

"ممکن ہے کہ میری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہ کر سکے۔" پالمر نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"بہتر ہوگا کہ تم باہر بیٹھ کر ہماری گفتگو ختم ہونے کا انتظار کرو۔"

سلویا کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی اور اس کی بوکھلاہٹ میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب پیٹر نے اسے باس کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہاری جگہ وہ ہے... ممکن ہے کہ ایک دن یہ سب کچھ تمہارا ہو جائے۔"

"مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" وہ کرسی کے کنارے پر ٹکتے ہوئے بولی۔

پیٹر نے کھڑے رہنے کو ہی ترجیح دی اور بولا۔ "تم میری مین کی کتنی پارٹیوں میں شریک ہوئی ہو؟"

"یہ دوسری تھی۔ میں نے کالج چھوڑنے کے بعد گزشتہ سال کے آخر میں یہاں ملازمت شروع کی تھی۔"

"پہلی بار تو تمہیں اسے دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی ہوگی جب وہ وھیل چیئر گھسیٹتا ہوا آکاس بیل اور شیری کی بوتلوں کے ساتھ آیا ہوگا؟ کیا اس نے تمہارا بوسہ لینے پر اصرار کیا تھا؟"

سلویا نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور بولی۔ "وہ اسے کرسمس کی رسم کہہ رہا تھا جبکہ میں اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔"

"وہ اسے اپنا حق سمجھتا ہوگا؟"

"مجھے تو اس بارے میں سوچ کر ہی گھن آتی ہے۔" سلویا بیزاری سے بولی۔ شاید وہ اس موضوع پر مزید گفتگو کرنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن پیٹر کو اسے کریدنے میں مزہ آ رہا تھا۔

"اگر تم انکار کر دیتیں تو تمہاری نوکری خطرے میں پڑ سکتی تھی اور تم جانتی ہو کہ اس شہر میں جونیئر اکاؤنٹنٹ کے لیے کچھ زیادہ مواقع نہیں ہیں۔"
اس نے اپنی آنکھیں گھمائیں اور بولی۔ "میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔"
"کیا تم جانتی تھیں کہ یہ کٹھن گھڑی سال میں ایک بار آتی ہے؟"
"ڈونا نے اس بارے میں کچھ بتایا تھا لیکن میں یہی سمجھی کہ وہ مجھے بہلا رہی ہے۔"
"یہ وہی عورت ہے جو یہاں کام کرتی ہے؟"
لڑکی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہ یہاں چھ سال سے ہے اور اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو اگلے سال وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن جائے گی۔"
"لیکن وہ آج کیوں نہیں آئی؟" ڈونا کا نام سن کر پیٹر کا تجسس بڑھ گیا۔
"وہ چھٹی پر ہے۔"
"کیا کرسمس منانے کہیں باہر گئی ہوئی ہے؟" پیٹر نے پوچھا۔
"غالباً نہیں۔ اس کا فلیٹ ویلکوٹ اسٹریٹ پر ہے۔"
"کیا وہ وہاں اکیلی رہتی ہے؟"
"ہاں!"
"اس کی عمر کیا ہوگی؟ ویسے تو یہ احمقانہ سوال ہے کیونکہ عورتیں اپنی عمر ظاہر نہیں کرتیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ چالیس سے کم کی ہی ہوگی۔"
"میں بھی یہی سمجھتی ہوں۔"
پیٹر نے خالی چھت کی طرف دیکھا۔ اس کے وسط میں کوئی لائٹ نہیں تھی بلکہ آمنے سامنے دیواروں پر موم بتی کی شکل کی لائٹیں لگی ہوئی تھیں، وہ بولا۔ "میں اپنے ذہن میں اس پارٹی کا نقشہ بنا رہا ہوں۔ میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ وہ بوڑھا اپنی وہیل چیئر پر آکاس بیل کے نیچے ہی بیٹھا ہوگا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے کہاں لٹکایا ہوگا کیونکہ چھت میں تو کوئی کنڈا نہیں ہے۔"
"اس کے لیے ہمیں ایک وال لائٹ سے دوسری وال لائٹ تک رسّی باندھنا پڑی تھی اور اس کے وسط میں وہ آکاس پودا لٹکایا گیا تھا جہاں تم اس وقت کھڑے ہو۔"
"سمجھ گیا... لیکن ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟"
"میں اور ڈونا۔"
"اب تصویر مکمل ہوتی جارہی ہے۔ اس پودے کو رسّی پر لٹکانے کے لیے تم میں سے کسی ایک کو اس میز پر کھڑا ہونا پڑا ہوگا۔ یہ کام کس نے کیا؟"
سلویا نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں گھمائیں اور بولی۔ "اس کا اصرار تھا کہ وہ پودا میں لٹکاؤں کیونکہ میرا قد لمبا ہے۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے اور شرماتے ہوئے بولی۔ "دراصل اس روز میں نے شارٹ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔"
"تصویر اب مزید واضح ہوتی جارہی ہے۔ جس وقت تم میز پر کھڑی ہوئی تھیں تو مسٹر پالمر کہاں تھے؟"
"وہ آتش دان کے پاس کھڑے تھے جبکہ مسٹر میری مین بالکل میرے نیچے وہیل چیئر پر بیٹھے مجھے پودا لٹکاتے دیکھ رہے تھے۔ تاہم میں نے محسوس کیا کہ ان کی نظریں میرے جسم کا جائزہ لے رہی تھیں۔"
"کیا انہوں نے خود وہ پودا تمہیں دیا تھا؟"
"نہیں، ان کا دھیان میری طرف تھا۔ ڈونا نے میری مدد کی تھی۔"
"اس کے بعد پارٹی شروع ہوگئی ہوگی اور ڈرنک کا دور چلا ہوگا؟"
سلویا نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ "ہاں، میں نے بھی ایک گلاس لیا تھا۔"
"شیری کی بوتلیں کہاں رکھی ہوئی تھیں؟"
"اس میز پر۔"
"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بوتلیں سیل پیک تھیں اور انہیں اسی وقت کھولا گیا تھا؟"
"ہاں، انہیں کھولنے کے لیے مسٹر میری مین کو قینچی کی ضرورت پیش آئی تھی۔"
"تم جانتی ہو کہ میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہا ہوں... وہ اس لیے کہ پارٹی کے دوران ہی اس کے پیٹ میں درد ہورہا تھا۔ اگر شراب نئی تھی تو پھر ان پیٹیز میں کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے؟"
سلویا نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ "نہیں، وہ بالکل تازہ تھے۔ اس بیکری کی چیزیں کبھی خراب نہیں ہوتیں بلکہ مجھے تو وہ بہت ذائقے دار لگے۔"
"تم نے کتنے پیٹیز لیے تھے؟"
"تین... سب کے حصے میں اتنے ہی آئے تھے۔"
"کیا یہ ممکن ہے کہ کسی نے مسٹر میری مین کی پلیٹ میں کسی اور بیکری سے لایا ہوا پیٹیز رکھ دیا ہو۔"
"نہیں، ہم سب اس کمرے میں موجود تھے۔ کوئی باہر گیا اور نہ اپنے ساتھ کوئی چیز لے کر آیا۔"
"پھر کیا ہوا؟"
سلویا گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنے گرے ہوئے کردار کا مالک ہوگا۔ وہ نشے میں آکر بھول گیا کہ میں اس کی پوتی کے برابر ہوں۔ اس نے مجھے اپنی جانب گھسیٹا اور زانو پر بٹھا کر غیر اخلاقی حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے شدید کراہیت محسوس ہوئی۔ اس کے ہاتھ میرے پورے جسم پر رینگ رہے تھے۔ یہ ڈراما ایک منٹ تک چلتا رہا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس کا وہیں گلا گھونٹ دیتی۔"
"کیا ڈونا کے ساتھ بھی اس نے یہی حرکت کی؟"
"کچھ زیادہ نہیں کیونکہ اس نے پتلون پہن رکھی تھی۔"
"کیا مسٹر پالمر نے بھی اس روایت پر عمل کرتے ہوئے آکاس پودے کے نیچے تمہارا بوسہ لیا تھا؟"
"وہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس نے شریفانہ انداز میں میرے گال پر ہلکا سا بوسہ لیا۔ ویسے بھی اسے میری زیادہ پروا نہیں ہے۔"
پیٹر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے سے باہر آگیا جہاں پالمر ان کی گفتگو ختم ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ پیٹر نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "مجھے تمہارے دفتر میں کام کرنے والی دوسری خاتون کا پتا چاہیے۔"
"ڈونا؟" وہ حیرت سے بولا۔ "وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکے گی۔"
"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ ممکن ہے کہ اس نے کوئی ایسی بات دیکھی ہو جو تمہارے اور سلویا کے علم میں نہ ہو۔"
"تم غلط راستوں پر بھٹک رہے ہو۔ یہاں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا۔ فلیچر کی موت طبعی تھی۔"
"ڈونا سے ملنے کے بعد ہی اس بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ اس سے پہلے میں تمہاری بات سے متفق نہیں ہوسکتا۔"
پالمر کے دفتر سے واپسی پر وہ پولیس اسٹیشن گیا اور سراغ رساں سارجنٹ انگلبورگ سے کہا کہ وہ انٹرنیٹ سے اس کیس کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرے۔ سارجنٹ نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ویسے بھی وہ اسے پسند کرتی تھی اور اسے خوش کرنا چاہتی تھی۔ ان معلومات کی روشنی میں اس نے فارنسک

لیبارٹری کو فون کیا جنہوں نے فلیچر کی پوسٹ مارٹم رپورٹ تیار کی تھی۔ پیٹر نے انہیں ہدایت کی کہ وہ فلیچر کے معدے سے حاصل ہونے والے اجزا کا دوبارہ تجزیہ کریں۔ اسے بتایا گیا کہ پوسٹ مارٹم مکمل ہے اور دوبارہ تجزیہ کرنے سے کسی نئی بات کے معلوم ہونے کا امکان بہت کم ہے تاہم اگر وہ مصر ہے تب بھی اسے رپورٹ کے لیے چھٹیاں ختم ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔

''کام چور۔'' وہ انگبورگ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم بھی تو چھٹی والے دن کام کر رہے ہیں پھر انہیں کیا مسئلہ ہے؟''

ڈونا کا فلیٹ بہت شان دار تھا اور وہ خود بھی کسی سے کم نہ تھی۔ پیٹر نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ اس کی عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان ہے اس کے باوجود وہ بڑی دلکش اور رعنائی سے بھرپور نظر آ رہی تھی۔ وہ پیٹر کو دیکھ کر بالکل بھی خوف زدہ نہیں ہوئی اور اسے لیونگ روم میں بٹھا کر کافی بنانے چلی گئی۔ اس نے **1471** سے معلوم کیا کہ ڈونا نے آخری کال کب ریسیو کی تھی۔ یہ وہی وقت تھا جب وہ پالمر کے دفتر سے باہر آیا تھا۔ اسے یہ جاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی کہ یہ کال کس کی ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ دفتر کا کوئی بھی ساتھی ڈونا کو اس کی آمد کے بارے میں بتا سکتا تھا۔

کافی، بہت خوش ذائقہ تھی۔ پیٹر نے پہلا گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ ''تمہیں اس لیے زحمت دی کہ کچھ سوالات مجھے پریشان کر رہے ہیں۔ اس روز پارٹی میں فلیچر میری مین کی طبیعت بگڑ گئی۔ پیٹ میں شدید درد ہونے کی وجہ سے اسے اسپتال جانا پڑا جہاں چند گھنٹوں کے بعد اس کی موت واقع ہو گئی۔ میں نے اس کی میڈیکل رپورٹ دیکھی ہے۔ پیٹ میں درد کے علاوہ اس کی بینائی متاثر ہوئی، متلی ہونے لگی اور نبض کی رفتار بھی کم ہو گئی۔ ہمیں شبہ ہے کہ اسے زہر دیا گیا جس کی وجہ سے اسے دل کا دورہ پڑا اور وہ چل بسا۔''

''زہر دیا گیا؟'' وہ یقین نہ کرنے کے انداز میں بولی۔

''ہاں لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسے کس طرح زہر دیا گیا۔ وہ اپنے ہمراہ جو چیزیں لے کر آیا تھا، وہ سب تازہ تھیں۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے سب کے گلاسوں میں شراب انڈیلی اور وہاں موجود تمام لوگ اس کے گواہ ہیں۔''

''کیا پوسٹ مارٹم رپورٹ میں زہر کی نشاندہی ہوئی ہے؟'' اس نے اتنے پُرسکون لہجے میں پوچھا جیسے گزشتہ شب ہونے والی بارش کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔

''ابھی کچھ واضح نہیں۔ اگر کوئی عام زہر مثلاً آرسینک وغیرہ ہو تو اس کا پتا لگانا آسان ہے لیکن اب ان کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہ کوئی خاص قسم کا زہر ہے جس کے لیے میں نے لیبارٹری کو ہدایات جاری کر دی ہیں اور وہ اس کا تجزیہ کر رہے ہیں۔''

ڈونا نے اس بارے میں مزید کوئی سوال نہیں کیا اور بولی۔ ''ایک ریٹائرڈ اکاؤنٹنٹ کو مارنے سے کسی کو کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟''

''یہ محض ایک قیاس آرائی ہے۔ پہلے یہ ثابت ہو جائے کہ اسے زہر دیا گیا ہے پھر ہم اس کے محرکات بھی پتا لگا لیں گے۔ ویسے اس کی موت سے مسٹر پالمر کو تو یقیناً فائدہ ہو گا۔ اب وہ فرم کے واحد مالک ہیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم مسٹر پالمر پر شک نہیں کر رہے۔''

پیٹر نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے بولا۔

''سلویا نے بتایا ہے کہ پارٹی میں اس بوڑھے نے اسے جو اذیت پہنچائی، اس کے بعد اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ بوڑھے کا گلا گھونٹ دے۔''

''سلویا ابھی بچی ہے۔ اسے مردوں کو سمجھنے میں کچھ وقت لگے گا۔''

''اس بوڑھے نے سلویا کے ساتھ جو سلوک کیا، اس پر تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی؟''

''مجھے اس فرم میں کام کرتے ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں اور میں مسٹر فلیچر کو اچھی طرح جان چکی تھی۔'' وہ اپنی انگلی کپ کے کناروں پر پھیرتے ہوئے بولی۔ ''مسٹر پیٹر! تمہارے خیال میں اسے زہر دینے کے لیے کیا طریقہ استعمال کیا گیا ہوگا؟ کیا اس نے زیادہ مقدار میں دوا تو نہیں لے لی؟ یہ تو تم جانتے ہو کہ اس کی جیب میں ہر وقت دوا موجود رہتی تھی۔''

''میرا خیال اس سے مختلف ہے۔ لگتا ہے کہ اس کی موت پیٹیز کھانے سے ہوئی۔ ان میں کچھ ملا ہوا تھا۔''

ڈونا نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم سب نے وہ پیٹیز کھائے تھے۔ اگر ان میں کوئی خرابی ہوتی تو بقیہ لوگ بھی بیمار ہو سکتے تھے لیکن کسی کو کوئی شکایت نہیں ہوئی۔''

''فلیچر نے جو پیٹیز کھائے، ان میں سے کم از کم ایک میں ضرور کچھ ملا ہوا تھا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیسے ہو سکتا ہے؟''

''اس پیٹیز میں زہر موجود تھا۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔''

اس نے جیب سے ایک نوٹ بک نکالی اور پڑھنا شروع کیا۔ ''ٹائرامائن اور بیٹا فینائل تھیلا مائن۔''

''میں نے کبھی یہ نام نہیں سنے۔''

''لیکن تم آکاس پودے کے بارے میں ضرور جانتی ہو گی۔ اس کی شاخوں میں چھوٹے چھوٹے بیر لگے ہوتے ہیں جن میں زہریلا مادہ ہوتا ہے۔ میڈیکل رپورٹ میں آنتوں پر ورم دکھایا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی نظر کی دھندلاہٹ اور نبض کی رفتار میں کمی کا بھی ذکر ہے۔ لیکن ان علامات کا دل کے دورے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسے زہر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔''

''لیکن وہ پودا تو اس کے سر کے اوپر لٹکا ہوا تھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ کوئی بیر گر کر اس کے منہ میں چلا گیا ہو۔''

''نہیں، سلویا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ پودا تم دونوں نے مل کر لٹکایا تھا۔''

''میں نے صرف رسّی باندھنے میں اس کی مدد کی تھی۔ پودا لٹکانے کے لیے وہی میز پر چڑھی تھی۔''

''بالکل ٹھیک... لیکن وہ میز پر چڑھ چکی تھی۔ اس نے مختصر اسکرٹ پہن رکھا تھا اور بوڑھے کی تمام تر توجہ اس کی جانب تھی۔ تم نے ہی وہ پودا سلویا کو پکڑایا تھا اور اس سے پہلے بڑی ہوشیاری سے اس میں سے کچھ سفید بیر توڑ لیے۔''

ڈونا بلّی کی طرح غراتے ہوئے بولی۔ ''یہ جھوٹ ہے۔''

''اب تمہیں مناسب موقع کا انتظار تھا جب وہ بوڑھا سلویا کے ساتھ غیر اخلاقی حرکات میں مصروف تھا تو تم نے اس کی پلیٹ میں رکھے ہوئے پیٹیز کا اوپری کاغذ ہٹایا اور اس کے اندر وہ زہریلا بیر دبا دیا جو مہلک ہونے کے باوجود ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ظاہر نہ ہو سکا۔''

ڈونا نے اب بھی اپنے حواس قابو میں رکھے اور اس بچے کی طرح معصوم نظر آنے لگی جو کرسمس کی شام سانتا کلاز کا انتظار کرتا ہے۔

پیٹر اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا میں تمہارا بیڈروم دیکھ سکتا ہوں؟''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

''میں کوئی کام بے وجہ نہیں کرتا۔'' پیٹر بے رخی سے بولا۔ ''دروازہ کس طرف ہے؟''

اس سے پہلے کہ وہ اسے روکنے کی کوشش کرتی، پیٹر بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔ اس کی نظر بستر پر رکھے بند سوٹ کیس پر گئی تو وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''چھٹیاں منانے کہیں باہر جا رہی ہو؟''

''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سبھی لوگ ایسا کرتے ہیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔

اس نے بستر کے قریب جا کر سوٹ کیس پر چسپاں لیبل دیکھا۔ اس پر جگہ کا نام ٹینیرف لکھا تھا۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور چشم زدن میں ساری کہانی اس کی سمجھ میں آ گئی۔ پالمر بھی تو چھٹیاں گزارنے اسی جزیرے پر جا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور مضبوطی سے ڈونا کی کلائی پکڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تم اس پُرفضا جزیرے پر اپنے ساتھی کے ہمراہ خوش گوار دھوپ کا مزہ نہیں لے سکو گی۔ میں تمہیں فلیچر کو قتل کرنے کے شبہے میں گرفتار کر رہا ہوں۔''

''تم مجھے کسی ثبوت کے بغیر گرفتار نہیں کر سکتے۔'' ڈونا نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''فی الحال تم سے ابتدائی پوچھ گچھ ہو گی اور اس کے بعد تم خود ہی اپنے جرم کا اعتراف کر لو گی۔ میں ثبوت کے بغیر کسی پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔'' پیٹر نے جیب سے ہتھکڑی نکالتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

اس کارروائی سے فارغ ہونے کے بعد وہ دفتر پہنچا تو اسسٹنٹ چیف کانسٹیبل ماریا اس کا انتظار کر رہی تھی۔ پیٹر نے اسے مختصر لفظوں میں روداد سنائی اور اپنی کرسی پر ٹانگیں پسار کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ کافی مطمئن اور پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے ماریا کی جانب شوخ نگاہوں سے دیکھا اور دھیمے سروں میں ایک طربیہ گیت گنگنانے لگا۔

''کیا بات ہے... بہت خوش نظر آ رہے ہو؟'' وہ ایک ادا سے بولی۔

''میڈم! تم بھول رہی ہو کہ یہ کرسمس کی شام ہے۔''

''اور ہم آج بھی ڈیوٹی پر موجود ہیں۔'' وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو بتاؤ کہ اس نے فلیچر کو کیوں قتل کیا؟''

"وہ بہت ہی محنتی اور ذہین عورت ہے۔ اس فرم میں چھ سال سے کام کررہی تھی اور اسے پوری امید تھی کہ اگلے سال وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن جائے گی اور ممکن ہے کہ پالمر اسے اپنا پارٹنر بنالے کیونکہ فلیچر کے ریٹائر ہو جانے کے بعد کام کا سارا بوجھ اس پر آگیا تھا۔ لیکن سلویا کے آنے کے بعد وہ اسے اپنے لیے خطرہ محسوس کرنے لگی کیونکہ وہ اس کے مقابلے میں بہت زیادہ پرکشش، جوان، ذہین اور ہوشیار ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کی لگن بھی ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ سلویا کو اس کی جگہ لینے بلکہ اس سے آگے نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی چنانچہ اس نے پالمر پر ڈورے ڈالنا شروع کردیے اور وعدہ کیا کہ اس سال وہ اس کے ساتھ کرسمس کی تعطیلات گزارنے ٹینیرف جائے گی۔ اسے یقین تھا کہ وہ پالمر کو اپنا پارٹنر بنانے پر مائل کرلے گی لیکن اس کے لیے فلیچر کو راستے سے ہٹانا ضروری تھا کیونکہ اس کی زندگی میں ڈونا کا خواب پورا نہیں ہوسکتا تھا۔ بظاہر فلیچر صحت مند تھا اور اسے دل کے سوا کوئی عارضہ نہیں تھا۔ ڈونا جانتی تھی کہ مناسب علاج اور احتیاط کی بدولت ایسے مریض کئی برس تک زندہ رہتے ہیں اور وہ اس کی موت کے انتظار میں اپنی زندگی کے بہترین سال ضائع نہیں کرسکتی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اس دوران سلویا اپنے حسن اور ذہانت کے بل بوتے پر پالمر کے دل میں جگہ بنا سکتی ہے۔ اگر ایسا ہوگیا تو وہ خود کہیں کی نہ رہے گی لہٰذا اس نے فلیچر کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا۔"

"مجھے تو حیرت ہورہی ہے کہ اس نے کتنی ہوشیاری سے یہ منصوبہ بنایا۔ اگر تم بیچ میں نہ پڑتے تو کوئی بھی یہ ثابت نہیں کرسکتا تھا کہ فلیچر طبعی موت نہیں مرا بلکہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ اور اگر یہ ثابت ہوجاتا، تب بھی ڈونا کی طرف کسی کا دھیان نہیں جاتا۔ سب یہی سمجھتے کہ اس کے حصے میں آنے والے پیٹیز میں کوئی زہریلی چیز چلی گئی ہوگی، چاہے کتنی ہی اچھی اور معیاری بیکری کیوں نہ ہو۔ سامان کی تیاری کے دوران اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔"

"واقعی اس نے بڑی ذہانت سے منصوبہ تیار کیا تھا۔ شروع میں تو میں بھی الجھ گیا تھا۔ یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے زہر کس طرح دیا گیا لیکن جب میں نے اس بارے میں غور کیا تو زہر کی نوعیت سامنے آگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسے کس طرح فلیچر کے معدے میں پہنچایا گیا۔ ڈونا جانتی تھی کہ فلیچر رسومات کا پابند ہے اور وہ پارٹی میں مطلوبہ سامان لے کر آتا ہے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ سلویا میز پر چڑھی ہوئی ہے اور فلیچر کی ساری توجہ اس کی جانب ہے۔ پالمر کچھ فاصلے پر آتش دان کے پاس اس کی جانب پشت کیے کھڑا ہوا تھا چنانچہ اسے اپنا کام دکھانے کا موقع مل گیا۔۔۔ کیونکہ فلیچر کی موت دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی تھی، اس لیے کسی نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ بعد میں میرے کہنے پر تجزیہ کیا گیا۔"

"ابھی تو لیبارٹری سے رپورٹ نہیں ملی پھر تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ ڈونا نے ہی فلیچر کو زہر دیا ہے؟"

"کیونکہ وہ اعتراف کرچکی ہے۔ میرے لیے اب اس رپورٹ کی کوئی اہمیت نہیں ہے البتہ اسے عدالت میں ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔"

"کیا کوئی اس طرح قتل کرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟"

"ہاں، ڈونا جیسی آرزومند عورت سب کچھ کرسکتی ہے کیونکہ وقت اس کے ہاتھ سے نکلا جارہا تھا اور اس کے پاس انتظار کرنے کی گنجائش بہت کم تھی۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ پالمر بھی اس سازش میں شریک ہوگا؟"

"نہیں، وہ اتنا دلیر اور ذہین نہیں ہے۔ تاہم میں اسے ایک وضع دار انسان سمجھتا ہوں جو گھر بٹھا کر اپنے سینئر پارٹنر کو منافع میں سے حصہ دے رہا تھا۔ کسی نے اسے اس قسم کے لیے مجبور نہیں کیا۔"

"چلو، یہ کیس تو ایک ہی دن میں حل ہوگیا۔ اب تم گھر جاکر اپنے مہمانوں کے ساتھ کرسمس منا سکتے ہو۔"

پیٹر نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "ابھی کچھ دیر رکنا ہوگا تاکہ کاغذی کارروائی مکمل کرلوں۔"

"یہ کام بعد میں بھی ہوسکتا ہے۔"

"نہیں، مجھے اپنی یادداشت پر بھروسا نہیں۔ یہ کام ابھی ہوجائے تو بہتر ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دوگی؟"

وہ اٹھلاتی ہوئی اس کے قریب آئی اور کرسی کی پشت پر کھڑے ہوکر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ "میں تو ساری زندگی تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔"

پیٹر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے ماریا کو رکنے کے لیے نہ کہا ہوتا۔

بازی

امجد رئیس

بساطِ زندگی ہو یا بساطِ عشق... کسی بھی بازی میں مات ناقابلِ قبول ہوتی ہے... مگر وہ شطرنج کی بساط پر بیٹھا تھا... شطرنج اس کی گھٹی میں رچی بسی تھی... جیتنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا... لیکن اس کے لیے ہار ہر صورت ضروری تھی...

ایک منفرد کہانی کے پیچیدہ تانے بانوں میں الجھی صورتِ حال

جنگ اپنی ہولناک تباہ کاریوں کے ساتھ ختم ہوچکی تھی لیکن یورپ کی فضاؤں میں مایوسی سی خاموشی اور اداسی رچی ہوئی تھی۔ ہنگری کا بھی یہی حال تھا۔ میں اس وقت دارالحکومت، بوڈاپسٹ کے ریلوے اسٹیشن پر کھڑا، اپنے اندرونی خوف اور اضطراب کو چھپائے رکھنے کی سرتوڑ کوشش کررہا تھا۔ ستمبر 1946ء کی وہ صبح میری آزادی اور زندگی کے لیے اہم ترین تھی۔

میں بخوبی آگاہ تھا کہ بدحواسی، فرار کے امکانات کو تباہ

کر دے گی۔ میں سراپا دعا بنا ہوا منتظر تھا کہ کب ''آسکر زنر کا نام پکارا جاتا ہے؟ اگرچہ میں جانتا تھا کہ یہ نام میری بربادی پر مہر بھی ثبت کر سکتا ہے....

دس دن قبل میں نے کبھی ''آسکر زنر'' کا نام نہیں سنا تھا۔ ہوا یوں میرے ایک پرانے دوست نے مجھ سے خفیہ ملاقات میں یہ نام بتایا تھا۔ میرا دوست بوڈاپسٹ سے نکلنے والے آسٹریا کے جنگ زدہ پناہ گزینوں کے بارے میں بھرپور معلومات جمع کر چکا تھا۔

''اپنے وطن واپس جانے والوں کی فہرست میں ایک بندہ ہے۔'' اس نے مجھے بتایا۔ ''آسٹرین پناہ گزیں جو ویانا جا رہے ہیں، انہیں اطلاع دی گئی ہے کہ آخری ٹرین ویانا کے لیے کب روانہ ہوگی... آسکر زنر نامی شخص کی جانب سے اب تک کوئی جواب نہیں مل رہا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ زندہ ہی نہ ہو۔ یہ آدمی پورٹریٹ پینٹر ہے، اس کا پورا نام آسکر زنر ہی ہے۔'' اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''آزادی کی جانب اس سفر میں کیا تم آسکر کا نام استعمال کرنے کا خطرہ مول لے سکتے ہو؟''

دوست کے اس سوال پر میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ آسٹرینز پناہ گزینوں میں شامل ہو کر ہنگری سے نکلنے کا یہ اچھا موقع تھا۔ تاہم خطرہ بھی موجود تھا... نازی قبضے اور بعدازاں کمیونسٹ تسلط کے دوران میں بوڈاپسٹ میں اتحادیوں کی جانب سے جاسوسی پر مامور تھا۔ لیکن روسی یلغار نے وہاں ایسا جال بُنا کہ مجھے اپنے دیگر ساتھیوں کے ہمراہ روپوش ہونا پڑ گیا۔

فرینک لازلو سے آسکر زنر بننے میں پاسپورٹ شامل نہیں تھے بس ایک نیا نام اختیار کرنا تھا اور پھر ہر قسم کی پوچھ گچھ میں وہی سب بتانا تھا جو اصل آسکر زنر خود بتاتا۔ روسیوں کی لوٹ مار اور آتشزنی نے بوڈاپسٹ کا کوئی گھر نہیں چھوڑا تھا۔ ہر جگہ، ہر قسم کی دستاویزات تلف کر دی گئی تھیں۔

بہرحال مجھے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ میرے دوست نے ٹائپ شدہ کئی صفحات مجھے پکڑا دیے جن میں آسکر زنر کے بارے میں ساری ممکنہ تفصیلات اور اطلاعات موجود تھیں۔ ان صفحات کو مجھے ازبر کرنا ضروری تھا۔

''تم اب پینٹر آسکر زنر ہو۔'' اس نے کہا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ تمہیں خود کو ہر زاویے سے پینٹر زنر سمجھنا اور ثابت کرنا ہے۔'' اس نے کاغذات کی جانب اشارہ کیا۔ ''سرحد پر کمیونسٹ پہرے داروں کے پاس یہ کاغذات موجود ہوں گے۔ میں نے تمہارے لیے ان کی پوری نقل چرائی ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس قدر سختی سے چھان پھٹک کرتے ہیں۔ جو گروپ روانہ ہو رہا ہے اس کے سپروائزر کے پاس بھی کاغذات کی ایک نقل موجود ہے۔ تاہم وہ ذاتی طور پر آسکر زنر کو نہیں جانتا۔ کاغذات میں موجود تفصیلات کو ذہن نشین کر کے تلف کر دینا۔''

''چیکنگ سخت ہے اور انہوں نے مجھے آسکر زنر سمجھ کر تصویر بنانے کے لیے کہہ دیا تو پھر میں کیا کروں گا؟'' میں نے زبردستی چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

''ایسا امکان نہیں ہے۔'' میرے دوست نے اطمینان سے میرا سوال مسترد کر دیا۔ جبکہ میں سوچ رہا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے، کون جانتا ہے؟ روسیوں کے بارے میں کوئی پیشگوئی کرنا بہت مشکل تھا... اگر صورت پسند نہ آنے کی وجہ سے چیکنگ کے بغیر ہی گولی مار دیتے تو کوئی حیرت انگیز بات نہ ہوتی۔

''ایک بات کا خیال رکھنا۔'' اس نے مزید سمجھایا۔ ''اسٹیشن پر جب نام پکارا جائے تو انتظار کرنا... فوراً جواب مت دینا۔''

''کیوں؟''

''اگر زنر موجود ہے اور آخری لمحات میں نمودار ہوتا ہے تو وہاں دو آسکر زنر کھڑے ہوں گے۔ تب آگے کیا ہوگا تم خود سمجھ سکتے ہو۔'' اس نے تشریح کی اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

☆☆☆

اگلے چند روز تک میں آسکر زنر کی زندگی کی کہانی پڑھتا رہا... اس کا مکان کہاں تھا، کیسا تھا؟ وہ گیراز، آسٹریا میں پیدا ہوا۔ اس کی عادتیں، پسند اور ناپسند کیا تھی... تعلیمی پس منظر، پینٹنگ کا انداز کیسا تھا؟ نقاد اس کے کام کے بارے میں کیا کہتے تھے؟ اس کی تصاویر عموماً کس قیمت پر فروخت ہوتی تھیں؟ اس کے گھر میں کون لوگ شامل تھے؟ وغیرہ وغیرہ...

آخری دن، اسٹیشن پر پہنچنے سے قبل میں نے کاغذات پرزے پرزے کر کے دریائے ڈینوب کے نرم رو پانی میں بہا دیے۔ میں ٹرین کی روانگی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ میں پرسکون رہنے اور اس سے زیادہ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دفعتاً لاؤڈ اسپیکر بول پڑا۔ میں نے دماغ حاضر کیا۔ دل ہی دل میں یاد کی ہوئی تفصیلات کو دہرانے لگا۔

ایک کرخت آواز نام پکار رہی تھی۔ نام حروفِ تہجی کی ترتیب سے پکارے جا رہے تھے۔

میرے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں... آخر میرے نام کا پہلا حرف، آخر میں کیوں تھا؟ انتظار، اضطراب کو مہمیز دے رہا تھا۔

بالآخر یہ اذیت ناک گھڑیاں تمام ہو گئیں۔

''زنر... آسکر زنر!'' اسپیکر سے بھیڑیے کی غراہٹ سے مشابہ آواز آئی یا مجھے ایسا محسوس ہوا۔ میں بوکھلاہٹ میں جواب دینے ہی والا تھا کہ اپنے خیرخواہ کی ہدایت یاد آتے ہی معاً تھم گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑ دھڑا رہا تھا۔ دماغ میں دعا گردش کر رہی تھی کہ کوئی جواب نہ آئے۔ یہاں ایک ہی زنر ہے۔

''زنر!'' غراہٹ پھر سنائی دی۔ میں نے گھبراہٹ کے عالم میں پیش قدمی کر ڈالی...

''یہاں ہوں۔'' میری آواز میں مضبوطی نہیں تھی۔ اصلی زنر سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ ابتدائی مرحلہ خیریت سے گزر گیا اور ہمیں 10،10 کے گروپس میں تقسیم کر کے ٹرین کے ڈبوں میں منتقل کر دیا گیا۔

میرا ذہن متواتر اپنا سبق یاد کرنے میں لگا ہوا تھا... میں پورٹریٹ پینٹر ہوں، میں گراز میں پیدا ہوا۔ میرا باپ آرکیٹکٹ تھا... میرا نام... م... م... میں ہراساں ہو گیا۔ اتنی جلدی؟؟ میرا نام... آسکر، آسکر زنر... آسکر زنر... زنر... زنر ہے۔ میں اپنے آبائی گھر ویانا جا رہا ہوں...

ایک تیز چبھتی ہوئی سیٹی جیسی آواز فضا میں بلند ہوئی جو ٹرین کی روانگی کا اشارہ تھا۔ لیکن ٹرین نے حرکت نہیں کی۔ چار روسی آفیسرز مارچ کرتے ہوئے ہمارے ڈبے کے قریب سے گزرے اور اگلے ڈبے کے مسافروں کو احکامات دیے کہ وہ کوریڈور کی طرف ہو جائیں۔ پھر وہ اس ڈبے میں سوار ہو گئے۔ ان کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں پھر گلاسوں کی کھنک سنائی دی... چاروں مستی میں تھے۔

سیٹی دوبارہ بلند ہوئی اور ایک جھٹکے کے ساتھ ٹرین نے حرکت کرنا شروع کر دی۔ دھیرے دھیرے ٹرین کی رفتار تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ کیا واقعی اپنی منزل تک پہنچ جاؤں گا؟ لیکن میں نے اتنا محسوس کر لیا کہ فضا سے اداسی کی اَن دیکھی لہر غائب ہو گئی تھی کیونکہ میں نے اپنے وطن، اپنی مٹی کی طرف سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ اتحادیوں کا ایک جاسوس قابض روسیوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بوڈاپسٹ بلکہ ہنگری ہی سے نکلنے والا تھا۔

''میں آسکر زنر ہوں اور اپنے گھر ویانا جا رہا ہوں۔'' میرے ذہن نے طوطے کے مانند اپنا سبق دہرایا۔

ٹرین گڑگڑاہٹ کے ساتھ کیلین فولڈ پر رکی یہ پہلا چیک پوائنٹ تھا۔ ہمیں روسی انسپکٹنگ آفیسر کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کے ہمراہ مترجم بھی تھا۔ کوریڈور میں مسلح روسی سپاہی بھی ساتھ تھے اور خاموشی سے کارروائی کا جائزہ لے رہے تھے۔ پتھریلے نقوش والے آفیسر نے ایک عورت سے سوالات کا آغاز کیا۔ وہ روسی زبان بول رہا تھا اور مترجم جرمن میں اس کا ترجمہ کر رہا تھا۔ آفیسر کے پاس بائیوگرافیکل کاغذات تھے۔ وہ کاغذات کھنگالتا ہوا سوالات کے تیر برسا رہا تھا...

کچھ دیر میں وہ میرے ساتھ بیٹھے مسافر تک آ گیا۔ میرے ذہن میں بیٹھے طوطے نے گردان شروع کر دی...

''میں گراز میں پیدا ہوا۔ میرا نام... میرا نام...''

میری پیشانی پر پسینے کے موتی ابھرنے لگے۔ روسی انسپکٹر اور مترجم کی آوازیں دور چلی گئیں۔ ''میرا نام... پلیز، گاڈ۔'' میں نے دعا کی۔ ''مجھے کیا ہو رہا ہے؟ روسیوں کی بوڈاپسٹ میں آمد کے بعد جو غارت گری ہوئی تھی کیا اس نے میرے اعصاب توڑ دیے ہیں؟'' اپنا نیا نام یکا یک میرے ذہن کی تختی سے غائب ہو چکا تھا۔

''میں ایک پرائیویٹ پینٹر ہوں اور میرا نام... لعنت ہے... میرا نام... م... م...'' مایوسی نے مجھے گھیرنا شروع کر دیا۔

آفیسر اب میرے سر پر کھڑا تھا۔ میرے کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ ''میرا نام... م... کہاں دفن ہو گیا۔'' آفیسر میری جانب متوجہ تھا۔ میں نے دھندلائی نظروں سے اسے منہ کھولتے دیکھا... جیسے میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔

دفعتاً ملحقہ کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا، کوریڈور میں کچھ ہلچل ہوئی اور ریڈ آرمی کی وردی پر ایک روسی کرنل کا سر دکھائی دیا۔ انسپکٹر کی توجہ بٹ گئی۔ میں نے جلدی سے عرق آلود پیشانی کو صاف کیا اور ذہن میں بیٹھے طوطے کو پچکارا۔

انسپکٹر نے مداخلت پر گھور کر کرنل کو دیکھا پھر اپنے سے بڑے فوجی عہدے دار کو پہچان کر مؤدب ہو گیا۔

''وراسیلٹ شاش؟'' کرنل نے سوال کیا۔ (شطرنج کون کھیلتا ہے؟'')

انسپکٹر نے اپنے مترجم کی جانب دیکھا اور ایک قدم پسپا ہو گیا۔ میں دروازے کے نزدیک تھا۔ کرنل کا اگلا سوال جیسے براہِ راست مجھ سے کیا گیا۔

''اسپلین سائی شاش؟'' اس نے استفسار کیا۔ اگرچہ مجھے شطرنج کھیلے ہوئے 10 برس ہو چکے تھے۔ تاہم اس طویل وقفے سے مجھے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ شطرنج میری گھٹی میں پڑی تھی۔ اور میں اس بات سے بھی واقف تھا کہ روس میں شطرنج کی مقبولیت اور مقام کیا ہے؟ لیکن سوال یہ تھا کہ کیا میں اعتراف کر لوں۔ کمپارٹمنٹ میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس انوکھی مداخلت کی وجہ سے میں فی الحال بال بال بچ گیا تھا۔

''جا، اش اسپلین شاش۔'' میں نے کہا۔

کرنل مسکرایا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

روسیوں کے کمپارٹمنٹ میں دو کرنل اور موجود تھے اور ایک دیوزاد جنرل جس کی وردی میڈلوں سے سجی تھی... جنرل کی عمر پچاس... کے لگ بھگ تھی۔

جنرل بظاہر وہی آدمی تھا جو شطرنج کھیلنا چاہتا تھا۔ اس کے اشارے نے تصدیق کر دی... وہ مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کررہا تھا۔ میز کے ایک طرف درجن بھر سینڈوچ اور ایک چاکلیٹ کا ڈبا موجود تھا۔ کھڑکی کے ساتھ ریک پر گلاس اور واڈ کا کے علاوہ ہنگری کی عمدہ وائن اور برانڈی نظر آرہی تھی۔ جنرل کی نظروں میں میرے لیے مدھم ستائش نظر آئی۔ یہ ستائش شاید اس لیے تھی کہ اسے شطرنج کا ایک کھلاڑی مل گیا تھا یا پھر ایک شکار مل گیا تھا۔ اس نے اشیائے خوردونوش کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔ ''دوائی۔'' (شروع ہوجاؤ)

میں نے سسپنس اور خوف کے ملے جلے احساسات کے ساتھ سینڈوچ اٹھایا۔ کسی لمحہ کوئی بھی روسی میرا نام پوچھ سکتا تھا۔ یا وہ انسپکٹر ہی نام دریافت کرنے آجاتا۔ ذہن میں تقریباً تمام معلومات محفوظ تھیں... ناقابلِ یقین طور پر ''پینٹر'' کا نام غائب تھا جو سب سے بنیادی اہمیت رکھتا تھا۔ ایسا کیونکر ہوسکتا ہے۔ کیا میں نے اسے ایک آسان بات سمجھ کر دوسری تفصیلات پر زیادہ توجہ دی تھی؟ لیکن پھر بھی اتنی جلدی میں نام کیسے بھول گیا؟

ٹرین نے رینگنا شروع کیا اور جنرل نے شطرنج نکال کر میز پر سجانی شروع کی۔ اس وقت بھی دنیا میں شطرنج کے کھیل میں روسیوں کا کوئی مدِمقابل نہیں تھا۔

''خدا میری مدد کرے۔'' میں نے دعا مانگی۔ ''میری زندگی شطرنج کی بساط سے منسلک ہوگئی ہے اور میں جیت کی قیمت ادا نہیں کرسکتا۔''

روسی شطرنج کے کھیل میں شکست سے نفرت کرتے تھے۔ اوران حالات میں روسی جنرل کو ہرانا صریحاً خودکشی تھی۔ میری نظریں بساط پر تھیں اور ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اگر ہار جاتا تو شاید وہ دوسرا گیم نہ کھیلے، جبکہ میری بچت کے امکانات اس نکتے میں پوشیدہ تھے کہ میں کسی طرح جیتے بغیر جنرل کو زیادہ سے زیادہ دیر تک کھیل میں الجھائے رکھوں... وہ شوقین معلوم ہوتا تھا۔ کمپارٹمنٹ میں موجود دوسرے افسران کی باڈی لینگویج بتارہی تھی کہ وہ جنرل کو ماسٹر پلیئر سمجھتے ہیں۔

درحقیقت فرار کا منصوبہ غیر متوقع طور پر شطرنج کی بساط پر منتقل ہوگیا تھا۔ جب جنرل نے شطرنج کی چالیں لکھنے کے لیے نوٹیشن شیٹ اور چیس کلاک نکالا تو مجھے حیرت ہوئی۔

نوٹیشن شیٹ اور چیس کلاک کی موجودگی نے مجھے چونکا دیا۔ عام طور پر دوستانہ کھیل میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بڑے ٹورنامنٹس میں استعمال ہوتی ہیں۔ چیس کلاک دراصل دہری اسٹاپ واچ ہوتی ہے جو ہر کھلاڑی کی چال کا وقت بتاتی ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ جنرل ٹورنامنٹ کنڈیشنز پیدا کرکے ایک سنجیدہ کھیل کھیلنے جارہا تھا... لیکن کیوں؟ میں نے ذہن دوڑایا تاہم کوئی واضح جواب تلاش نہ کرسکا سوائے اس کے کہ جنرل بہت شوقین معلوم ہوتا تھا۔

بہرحال مجھے اس میں ایک فائدہ نظر آیا۔ وہ یہ کہ اس طرح کے ماحول میں کھیلتے ہوئے کوئی شخص مداخلت پسند نہیں کرتا...

جنرل نے ایک نوٹیشن شیٹ اور قلم میری طرف بڑھا دیا۔ میں تو ایک پیادہ تھا۔ میں نے خاموشی سے نوٹیشن شیٹ لے لی۔ جنرل نے آفیسر سے کچھ کہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''لکھنا آتا ہے؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

جنرل نے ایک بار پھر مجھے حیران کردیا۔ جب اس نے ٹاس کرنے کے بجائے سفید مہرے میرے حوالے کردیے۔ یہ ٹورنامنٹ کنڈیشن کی خلاف ورزی تھی لیکن کوئی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ حقیقی بادشاہ اس وقت جنرل ہی تھا۔

میں نے اپنا منصوبہ تیار کرلیا۔ یعنی مجھے جیتنا نہیں ہے، دوم کھیل کو طول دینا ہے۔ سوم کھیل کو دلچسپ بنا کر ہارنا ہے تاکہ جنرل خوش ہوکر دوسرا کھیل لگائے۔ دو گیمز میں اتنا وقت گزر جاتا کہ ٹرین سرحد پار کرکے آسٹریا کے محفوظ علاقے میں داخل ہوجاتی۔

دوسرا آپشن یہ تھا کہ میں جیت جاؤں اور بدلہ لینے کے لیے وہ دوبارہ کھیلے... جیسا کہ شطرنج کا ہر کھلاڑی کرتا ہے۔ میں نے یہ آپشن فوراً مسترد کردیا۔ وہ کوئی عام کھلاڑی نہیں تھا جو بدلہ لینے کے لیے دوسرا گیم لگاتا... بھاری امکانات تھے کہ وہ مجھے زندگی کی قید سے ہی آزاد کردیتا۔ نہ ہی یہ گیم عام حالات میں ہورہا تھا۔ یہ بظاہر عام سا کھیل میری زندگی اور موت کا کھیل بن گیا تھا جہاں بساط پر میری زندگی ایک پیادے کے مانند تھی...

وہاں موجود افراد میری پہلی چال کا انتظار کررہے تھے۔ میں شطرنج کے پیچیدہ ترین کھیل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میری پہلی چال... شاہ کے سامنے والا پیادہ میں نے دو گھر آگے بڑھادیا۔ اورشیٹ پر نمبر 1 کے آگے ey لکھ دیا۔ جنرل کی آنکھوں میں شکاری کتے جیسی چمک پیدا ہوئی اور اس نے بھی شاہ کے سامنے والا ''پیدل'' دو گھر آگے بڑھادیا۔ وہ آرام سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سینٹر میں پیدل سے پیدل بھڑ گیا۔

میری دوسری چال (Nf3) تھی... شاہ کی سائڈ والا گھوڑا نکل کر چھٹے کالم کے تیسرے خانے پر آگیا۔ جنرل کی

مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ میں نے جھانسا دیا تھا کہ میں اسپینش گیم کھیلنا چاہتا ہوں۔ یہ چال دنیا میں ہر سطح پر بہت زیادہ کھیلی جاتی ہے۔ دوسری طرف میرا قوی اندازہ تھا کہ جنرل مجھے اسپینش گیم نہیں کھیلنے دے گا بلکہ ''رشین گیم'' کو ترجیح دے گا... جسے ''پیٹروف ڈیفنس'' بھی کہتے ہیں۔ میں اس کو اس کے پسندیدہ میدان میں آنے کا موقع دے رہا تھا۔

کمپارٹمنٹ میں موجود وردیاں کھیل کی جانب متوجہ ہوگئیں۔ جنرل نے دوسری چال گھوڑے کی چلی اور بادشاہ کی سمت کا گھوڑا تیسرے خانہ پر عین اس کالم پر رکھ دیا۔ جس کالم پر میں نے اپنا گھوڑا رکھا تھا اور اس چال نے رشین گیم شروع کردیا۔ میں اس کا پیادہ اپنے گھوڑے سے مار سکتا تھا۔

میں نے چہرے کو بے تاثر رکھا جبکہ جنرل کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ میں باخبر تھا کہ پیادہ مفت میں نہیں ملے گا۔ تاہم میں نے بلا تامل سیاہ پیادہ ماردیا۔ کمپارٹمنٹ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ میں بساط پر جھکا ہوا تھا۔

جنرل سمجھ رہا تھا کہ اس نے بلف کیا ہے اور ''اسپینش'' کے بجائے ''رشین ڈیفنس'' میں چلا گیا ہے جبکہ میں ابتدائی نفسیاتی جنگ میں ایک قدم آگے تھا اور شطرنج کی تھیوری کے مطابق جانتا تھا کہ جنرل کی اگلی چال کیا ہوگی؟

☆☆☆

کھیل آگے بڑھتا رہا۔ دونوں بارہ بارہ چال کھیل چکے تھے اور بساط کی پوزیشن برابری کو ظاہر کررہی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں سکوت تھا۔ جنرل کے چہرے پر مسکراہٹ کی جگہ دلچسپی نے لے لی تھی۔ اسے مزہ آرہا تھا۔ تاہم چہرے پر پریشانی کا کوئی تاثر نہیں تھا۔

میں پانچویں چال پر کھیل کو ''کاف مین ویری ایشن'' میں لے گیا تھا۔ یہ ایک نفسیاتی حرکت تھی۔ ''کاف مین ویری ایشن'' آرتھر کاف مین کے نام سے منسوب ہے جو بذات خود ویانا سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسرے الفاظ میں، میں نے خود کو آسٹرین ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ جنرل چوکنا ہوگیا، وہ نہیں جانتا تھا کہ میں جیتنے کے لیے نہیں کھیل رہا تھا۔

میں کامیابی سے اپنا منصوبہ آگے بڑھا رہا تھا۔ کھیل دلچسپ ہوگیا تھا اور طول پکڑ رہا تھا۔ قوی امکان تھا کہ جنرل جیتنے کے بعد دوبارہ کھیلے گا۔ مجھے جیتنا تو تھا ہی نہیں... دوسری اہم بات یہ تھی کہ میں آسانی سے نہ ہاروں اور نہ جنرل کو خبر ہونے دوں کہ میں عمداً ہارا ہوں۔ اگر وہ ہار جاتا تو بلامبالغہ مجھے شوٹ کرنے میں حق بجانب ہوتا۔

جنرل اچھا کھلاڑی تھا تاہم وہ میرے شطرنج کے پس منظر سے بے خبر تھا۔ میں 10 سال بعد بساط پر آیا تھا اور فطری طور پر میرا شطرنجی ذہن بیدار ہوگیا تھا۔ عجیب صورتِ حال تھی... مجھے ہارنا تھا اور جیتنے کے لیے ہارنا تھا۔ یعنی پیچیدہ کھیل، پیچیدہ تر ہوگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جنرل کی دلچسپی، سنجیدگی میں بدل گئی۔ اب وہ چال چلنے میں زیادہ وقت لے رہا تھا۔ اس سے قبل کہ وہ دباؤ میں آتا اور اس کے ساتھی اس دباؤ کو محسوس کرلیتے اور میرے حق میں بدترین صورتِ حال پیدا ہونے لگتی، لہٰذا میں نے احتیاط سے سترہویں چال ہلکی دی اور جنرل کے چہرے پر رونق آگئی۔

اس نے واڈ کا کا جام طلب کیا اور اگلی چال میں ''ٹریپ'' لگادیا۔ میرے لیے اس ٹریپ کو توڑنا مشکل نہیں تھا جس میں بظاہر میرا ایک مہرہ ضائع ہورہا تھا۔ تاہم میں نے دونوں ہتھیلیوں کے درمیان چہرہ کو پیوست کیا اور شکن آلود پیشانی کے ساتھ گہری سوچ میں ڈوب جانے کی کامیاب اداکاری شروع کردی۔

جنرل مطمئن انداز میں واڈ کا کی چسکیاں لے رہا تھا اور اس کے ساتھیوں کے چہرے پر جنرل کے لیے خوشامد اور ستائش دونوں موجود تھی۔

☆☆☆

مجھے محسوس ہوا کہ ٹرین کی رفتار سست ہورہی ہے ''گائی اور'' پر دوسرا چیک پوائنٹ تھا۔ میرے ذہن میں خیالات کی گردش تیز ہوگئی۔ کمپارٹمنٹ کا سلائڈنگ ڈور کھلا اور آسٹرین گروپ کا سپروائزر دکھائی دیا۔

میں نے اچٹتی نظر ڈالی اور اپنی سابقہ پوزیشن میں آگیا۔ میں چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بساط پر جھکا ہوا تھا۔ سپروائزر کے آنے سے قبل جنرل میری اس کیفیت سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ چیس کلاک پر جنرل کی گھڑی نے زیادہ وقت لیا تھا۔ تاہم اس کی پوزیشن بہتر تھی۔

''اس آدمی سے ابھی تک تفتیش نہیں کی گئی ہے۔'' سپروائزر نے مستحکم لہجے میں بتایا۔ میں نے کوئی پریشانی محسوس نہیں کی۔ جنرل دھیرے سے اٹھا اور دائیں ہاتھ کا چوڑا پنجہ سپروائزر کے سینے پر رکھ کر اسے دھکا دیا۔ پھر دروازہ بند کرکے بساط کی جانب اشارہ کیا۔

''دوائی، مگیار!'' (تمہاری چال ہے، ہنگرین!) ہنگرین! میں ہنگری سے ہی آرہا تھا لیکن آسٹرین پینٹر بنا ہوا تھا۔ جنرل کی زبان پھسل گئی ہے یا کوئی اور بات ہے؟ میری کھوپڑی میں پھر منفی خیالات چکرانے لگے... اس نے ہنگرین

کیوں کہا؟

سر جھٹک کر میں نے چال چل دی اور تھوڑی دیر بعد کھیل ختم ہوگیا۔ ظاہر ہے جنرل جیت چکا تھا۔ اس نے جرمن زبان میں ایک آفیسر سے کچھ کہا۔

''جنرل صاحب کو تمہارا کھیل پسند آیا ہے۔'' اسی نے ترجمہ کیا۔ ''وہ ایک گیم اور کھیلیں گے۔''

جنرل نے دوسرے گیم سے پہلے پینے پلانے پر زور دیا۔ پھر ہم نے کھیل شروع کر دیا۔ اصولاً جنرل کو اب سفید مہروں سے کھیلنا تھا لیکن اس نے پھر سفید مہرے مجھے دے دیے اور فخریہ انداز میں ساتھیوں کو دیکھا۔

اس مرتبہ میں نے کھیل کو مزید لمبا کرنے کے لیے کوئین کے سامنے والا پیادہ بڑھایا۔

اب ہم ''کوئین گیمبٹ ڈکلائن'' (QGD) کھیل رہے تھے۔ موقع ملتے ہی میں نے کھیل کو ''لاسکر ویری ایشن'' کی لائن پر ڈال دیا۔ یہ اور بات تھی کہ یہ لائن ریور سڈ کلر کے ساتھ کھیلی جا رہی تھی۔ سیاہ مہروں کے ساتھ کھیلی جاتی تو کھیل ڈرا کی طرف چلا جاتا۔ سیاہ رنگ کے ساتھ ''لاسکر ڈیفنس'' بہت مضبوط اور خطرات سے عاری ہوتا ہے۔

جنرل اس چال بازی کو نہیں سمجھا، تاہم کھیلتا رہا۔ دفعتاً میرے ذہن میں دھماکا ہوا۔ ''لاسکر ویری ایشن'' کے ساتھ ''آسکر'' کا نام ذہن میں ابھر آیا تھا۔

''میرا نام آسکر زنر ہے... میرا نام آسکر زنر ہے... آسکر زنر... آسکر زنر...'' میرا ذہن ہلکا ہوگیا اور میں نے دل ہی دل میں ورلڈ چیمپئن لاسکر کا شکریہ ادا کیا جو ایک طویل عرصے تک عالمی چیمپئن رہا تھا۔

بالآخر کھیل 35 چالوں کے بعد اس مقام پر آگیا جہاں میری اگلی چال ہار جیت کا فیصلہ کرتی۔ جیتنے میں تباہی کے امکانات بہت روشن تھے۔ چال اتنی واضح نہیں تھی کہ جنرل فوراً ہی جیت جاتا اور شک میں پڑ جاتا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی فیصلہ کرتا، ٹرین ہچکی شالوم کے تیسرے اور آخری چیک پوائنٹ پر پہنچ گئی۔ منصوبے کے مطابق میں ٹھیک جا رہا تھا۔ آزادی کا وقت قریب آ گیا تھا۔

کمپارٹمنٹ میں ریڈ آرمی کے مسلح آدمی کئی مترجمین کے ساتھ گھس آئے۔ انہوں نے رائفلیں سونتی ہوئی تھیں۔ ان کی بیلٹس کے ساتھ گرینیڈ لٹک رہے تھے۔ انہوں نے کمپارٹمنٹ کا سرسری جائزہ لیا اور دوسرے کمپارٹمنٹ میں چلے گئے۔

ناراض سپروائزر نے ''آسٹرین'' یعنی میرے بارے میں غالباً بتا دیا تھا جو ہائی رینک آفیسرز کے ساتھ بیٹھا موج کر رہا تھا۔ ایک گارڈ واپس آیا اور مستعدی سے دروازے میں کھڑے ہو کر سیلیوٹ جھاڑا۔ پھر تیزی سے رشین میں بولنے لگا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ لیکن یہ پہلے جتنا شدید نہیں تھا۔ ''جنرل تفتیش کی اجازت دے سکتا تھا۔'' میں نے سوچا۔

جیسے جیسے گارڈ بولتا جا رہا تھا۔ جنرل کا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ مشتعل تھا... دوسری طرف گارڈ کی نگاہیں میری آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ اگر جنرل وہاں نہ ہوتا تو وہ مشتعل گارڈ میرے ساتھ کیا کرتا۔

پھر میں نے جنرل کو احتیاط سے اٹھتے دیکھا۔

''خاتمہ سر پر ہے۔'' مجھے پہلا خیال یہی آیا تھا۔ جنرل نے کھڑے ہو کر ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ گارڈ خاموش ہو گیا تھا۔ سب خاموش تھے۔ میں نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

بساط پر بازی نامکمل تھی... میری زندگی اور موت کی بازی بھی نامکمل تھی... معاً وہ ہوا، جس کی غالباً کوئی توقع نہیں کر رہا تھا۔

جنرل کا ایک ہاتھ حرکت میں آیا اور زناٹے سے گارڈ کے منہ پر پڑا۔ گارڈ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی جانب گیا اور کوریڈور کی دیوار سے ٹکرایا۔

اس بار جنرل نے دروازہ دھماکے سے بند کیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

ہم دونوں پھر کھیلنے لگے۔ ''اب کسی کو یہاں گھسنے کی جرأت نہیں ہوگی۔'' میں نے سوچا۔ ٹرین دوبارہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ بہت دیر سے جس اعصابی تناؤ اور خوف نے مجھے جکڑا ہوا تھا وہ تحلیل ہو گیا۔

میں پہلی بار مسکرایا۔ جواب میں جنرل بھی مسکرایا اور اپنے آفیسر سے کچھ کہا۔

''صاحب کو مزہ آیا، ان کی خواہش ہے کہ تم ویانا میں بھی شطرنج سے لطف اندوز ہونے کے لیے وقت نکالو گے۔ ویانا میں صاحب تم سے کہاں مل سکتے ہیں؟''

بے ساختہ میری زبان پر ویانا کے مشہور ہوٹل کا نام آ گیا۔

''اور تمہارا نام؟'' افسر نے پوچھا۔

خوفناک دہشت نے مجھے آزاد کر دیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ کا توقف کیا اور بلند آواز میں کہا۔

''آسکر زنر!''

گمشدہ

ماہ نور

اکثر لوگ روزمرّہ زندگی کے معمولات میں بھی اس طرح الجھ کر رہ جاتے ہیں جیسے اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور مسئلہ نہیں... دو پڑوسنوں کے مابین جاری مکالمے بازی جو ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے مرض میں مبتلا تھیں...

ایک بیٹے کی گمشدگی پر والدہ کی پریشانی کا سنسنی خیز احوال

اس شاندار کثیر المنزلہ عمارت کے باہر درجہ حرارت نوّے ڈگری کو پار کر چکا تھا۔ مرکزی نظام کے تحت عمارت کے تقریباً تمام اے سی چل رہے تھے۔ بجلی کے بحران کے آثار اس پوش علاقے میں یا کم از کم اس بلڈنگ میں نظر نہیں آ رہے تھے یا پھر غیر قانونی بجلی استعمال کی جا رہی تھی۔ تاہم اے سی بھی گرمی کی شدت کو توڑنے میں ناکام ثابت ہو رہے تھے۔

بیگم شہلا عمران نے زیریں منزل چھوڑ کر دوسری منزل پر ساحلہ بیگم کے گیٹ پر قدم رکھا۔ ''نیچے تو مناسب ٹھنڈک ہے۔'' ساحلہ بیگم کی طرح شہلا عمران بھی عمر کے لحاظ سے پچاس کے قریب تھیں۔ تاہم اس عمر میں بھی بالوں کو بھورے رنگ میں تبدیل کیا ہوا تھا۔ سنہری مائل بھورا... بدن کی ڈھیل کو قابو میں رکھنے کے لیے بھی کچھ مصنوعی اقدامات کیے گئے تھے۔

''شاید ہمارا اپارٹمنٹ چھت سے قریب ہے۔'' ساحلہ بیگم نے کہا۔ ''اسی لیے مناسب ٹھنڈک نہیں ہو پا رہی ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' شہلا نے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ٹین کی چھت کے نیچے پیدا ہوئی ہوگی اور نخرے پیدائشی امرا جیسے ہیں۔

''بہرحال تپش سے زیادہ تو مجھے پانی گرنے کی متواتر آواز

نے پریشان کیا ہوا ہے۔" ساحلہ بیگم نے پریشانی ظاہر کی۔
شہلا نے لفظ "تپش" پر تپش محسوس کی۔ "دوائے سی اور لگوا لو۔" اس نے دل میں کہا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ملتی رہتی تھیں تاہم یہ ملاقاتیں انسیت سے خالی تھیں۔ مقصد کن سوئیاں لینا تھا حالانکہ یہ متوسط اور نیم متوسط گھرانوں کا اسٹائل تھا یا یہ دونوں بھی حالات کی گردش کے ساتھ کسی پسماندہ علاقے سے ہی اٹھ کر آئی تھیں لیکن چونچلے پیدائشی دولت مندوں کی طرح کے تھے۔
"کیا تم کو سنائی نہیں دے رہی؟"
"کیا؟"
"پانی کی آواز۔" ساحلہ بیگم نے توجہ دلائی۔ وہ اعصابی خلل کی مریضہ تھیں شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ پچھلے چند... سالوں میں آنے والی معاشی خوشحالی اور اس کے نتیجے میں چکا چوند والے نئے طرز زندگی میں خود کو ہم آہنگ نہیں کر پا رہی تھیں اور پچاس سے اوپر کی عمر بھی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ دولت کے بل پر 50 کو 25 میں بدلنے کے لیے کوشاں تھیں۔ ساتھ ہی شکوہ کناں رہتیں کہ یہ سنہرا وقت بیس برس قبل کیوں نہیں آیا۔ اس معاملے میں دونوں کی سوچ قریب قریب یکساں تھی۔
"مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" شہلا نے کان لگائے۔
"میں تو یہ جانتی ہوں..."
"کیا جانتی ہو؟"
"پہلے یہ بتاؤ کہ تم دوائیں وقت پر لے رہی ہو؟"
"ہاں۔" ساحلہ نے کہا۔
"پھر اجڑی اجڑی کیوں نظر آ رہی ہو؟" شہلا نے عملاً مزہ لیا اور ساحلہ بیگم کا منہ بن گیا۔
"تمہیں حالیہ پریشانی کا بتایا تو ہے شاید اس کا معمولی اثر ہوا ہو... بہر حال تم کیا کہہ رہی تھیں؟"
"میں اپنے لڑکے اسلم کی بات کر رہی تھی۔"
"کیا ہوا اسے؟"
"ارے کیا بتاؤں، جب سے اس کے اب... پاپا نے..." وہ پرانا لفظ ابا بولتے بولتے رہ گئی۔ "پاپا نے ابوظہبی سے قیمتی جیکٹ بھیجی ہے وہ ہیوی بائک پر جیکٹ کے ساتھ اڑا اڑا پھرتا ہے۔"
"شہلا اس تپش میں؟ یہ موسم گرما ہے۔" شہلا تپش کے لفظ پر پھر تپ گئی۔
"بائک پر کھلی جیکٹ میں کیا گرمی لگے گی۔" اس نے بیٹے کا دفاع کیا۔ "لیکن بات کچھ اور ہے۔"
"اچھا۔" ساحلہ کی آنکھوں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔
"اس کو وہ جیکٹ کچھ زیادہ ہی پسند ہے۔ اس کی آستین کا ایک سنہرا بٹن کہیں غائب ہو گیا ہے اور وہ بولایا پھر رہا ہے۔" شہلا نے وضاحت کی۔
"اس میں کیا مسئلہ ہے، دونوں آستینیں الگ کر دو۔ یہ بھی فیشن ہے۔" ساحلہ بیگم نے قیمتی مشورہ دیا۔
"نہیں، جیکٹ کی تمام کشش اس کی مخصوص بناوٹ اور اس کے ایک ایک بٹن، اس کے ڈیزائن کا خاص حصہ ہے۔" شہلا نے بتایا۔
"میرے خیال میں یہ کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں ہے۔" ساحلہ بیگم نے کہا۔
"تمہیں پتا نہیں، وہ کتنا حساس ہے۔"
"وہ خود ہی کوئی حل نکال لے گا... اپنا کھویا ہوا بٹن ڈھونڈ لے گا۔" ساحلہ نے کہا۔ "کوئی بچہ نہیں ہے۔ اکیس برس کا جوان ہے۔ تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟"
"پریشانی یہ ہے کہ وہ دو دن سے غائب ہے۔ سارے گھر میں بٹن ڈھونڈتا رہا پھر جو نکلا ہے تو اب تک نہیں لوٹا۔" شہلا نے اطلاع دی۔
"آ جائے گا، میں نے کہا نا کہ بچہ نہیں ہے۔"
"لیکن مجھے ہول آ رہے ہیں۔"
"کیا بوڑھی عورتوں کی طرح گھبرا رہی ہو۔"
شہلا یہ بات سن کر خوش ہو گئی اور قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ "اچھا بتاؤ، کہاں آ رہی ہے آواز پانی کی؟"
"اب تو یہ دھماکوں کی طرح سماعت سے ٹکرا رہی ہے۔"
شہلا نے پھر کان لگائے اور باتھ روم کی جانب سے اسے ہلکی آواز سنائی دینے لگی۔ اس نے بڑے سائز کا رنگین چشمہ چہرے پر درست کیا۔ "میرے خیال میں بالائی منزل کا شاور یا نلکا پوری طرح بند نہیں ہے۔ وہاں مونیکا کھیمانی رہائش پذیر ہے۔ خوش مزاج عورت ہے۔ گھنٹی بجا کر اسے بتا دو... وہ تمہیں کھا نہیں جائے گی۔ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے جو تم تین دن سے پریشان ہو رہی ہو۔"
"میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔" ساحلہ بیگم نے کہا۔ "میں یہ کام پہلے بھی پانچ مرتبہ کر چکی ہوں۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ اکیلی رہتی ہے۔ اس کا شوہر امریکا میں ہے اور ملازم چھٹی پر۔ میں فون بھی کر چکی ہوں... کوئی جواب نہیں مل رہا۔"
"حیرت ہے۔" شہلا بڑبڑائی۔ "ہو سکتا ہے وہ گھر میں نہ ہو۔ موسم گرما ہے بیشتر مکین ادھر ادھر نکل گئے ہوں۔"
"اگر ایسا ہے اور وہ پورے موسم گرما میں غائب رہی تو کیا ہوگا۔ میرا تو واش روم میں جانا محال ہو گیا ہے۔ میرے اعصاب تڑخنے لگتے ہیں۔"
"سپروائزر کو بتا دو۔"
"وہ احمق شخص... اس کے پاس چابی کی نقل ہے اور نہ ہی وہ بظاہر اتنی سی بات کے لیے اندر گھسے گا۔ یہاں اتنی سی بات میرے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی ہے پھر یہ کہ اگر وہ اندر ہی ہوئی تو کیا ہوگا۔ میں نے اس کی گاڑی گیراج میں دیکھی ہے۔"
شہلا نے کچھ بے چینی سی محسوس کی۔ "وہ کسی اور کی کار میں جا سکتی ہے۔" اس نے خیال آرائی کی۔
"کسی اور کے ساتھ؟"
"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ تمہیں نہیں پتا کہ وہ ایک آزاد خیال عورت ہے اور اس کی عمر بھی تیس سے پینتیس سے زیادہ نہیں ہے نیز وہ خوش شکل بھی ہے۔"
"ایسا نہیں ہے، وہ اوپر موجود ہے۔" ساحلہ بیگم نے کہا۔
"وہ کیسے؟"
"میں نے اوپر چلنے پھرنے کی آوازیں سنی ہیں اور وہ واش روم بھی بار بار استعمال کرتی ہے لیکن ایک بار بھی اس نے شاور یا نلکا پوری طرح بند نہیں کیا۔"
"اگر وہ اوپر ہے تو پھر جواب کیوں نہیں دیتی؟"
"کیا معلوم؟"
"تم روز بروز حساس نہیں ہوتی جا رہی ہو؟" شہلا نے کہا۔
"کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" ساحلہ بیگم نے منہ بنایا۔
"میں نے یہ کب کہا لیکن تم اس معمولی بات کو ذہن پر سوار کر رہی ہو۔"
"وہ جب دور جاتی ہے تو میں اس کے پودوں کو پانی دیتی ہوں۔ اسے اپنے سب پودوں سے عشق ہے۔" ساحلہ نے بتایا۔ "اس کے پاس کئی 'بون سائی' کے نمونے بھی ہیں۔"
"یعنی ایک چابی تمہارے پاس بھی ہے؟" شہلا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "اور وہ پھر بھی تمہیں جواب نہیں دے رہی ہے۔ عجیب الجھن ہے... پھر تم خود اندر چلی جاؤ۔"
"نہیں میں نہیں جا سکتی۔"
"کیوں؟"
"اس نے مجھے پانی ڈالنے کے لیے نہیں کہا اور نہ وہ کہیں باہر گئی ہے۔" ساحلہ بیگم نے وضاحت کی۔
"ہو سکتا ہے وہ بیمار ہو اور بستر پر پڑی ہو۔" شہلا نے خیال ظاہر کیا۔ "یا گزر ہی گئی ہو... ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔"
"اس کی عمر ہارٹ اٹیک کی نہیں ہے۔" ساحلہ کا منہ بن گیا۔
"اس کے کسی دوست نے اسے مار دیا ہو؟"
"تمہارا ابھی دماغ چل گیا ہے۔"
"ہم بکواس ہی کرتے رہیں گے یا کچھ کریں گے بھی۔ تم چابی لاؤ ہم دونوں چلتے ہیں۔ تم پودوں کو پانی دینا میں شاور یا نل جو بھی ہے بند کر دوں گی۔ اس میں کیا خطرہ ہے؟" شہلا نے حتمی لہجہ اختیار کیا۔
ساحلہ بیگم نے ہچکچاہٹ محسوس کی۔ تاہم وہ کچھ دیر میں دوسری چابی لے آئیں۔

☆☆☆

"اگر وہ اندر ہوئی تو؟" ساحلہ نے کہا۔ "اور پوچھا کہ کون ہے؟"
"بس رہنے دو، چھوٹی سی بات ہے کہہ دینا جواب نہیں مل رہا تھا اس لیے میں پودوں کو بچانے آ گئی اور میں اس سے درخواست کروں گی کہ واش روم کی پلمبنگ چیک کر لے۔"
ساحلہ نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ کھول دیا پھر کھلے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ انہوں نے دروازہ پورا کھول دیا۔ اے، سی بھی بند تھا۔
"تم پودوں کو پانی دو۔" شہلا نے کہا اور دروازہ اپنے عقب میں بند کر دیا۔
"عجیب سی بو ہے فضا میں۔" ساحلہ نے کہا۔ دونوں نے کوریڈور، کمرا، واش روم چیک کیا، سب ٹھیک تھا۔
"ماسٹر بیڈ روم۔" ساحلہ نے اشارہ کیا۔ دونوں نے لیونگ روم سے گزرتے ہوئے وہاں اور گیلری میں پودوں کو دیکھا جو سوکھے پڑے تھے۔
"میں خواب گاہ میں جا رہی ہوں۔" ساحلہ نے کہا اور خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ کوئی آواز، کوئی حرکت نہیں تھی۔ اس کی پہلی نظر بستر پر پڑی اور اس کا منہ کھلتا چلا گیا۔ شہلا اس کے برابر میں کھڑی تھی۔ مذکورہ عجیب بو اس کمرے میں زیادہ تھی بلکہ یہیں سے پھیل رہی تھی۔
"اوہ میرے خدا..." ساحلہ کی سانس رک گئی وہ چیخنے سے قاصر تھی۔
بستر کی چادر کا برا حال تھا۔ مونیکا کھیمانی کا سر بستر کے کنارے پر ڈھلکا ہوا تھا اور زلفیں فرش کو چھو رہی تھیں۔ اس کی گردن پر خراشیں تھیں اور دونوں ہاتھ بستر سے نیچے جھول رہے تھے۔ ایک ہاتھ کی ہتھیلی پوری کھلی ہوئی تھی اور دوسرا ہاتھ آدھا کھلا ہوا تھا۔
"پولیس کو فون کرو۔" ساحلہ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "کسی چیز کو مت چھونا۔" اس نے فون کی جانب اشارہ کیا۔
شہلا عمران فون کی طرف بڑھتے بڑھتے معاً اپنی جگہ پر جامد ہو گئی۔
اسے اپنے بیٹے کا کھویا ہوا بٹن مل گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسلم کی جیکٹ کے سنہرے بٹن کو گھور رہی تھی جو لاش کی ادھ کھلی مٹھی میں سے آنکھ مارتا دکھائی دے رہا تھا۔

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

آخری قسط

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانہ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ... کرداروں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ... سرپھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمحِ نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ... ایک للکار ہے۔

کسی بھی وقت کوئی گولی ثروت کو لگ سکتی تھی۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے میں اس کی طرف جانا چاہ رہا تھا، وہ میری طرف آنا چاہ رہی تھی۔ وہ ایسا کرتی تو اس کے لیے زبردست رسک ہوتا۔ یہ رسک مجھے لینا چاہیے تھا۔ میں ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور جھک کر بھاگتا ہوا برآمدے کی طرف گیا۔ گولیوں کی سنسناہٹ موت کی سرگوشیوں کی طرح تھی اور یہ سرگوشیاں ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔ میں ثروت کے پاس پہنچا اور اسے کھینچتا ہوا کمرے میں لے آیا۔

گولیوں کی باڑ آئی۔ ہم کچے فرش پر گرے۔ ثروت میری بانہوں میں تھی۔ میں نے اسے ڈھانپ لیا۔ مجھے لگا اسے گولی لگ گئی ہے۔ میں نے تیزی سے اس کے جسم کو ٹٹولا۔ ”تم ٹھیک ہو نا؟“

اس نے آنکھیں بند کیے کیے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے شفاف رخساروں پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کی پیشانی چومی۔ ”حوصلہ کرو ثروت! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”...اگر مجھے کچھ ہو گیا تو آپ نصرت کا خیال رکھیں گے نا؟“ اس نے آنکھیں بند کیے کیے پوچھا۔

”ایسی باتیں مت کرو۔ نصرت کا خیال تم رکھو گی اور دیکھنا وہ ٹھیک بھی ہو گی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا... لیکن... اب تم کمرے سے باہر نہیں نکلو گی جب تک میں نہ کہوں۔ تمہیں اندر ہی رہنا ہے میڈم صفورا کے ساتھ۔“

وہ چپ رہی۔ تاہم چہرے سے عیاں تھا کہ وہ آمادگی ظاہر کر رہی ہے۔

ہمارے اردگرد ہونے والی فائرنگ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میرا عمران کے پاس فوراً پہنچنا ضروری تھا۔ میں ثروت سے علیحدہ ہو کر واپس احاطے کی طرف جانے کے لیے اٹھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا اور سسک کر بولی۔ ”تابش! آپ اور عمران صاحب میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسے ہیں۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، میری نگاہ ثروت کے عقب میں گئی۔ یہاں نیم تاریکی میں اس لڑکی کی لاش پڑی تھی جو جاوا نے دھوکے سے ہمیں سونپی تھی۔ یہ اس کی رکھیل سریتا نہیں تھی مگر ہم نے اسے سریتا سمجھ کر جاوا سے وصول کیا تھا۔ کوئی اندھی گولی اسے چاٹ گئی تھی۔ اس کے سینے پر بائیں طرف زخم تھا۔ ثروت کی نگاہ ابھی تک اس لاش پر نہیں پڑی تھی۔

میں نے ثروت کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیا اور اس طرح اسے کمرے سے دوسرے کمرے میں پہنچایا کہ اس تازہ لاش پر اس کی نظر نہ پڑ سکی۔ اس دوسرے کمرے میں میڈم صفورا لڑکیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے انہیں دیوار کے ساتھ ایک محفوظ آڑ میں بٹھایا ہوا تھا۔ وہ خود لوڈڈ پستول کے ساتھ ان کی نگہبانی میں مصروف تھی۔ گولیوں والی ایک بیلٹ اس کے کندھے سے جھول رہی تھی۔ سویٹی، ایشوریا رائے کی لاش پر ایک اوڑھنی ڈال دی گئی تھی۔ اوڑھنی پر خون کے دو بڑے دھبے نمودار ہو رہے تھے۔ ثروت کو میڈم کے سپرد کر کے میں واپس احاطے کی طرف بڑھا۔ عمران کے شوٹرز میں سے چار پانچ بندے اب تک را... میں اور یہاں کام آ چکے تھے لیکن سترہ اٹھارہ اب بھی پوری طرح ڈٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے مختلف جگہوں پر بڑی اچھی پوزیشنیں لے لی تھیں۔ کچھ چھت پر چلے گئے تھے۔ ان میں اسنیپر گن والا بھی شامل تھا۔ لیکن اب وہ ایک ایل ایم جی چلا رہا تھا۔ اس کی اسنیپر گن، راؤنڈز ختم ہونے کے سبب بیکار ہو گئی تھی۔

میں عمران کے پاس پہنچا۔ ہم اس ریسٹ ہاؤس کے ایک سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ یہ خالی کوارٹر پھاٹک کے بالکل قریب واقع تھا۔ اس کی خستہ دیوار میں رخنے موجود تھے۔ یہ جگہ فائرنگ کرنے کے لیے بالکل ایک مورچے جیسی ہو گئی تھی۔ عمران کے اردگرد گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے اور اس نے ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر آٹومیٹک رائفل کا بٹ اپنے کندھے سے لگایا ہوا تھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے جن گاڑیوں کی دھول دیکھی تھی، وہ اب قریب پہنچ گئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں جاوا کی دیوہیکل گرے جیپ صاف نظر آ رہی تھی۔ تین چار گاڑیاں مزید تھیں۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے جاوا بھی آ گیا۔“

”دعا کرو کہ واپس نہ جائے۔“ عمران نے ایک سنگل شاٹ فائر کرتے ہوئے کہا۔

”ہم کب تک ان کی فائرنگ کا جواب دے سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر ایمونیشن احتیاط سے استعمال ہو تو چوبیس گھنٹے بہ آسانی گزر سکتے ہیں۔“

”اس کے بعد کیا ہو گا؟“

”جنگ میں یہ نہیں سوچا جاتا کہ اس کے بعد کیا ہو گا۔ یہ سوچا جاتا ہے کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے۔“

”لیکن عمران! یہ جنگ لگی کیوں ہے؟ جاوا کے ساتھ ہمارا معاملہ تو صرف گندھارا مورتی کا تھا۔ مورتی اسے مل گئی ہے۔ اب کیوں وہ تمہارے پیچھے ہے؟ پولیس اور بی ایس ایف بھی اس کا پورا ساتھ دے رہی ہے۔“

”تمہیں سب کچھ بتایا تو ہے جان۔ جاوا کا اور ہمارا

معاملہ صرف مورتی کا تھا لیکن گڑبڑ یہ ہوئی کہ ادھر پاکستان میں اقبال بدقسمتی سے جاوا گروپ کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے تشدد اور پوچھ گچھ کے جدید طریقے اختیار کر کے یہ معلوم کر لیا کہ ہم انڈیا کے اندر کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ ان کارروائیوں میں پاکستانیوں کو یہاں کی ایجنسیوں سے رہائی دلا کر وطن واپس پہنچایا جاتا رہا ہے۔ ہماری اس نئی شناخت سے جاوا نے ایجنسیوں کو باخبر کر دیا ہے...“

”عمران! تم اب بھی پوری بات نہیں بتا رہے ہو... تمہیں اچھا لگے یا برا لیکن آج میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے ممبئی میں بند کمرے کے اندر تمہاری اور جیلانی کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔“

عمران نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ”جیلانی تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا ہے بہت برا ہوا ہے۔ اب کم از کم تمہیں تو کسی صورت جاوا کے سامنے نہیں جانا چاہیے۔ جتنی جلد ہو سکے انڈیا سے نکل جانا چاہیے۔ اس نے رو رو کر درخواست کی لیکن تم نے اس کی بات نہیں مانی۔“

”بس یہی وجہ تھی جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔ ان لوگوں کو پتا چل چکا ہے کہ میں اور میرے ساتھی یہاں کارروائیاں کرتے رہے ہیں۔“

بائیں جانب سے گھیرا ڈالنے والی گاڑیاں اب آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھیں۔ ان کے عقب میں مسلح افراد اوٹ لیے ہوئے تھے۔ عمران کے شوٹرز انہیں ٹارگٹ کرنے لگے۔ کچھ دیر تک یہ زوردار کشمکش جاری رہی۔ پھر آگے بڑھنے والی گاڑیاں درختوں کے جھنڈ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔ اب وہ بہتر طریقے سے ہمیں نشانہ بنا سکتے تھے۔ عمران نے قربان علی سے کہا کہ وہ سیڑھیوں پر اپنی پوزیشن ختم کر کے چھت پر چلا جائے۔ اگر وہ سیڑھیوں میں رہتا تو وہ اور اس کے دو ساتھی بہ آسانی نشانہ بن سکتے تھے۔

کچھ دیر کے لیے فائرنگ میں وقفہ آیا۔ شوٹرز نئے میگزین رائفلوں سے اٹیچ کرنے لگے۔ میں نے دیکھا، میڈم صفورا میگزین بھرنے میں جگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی مدد کر رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ”عمران! کوئی کمک ملنے کا چانس بھی ہے؟“

”کیا مطلب؟“

”تمہارے دیگر ساتھی اور... اور وہ سابق میجر صاحب... جن کو تم انچارج کہتے ہو، کیا وہ یہاں تک پہنچ سکیں گے؟“

”یہ تو حالات پر ہے تابی! ان کو خبر تو بہرحال ہو چکی ہے۔ اب دیکھیں کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر کرتے ہیں تو کتنی دیر میں؟“

”اگر میجر صاحب یہاں پہنچ جائیں اور اچانک باہر سے حملہ کریں تو ہم اندر سے زور مار کر ان کا گھیرا توڑ سکتے ہیں۔“

”ہوں۔“ عمران نے مختصر جواب دیا۔ رائفل پر اس کی گرفت بڑی مضبوط تھی اور چہرے پر چٹانوں کی سی سختی تھی۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن... مجھے نہیں لگتا عمران کہ تمہارے وہ میجر صاحب کچھ کر پائیں گے۔“

”اتنی مایوسی کیوں؟“

”شاید میجر کا انتظار بیکار ہی ثابت ہو۔“

”کیوں؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس لیے... کہ مجھے ایک شک ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ... تم خود ہی وہ میجر ہو۔“

میرے آخری الفاظ نے اسے جیسے جھنجوڑ ڈالا۔ وہ متحیر نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”...عمران! تمہارے ساتھ رہ رہ کر مجھے بھی اندھیرے میں دیکھنا آ گیا ہے۔ تم کچھ بھی کہو میرا دل کہتا ہے کہ تم اب بھی صاف بات نہیں بتا رہے ہو۔ جس آرگنائزیشن کا تم نے ذکر کیا ہے، اگر وہ واقعی ہے تو پھر یہ تمہاری ہی بنائی ہوئی ہے اور اس کے ہیڈ بھی تم خود ہی ہو۔“

دو گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں۔ ایک عمران کے سر پر سے گزر گئی۔ دوسری نے اس کے کندھے کو بوسہ دیا۔ وہ اس کی قمیص جلاتی ہوئی اور کندھے پر سرخ لکیر ڈالتی ہوئی نکل گئی۔

ہم نیچے جھک گئے اور دیوار کے بالکل ساتھ لگ گئے۔

میں نے جلدی سے عمران کا کندھا دیکھا۔ اسے صحیح معنوں میں گولی کا بوسہ کہنا چاہیے تھا۔ وہ بس ایک گہری خراش ڈالتی ہوئی گزر گئی تھی۔

”کچھ نہیں ہوا۔“ عمران مسکرایا۔ ”میں بلٹ پروف

ہوں۔ سیدھی گولی بھی لگے گی تو اندر نہیں گھس سکے گی۔ ویسے بھی ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ہمیں۔ گھبراؤ مت، آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

اسی دوران میں جیلانی بھی ہمارے پاس آگیا۔ اس کا بازو زخمی تھا لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "عمران صاحب! وہ لوگ گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو گاڑیاں درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گئی ہیں، وہ نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ان میں موجود بندے بڑے خطرناک زاویے سے گولی چلا رہے ہیں۔"

اگلے ایک گھنٹے تک مسلسل گولیاں چلتی رہیں۔ بہرحال ہم نے ان گاڑیوں کو اس سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔

جگت سنگھ نے مجھے اشارے سے پاس بلایا۔ میں اس کی پوزیشن پر پہنچا تو وہ بولا۔ "بادشاہ زادے! مجھے عمران صاحب سے آگیا (اجازت) لے دو۔ میں اس ماں دی سالی کا بولو رام کرنا چاھندا ہوں۔"

"کون ماں دی سالی؟"

"او یار! یہی مشین گن۔ مجھے آگیا دو۔ میں ابھی اس کے پندرہ سو ٹوٹے نہ کروں تو جگت سنگھ نام نہیں۔ دو کالے اناروں کی مار ہے یہ۔"

"اور تم کتنی گولیوں کی مار ہو؟"

"واہگرو کی سوگند ہے، مجھے اپنی کوئی پروا نہیں۔ اس جاوا نے میرا پتروں جیسا بھرا مارا ہے، آشا کور کی جندگی لی ہے۔ تم لوگ میرے شریر سے بم باندھ دو، میں اپنے پیو کا نہیں اگر اس کتے جاوا کے اندر پہنچ کے خود کو نہ اڑا لوں۔"

"پر یہ لوگ تمہیں جاوا تک پہنچنے دیں گے تو پھر ہے نا؟"

"نہ پہنچنے دیں۔ میں کوشش تو کروں گا نا۔ اگر میں اس کے آس پاس بھی پہنچ گیا اور میں نے اس ذلیل کی آنکھوں میں دیکھ کر اس کی ماں بہن ایک کر دی اور خود کو اڑا لیا تو یہ بھی معمولی گل نہیں ہوگی۔ اسے یہ پتا تو چل جائے گا نا کہ موت ہولے ہولے اس کے کول آرہی ہے۔" جگت سنگھ کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے اور داڑھی کے بال جیسے کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اگر کچھ کرنا ہے تو پھر تم اکیلے نہیں، ہم دونوں کریں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔ اندھیرا ہونے دو۔"

"ٹھیک ہے بادشاہ زادے! پر ایک وچن تم ابھی دو۔ اگے جا کر جیپ پر کالے انار میں خود پھینکوں گا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا اور میں نہ پھینک سکا تو پھر تم کوشش کر لینا۔ پر میں تمہیں بتا دوں، مجھے ناکام نہیں ہونا ہے۔ میرے اندر اس بندے کے لیے جتنی آگ ہے، میں مر بھی گیا تو میری لاش تڑپ پھڑک کر اس کی چھاتی تک پہنچ جائے گی۔"

☆☆☆

ہم محاصرے میں تھے۔ اس ریسٹ ہاؤس سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ دوسری طرف ہم بھی ان لوگوں کو آگے آنے نہیں دے رہے تھے۔ سہ پہر سے ذرا بعد جھنڈ میں موجود گاڑیوں نے آگے کھسکنے کی کوشش کی۔ سیکیورٹی فورس کے باوردی افراد ان گاڑیوں کو دھکیلتے ہوئے اور ان کی آڑ لیتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ ہم نے بھرپور جواب دیا۔ ریسٹ ہاؤس کی چھت پر موجود ماہر شوٹرز نے بڑی موثر فائرنگ کی۔ سیکیورٹی فورس کے کم از کم دو بندے زخمی ہوئے اور وہ لوگ واپس جھنڈ میں گھسنے پر مجبور ہو گئے۔ اب رات کے تاریک سائے پھیل چکے تھے۔ آندھی کے جھکڑ بھی کم ہو گئے تھے لیکن تیز ہوا بدستور موجود تھی۔ ہم نے سویٹی کی لاش کو ریسٹ ہاؤس کے عقبی صحن میں تالاب کے پاس خودرو گھاس میں امانتاً دفنا دیا۔ ڈرائیونگ کے دوران میں ہلاک ہونے والے شوٹر قاسم کی لاش کو بھی اسی طرح دفنایا گیا۔ نصیر احمد کی حالت بدستور تشویش ناک تھی۔ ڈاکٹر مہناز تندہی سے اس کو طبی امداد دے رہی تھی۔ نصیر کے جسم سے ایک گولی تو مہناز نے بس کے اندر ہی نکال دی تھی۔ دوسری گولی پسلی توڑ کر اس کے پھیپھڑے میں لگی تھی۔ نصیر کو اندرونی بلیڈنگ کا سامنا تھا۔

وقتی طور پر فائرنگ بالکل رکی ہوئی تھی۔ تاہم دونوں طرف کے رائفل بردار پوری طرح چوکس تھے۔ بس کے اندر کھلاڑیوں کے اٹیچی کیسز میں سے ہی کھانے کی اشیا بھی ہمیں ملی تھیں۔ ان میں بسکٹ کے ڈبے... نمکو... چپس اور دودھ کے پیکٹ بھی تھے۔ کچھ سامانِ خورونوش ڈاکٹر مہناز ممبئی سے ہی لے کر آئی تھی۔ اگر احتیاط سے استعمال کیا جاتا تو یہ راشن ہمارے لیے تین چار دن کے لیے کافی تھا۔

میں اور عمران ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ اپنے حصے کا راشن میں نے زبردستی جگت سنگھ اور قربان علی کو دے دیا تھا۔ دیگر تکالیف کی طرح مجھے بھوک اور پیاس برداشت کرنے کا ہنر بھی آگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ضرورت پڑی تو میں ایک ہفتے تک بغیر کچھ کھائے صرف پانی پر گزارہ کر سکوں گا۔

قربان علی رائفل کندھے سے لٹکائے سرونٹ کوارٹر میں ہمارے پاس آیا۔ اس نے کہا۔ "عمران صاحب! اب ریسٹ ہاؤس تقریباً صاف ہے۔ شاید ہی ایک آدھ بلی یا دو چار چوہے موجود ہوں..."

"کیا کچھ نکلا ہے؟" عمران نے پوچھا۔

"بہت کچھ جی۔ لگتا ہے پورا چڑیا گھر تھا۔ پکی بات ہے کہ یہ سارے جانور جان بوجھ کر یہاں چھوڑے گئے تھے۔ تین چار جنگلی بلے تھے... اتنے ہی خارپشت بھی تھے... پھر نیولے تھے۔ کچھوے تو آپ نے بھی دیکھے ہیں۔ ایک دو شاید اب بھی وہاں باؤلی (تالاب) میں ہوں۔"

"کچھ پتا چلا کہ یہ چکر ہے کیا؟" عمران نے پوچھا۔

"یہ دیکھیں... یہ پوٹلیاں اندر چوکھٹوں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔" قربان نے رنگ برنگے ریشمی کپڑوں کی چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں عمران کو دکھائیں۔

یہ دراصل ریشمی رومال تھے۔ ان میں خشک ناریل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، بادام، بتاشے اور اس طرح کی دیگر چیزیں باندھی گئی تھیں۔ کچھ پوٹلیوں میں تعویذ بھی تھے۔ قربان علی نے ایک پوٹلی دکھائی۔ اس میں تعویذ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی ہڈیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ یہ انسانی ہڈیاں تھیں۔ ایک جبڑے کی ہڈی لگتی تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ پھاٹک پر جو بڑی ہڈیاں لٹک رہی تھیں، وہ بھی انسانی ہی تھیں۔ یہ ہڈیاں غالباً کسی قبر سے نکالی گئی تھیں۔

قربان علی نے ایک بڑے تعویذ کی تہیں کھولیں۔ ایک سفید موٹے کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر تھی۔ سرکنڈے کے قلم سے لکھی گئی یہ تحریر سنسکرت زبان میں تھی۔

"اب اسے پڑھے گا کون؟" عمران نے کہا۔

قربان بولا۔ "میرا خیال ہے کہ ماسٹر جواہر پڑھ لے گا۔"

"اسے بلاؤ۔"

کچھ ہی دیر بعد جاوا کی رکھیل کا سابق پتی، جوگی نما جواہر ہمارے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف نقش ہو چکا تھا اور چہرے پر موت کی زردی کھنڈی تھی۔ اس وقت جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا تھا اسی شخص کی وجہ سے تھا۔ سریتا اس کی نہیں رہی تھی لیکن وہ پھر بھی اس کا تھا۔ وہ اب بھی اس کی بھلائی اور زندگی چاہتا تھا۔ اسے خطرناک حالات سے بچانے کے لیے اس نے ہم سب کو موت کے منہ میں جھونک دیا تھا اور ہمارے ساتھ ساتھ خود کو بھی... اور اپنے نکتۂ نظر سے اس نے جو کچھ کیا تھا، درست ثابت ہو چکا تھا۔ سریتا کی جگہ جو لڑکی ہمارے حوالے کی گئی تھی، وہ ماری جا چکی تھی۔ بہرحال اس سب کے باوجود پتا نہیں کیوں مجھے اس پر غصہ نہیں آرہا تھا اور شاید عمران کو بھی نہیں۔ ہم اس کی مجبوری سمجھ رہے تھے۔

میں نے کہا۔ "ماسٹر جواہر! پڑھو یہ کیا لکھا ہے۔ لیکن اس مرتبہ گمراہ مت کرنا ہمیں۔"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پڑھنا شروع کیا۔ یہ تقریباً پندرہ سطریں تھیں۔ خوش خط لکھا گیا تھا۔ ماسٹر جواہر نے دو مرتبہ پڑھا اور پھر ترجمہ کرنا شروع کیا۔

"... بے شک یہ ثابت ہوا کہ سن 1999 جولائی کی دس تاریخ کو یہاں راجستھان کے کچھ مہمان آکر ٹھہرے۔ ان کے ساتھ پانچ نہایت خوب صورت چھوٹے رشین کتے تھے۔ یہ کتے انہوں نے اپنی بڑی جیپ میں لادے ہوئے تھے۔ ان کو غلطی لگی اور اس کی وجہ سے ایک بہت بڑا اپرادھ ان سے ہو گیا۔ وہ گاڑی کو احاطے میں چھایا میں کھڑا کر کے فوراً شکار پر نکل گئے۔ وہ بھول گئے کہ چھایا چلی جائے گی اور سورج اوپر آتے ہی دھوپ پھیل جائے گی۔ گاڑی سارا دن دھوپ میں جلتی رہی۔ اس کے اندر گرمی انتہا کو پہنچ گئی۔ کتے سسک سسک کر مر گئے۔ ان کی آتمائیں اب اس جگہ پر قابض ہیں۔ وہ یہاں آنے والے کا جیون چھین لیتی ہیں۔ وہ یہاں سے باہر نکل کر بھی لوگوں کے پران لے سکتی ہیں۔ ان کے من بہلاوے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں جانوروں کو رکھا جائے۔ اس کے سوا اور کوئی حل نا ہیں ہے۔ ہو ہی نا ہیں سکتا۔ ایسا نہ کیا گیا تو اردگرد کا علاقہ بھی ان آتماؤں کی زد میں آئے گا۔ ہم بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اندھیرے میں چمکتی ہوئی آنکھوں سے بچائے۔ ہم نیچے لکھے ہوئے اشلوکوں کو اپنی رکھشا کے لیے یہاں لٹکا رہے ہیں۔"

اس کے نیچے کچھ اشلوک تھے اور کچھ دیگر ہدایات وغیرہ تھیں۔

اس تحریر کو مکمل طور پر دیکھنے اور سمجھنے سے اندازہ ہوا کہ چند سال پہلے یہاں کچھ جانوروں کی اذیت ناک موت کا حادثہ ہوا اور اس کے بعد کچھ ایسے واقعات یہاں پیش آئے کہ جس کے بعد اس ریسٹ ہاؤس کو آسیب زدہ قرار دیا گیا۔ علاقے کے لوگوں نے اس طرف کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ یہاں مختلف جانور پکڑ کر رکھے گئے اور دیگر ٹونے ٹوٹکے کیے گئے۔

ایسے دور دراز علاقوں میں اس قسم کی توہمات کا ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ عمران نے ماسٹر جواہر کو سختی سے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جو کچھ تم نے یہاں ہمارے

سامنے پڑھا ہے، بس تم تک ہی رہنا چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ باقی ساتھیوں میں سے کسی میں کسی طرح کا کوئی ڈر پیدا ہو۔ یہ سب کمزور عقیدے والی باتیں ہیں۔ کیا تم ان پر یقین رکھتے ہو؟''

''نہیں جی۔'' ماسٹر جواہر نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں یہ باتیں میرے دھرم کا حصہ نا ہیں ہیں۔ یہ راکھشس کے پیدا کیے ہوئے وچار ہیں جو منش کے ذہن کو بکھیرتے ہیں۔''

''تو پھر یہ وچن دیتے ہو کہ کسی سے ان کا ذکر نہیں کرو گے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، وچن دیتا ہوں... میں جانتا ہوں میرے کارن پہلے ہی آپ ایک بڑی مصیبت کا شکار ہوئے ہیں۔ اس کے لیے میں جتنی بھی شما چاہوں، وہ کم ہے۔ مم... میں مجبور تھا۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔'' اس کا گلا رندھ گیا۔

عمران نے کہا۔ ''خیر، جو کچھ بھی تھا ہماری قسمت میں لکھا تھا۔ لیکن اب اس میں سے نکلنے کے لیے ہمیں اپنی قسمت کے ساتھ ساتھ اپنی ہمت پر بھی بھروسا کرنا ہوگا۔ میں تم سب سے یہ امید رکھتا ہوں کہ ہمت سے کام لو گے... اور ساتھ دو گے۔''

جواب میں وہ بس آنسو بہاتا رہا۔ ماسٹر جواہر اور قربان علی وغیرہ چلے گئے تو ہم پھر سرونٹ کوارٹر میں تنہا رہ گئے۔ سامنے دیوار کے رخنے میں ہم نے فوجیوں کی طرح اپنی آٹومیٹک رائفلیں رکھی ہوئی تھیں اور نگاہیں اندھیرے میں دشمن کی حرکت کو تلاش کر رہی تھیں۔

ہوا تیز تھی لیکن مطلع صاف تھا۔ مدھم چاندنی میں اردگرد کا احوال دکھائی دے رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے باہر جو بھی نقل و حرکت ہوتی، ہمیں نظر آسکتی تھی۔ ہمیں اپنے سامنے کم از کم سات گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ سیکیورٹی فورس کی چند موٹر سائیکلیں بھی تھیں۔ ہم سے ان کا فاصلہ 300 میٹر کے قریب تھا۔ ان گاڑیوں کے اندر اور عقب میں مسلح لوگ موجود تھے اور کسی بھی وقت ہم پر ہلا بول سکتے تھے۔ کچھ یہی صورت حال باقی اطراف میں بھی تھی۔ بہرحال ہمیں دو ایڈوانٹیج حاصل تھے۔ ایک تو ہم کھلی جگہ کے بجائے ریسٹ ہاؤس کے اندر تھے۔ دوسرے ہم قدرے بلندی پر بھی تھے۔ خاص طور سے جو نشانے باز چھت پر تھے، وہ کافی دور تک دیکھ سکتے تھے اور بڑی کارگر فائرنگ کر سکتے تھے۔

''کیا تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ یہ لوگ کمک کا انتظار کر رہے ہیں؟'' عمران نے کہا۔

''ہو بھی سکتا ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ میرا ذہن دراصل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ آج صبح میرے اور عمران کے درمیان جو چونکا دینے والی گفتگو ہوئی تھی، اس کو شدید فائرنگ کے سبب بریک لگ گئے تھے۔ میں اس گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑنا چاہتا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''عمران! تو تم تسلیم کرتے ہو؟''

''کیا؟''

''یہی کہ وہ آرمی آفیسر تم ہی ہو... جو اس آرگنائزیشن کو چلا رہا ہے، وہ جو بھی ہے کیپٹن ہے یا میجر ہے، تم ہی ہو؟''

''اگر میں کہوں ''ہوں'' تو اس سے تمہیں کیا فائدہ ہو جائے گا اور اگر نہ کہوں تو کیا بگڑ جائے گا؟ ان سوالوں کے جواب بعد میں بھی ڈھونڈے جا سکتے ہیں۔ فی الحال ہمارا فوری مسئلہ تو یہاں موت کے اس گھیرے سے نکلنے کا ہے۔''

''اگر نہ نکل سکے تو میرے سینے میں میرا یہ سوال ایک زہریلے تیر کی طرح اٹکا رہ جائے گا۔ شاید میں مرنے کے بعد بھی اس کی چبھن محسوس کروں۔''

''تمہیں کیوں یہ شبہ ہوا ہے کہ میں اس آرگنائزیشن کو چلا رہا ہوں؟''

''شبہ اب نہیں ہوا، اس وقت ہو گیا تھا جب میں نے تمہاری اور جیلانی کی گفتگو سنی تھی اور تمہارے لیے آئی ہوئی ای میلز پڑھی تھیں۔ مجھے وہاں درازوں سے کچھ ایسے پیپر ملے جن میں بار بار کسی میجر کا ذکر تھا مگر نام کہیں نہیں تھا۔ زیادہ شک بلکہ قوی شک مجھے آج ہوا ہے۔ شاید تم نے غور نہیں کیا۔ تمہارے ساتھیوں میں سے بھی کسی نے نہیں کیا... لیکن آج تمہیں تمہارے ایک قریبی بندے نے بے دھیانی میں میجر کہہ کر پکارا... یہ اس وقت ہوا جب بی ایس ایف کی گاڑیاں جھنڈ میں پہنچ گئیں اور زوردار فائرنگ ہوئی۔ تمہیں پتا ہی ہے، یوں لگ رہا تھا کہ شاید وہ لوگ اندر گھس آئیں گے۔ تمہارے شیخ (جیلانی) نے تمہیں کہا تھا... شوکت کو گولی لگ گئی میجر! میں اس کی جگہ چھت پر جا رہا ہوں... اس مار دھاڑ میں اس کا مخاطب تمہارے سوا اور کوئی نہیں تھا۔''

وہ خاموشی سے سامنے دیکھتا رہا۔ اپنا نچلا ہونٹ ہولے ہولے دانتوں سے دباتا رہا۔ اس کی ٹھوڑی کا گڑھا مدھم روشنی میں صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی ذات کی طرح اس کے خدوخال بھی اپنے اندر کی روشنی اور تاریکی باہر

نہیں آنے دیتے تھے۔

''میں نے تم سے کہا نا تابی! میں نے کچھ حلف دیے ہوئے ہیں۔ میں ان کے خلاف نہیں جا سکتا۔''

''لیکن تم ہی تو کہا کرتے ہو، ہم دو نہیں ایک ہیں تو پھر اس ایک کو وہ سب کچھ معلوم ہونا چاہیے جو تمہیں معلوم ہے، مجھے معلوم ہے۔ اور میں جانتا ہوں... میرا خدا بھی جانتا ہے، میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں چھپایا۔''

''میں نے بھی کچھ نہیں چھپایا لیکن تابی...''

''لیکن کچھ نہیں عمران۔'' میرا لہجہ سخت تھا۔ ''آج تمہارے رویے سے فیصلہ ہو جائے گا کہ ہم واقعی ایک ہیں یا نہیں۔'' میری آواز آخر میں بھرا گئی۔

وہ جیسے اندر سے پگھل گیا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کچھ دیر خاموش رہا... پھر سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تابی! میرا تعلق آرمی کی اسپیشل فورسز سے ہے۔ میری شومین کی حیثیت اور دیگر مصروفیات دکھاوے کی تھیں۔ سمجھ لو کہ یہ میرے کام کے حوالے سے میری مجبوریاں تھیں۔ مجھے لیفٹیننٹ سے کیپٹن بننے میں تین سال لگے لیکن میجر تک کا سفر میں نے نسبتاً تیزی سے طے کیا اور اس کی وجہ میری کچھ کارکردگی ٹھہری۔ یہ وہی دن تھے جب میں نے والدہ کی تلاش میں ذاتی حیثیت سے انڈیا کے دو چکر لگائے تھے۔ وہاں کچھ ایسے لوگوں سے میرا ٹکراؤ ہوا جن کو جہنم واصل کرنا میرے لیے ضروری تھا۔ میں نے یہ کیا لیکن اس سے آگے کا سفر مشکل تھا۔ مجھے یوں لگا کہ میری یونیفارم میرے راستے میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ میں ان حرامزادے انڈین ایجنٹس کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہتا تھا، وہ ایک حاضر سروس فوجی کی حیثیت سے نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے فوج چھوڑ دی اور وہ سب کچھ کیا جو کر سکتا تھا۔ میں نے ان لوگوں کو چن چن کر مارا ہے تابی جنہوں نے میرے اندر نفرت اور عداوت کا پہاڑ کھڑا کیا تھا۔ اپنی والدہ کی تلاش کے دوران میں میرا واسطہ ان کی بے حسی، بے رحمی سے کچھ اس طرح پڑا تھا کہ میرے اندر ان کے خون کی پیاس پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے ممبئی، الہ آباد، چودھ پور اور دہلی کے گلی کوچوں میں ان لوگوں کو بے رحمی سے قتل کیا۔ میں نے اور میرے ساتھیوں نے اپنی ہٹ لسٹ میں تقریباً تیس نام رکھے تھے۔ ان میں دو جیل سپرنٹنڈنٹ اور دو تین بڑے پولیس آفیسر بھی تھے۔ ان میں سے کم از کم بیس کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارا۔ پانچ اپنی باہمی لڑائیوں میں مارے گئے اور پانچ کے قریب اپنے تیئں جو زیرِ زمین چلے گئے۔ یہ لوگ مجھے کبھی پکڑ نہیں سکے۔

میرے ساتھی بھی وفاداری میں اپنی مثال آپ ہیں تابی۔ انہوں نے عہد کر رکھا ہے کہ اگر کبھی کوئی بھارتیوں کی گرفت میں آجائے گا تو اپنی زبان کھولنے کے بجائے اپنی جان ختم کر لے گا۔ میرے ایک شہزاد نامی ساتھی نے یہ کر کے بھی دکھایا ہے۔ پچھلے برس اس نے نئی دہلی میں اپنی جان دے دی اور ملک سے وفاداری نبھا کر ہمارے سیٹ اپ کو بچایا۔ مگر افسوس کہ چند دن پہلے اقبال یہ نہ کر سکا۔ یہ نہیں کہ اس نے حلف کے مطابق کوشش نہیں کی۔ جب انڈین ایجنسی نے سلطان چٹا کے ساتھ مل کر اسے لالہ زار ہوٹل سے پکڑا تو اس نے خود کو شوٹ کرنے کی کوشش کی۔ گولی اس کے سر کے بجائے اس کے جبڑے میں لگی اور پستول اس سے چھین لیا گیا۔ بعدازاں شدید تشدد اور مخصوص نشہ آور انجکشنوں کی مدد سے اس سے بہت سی باتیں اگلوا لی گئیں۔ اب یہ لوگ چاروں طرف سے سمٹ کر مجھ پر جھپٹ پڑے ہیں۔ میری بدقسمتی صرف اور صرف یہ ہے کہ اس وقت تم اور ثروت میرے ساتھ ہو اور وہ بے گناہ لڑکیاں اور میڈم صفورا وغیرہ بھی یہاں ہیں۔ یہ لڑکیاں نہ ہوتیں تو میں اور میرے ساتھی بہتر طریقے سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ سچ پوچھو تابی! میں اس وقت خود کو تم سب کے لیے ذمے دار محسوس کر رہا ہوں۔''

میں سکتے کی سی کیفیت میں یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ آج عمران کا وہ روپ میرے سامنے آگیا تھا جس کا شبہ ایک عرصے سے میرے دل و دماغ میں موجود تھا۔

میں نے کہا۔ ''عمران... بلکہ محترم میجر عمران! تم یہ ذمے داری کیوں محسوس کر رہے ہو؟ کیا تم یہ بھول گئے ہو کہ تم میرے بلانے پر میرے اور ثروت کے لیے انڈیا آئے تھے؟ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہاں تمہارے لیے خطرات بڑھ گئے ہیں۔ جیلانی وغیرہ نے بھی تمہیں انڈیا آنے سے روکا تھا۔''

''جو کچھ بھی ہے، مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ میں تمہارے لیے کسی بڑی مشکل کا سبب بن سکتا ہوں۔''

''اچھا ان باتوں کو چھوڑو۔ اس بات کا فیصلہ ہم بعد میں بھی کر سکتے ہیں کہ تم نے ہمیں پھنسایا یا ہم نے تمہیں۔ اس وقت تو حقیقت پر غور کرنا چاہیے اور حقیقت یہ ہے کہ ہم سب پھنسے ہوئے ہیں۔''

وہ خاموش رہا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ میں نے کہا۔ ''کیا تمہاری اس حقیقت کا پتا شاہین کو بھی ہے؟''

''نہیں، تمہیں بتایا ہے نا کہ جیلانی، اقبال اور امتیاز

وغیرہ کے سوا کسی کو خبر نہیں تھی۔"
"یہ جیلانی، امتیاز وغیرہ بھی کیا فوج کے بندے ہیں؟"
"ہیں نہیں، تھے... میری وردی کی طرح ان کی وردی بھی کام میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ انہوں نے فوج چھوڑ دی۔ وردی اتار دی۔ ریزائن کر دیا۔"
"ان کے عہدے کیا تھے؟"
"امتیاز لیفٹیننٹ تھا۔ جیلانی اور اقبال کیپٹن۔"
مجھ پر حیرت ناک انکشافات ہو رہے تھے۔
اس دوران میں عمران کے فون پر بیل ہوئی۔ عمران نے کال ریسیو کی۔ دوسری جانب سے آنے والی آواز نے ہمیں اچھلنے پر مجبور کر دیا۔ یہ جلالی صاحب کی بوڑھی لیکن پُرجلال آواز تھی۔ آج ایک عرصے بعد ہم انہیں سن رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ عمران فون بند کر دے گا لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ علیک سلیک کے دو تین فقروں کے بعد جلالی صاحب بجلی کی طرح لپک کر اصل موضوع پر آ گئے۔ "کہاں ہو تم دونوں؟ تم نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ رات دن تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔ آج بڑی مشکل سے اس بی بی سے یہ فون نمبر ملا ہے۔"
عمران نے اطمینان سے کہا۔ "آپ ہمارا انتظار کر رہے ہیں یا ڈاکٹر مہناز صاحبہ کا؟"
"اس کا بھی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ ممبئی سے آگے رتنا گری میں کہیں ہے اور تم دونوں بھی وہیں ہو۔ کوئی کھوج ملا ہے اس کا یا نہیں؟ مجھے جو بتانا سچ بتانا۔"
"بس اتنا کھوج ملا ہے... کہ وہ رتنا گری میں ہی کسی پگوڈے میں ہے اور خیر خیریت سے ہے۔ کچھ بھکشوؤں نے اسے اپنے پاس روکا ہوا ہے۔"
"کون بھکشو ہیں؟ وہ کیا بیچتے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں وہ مہناز سے؟" جلالی صاحب کڑکے۔
"آپ پریشان نہ ہوں جناب! آپ جانتے ہی ہیں یہ بھکشو لوگ اکثر بالکل بے ضرر ہوتے ہیں۔ مچھی مکھر تک نہیں مارتے۔ میرا مطلب ہے مکھی مچھر تک۔"
"اوپر سے سارے ہی بے ضرر نظر آتے ہیں۔ تم دونوں بھی تو باورچی بن کر گھسے تھے میرے گھر میں۔ ہانڈی بھونتے بھونتے مجھے ہی بھوننے لگ پڑے۔ لیکن میں ایک بات بتا دوں تمہیں عمران... میں بڑی سخت ہڈی کا ہوں۔"
"اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے جناب! آپ بے فکر رہیں۔ ہم آج بھی آپ کے پوری طرح وفادار ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ڈاکٹر مہناز خیر خیریت سے آپ کے پاس پہنچیں گی اور پھر سے آپ کا "علاج معالجہ" شروع کریں گی۔" عمران نے علاج معالجے پر زور دیا۔
"بکواس بند کرو۔ تم کیا سمجھتے ہو، میں بیمار ہوں۔ چل چلاؤ ہے میرا؟" وہ اتنے زور سے بولے کہ کھانسی شروع ہو گئی۔
"توبہ نعوذ باللہ۔ ہم ایسا سوچ سکتے ہیں؟" عمران نے کہا۔
کھانسی ذرا سنبھلی تو وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔
"مورتی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"
"ہمیں لگتا ہے جی کہ مورتی تو ڈاکٹر صاحبہ کے ہاتھ سے نکل گئی ہے۔ بہر حال اصل بات تو آپ کو ڈاکٹر صاحبہ ہی آ کر بتائیں گی۔ ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ دو چار دن تک انہیں آپ کی بانہوں... مم، میرا مطلب ہے نگاہوں میں لے آئیں۔"
"کوئی ڈراما تو نہیں ہو رہا میرے ساتھ؟" وہ گرجے۔
"ہمیں اپنی جانیں پیاری ہیں جناب! ہمیں پاکستان میں رہنا ہے۔ ہماری اگلی نسلوں نے پاکستان میں رہنا ہے۔ آپ کے زیرِ سایہ زندگی گزارنی ہے۔"
"زیادہ باتیں نہ بناؤ... اور دیکھو، تم دونوں میرے ساتھ رابطے میں رہو۔ کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بلکہ کہو تو میں خود بھی آ سکتا ہوں۔"
"اللہ نہ کرے جی کہ اتنا بُرا وقت آئے۔ آپ فارم ہاؤس میں اطمینان سے بیٹھیں۔ آپ کے یہ خادم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ڈاکٹر مہناز کو بہت جلد آپ کے حضور پیش کریں گے۔"
جلالی صاحب نے کہا۔ "اور وہ تابش کہاں ہے؟ اس سے بات کراؤ۔" میں نے انگلی کے اشارے سے منع کر دیا۔
عمران بولا۔ "وہ لوٹا لے کر نکلا ہے کھیتوں کی طرف۔"
"یہ کیا بات ہوئی۔" وہ بیزاری سے بولے۔ "اچھا یہ اس بی بی سے بات کرو۔" انہوں نے کہا۔
چند سیکنڈ بعد فون پر جو آواز ابھری، وہ بھی ہمارے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ شاہین تھی۔ اندازہ ہوا کہ جلالی صاحب نے شاہین ہی سے عمران کا یہ فون نمبر حاصل کیا ہے۔
"ہیلو عمران! کہاں ہو؟"
عمران نے کھوپڑی سہلائی۔ "وہاں جہاں کوئی آتا جاتا نہیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔

"پھر تو ضرور ریما یا نرگس میں سے کوئی ایک تمہارے ساتھ ہوگی۔"
"ایک نہیں دونوں۔ ایک فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ باجی ریکھا بھی ایک چھوٹا سا رول کر رہی ہے اس میں۔ لیکن پہلے تم یہ بتاؤ کہ جلالی صاحب تمہارے پاس ہیں؟"
"نہیں، ذرا لان تک گئے ہیں، سانسیں درست کرنے۔ تم سے بات کر کے ہانپ رہے تھے۔"
"یہ حضرت تمہارے پاس آئے ہوئے ہیں یا تم ان کے پاس گئی ہو؟"
"یہ خود نازل ہوئے ہیں۔ ایک بہت پرانی مرسیڈیز پر۔ دو تین ملازم بھی ساتھ ہیں۔ پتا نہیں کہاں سے کھوج لگاتے ہوئے پہنچے ہیں۔ کسی نے ان کے کان میں یہ بے ہودہ پھونک ماری ہے کہ میں تمہاری منگیتر ہوں اور تمہارے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں۔ حالانکہ تمہارے بارے میں تو تمہارے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ کہاں ہو۔"
"ایسی بات نہیں ہے جانم! لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اسے بے ہودہ پھونک کیوں کہا؟ کیا تم میری منگیتر نہیں ہو؟"
"اللہ مجھ پر اتنا بُرا وقت نہ لائے۔ شوبز کی ایک آفت ہی کم نہیں ہوتی تمہیں تو دو دو چمٹی ہوئی ہیں۔"
یکا یک چند فائر ہوئے۔ یہ گولیاں جھنڈ میں سے چلائی گئی تھیں۔ ایک گولی ہمارے عین سامنے دیوار پر لگی۔
"اوہ، یہ فائرنگ کیسی ہے؟" شاہین کی پُرتشویش آواز ابھری۔
"تمہیں میری کسی بات پر یقین ہی نہیں آتا۔ یہ شوٹنگ ہو رہی ہے بھئی۔ مجھ پر اور ریما پر گولیاں چل رہی ہیں اور تمہیں پتا ہی ہے فلموں میں ہیرو، ہیروئن پر گولیاں کیوں چلائی جاتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ کسی بہت ہی تنگ جگہ پر گھس کر بیٹھ جائیں بلکہ لیٹ جائیں۔ ایک دوسرے سے جڑ کر۔ سنسر والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔ ہم بھی اس وقت سیوریج کے ایک خالی پائپ میں گھسے ہوئے ہیں۔"
"خالی تو تم یونہی کہہ رہے ہو۔ ورنہ یہ گند سے بھرا ہوا پائپ ہوگا۔ تمہارے دماغ کی طرح۔"
ایک بار پھر دونوں طرف سے تابڑ توڑ گولیاں چلیں۔ شاہین چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہو گئی۔ پھر اس کی سنجیدہ آواز آئی۔ "عمران! تم کسی مشکل میں ہو؟"
"اس سے بڑی مشکل اور کیا ہوگی کہ تم سے بات کر رہا ہوں۔" وہ مخصوص انداز میں بولا۔
"عمران!" شاہین نے احتجاجی لہجے میں کہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "پتا نہیں کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ ہمیں تمہارے دوست اقبال والے واقعے کا پتا چلا ہے۔ بہت زیادہ دکھ ہوا ہے۔"
وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "اقبال دیر سے آتے ہیں اور کبھی کبھی جلدی چلے جاتے ہیں۔ اس بارے میں پھر بات کریں گے۔"
"اچھا تابش صاحب کہاں ہیں؟ عاطف اور فرح ان کے لیے بڑے پریشان ہیں۔"
"وہ میرے ساتھ ہی ہے اور بالکل خیریت سے ہے۔ ہو سکا تو میں اس سے ان لوگوں کی بات کراؤں گا۔"
سامنے جھنڈ میں نقل و حرکت نظر آ رہی تھی۔ مشین گن والی جیپ بھی کچھ آگے آ گئی تھی۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ عمران نے کہا۔ "اچھا ڈیئر! اگلا شاٹ تیار ہو گیا ہے۔ ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں، خدا حافظ۔"
اس نے شاہین کا جوابی خدا حافظ سنے بغیر ہی فون بند کر دیا۔
جگت سنگھ کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ "یہ لوگ آگے آ رہے ہیں۔ ان کی ماتا کی..." اس کے ساتھ ہی اس نے گولیوں کی بوچھاڑ کی۔ دوسری طرف سے تند و تیز جواب آیا۔ ایک بار پھر دو طرفہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ قریباً پانچ منٹ تک تاریکی میں شعلے لپکے اور دھماکے ہوئے۔ پھر میگا فون پر کسی فوجی کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ "بچ نہیں سکتے ہو تم لوگ۔ مفت میں جیون گنوانے سے بہتر ہے کہ گرفتاری دے دو۔ تمہارے ساتھ قانون کے مطابق برتاؤ ہوگا۔"
چند سیکنڈ کے وقفے سے اعلان دہرایا گیا۔ آخر میں کہا گیا۔ "اگر تمہیں سرنڈر کی آفر منظور ہے تو ہوا میں ایک ساتھ تین سنگل شاٹ چلاؤ... تین سنگل شاٹ۔"
سرنڈر کی آفر کسی کو قبول نہیں تھی۔ درحقیقت ہم مرنے کے لیے آمادہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔

☆☆☆

یہ رات ایک بجے کا وقت تھا۔ بادلوں کے ٹکڑوں نے مدھم چاندنی کو ڈھانپ لیا تھا۔ پروگرام کے مطابق، میں اور جگت سنگھ بڑی خاموشی سے تاریکی میں رینگ گئے۔ دو دستی بم جگت کے پاس اور دو میرے پاس تھے۔
میں نے شام ہی کو جگت سنگھ سے دستی بم اچھالنے کا میکنزم اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ میں نے مڑ کر اندرونی کمروں کی طرف دیکھا... وہاں ثروت موجود تھی۔ اگر اسے پتا چلتا کہ میں ایسی خطرناک حرکت کرنے جا رہا ہوں تو اس پر بہت بُرا

اثر پڑتا۔ شاید وہ بے ہوش ہی ہو جاتی۔ جس طرح فرید کوٹ میں ریچھوں کی یلغار کے بعد ہوئی تھی۔

ہم ریسٹ ہاؤس سے نکلے۔ کچھ دور تک جھک کر چلتے رہے پھر پیٹ کے بل رینگتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھے۔ ہمارے دل شدت سے دھڑک رہے تھے۔ زمین ٹھنڈی اور قدرے ریتیلی تھی۔ پیٹ اور کہنیوں کے بل اس طرح رینگنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ خاص طور سے ایسے افراد کے لیے جو اس کا تجربہ نہ رکھتے ہوں۔ کہنیوں اور گھٹنوں سے باقاعدہ خون رسنے لگتا ہے۔ حسب پروگرام جگت آگے تھا، میں دو تین فٹ پیچھے۔ رائفلیں افقی رخ سے ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔

قریباً ساٹھ میٹر کا فاصلہ ہم نے اسی طرح طے کیا۔ درختوں کے قریب پہنچے تو باتوں کی مدھم آوازیں آنے لگیں۔ ہم بے آواز رینگتے چلے گئے۔ آوازیں واضح ہو گئیں۔ یہ بی ایس ایف کے دو جوان تھے۔ ان کی باتوں میں جاوا کا نام آیا... وہ جاوا کے بارے میں ہی باتوں میں مصروف تھے۔ ایک نے کہا۔ ”اوئے، کون سی ایسی ہیروئن ہے جو جاوا صاحب نے چھوڑی ہوگی۔ اسٹوڈیو کا رستہ جاوا صاحب کے بیڈروم سے ہو کر گزرتا ہے پیارے۔“

”خیر، ایسی بھی بات نہیں۔ ہم لوگ اپنے دل سے ہی قصوں کے طوطے چڑیاں بنا لیتے ہیں۔ کم از کم... کم از کم پونم کے بارے میں تو میں یہ بات ماننے کو بالکل تیار نہیں۔ تم کو پتا ہی ہے اس کا چاچا پرکاش پائل خود اچھا بھلا ڈان ہے۔“

”اوئے تم کو آئیڈیا نہیں۔ ایسے 70 سی سی ڈان جاوا صاحب کی سو ہارس پاور کے سامنے ایک دم پھس ہو جاتے ہیں۔ میں نے سنا ہے جن دنوں جاوا نے پونم کو چکھا تھا، ان دنوں وہ پرکاش بھائی دبئی چلا گیا تھا کوئی لوکیشن دیکھنے کے بہانے...“ وہ دبی آواز میں ہنسا۔

ان دونوں افراد نے ایک خستہ دیوار کے اوپر رائفلیں پوزیشن کر رکھی تھیں۔ ہم ان کے پہلو کی طرف سے آگے بڑھ رہے تھے۔ جگت نے میری طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ ہوا۔ درمیانی فاصلہ پچیس فٹ کے قریب تھا۔ ہم دونوں ایک ساتھ اٹھے اور جھپٹے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ اپنی وزنی رائفلوں کا رخ تبدیل کر سکتے یا کچھ اور کرتے، میں نے اپنی وزنی رائفل گھما کر ایک شخص کی کنپٹی پر ماری۔ یہ اتنی بھرپور اور ”جچی تلی“ ضرب تھی کہ یہ شخص بغیر آواز نکالے کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ دوسری طرف جگت سنگھ نے بھی اپنے حریف کو اچھی چوٹ لگائی تھی۔ وہ گر گیا لیکن بے ہوش نہیں ہوا۔ مجھے لگا کہ وہ آواز نکالنے جا رہا ہے۔ میں نے جھپٹ کر اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ دیا۔ اس دوران میں جگت نے اپنی کرپان دستے تک اس کے سینے میں پیوست کر دی۔ وہ چند بار پھڑک کر ساکت ہو گیا۔

ہم اپنی جگہ دبکے رہے اور اردگرد کی سن گن لیتے رہے۔ گاڑیاں اب بھی تقریباً تین میٹر کے فاصلے پر تھیں۔ چند سیکنڈ بعد ہی اندازہ ہو گیا کہ ہماری اس کارروائی کی خبر گاڑی سواروں کو نہیں ہوئی۔ اب ہم اگلے مرحلے کے لیے تیار ہوئے۔ ہم نے ایک ایک دستی بم اپنی بیلٹس سے علیحدہ کیا اور مٹھی میں دبا لیا۔ مشین گن والی جیپ کا ہیولا ہمیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”جگت سنگھ! ہمارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔“

”کیا مطلب بادشاہ زادے؟“

”یہ دیکھو، بدلیاں آگے جا رہی ہیں۔ یہ تمہارا چندا ماموں کسی بھی وقت مکھڑا دکھا دے گا۔“

”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ جگت بولا۔

ہم ایک بار پھر کرالنگ کے انداز میں گاڑیوں کی طرف بڑھے۔ دو افراد کو لمبا لٹانے کے بعد ہمارا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ میرے ذہن میں بس ایک ہی ڈر تھا اور یہ ڈر کچھ دیر بعد سامنے بھی آ گیا۔ ہم پہلو کی طرف سے تھوڑا سا کلاوا کاٹ کر بڑھ رہے تھے۔ کوشش تھی کہ ہلکی سے ہلکی آواز بھی پیدا نہ ہو۔ جوں جوں مشین گن سے فاصلہ کم ہو رہا تھا، دھڑکن بڑھ رہی تھی۔ اب ہم اس دوری پر پہنچنے والے تھے جہاں سے جگت سنگھ کے بقول مشین گن والی گڈی کو پندرہ سو ٹوٹوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا یعنی تباہ کیا جا سکتا تھا۔ جگت سنگھ مجھ سے پانچ چھ فٹ آگے نکل گیا تھا۔ دستی بم جیسے اس کے ہاتھ میں بے طرح مچل رہا تھا۔

یکایک ایک جھماکا ہوا۔ اتنی تیز روشنی ہوئی کہ ہمیں زمین پر گھاس کے تنکے اور ریت کے ذرّے تک نظر آنے لگے۔ یہی وہ اندیشہ تھا جو بار بار میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ ہم سرچ لائٹ کی زد میں تھے۔ اس لائٹ نے ہمارے اردگرد موت کا چمکیلا ہالا سا بنا دیا تھا۔ ہم ایک ساتھ اٹھے... کسی بھی وقت ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہونے والی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس کا منبع کس طرف ہے۔

پھر گولیاں چلیں لیکن یہ ہمارے سامنے سے نہیں، عقب سے چلی تھیں اور انہوں نے براہ راست سرچ لائٹ کو نشانہ بنایا تھا۔ یکایک پھر ہمیں تاریکی نے چھپا لیا۔ ہم نے پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے اپنی جگہ چھوڑی۔ عقب سے عمران کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ”واپس آ جاؤ۔“

اب شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ عمران ہی تھا جو ہمارے پیچھے آیا تھا اور جس نے سرچ لائٹ کو اندھا کر کے ہماری مدد کی تھی لیکن اب ہم اتنا آگے آ گئے تھے کہ بغیر کچھ کیے واپس جانا نہیں چاہتے تھے۔ شاید جا ہی نہیں سکتے تھے۔ جگت نے ایک چنگھاڑ کے ساتھ مشین گن والی گاڑی پر دستی بم پھینکا۔ زبردست شعلے کے ساتھ سماعت شکن دھماکا ہوا۔ اس روشنی میں مجھے نظر آیا کہ اس گاڑی کے ساتھ ایک اور گاڑی بھی ہے۔ اس پر بھی ہیوی گن نصب تھی۔ میں نے RING میں انگلی ڈال کر پن کھینچی اور اس دوسری گاڑی کو نشانہ بنایا۔ میرا پھینکا ہوا بم گاڑی کے پچھلے حصے میں گرا۔ گاڑی اگلی طرف سے اچھلی اور ایک سائڈ پر الٹ گئی۔ اس میں غالباً کچھ دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ اس نے زوردار آواز کے ساتھ آگ پکڑ لی اور پوری گاڑی دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ اس دوران میں جگت دوسرا بم بھی پھینک چکا تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گرا لیکن اس نے بھی یقیناً قرار واقعی نقصان پہنچایا۔

ہم پلٹ کر بھاگے۔ ہم نیچے جھکے ہوئے تھے۔ عقب سے گولیوں کی ایک باڑ آئی۔ فائرنگ کے رخ سے اندازہ ہوا کہ یہ اندھی فائرنگ ہے۔ وہ لوگ ہمیں دیکھ نہیں پا رہے۔ عمران سامنے سے ہمیں کور دے رہا تھا۔ اس کی فائرنگ موثر تھی کیونکہ وہ گاڑیوں کے ہیولے دیکھ سکتا تھا اور اندازہ ہوا کہ وہ اکیلا نہیں۔ اس کے ساتھ کم از کم دو شوٹرز موجود تھے۔

ہم ان درختوں کے پاس سے گزرے جہاں دو بے حرکت جسم پڑے تھے۔ ان میں سے ایک زندگی سے محروم ہو چکا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے سینے میں جگت نے اپنی کرپان گھونپی تھی۔ ہم انہیں کراس کر گئے اور آگے نکل گئے۔ عمران نے ہماری راہنمائی کی۔ ہم ایک چھوٹے سے ٹیلے کی اوٹ میں چلے گئے۔ اب ہم محفوظ دوری پر تھے۔

☆☆☆

عمران بھی اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ اس نے مجھے گھورا جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو... نہیں باز آئے نا۔

ہم نے بھرپور جوابی فائرنگ کی۔ دو گاڑیاں جل رہی تھیں۔ یہ وہی تھیں جو میرے اور جگت سنگھ کے نشانے پر آئی تھیں۔ یقیناً مشین گنوں کے ساتھ ساتھ دو چار اہلکار بھی ہٹ ہوئے تھے۔ ایک شخص کو آگ کا لباس پہن کر رقصِ بسمل کرتے تو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

ریسٹ ہاؤس کے اندر سے بھی ہمیں پوری سپورٹ مل رہی تھی۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے ”ری ٹریٹ“ ہونے لگے اور واپس ریسٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ اچانک مجھے ان دو رائفلوں کا خیال آیا جو ہم میدان میں چھوڑ آئے تھے۔ یہ ان دو اہلکاروں کی رائفلیں تھیں جنہیں ہم نے جھنڈ کے درختوں میں لمبا لٹایا تھا اور جن میں سے ایک کے سینے میں جگت سنگھ نے کرپان گھونپی تھی۔ وہ دو رائفلیں ہمارے لیے مال غنیمت کی حیثیت رکھتی تھیں اور ہمیں ان کی ضرورت بھی تھی۔

عمران نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور بولا۔ ”ان رائفلوں کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے؟“

میں نے دیکھا، وہ دونوں رائفلیں عمران کے پاس تھیں۔ یہ پوری طرح لوڈڈ تھیں۔ رائفل مینوں کو فائر کرنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا ہم نے۔ گولیوں کے تین چار طویل اسٹریپس بھی عمران کے ایک شوٹر کے ہاتھ میں تھے۔ تین چار سو گولیاں تو یقیناً ہوں گی۔ یہ ایمونیشن اس وقت ہمارے لیے انرجی ٹانک کی حیثیت رکھتا تھا۔

”ویل ڈن۔“ میں نے بے ساختہ عمران کی تعریف کی۔

”تم نے بھی اچھا کیا لیکن مشورہ کر لیتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔“ عمران نے کہا۔

”ہو سکتا ہے کہ تم اجازت نہ دیتے۔“ میں نے کہا۔

جگت بولا۔ ”بادشاہو! آپ واقعی کمال کے بندے ہو۔ لگتا ہے کہ واہگرو کی خاص کرپا ہے آپ پر۔ شاید آپ خطرے کو سونگھ لیتے ہو۔ آپ ہمارے پیچھے آ کر اس سرچ لائٹ کا کونڈا نہ کرتے تو پکی گل ہے ہمارا کونڈا ہو جانا تھا۔ بہت بہت دھنیواد آپ کا۔“

فائرنگ میں ایک بار پھر وقفہ آ گیا تھا۔ دور سے انڈین سپاہیوں کے بولنے اور چلاّنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ریت سے گاڑیوں کی آگ بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک گاڑی بڑی تیزی سے واپس جاتی دکھائی دی۔ یقیناً وہ زخمیوں کو لے کر گئی تھی۔ ہماری یہ کارروائی بڑی کامیاب رہی تھی۔ میرے اور جگت سنگھ سمیت کسی بندے کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ ہم نے دو مشین گنیں ناکارہ کر دی تھیں۔ کم از کم ایک دو بندوں کو تو یقیناً ہلاک کیا تھا۔ ایمونیشن سمیت دو ہیوی رائفلیں بھی ہاتھ آئی تھیں۔

جگت سنگھ کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ باقی دو دستی بم بھی لے کر نکلتا اور گھیرا ڈالنے والوں میں گھس جاتا۔ مجھے وہ گالیاں یاد آئیں جو اس نے دستی بم پھینکتے ہوئے انڈین سپاہیوں اور جاوا کے غنڈوں کو دی تھیں۔

کچھ دیر بعد میں اور عمران پھر اپنی پوزیشنوں پر تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہ کیا جادو ہے تمہارے پاس... میں جب بھی تمہیں بتائے بغیر کہیں نکلتا ہوں، تمہیں پتا چل جاتا ہے؟“

”اسی کو تو کہتے ہیں خبردار جرنلسٹ۔“

”کچھ آگے کی بھی خبر ہے جرنلسٹ صاحب؟ یہاں سے نکل سکیں گے یا نہیں؟“

”شام تک میں مایوس تھا لیکن اب نہیں ہوں۔ یہاں مجھے ایک ایسی چیز نظر آگئی ہے جو مجھے یقین دلا رہی ہے کہ ہم یہاں سے نکل سکیں گے۔ نہ صرف نکل سکیں گے بلکہ عنقریب ثروت اور ڈاکٹر مہناز وغیرہ کے ساتھ مل کر بدین کے کسی اچھے سے ریستوران میں مزیدار سا ڈنر بھی کریں گے اور ابرار صدیقی اور ایشوریا رائے کی موت کا دکھ بھلانے کی کامیاب کوشش کریں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے قاتلوں کو عبرت ناک انجام تک پہنچانے کی پلاننگ بھی ہو گی۔“

”ایشوریا کا مجھے بھی صدمہ ہوا ہے۔ اس نے کافی سزا پائی تھی۔ اب وہ اپنے گلی کوچوں کے لیے ترس رہی تھی۔ لیکن تم بات کو کسی اور طرف لے گئے ہو۔ کون سی شے تمہیں ایسی نظر آئی ہے جو تمہاری امید بندھا رہی ہے؟“

وہ دور تاریکی میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی مجھے خود کسی نتیجے پر پہنچ لینے دو پھر بتاؤں گا۔“

”کیوں، کوئی خطرہ ہے مجھ سے؟“

”خطرہ تو ہونا چاہیے۔ تم اب من مانیاں کرنے لگے ہو۔“

ہمارے سامنے جھنڈ کے اندر اور اردگرد نقل و حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ نقصان اٹھانے کے بعد وہ لوگ یقیناً پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اب یہ لوگ حملہ کریں گے۔“ میں نے کہا۔

”اور زوردار کریں گے۔“

”تو پھر تیار ہو جانا چاہیے۔“ میں نے کہا۔

عمران نے اثبات میں سر ہلایا اور ساتھیوں کو ہدایات دینے کے لیے سرونٹ کوارٹر سے باہر نکل گیا۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ آج میں اسے کسی اور نظر سے دیکھ رہا تھا۔ یہ نظر نئی تھی اور وہ خود بھی نیا تھا۔ سینہ تان کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ ان لمحوں میں وہ واقعی ایک فوجی افسر ہی نظر آیا۔ پتا نہیں کتنے روپ تھے اس کے؟ عمو... موت کے کنوئیں میں زندگی کو داؤ پر لگانے والا بازی گر... ریوالور کا کھیل کھیلنے والا نڈر طالع آزما، دردِ دل رکھنے والا ایک سماجی کارکن، جانوروں کا ٹرینر... اور اب ایک سابق فوجی... پیاز کی طرح اس کی بہت سی پرتیں تھیں۔ ہر پرت کے نیچے ایک اور پرت ظاہر ہوتی تھی۔ ساتھیوں کو ہدایات دینے کے بعد عمران واپس آگیا۔

سویٹی کی موت کے بعد اس کی ساتھی دونوں لڑکیاں بہت دہشت زدہ تھیں۔ ان میں سے ایک پر تو بار بار غشی سی طاری ہو رہی تھی۔ سویٹی کی طرح یہ دونوں لڑکیاں بھی عمران پر بہت بھروسا کر رہی تھیں۔ جب وہ عمران کی طرف دیکھتیں تو ان کی آنکھوں میں امید اور حوصلے کی چمک پیدا ہو جاتی تھی لیکن جب وہ دور ہو جاتا تو ان کی آنکھوں میں بھی تیرگی پھیل جاتی تھی۔ جگت سنگھ جھک کر چلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”بادشاہو! آپ کا بڑا آسرا ہے ان دونوں کڑیوں کو۔ آپ ایک بار ان کو شکل دکھا دیں اور تسلی کے دو چار بول بول دیں۔ نہیں تو رو رو کر مر جائیں گی وہ۔“

عمران نے مجھے پوزیشن پر چوکس بیٹھنے کو کہا اور خود جگت سنگھ کے ساتھ اندرونی کمروں کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے چند سیکنڈ بعد ہی جیلانی میرے پاس آبیٹھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ دوسرا پٹیوں میں لپٹا ہوا اس کے گلے سے جھول رہا تھا۔ وہ کچھ دیر خاموش اور گم صم بیٹھا رہا... پھر اچانک بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تابش بھائی! آپ عمران صاحب کے بہت قریب ہیں، آپ ہی کچھ کریں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں دکھ کے بوجھ سے سرخ تھیں۔ وہ کوئی بہت گمبھیر بات چھپا رہا تھا۔

”جیلانی! کیا بات ہے... تم بتاتے کیوں نہیں؟“

اس نے عقب میں دیکھا، جیسے اندازہ لگانا چاہ رہا ہو کہ عمران کی واپسی کے آثار تو نہیں۔ پھر بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ”تابش بھائی! آپ عمران صاحب کو روکیں... مجھے یقین ہے وہ بہت غلط کام کرنے جا رہے ہیں۔ انہوں نے...“ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

”جیلانی! تم پریشان کر رہے ہو۔ جو بات ہے، جلدی کہو۔“

اس نے ایک لمبی آہ بھری اور جیسے حوصلہ جمع کرنے لگا۔ ہمارا گھیرا مزید سخت ہو رہا تھا۔ کچھ اور گاڑیاں موقع پر پہنچ رہی تھیں۔ ان کی متحرک روشنیاں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جیلانی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک

تھی۔ وہ بولا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ عمران صاحب ایک بہت غلط قدم اٹھانے جا رہے ہیں۔ میں نے انہیں موبائل پر بات کرتے سنا ہے۔ وہ کسی انڈین کرنل سے بات کر رہے تھے۔“

”انڈین کرنل سے؟“

”جی ہاں، مجھے لگتا ہے وہ یہاں موجود ہے۔ وہ کمینہ جادو ابھی شاید اس کے پاس ہی ہے۔ عمران صاحب ان کو اپنی حوالگی کی آفر کر رہے ہیں... اس شرط پر کہ باقی سب افراد کو حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکل جانے دیا جائے...“ جیلانی کی آواز پھر بھرا گئی۔

میں سناٹے میں رہ گیا۔ بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے عمران کے کہے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا اسے ایک خاص طریقہ نظر آ رہا ہے اور اس کی وجہ سے سب کے لیے امید کی کرن پیدا ہو گئی ہے۔ تو کیا یہی وہ طریقہ تھا؟ وہ اپنی جان کو اتنا ارزاں کیوں سمجھتا تھا؟ کیوں ہر جگہ اسے داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتا تھا؟ مجھے اس کے دیوانے پن پر تاؤ آنے لگا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، جیلانی دھیمی آواز میں بولا۔ ”انہوں نے جو ارادہ کر لیا ہے پورا کریں گے۔ ہم انہیں روک نہیں سکیں گے۔ ہماری خاطر اور ان لڑکیوں کی خاطر وہ خود کو بڑی تکلیف دہ موت کے حوالے کر دیں گے۔ میری سمجھ میں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے...“

”وہ کیا؟“

اس نے ایک بار پھر عقب میں دیکھا اور بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ”ہمارا یہ پکا ارادہ ہونا چاہیے کہ آخری گولی اور آخری بندے تک لڑیں گے۔ اکٹھے جینے مرنے کا یہی تو مطلب ہوتا ہے۔ ہمیں عمران صاحب کو کسی ڈھنگ سے روکنا پڑے گا۔ وہ رک جائیں اور تھوڑا وقت گزر جائے تو پھر ہو سکتا ہے کہ قدرت کی طرف سے کوئی مدد بھی آجائے۔“

”ایسی کسی مدد کی توقع ہے تمہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت زیادہ تو نہیں لیکن تھوڑی بہت ہے۔ ہمارے کچھ ساتھی سائل پور تک آچکے ہیں۔ انہوں نے دو سرکاری ٹرک بھی حاصل کر لیے ہیں۔ وہ آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ ممکن ہے یہ کوشش کامیاب ہو جائے۔“ جیلانی کہہ تو رہا تھا لیکن اس کی آواز میں کوئی خاص دم خم نہیں تھا۔

میں نے جیلانی سے پوچھا۔ ”تم نے عمران کو انڈین کرنل سے بات کرتے کب سنا؟“

”یہ کوئی ایک گھنٹا پہلے کی بات ہے۔ آپ اس وقت اندر کے کمروں میں ٹارچ ڈھونڈ رہے تھے۔“

”تم نے عمران کو روکنے کے لیے ابھی کسی طریقے کی بات کی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

جیلانی نے محتاط نظروں سے دائیں بائیں دیکھ کر جیب میں سے تین چار گولیاں نکالیں... یہ ہائی پوٹینسی ٹرنکولائزر تھیں۔ وہ بولا۔ ”ابھی لڑکیاں چائے بنائیں گی، میں ہی لے کر آؤں گا۔ عمران صاحب کے کپ میں دو گولیاں ڈال دیتے ہیں۔“

اس کی بات سمجھ میں آرہی تھی۔ عمران جیسے شخص کو اس کے کسی ارادے سے روکنا تقریباً ناممکن ہی ہوتا ہے اور جیلانی نے جو کچھ بتایا تھا... اور یقیناً درست ہی بتایا تھا، وہ ازحد خطرناک تھا۔ مجھے خود بھی بار بار اس قسم کا شبہ ہو رہا تھا... پچھلے دو تین گھنٹوں میں عمران نے کئی بار کہا تھا کہ اس ساری سچویشن کا ذمے دار وہ خود ہے۔ اس نے یہاں جو دشمن پال رکھے تھے، وہ سب سمٹ کر سامنے آگئے ہیں اور وہ خود تو پھنسا ہی ہے، ہم سب بھی پھنس گئے ہیں۔

میں نے جیلانی سے پوچھا۔ ”اس ڈوز کا اثر کب تک رہے گا؟“

”کم از کم صبح تک تو چلے گا ہی۔ تب تک صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔“

ہم نے اس بارے میں چار پانچ منٹ بات کی اور پھر فیصلہ کیا کہ اب رات کا باقی حصہ عمران کو ”آرام“ کرنے کا موقع دیا جائے۔

عمران واپس آگیا تھا۔ ہماری گفتگو کا رخ بدل گیا۔

ڈاکٹر مہناز کے پاس چائے کے لوازمات موجود تھے۔ فاخرہ اور ثروت نے اندرونی کمرے میں عارضی چولہا بنا کر چائے تیار کی۔ اس کے لیے ایک بڑی کیتلی بھی بس کے اندر سے ہی مل گئی۔ پروگرام کے مطابق جیلانی ہی چائے لے کر آیا۔ وہ صرف جیلانی نہیں، کیپٹن جیلانی تھا اور آج وہ اپنے افسر کو ایک نہایت خطرناک ارادے سے باز رکھنے کے لیے ایک قدم اٹھا رہا تھا۔ اس قدم کے لیے اسے میری پوری حمایت حاصل تھی۔

عمران والا کپ عمران کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ٹیلی اسکوپ تھی اور وہ گاہے بگاہے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے ایک گھونٹ لیا اور پھر دوبارہ ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ اس نے کپ کو دیکھا۔ اس کی حسیات بلا کی تھیں۔ وہ کچھ چونکا ہوا نظر آیا۔ اسی دوران میں اس کے موبائل کی بیل ہوئی۔ وہ کال

ریسیو کرتا ہوا احاطے کی طرف چلا گیا۔ یہ دوسری بار ہوا تھا کہ اس نے علیحدہ میں جا کر بات کی تھی۔ یہ سب کچھ جیلانی والی اطلاع کی تصدیق کر رہا تھا۔ آدھ منٹ بعد ہی وہ واپس آ گیا۔

''کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے وہ چائے کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے پھر ایک چھوٹا سا ''سپ'' لیا اور کپ ایک طرف رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا یا اپنا سوال دہراتا، اس نے میرے ہاتھ سے کپ لے کر ایک گھونٹ لیا اور ہمیں گہری نظروں سے دیکھ کر دیوار سے ٹیک لگا لی۔

''کک... کیا ہوا جی؟'' جیلانی نے پوچھا۔

''وہی جو تم نے کیا ہے۔ بلکہ شاید... شاید تم دونوں نے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''اس میں BROMAZEPAM ہے... کیوں کر رہے ہو تم ایسا؟'' عمران نے پوچھا۔

جیلانی گنگ سا ہو گیا۔ میں بھی سٹپٹا گیا۔ عمران کی غیر معمولی زود فہمی کا تجربہ میں اس سے پہلے بھی دو چار بار کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کی بوجھل خاموشی کے بعد میں نے بھنائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ہم ایسا اس لیے کر رہے ہیں کہ تمہیں تمہارے دیوانے پن سے روکنا چاہتے تھے۔ تم سمجھتے ہو کہ دنیا جہان کی عقل اکٹھی ہو کر تمہارے دماغ میں گھس گئی ہے۔ تم جو فیصلہ بھی کرو گے، سو فیصد درست ہو گا اور اس فیصلے کے لیے تمہیں کسی الو کے پٹھے سے مشورے کی ضرورت بھی نہیں۔ تمہارے ارد گرد نرے گدھے اور پیدائشی احمق ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہارا موبائل فون اس بات کی گواہی دے گا کہ تم انڈین کرنل سے بات چیت کر رہے ہو۔ خود کو اس کے حوالے کر کے ایک تاریخی احسان کرنا چاہ رہے ہو ہم سب پر۔ ہماری زندگیاں بچانے کے لیے ایک عظیم الشان قربانی دے رہے ہو۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری اس سوچ پر... اور تمہارے اس احسان پر۔ ہم سب تمہاری طرح جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ہمیں بھی اللہ نے ہاتھ پاؤں دیے ہیں، دماغ دیا ہے۔ تم اکیلے ہی آسمانوں سے ہمدردی اور قربانی کے دیوتا بن کر نازل نہیں ہوئے ہو۔''

وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''ہم اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے مریں گے۔ قربانی ہو گی تو سب کی ہو گی۔ لاشیں اٹھیں گی تو سب کی اٹھیں گی۔ اپنی عقل پر اتنا ہی گھمنڈ کرو جتنا بنتا ہے۔ تم بھی دھوکا کھا سکتے ہو۔ ابھی ایک دن پہلے کھایا ہے کہ نہیں تم نے، ہم سب نے... ایک عام لڑکی کو جاوا کی رکھیل سمجھ کر لیے پھرے ہیں اپنے ساتھ۔''

وہ خاموش تھا۔ اچانک کہیں سے مشین پسٹل کے دو فائر ہوئے۔ پھر تابڑ توڑ گولیاں چلنے لگیں۔ دونوں طرف کے رائفل مین تواتر سے ٹریگر دبانے لگے۔ میں نے دیکھا، دو افراد کسی کو کھینچتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی طرف لا رہے ہیں۔ چند سیکنڈ بعد یہ ہمارے سامنے سرونٹ کوارٹر میں تھے۔ یہ جگت سنگھ اور قربان علی تھے۔ انہوں نے ایک مخالف شوٹر کو دبوچا ہوا تھا اور گھسیٹتے ہوئے اندر لا رہے تھے۔ اس بندے کے کندھے میں گولی لگی تھی اور اس کی دھاری دار شرٹ اور جینز کی پینٹ خوں رنگ ہو رہی تھی۔

''لگتا ہے یہ جاوا کا گرگا ہے۔'' قربان نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیسے پکڑا؟'' عمران نے پوچھا۔

جگت بولا۔ ''آپاں کو شک ہوا تھا جی۔ پہلے آپاں دونوں سمجھے کہ اندھیرے میں کوئی کتا ہل جل کر رہا ہے۔ پھر اندازہ ہوا کہ یہ چار نہیں دو لاتوں والا کتا ہے۔ یہ ڈڈھ کے بل رڑ رڑ کر (کرالنگ کر کے) ٹیلے سے آگے نکل آیا تھا۔ پتا نہیں کیا ارادہ تھا اس کا۔ ہم نے آگے جا کر گولی چلائی اور پکڑ لیا۔ یہ دیکھیں، تین دستی بم نکلے ہیں اس کے پاس سے۔''

ابھی تفصیل میں جانے کا وقت نہیں تھا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہم نے بھی پوزیشن سنبھال لی۔ مخالفین کی ''فائرنگ پاور'' زیادہ تھی اور تعداد بھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی تقریباً چار گولیوں کے جواب میں ہم ایک گولی چلا رہے ہیں۔ بہر حال ہم انہیں آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب تھے۔ پانچ چھ منٹ بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ اس دوران میں مخالفین نے جھنڈ میں اپنی پوزیشن کچھ اور مضبوط کر لی تھی۔

جگت سنگھ نے پکڑے جانے والے شخص کی مشکیں بڑی اچھی طرح کس دی تھیں... 38 بور کی گولی اس بندے کے کندھے کا گوشت چیر کر نکل گئی تھی۔ ڈاکٹر مہناز اپنے طبی سامان کے ساتھ آئی اور اس نے مضروب کا خون بند کرنے کے لیے مضبوطی سے پٹی باندھ دی۔ اس دوران میں وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا اور لمبی لمبی سانسیں لیتا رہا۔ یہ تیس

بتیس سال کا بندہ تھا۔ سکھ نہیں تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ پنجاب یا ہماچل پردیش وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے۔

اس نے کراہنے کے لیے منہ کھولا تو جگت سنگھ نے رائفل کی نال اس کے منہ میں گھسا دی اور انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ ''آپاں جو کچھ پوچھیں گے، سچ بتانا پڑے گا۔ نہیں تو گولی وہاں وہاں سے گزرے گی جہاں جہاں سے تیرا بھوجن گزرتا ہے۔''

وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ بے پروائی سے جگت کی طرف دیکھتا رہا۔ چہرے مہرے سے وہ بڑا کرخت بندہ لگتا تھا۔ ظاہر ہے جاوا جیسے ڈان کا قریبی ساتھی تھا۔

اگلے دو تین منٹ میں یقین ہو گیا کہ وہ آسانی سے زبان کھولنے والا بندہ نہیں۔ وہ الٹا ہمیں ڈرا رہا تھا کہ ہم بہت بری طرح پھنس چکے ہیں اور بہتر ہے کہ ہتھیار پھینک کر اپنی جانیں بچائیں۔

دفعتاً فرانسس نامی یہ بندہ کچھ چونکا ہوا نظر آیا۔ اس نے بغور عمران کو دیکھا اور بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ میں نے تمہاری آواز کہیں سنی ہے۔ یہ زیادہ دن پہلے کی بات بھی نہیں ہے۔'' اس کی نیم گنجی پیشانی پر الجھن کی لکیریں تھیں۔

تب یکا یک وہ اپنے زخمی کندھے کو تھامتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ اس نے عمران کا بازو دیکھا۔ عمران نے کلائی پر سے آستین اڑسی ہوئی تھی۔ ہم نے دیکھا، جاوا کا یہ عیسائی گرگا بڑے دھیان سے عمران کی کلائی دیکھ رہا ہے۔ عمران کی سرخ و سپید کلائی پر گولی لگنے کا ایک پرانا نشان تھا۔ یہ قریباً پانچ سال پرانی بات تھی جب ایک تاریک رات میں ایک پرشور نالے کے اوپر سراج کے کارندے شیرے نے عمران پر گولی کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ وہ جیکٹ کی وجہ سے بچا تھا تاہم چند گولیاں اسے لگی تھیں۔ یہ کلائی کا چار پانچ انچ لمبا سیاہی مائل نشان بھی اسی خونی واقعے کی یادگار تھا۔

فرانسس نے اس نشان کو دیکھا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ مجھے لگا وہ سخت حیران ہوا ہے اور اس کے ساتھ وہ ساری کرختگی اور عداوت اس کے چہرے سے دور ہو رہی ہے جو کچھ دیر پہلے تک اس کے نقوش کو ڈھانپے ہوئے تھی۔ اس نے ایک بار پھر عمران کو سر تا پا دیکھا اور بولا۔ ''مجھے یاد آ گیا... مجھے سب یاد آ گیا ہے... آپ کو میں نے گولڈن بلڈنگ میں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ آپ ہی تھے۔ آپ کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں ہے... اور آپ کے ہاتھ کا یہ نشان... اسی ہاتھ سے آپ نے کمرے کا دروازہ کھولا تھا۔ آپ دھوئیں کی وجہ سے بری طرح کھانس رہے تھے۔ مجھے ایک ایک بات یاد ہے۔''

''تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''لیکن مجھے سب کچھ سمجھ میں آ رہا ہے۔ میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ یہ آپ ہی تھے، آپ ہی نے ہمیں بچایا تھا۔ اس وقت آپ کے چہرے پر نقاب تھا لیکن میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ ایک بڑی خواہش پوری ہوئی ہے میری۔'' وہ عمران کے سامنے آ گیا۔ اس کا انداز مؤدب اور عقیدت مندی کا تھا۔

''کون ہو تم؟'' عمران نے پوچھا۔

اس نے ذرا توقف کیا اور جذباتی لہجے میں بولا۔ ''سر! میں گولڈن بلڈنگ کے ان گارڈز میں سے ہوں جو کمرا نمبر تین میں لاک رہ گئے تھے۔ پوری بلڈنگ میں دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ ہمیں اپنی موت یقینی نظر آ رہی تھی۔ آپ آگ اور دھوئیں میں سے گزر کر ہم تک پہنچے تھے۔ دروازہ کھول کر ہمیں نکالا۔ میں ان گارڈز کا سیکنڈ انچارج فرانسس جوزف ہوں۔ مجھے وہ سارا واقعہ معلوم ہے۔ آپ ہمیں بلڈنگ میں بھول گئے تھے لیکن پھر ہمارا جیون بچانے کے لیے آپ نے اپنے جیون کو شدید خطرے میں ڈالا... میں... بہت بڑا اپرادھی ہوں لیکن یہ ایک ایسا احسان ہے جو مجھ جیسا بندہ بھی بھلا نہیں سکتا۔ آ... آپ بتائیں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ آپ وہی ہیں نا؟''

عمران خاموش تھا، ہم سب خاموش تھے۔ یہ عجیب ٹوئسٹ آیا تھا۔ اگلے دس پندرہ منٹ کافی اہم اور انکشاف انگیز تھے۔ فرانسس نامی یہ انچارج گارڈ جاوا کے کارندوں میں سے تھا۔ ہم نے کچھ دیر پہلے بی ایس ایف کی گاڑیوں پر جو تین دستی بم پھینکے تھے، ان سے جہاں گنیں برباد ہوئی تھیں، وہیں چار بندے بھی شدید زخمی ہوئے تھے جن میں دو کچھ ہی دیر بعد ہلاک ہو گئے تھے۔ جاوا کا یہ کارندہ ان دستی بموں کا جواب دستی بموں سے دینے کے لیے ہماری طرف آیا تھا لیکن دھر لیا گیا۔ اب وہ صرف دس پندرہ منٹ کے اندر ہی ایک بدلا ہوا شخص نظر آ رہا تھا اور اس تبدیلی کی وجہ وہ بڑے جذباتی انداز میں گولڈن بلڈنگ والے واقعے سے جوڑ رہا تھا جسے ہم تقریباً بھول چکے تھے۔

پتا نہیں کہ جاوا سے فرانسس کا تعلق کتنی دیر سے تھا اور اس میں کتنی گہرائی تھی مگر عمران کے ایک عمل نے اسے اس طرح متاثر کیا تھا کہ اس کی ساری کیمسٹری ہی بدلی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔

اس کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ یوں لگا جیسے پتھر

اشک بار ہے۔۔۔وہ عمران کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔ ”میں اس احسان کے بدلے آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں؟“

عمران نے کہا۔ ”میں تمہاری احسان شناسی کی قدر کرتا ہوں لیکن تمہیں کسی مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ اگر تم ہمیں ہماری مطلوبہ معلومات فراہم کر دو تو یہی بہت ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں ان معلومات کے لیے تم پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔“

عمران کے کہنے پر مہناز نے فرانسس نامی اس بندے کی مرہم پٹی ایک بار پھر زیادہ اچھے طریقے سے کی۔ اسے چائے وغیرہ پلائی گئی۔ اس نے کئی اہم باتیں بتائیں۔ اس نے انکشاف کرنے والے لہجے میں کہا۔ ”شاید آپ لوگوں کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ بی ایس ایف اور ہمارے لوگوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ہم لوگ آپ پر ہلا بول کر ریسٹ ہاؤس میں گھسنا نہیں چاہتے۔“

”اس کی وجہ؟“

”وہی جو آپ نے بتائی ہے اور جو میں نے بھی بتائی ہے۔ علاقے میں یہ جگہ آسیب زدہ مشہور ہے۔ کوئی پاس سے بھی نہیں گزرتا۔ بی ایس ایف کے لوگ بھی یہاں نہیں گھسیں گے اور نہ ہم گھسیں گے۔“

”تو پھر؟“

”دیکھیں جی، یہ لوگ اس چکر میں ہیں کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ فائرنگ میں الجھایا جائے اور آپ پر یہ ظاہر کیا جائے کہ کسی بھی وقت ریسٹ ہاؤس پر چڑھائی ہو سکتی ہے۔ یوں آپ کا ایمونیشن بالکل ختم کر دیا جائے۔“

”ایمونیشن ختم ہو جائے گا تو پھر؟“ میں نے پوچھا۔

”پھر بھی یہ لوگ اندر نہیں گھسیں گے۔ یہ آپ ہی کو باہر آنے اور گرفتاری دینے کا کہیں گے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم یہاں جم کر بیٹھے رہیں تو کوئی ہمیں یہاں پکڑنے نہیں آئے گا۔“

”نہیں، خیر ایسا تو نہیں ہوگا۔۔۔ اگر آپ خود نہ نکلے تو پھر آپ کو کسی اور طریقے سے باہر نکالا جائے گا۔ خاص طور پر میجر صاحب کو تو یہ لوگ ہر صورت پکڑنا چاہتے ہیں۔“

”مثلاً کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟“

”شاید آپ کو یہ بات عجیب لگے لیکن حقیقت میں ایسا ہی ہے۔ آپ کو باہر نکالنے کے لیے آپ کو ایک دم ڈرا دیا جائے گا۔ دراصل علاقے کے لوگ بھی اس بات کو بالکل پسند نہیں کر رہے کہ آپ لوگوں کو پکڑنے کے لیے بی ایس ایف، پولیس یا ہم اندر گھسیں۔ انہوں نے مل جل کر کچھ عجیب ماحول بنا دیا ہے۔ مقامی بی ایس ایف تو پہلے ہی اس جگہ کو آسیب زدہ سمجھتی تھی، اب باقی لوگ بھی ڈرے ہوئے ہیں جن میں ہم بھی شامل ہیں۔ بھیا جاوا صاحب کے ساتھیوں میں واحد میں ہوں جو ان باتوں کو بکواس سمجھ رہا ہے۔“

”اور شاید اسی لیے تمہیں تین دستی بم دے کر یہاں بھیجا بھی گیا۔“ عمران نے کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جی۔“

”تم نے ابھی کہا ہے کہ شاید ہمیں ڈرا کر یہاں سے نکالا جائے گا۔۔۔ اس کا کیا مطلب ہے؟“ عمران نے دریافت کیا۔

”دراصل شام سے ہی مختلف طریقوں پر غور ہو رہا ہے۔ جاوا صاحب نے کرنل صاحب کو یہ مشورہ دیا تھا کہ گھیرا برقرار رکھا جائے۔ جب کھانا پانی اندر نہیں جا سکے گا تو آپ لوگ خود ہی ہمت ہار کر باہر آ جائیں گے۔ پر کرنل صاحب کہنا تھا کہ اس میں کافی وقت لگے گا۔ ہو سکتا ہے چار پانچ دن۔ اوپر سے سخت آرڈر ہیں کہ جلد سے جلد گرفتاری ہو۔ اوپر بیٹھے ہوئے افسر اس آسیب واسیب کی بات سے بے خبر ہیں اور انہیں خبر ہو بھی تو شاید وہ اس کو اتنی اہمیت نہ دیں۔“

”تو پھر ہمیں نکالنے کے لیے کیا پلاننگ ہے ان کی؟“

فرانسس نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”شاید آپ کو پتا ہی ہو بھیا جی (جاوا) کے پاس بہت سے پالتو ریچھ ہیں۔ وہ جگہ جگہ سے ہر طرح کے ریچھ اکٹھے کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ممبئی میں رکھے گئے ہیں، کچھ بھڑوچ اور کھمبات وغیرہ میں۔ یہ سارے بڑے خوں خوار جانور ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہاں ایک بڑا کنٹینر پہنچا ہے۔ دیکھیں۔۔۔ وہ دیکھیں۔۔۔ جھنڈ کے پاس، گاڑیوں کے پیچھے وہ اونچی چھت والا سفید کنٹینر۔“

میں نے ٹیلی اسکوپ کی مدد لی اور مجھے وہ کنٹینر صاف نظر آیا۔ وہ شاید ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا تھا۔ عمران اور جیلانی نے بھی ٹیلی اسکوپ سے کنٹینر کو دیکھا۔ خالی آنکھ سے بھی اس کی سفیدی مائل چھت دکھائی دیتی تھی۔

”اس میں کیا ہے؟“ کیپٹن جیلانی نے پوچھا۔

”اس میں پالتو ریچھ ہیں جی۔ سات کے قریب۔“

”ان کا کیا کیا جائے گا؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ایمونیشن ختم ہونے کے بعد بھی اگر آپ لوگ ریسٹ ہاؤس میں ڈٹے رہے اور باہر نہیں آئے تو ان ریچھوں کو ریسٹ ہاؤس کی طرف ہانک دیا جائے گا۔ اس کام کے لیے شکاری کتے بھی استعمال ہو سکتے تھے اور بی ایس ایف والوں نے وہ منگوا بھی لیے تھے لیکن مقامی لوگوں نے سختی سے منع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ پالتو کتے بلیاں اور گھوڑے یہاں داخل نہیں کیے جا سکتے۔ اس سلسلے میں پنڈتوں نے سختی سے منع کر رکھا ہے۔ بہرحال، بھیا جی کو امید ہے کہ شاید ریچھ چھوڑنے کی نوبت نہ آئے۔ آپ کو کسی اور طریقے سے باہر نکال لیا جائے۔“

میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی۔ جاوا کے وہ خوں خوار ریچھ نگاہوں کے سامنے آئے جنہوں نے اپنے ٹرینر کو مارا تھا اور کوٹھی میں زبردست توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ثروت کا خیال آیا۔ وہ بدترین حالات سے گزر رہی تھی لیکن اگر وہ جاوا کے ریچھ بھی یہاں دیکھ لیتی تو شاید اس کا دل ہی کام کرنا بند کر دیتا۔

عمران نے بی ایس ایف کی ٹوٹل نفری اور اسلحے وغیرہ کے بارے میں بھی فرانسس سے معلومات حاصل کیں۔ گاڑیوں کی کل تعداد کا پتا چلایا اور ان کی لوکیشنز معلوم کیں۔ فرانسس نے یہ بھی بتایا کہ جاوا گروپ کی پانچ گاڑیاں اور قریباً 30 شوٹرز یہاں موجود ہیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران کی نگاہیں گاہے بگاہے اس سمت میں اٹھ جاتی تھیں جہاں فرانسس نے سفید کنٹینر کی نشاندہی کی تھی۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہا تھا۔۔۔ فرانسس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ ہماری آپس کی تلخ کلامی اور لڑائی پس منظر میں چلی گئی تھی۔

قربان وغیرہ فرانسس کو باہر لے گئے۔ ایک طرح سے اب وہ ہماری حفاظتی تحویل میں تھا۔

فرانسس جو کچھ بتا رہا تھا، بڑا حیران کن تھا۔ ہمیں پہلے بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ لوگ صرف گھیرا ڈالے ہوئے ہیں ورنہ جتنی ان کی نفری تھی اور فائر پاور تھی، وہ دو تین گھنٹے پہلے اس قابل ہو گئے تھے کہ ہم پر ہلا بول کر ریسٹ ہاؤس میں گھسنے کی کوشش کرتے۔ توہمات کہاں نہیں ہوتے، یہاں بھی موجود تھے اور ایک طرح سے یہ ہمارے حق میں بھی تھے۔ علاقے کے لوگ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ بی ایس ایف یا پولیس وغیرہ ریسٹ ہاؤس میں گھسے اور یوں عاملوں اور دو تین بڑے پنڈتوں کے مطابق بدآتمائیں اس چار دیواری سے باہر نکل آئیں۔

ریچھوں کی یہاں آمد کا سن کر میرا دھیان بار بار ثروت کی طرف جا رہا تھا۔ وہ قریب سے کسی ریچھ کی آواز بھی سن لیتی تو شاید ہوش کھو دیتی۔ وہ کسی ایسی صورتِ حال کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ پرانے واقعے کے اثرات اس کے ذہن پر بڑے گہرے تھے۔

اس دوران میں جگت سنگھ نے آ کر مجھے بتایا۔ ”بادشاہ زادے! چھوٹی تمہیں بلا رہی ہے۔“

میں خود بھی ثروت کے پاس جانا چاہ رہا تھا۔ اپنی پوزیشن جگت سنگھ کو سونپ کر میں اندرونی کمروں کی طرف گیا۔ راستے میں مجھے ڈاکٹر مہناز ملی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ قربان علی بھی ایک دم غمزدہ کھڑا تھا۔ میں چونک گیا۔ میرا دھیان سیدھا نصیر احمد کی طرف گیا۔ وہ شدید زخمی تھا۔

”نصیر احمد تو ٹھیک ہے؟“ میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا اور اس کی خوب صورت آنکھیں نم ہو گئیں۔

قربان علی بولا۔ ”نصیر احمد ہمیں چھوڑ گیا ہے تابش صاحب۔“

میرے سینے میں سرد لہر دوڑ گئی۔ ڈاکٹر مہناز ہولے سے بولی۔ ”لیکن آپ لڑکیوں کو کچھ نہ بتائیں۔ خاص طور سے ثروت کو۔ وہ پہلے ہی ڈپریشن میں ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خود کو سنبھالتا ہوا ثروت کی طرف بڑھا۔ ثروت ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے ثروت؟“

”بیٹھ جائیں۔“ وہ عجیب انداز میں بولی۔

میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ انہی کپڑوں میں تھی جن میں ممبئی سے چلی تھی۔ سرخ پھولوں والی شلوار قمیص تھی جس پر اس نے شال اوڑھ رکھی تھی۔ شال کندھوں پر تھی اور ریشمی بال بکھرے بکھرے نظر آتے تھے۔ ایک چھوٹے جھمکے کا سایہ اس کے رخسار پر حرکت کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ بولے گی لیکن کچھ نہیں بولی۔ بس پلکیں جھکائے بیٹھی رہی۔ پھر ایک دم اس نے جذباتی انداز میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دی اور انہیں میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ قریباً ایک منٹ ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ میں نے کہا۔ ”کچھ بولو نا ثروت!“

اس کی روشن پیشانی پر ایک رگ ابھری ہوئی تھی مگر اس نے اپنے ہونٹوں کو حرکت نہیں دی۔ ہونٹ جو خشک اور بے رنگ ہونے کے باوجود میرے لیے بہت دلنشین تھے۔

''کچھ بولنا نہیں؟'' میں نے پیار سے پوچھا۔
اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ یہ دلربا انداز تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ بدستور میرے ہاتھوں پر رکھے ہوئے تھے۔
اس دوران میں ڈاکٹر مہناز نے کمرے میں جھانکا۔ ثروت نے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ دو آنسو اس کے شفاف رخساروں پر متحرک ہوئے۔ اس نے ایک کاغذ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''اسے پڑھ لیجیے گا۔''
ڈاکٹر مہناز اب اندر آ گئی تھی۔ میں اٹھ کر واپس اپنی پوزیشن پر پہنچ گیا۔ عمران ٹیلی اسکوپ میں اردگرد کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔
میں نے کاغذ کھولا اور ٹارچ کی روشنی میں پڑھنا شروع کیا۔ ''تابش! میں نے آپ کو بہت دکھ دیے ہیں اور آپ نے بڑے حوصلے سے برداشت کیے ہیں۔ میرے لیے شدید رنج کی بات یہی ہے کہ آپ کی ان اذیتوں کا میرے پاس کوئی صلہ نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟ میں اپنی سوچوں کا شکار ہوں تابش! میں وہی بات کہوں گی۔ میں اس خیال کو اپنے دل سے نکال ہی نہیں سکتی کہ آپ کا اور میرا ملاپ نصرت کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوگا۔ پتا نہیں کیوں اب بھی میرا دل بار بار یہی کہہ رہا ہے کہ نصرت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ضرور کسی بڑی مصیبت کا شکار ہے اور اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ میں اس وقت اپنے شوہر سے دور ہوں اور آپ کے قریب۔
''ہم جس طرح کے حالات میں ہیں، ہمارے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے تابش! ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ کے دوست نصیر کو دیکھا ہے۔ مجھے نہیں لگتا، ڈاکٹر مہناز اسے بچا پائے گی۔ شاید اگلی باری میری ہو یا خود ڈاکٹر مہناز کی ہو۔ تابش! اگر مجھے کچھ ہوگیا... تو آپ نصرت کا بہت خیال رکھیے گا۔ وہ بن ماں باپ کے ہے۔ بالکل بے آسرا ہے۔ اس نے بہت دکھ دیکھے ہیں۔ اسے میری کمی محسوس نہ ہونے دیجیے گا۔ اور ایک آخری بات آپ سے کرنا چاہتی ہوں۔ اسے ہمیشہ یاد رکھیے گا... میں آج بھی آپ سے پیار کرتی ہوں اور اس پیار کی شدت اتنی زیادہ ہے کہ میرے پاس اس کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ میں اس اظہار کے لیے خود کو بالکل بے بس محسوس کرتی ہوں۔ میری دوسری خطاؤں کی طرح میری اس بے بسی کو بھی معاف کر دیجیے گا۔ اگر ہم زندہ رہے تو آج کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گے۔ خدا حافظ۔''
میں نے کاغذ اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ عمران نے آخری بار ٹیلی اسکوپ کو نیم دائرے کی شکل میں گھمایا اور بولا۔ ''بھانڈیل اسٹیٹ کی قلعے والی لڑائی یاد ہے تابی! آج پھر ویسی ہی پوزیشن نظر آ رہی ہے۔''
میں نے کہا۔ ''اس وقت تو نل پانی سے چھوٹے سرکار کی کمک آ گئی تھی لیکن یہاں ایسی کوئی امید پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ جو کچھ کرنا ہے، شاید ہمیں خود ہی کرنا ہے۔ کوئی خاص بات آتی ہے تمہارے ذہن میں؟''
وہ ٹیلی اسکوپ کو ایک طرف رکھ کر ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''بھانڈیل میں کمک کا اصل فائدہ یہی ہوا کہ گھیرا ڈالنے والوں میں کھلبلی مچی تھی۔ اس کھلبلی کا فائدہ اٹھا کر ہم قلعے سے نکل کر حکم کی فوج پر ٹوٹ پڑے تھے۔ نوجوان طلال، بھرت کمار اور حسنات وغیرہ نے بھی ہمارے کندھے سے کندھا ملا کر بے مثال جرأت دکھائی تھی اور حکم اور اینڈرسن وغیرہ کا ستیاناس کر دیا تھا۔ اگر یہاں بھی کوئی اس طرح کی کھلبلی مچ سکے تو ہم باہر نکل کر بھرپور حملہ کر سکتے ہیں، اندھیرے میں گھیرا توڑ کر نکل سکتے ہیں۔ میرے خیال میں ابھی ان کے پاس سرچ لائٹس نہیں ہیں۔ یہ ایک ہی لائٹ تھی جو ہم نے توڑ دی ہے۔''
''لیکن کھلبلی ہو کس طرح؟''
''یہی مسئلہ ہے۔ اب تو جھکڑ بھی تھم گئے ہیں۔ اگر شدید جھکڑ ہی آ جائیں تو ایسی چویشن میں ہیلپ مل سکتی ہے۔ پچھلے سال اسی علاقے میں اسی طرح کی صورتِ حال میں تیز آندھی نے شہزاد، اقبال اور جیلانی کی مدد کی تھی۔''
جیلانی بھی ٹیلی اسکوپ سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ہماری باتیں بھی سن رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا ہمارے پاس آ گیا۔
عمران نے پوچھا۔ ''کوئی تجویز ہے تمہارے ذہن میں؟''
وہ بولا۔ ''تجویز تو نہیں لیکن آپ کی یہ بات درست لگتی ہے کہ کوئی ہلچل ہمیں ان کا گھیرا توڑنے کا موقع دے سکتی ہے اور وہ بھی صبح ہونے سے پہلے پہلے۔''
عمران نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ سگریٹ اس کے ہونٹوں میں تھا۔ وہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد پھر ٹیلی اسکوپ سے کسی خاص منظر کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ جیسے تذبذب میں تھا۔
''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''کچھ نہیں۔ ایم جی فور گن کس کے پاس ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے شوزصدیق کے پاس ہے۔''
''وہ کہاں ہے؟''
''سیڑھیوں کے پاس۔'' میں نے کہا۔
''آؤ میرے ساتھ۔'' وہ بولا۔
ہم جھک کر احتیاط سے چلتے ہوئے اس شوز کے پاس پہنچے۔ اس نے سیڑھیوں کے قریب پوزیشن لے رکھی تھی۔ اس کے چاروں طرف گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی صورتِ حال کی سنگینی کو دیکھ رہا تھا اور غالباً نصیر کی موت سے بھی باخبر ہو چکا تھا پھر بھی اس کا سینہ تنا ہوا تھا اور مورال ہائی تھا۔ عمران نے اس سے ایم جی فور آٹومیٹک لے لی اور اپنی ٹرپل ٹو اسے تھما دی۔ ایک میگزین گن کے ساتھ اٹیچ تھا۔ ایک اور فل لوڈڈ میگزین بھی عمران نے لے لیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر احتیاط سے سیڑھیاں چڑھا اور بالائی منزل پر آ گیا۔ یہاں کھڑکیوں اور دیواروں میں گولیوں کے بے شمار سوراخ تھے۔ قربان کے ایک ساتھی کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ اس پر ایک پولیتھین پھیلا دیا گیا تھا۔ ہم ایک چھوٹا زینہ طے کر کے بالائی منزل کی چھت پر آ گئے۔ یہاں سیڑھیوں کی ایک ڈھلواں چھت کے سوا کوئی آڑ نہیں تھی۔ اس چھوٹی سی آڑ میں ایک گن مین چوکس بیٹھا تھا۔ عمران نے اس کا کندھا تھپکا اور گن سمیت نیچے جانے کی ہدایت کی۔ ساتھ ہی اس سے کہا کہ وہ قربان علی اور دیگر ساتھیوں کو بالکل چوکس کر دے، ہر کوئی اپنی پوزیشن پر موجود رہے۔
''ایم جی فور گن'' خاصی طاقتور ہوتی ہے۔ کل دوپہر شوزصدیق نے بتایا تھا کہ اس قریباً ایک میٹر لمبی گن کا وزن نو کلوگرام کے لگ بھگ ہے۔ یہ لمبی رینج تک مار کرتی ہے اور ایک منٹ کے اندر 800 سے لے کر 885 راؤنڈ تک فائر کر دیتی ہے۔ یعنی ایک سیکنڈ میں تقریباً 15 راؤنڈ۔
عمران نے گن کے دستے کو مضبوطی کے ساتھ کندھے سے لگایا اور کسی شے کا نشانہ لینے میں مصروف ہو گیا۔ میں سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کچھ بتاؤ گے بھی؟'' میں نے بھنا کر کہا۔
''ابھی بتاتا ہوں۔'' اس نے ایک ہاتھ سے ٹیلی اسکوپ میں جھانکتے ہوئے۔
میں نے اندازہ لگایا کہ شاید کوئی اہم فرد اس کے نشانے پر ہے۔ مثلاً جاوا یا انڈین کرنل... یا پھر کوئی اور اہم بندہ۔ کچھ دیر بعد اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''میں سفید کنٹینر کو ہٹ کرنا چاہتا ہوں۔''
''کیا مطلب؟''
''فاصلہ تو کافی ہے اور زاویہ بھی خاصا مشکل ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ کامیابی ہو جائے۔''
وہ اب رسک لے کر کھڑا ہو گیا تھا اور بڑی یکسوئی سے اپنا نشانہ لے رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ شاید کنٹینر کی فیول ٹنکی کو نشانہ بنانا چاہ رہا ہے۔
''یار کھڑے ہونے کا رسک نہ لو۔'' میں نے اسے تنبیہ کی۔
''کس کس رسک سے روکو گے جگر! یہاں تو رسک کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔''
وہ بلا کا نشانے باز تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ جو کچھ کرنے جا رہا ہے اس کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ وہ سر تا پا ساکت ہو گیا جیسے سنگی مجسمہ ہو۔ اور پھر اس نے ٹریگر دبایا۔ گن کو زوردار جھٹکے لگے۔ ''ریٹ ٹیٹ'' کی مخصوص تہلکہ خیز آواز سے ایک برسٹ چلا... پھر دوسرا۔

تیسرے برسٹ سے پہلے دوسری طرف سے برسٹ آیا۔ عمران اس کے لیے پہلے سے تیار تھا اس لیے جھک گیا تھا۔ ڈھلوان چھت اور چمنی کے اردگرد چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوگئی... ہم دبکے ہوئے تھے۔ عمران کو ابھی تک اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک اور برسٹ چلانا چاہ رہا تھا اور یہ از حد خطرناک تھا۔ میں اسے روکنا چاہتا تھا لیکن جانتا تھا کہ وہ رکے گا نہیں۔ اور پھر فائرنگ میں چند سیکنڈ کے وقفے کے دوران میں وہ کھڑا ہوا اور پوری یکسوئی سے ایک اور برسٹ چلایا۔ بے شک وہ نشانے باز تھا لیکن قسمت کی دیوی بھی اس کا ساتھ دیتی تھی۔ اس بار عمران کے چلائے ہوئے برسٹ کا نتیجہ اس کی مراد کے مطابق تھا۔ ایک شعلہ نکلا اور دھماکے کے ساتھ ہی کنٹینر کے اگلے حصے نے آگ پکڑ لی۔ میں طاقتور دوربین کی مدد سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

کنٹینر شعلوں میں گھرا تو اردگرد افراتفری نظر آئی۔ کئی ہیولے دوڑتے بھاگتے دکھائی دیے۔ شاید یہی وہ افراتفری تھی جو عمران دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن نہیں... وہ اس کے سوا بھی کچھ چاہتا تھا۔ اور جو وہ چاہتا تھا پھر ہمارے سامنے بھی آیا۔ کچھ افراد نے گھبراہٹ کے عالم میں کنٹینر کا عقبی دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر موجود ریچھوں کو بچانا چاہتے تھے۔ میں نے ٹیلی اسکوپ میں دیکھا اور لرز گیا۔ بڑے بڑے ریچھ جست لگاتے ہوئے کنٹینر کے دھوئیں میں سے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے دیکھا، دروازہ کھولنے والے افراتفری میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ مدھم چاندنی میں سب کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ریچھ طوفانی رفتار سے ایک کھلی جیپ پر جھپٹا۔ جیپ میں موجود افراد چھلانگیں لگاتے ہوئے دوڑے۔ ایک ریچھ بی ایس ایف کے کسی اہلکار کی گولی سے زخمی ہوا۔ وہ ایک بار لوٹ پوٹ ہو کر گاڑیوں کی طرف لپکا۔ دو تین گاڑیاں اس کے سامنے ریورس ہوتی چلی گئیں۔ دائیں طرف بھی کچھ ایسی ہی سچویشن نظر آئی۔ اوپر تلے کئی فائر بھی ہوئے۔ دوسری طرف کنٹینر کو لگنے والی آگ ایک ٹرک نما گاڑی تک چلی گئی اور وہ بھی ایک دھماکے سے شعلوں کی لپیٹ میں آگئی۔

عمران اور میں سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے نیچے آئے۔ عمران ساتھ ساتھ اپنے شوٹرز کو پکار رہا تھا۔ وہ بھی جیسے پہلے ہی سے تیار تھے۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ عمران نے ان کو پہلے سے بریف کیا ہوا ہے۔ میں نے قربان علی، صدیق اور جیلانی وغیرہ کے ہاتھ میں دستی بم دیکھے لیکن جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ دستی بم نہیں تھے۔ یہ گیس بم تھے جو تیزی سے دھواں پھیلاتے تھے۔ ہم تیزی سے فائرنگ کرتے ہوئے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکلے۔ میں نے دیکھا، بھاگتے بھاگتے عمران نے جگت سنگھ سے اس کی کرپان بھی لے لی ہے۔ یہی وقت تھا جب میں ٹھٹک گیا۔ میری نگاہ ایک براؤن کوڈیاک ریچھ پر پڑی۔ یہ خوں خوار ریچھ پھنکارتا ہوا ریسٹ ہاؤس کا جنوبی دروازہ توڑ کر اندر آرہا تھا اور اندر عورتیں تھیں۔ فقط میڈم صفورا کے پاس ایک چھوٹا پسٹل موجود تھا۔ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میں واپس پلٹا۔ میں نے ریچھ پر دو سنگل شاٹ فائر کیے۔ اس دوران میں وہ چنگھاڑتا اور پھنکارتا ہوا اندرونی کمروں میں گھس گیا۔ اندر سے لڑکیوں کے چلّانے کی دردناک آوازیں آئیں۔ یقیناً ان میں ثروت کی آواز بھی شامل تھی۔ میں اندر جھپٹا۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی۔ میں نیچے گر گیا۔ ایک گولی میری کلائی کو زخمی کرتی ہوئی گئی... دیگر ایک دو گولیاں رائفل پر لگیں اور وہ میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گری۔ میں نے اس کا میگزین چکنا چور دیکھا۔ میں نے قمیص کے نیچے سے دندانے دار شکاری چاقو نکالا اور اندرونی کمروں کی طرف گیا۔ ایشوریا اور نصیر احمد کی چادر پوش لاشوں کو پھلانگتا ہوا میں کمرے میں پہنچا تو منظر لرزہ خیز تھا۔ لڑکیاں ساتھ والے کمرے کے ایک کونے میں دبکی ہوئی تھیں۔ میڈم صفورا قریباً آٹھ فٹ اونچے ریچھ کے سامنے تھی۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک فائر وہ ریچھ پر پہلے کر چکی تھی۔ دوسرا اس نے میرے سامنے کیا۔ لیکن اس سے پہلے میڈم کو شدید نقصان پہنچ چکا تھا۔ میں نے دیکھا میڈم کی گردن کے نیچے والے حصے اور کندھے کے اوپری حصے سے کافی سارا گوشت غائب تھا۔ خون تیزی سے نکل رہا تھا۔ یقیناً یہاں ریچھ کے بھاری پنجے نے کاری ضرب لگائی تھی۔ دو گولیاں کھا کر بھی ریچھ پر زیادہ اثر نہیں ہوا۔ اس نے میڈم پر جھپٹا مارا۔ کئی کلو وزنی تھپڑ میڈم کے چہرے پر پڑا۔ میڈم ایک جسیم اور دبنگ خاتون تھی لیکن کسی ہلکی پھلکی شے کی طرح اڑتی ہوئی دیوار سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھ سے پستول نکل کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

میں نے پہلو کی طرف سے جسیم ریچھ کی پسلیوں پر وار کیا... وہ تڑپ کر میری طرف متوجہ ہوا۔ حیوان اور انسان روبرو تھے۔ اس کے بالوں بھرے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں قاتل چمک تھی۔ وہ کسی بپھرے ہوئے پہلوان کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ مجھے اپنی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں۔ شاید یہ میری غیر معمولی قوت برداشت ہی تھی جس نے مجھے اس موقع پر زندہ رکھا۔ ریچھ کی تھوتھنی چھوٹی لیکن سر بہت بڑا ہوتا ہے۔ یہ بالوں بھرا متعفن سر مجھ سے فقط چند انچ کی دوری پر تھا۔ وہ شاید میری گردن نوچنا چاہ رہا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی قاتل تھوتھنی کو خود سے دور رکھا اور دائیں ہاتھ سے شکاری چاقو کا ایک اور وار اس کے پیٹ پر کیا۔ اس مرتبہ چاقو دستے تک اس کے اندر گیا۔ میں نے اسے واپس کھینچنے کی کوشش کی لیکن وہ نکلا نہیں۔ ریچھ نے ایک پھنکار کے ساتھ مجھے گھمایا۔ میں اڑتا ہوا ایک دیوار سے ٹکرایا۔ میڈم صفورا میرے قریب ہی گری ہوئی تھی۔ وہ بری طرح زخمی تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس نے انگلی کے اشارے سے مجھے دکھایا کہ اس کا پسٹل کہاں ہے۔ میں نے پسٹل پر جست لگائی اور گھوم کر اوپر تلے تین فائر موذی جانور پر کیے۔ ایک عین اس کی آنکھوں کے درمیان لگا اور وہ ایک دیوارگیر کھڑکی توڑتا ہوا اوندھے منہ گرا۔ مجھے باہر سے شدید ترین فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ ہر رائفل اور ہر آتشیں ہتھیار کا دہانہ کھل گیا ہے۔ ثروت سمیت دونوں لڑکیاں دوڑتی ہوئی کسی اور کمرے میں گھس گئیں۔ مجھے وہاں ایک رائفل پڑی نظر آگئی... میں نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور ابھی تک حرکت کرتے ہوئے ریچھ پر ایک برسٹ مار کر اسے ٹھنڈا کر دیا۔

اب میں باہر کی طرف لپکا۔ مجھے ریسٹ ہاؤس سے آگے اور جنڈ کی طرف ہر طرف دھواں ہی دھواں نظر آیا۔ یقیناً یہ وہی اسموک بم تھے جو عمران کے ساتھیوں نے پھینکے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں ایک درخت کی آڑ میں تھا۔ مجھ سے فقط آٹھ دس فٹ کے فاصلے پر قربان علی کھڑا تھا۔ پھر اس نے جھک کر اپنی پوزیشن بدلنے کی کوشش کی۔ گولیوں کی ایک باڑ آئی اور قربان علی کو چھلنی کر گئی۔ اس کی رائفل دور لڑھک گئی تھی۔ وہ ایک اچھی آٹھ ایم ایم رائفل تھی لیکن میں اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا تو شاید خود بھی قربان علی کے پاس پہنچ جاتا۔ میں نے دیکھا، صدیق اس بس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہے جس پر ہم یہاں پہنچے تھے۔ اس بس میں تین چار فالتو ٹائر موجود تھے جو ٹائروں کی جگہ لے چکے تھے۔ صدیق فائرنگ کی زد سے بچنے کے لیے نیچے جھک کر بیٹھا تھا۔ اس نے بس کو ٹرن کیا اور اندرونی کمروں کی طرف لایا۔ غالباً عمران کی ہدایت تھی کہ اندر موجود لڑکیوں کو ڈاکٹر مہناز سمیت سوار کرایا جائے اور آس پاس موجود شوٹرز کو بھی بٹھا لیا جائے۔ شاید وہ گھیرا توڑ کر نکلنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن ابھی بس احاطے کے آخری سرے تک ہی پہنچی تھی کہ اس کی باڈی میں کئی برسٹ لگے۔ غالباً اس کی فیول لائن کو نقصان پہنچا۔ اگلے پہیوں کے قریب سے شعلے نکلے اور دیکھتے ہی دیکھتے دروازے والا حصہ جلنا شروع ہوگیا۔

''صدیق... چھلانگ لگاؤ؟'' میں نے پکار کر کہا۔

صدیق نے چھلانگ لگائی مگر یہ موت کی چھلانگ ثابت ہوئی۔ دو گولیاں اس کے سینے سے پار ہوگئیں۔ گولیاں ریسٹ ہاؤس پر مینہ کی طرح برس رہی تھیں۔

جیلانی دھوئیں میں سے برآمد ہوا۔ اس نے جلتی ہوئی بس کو دیکھا اور تاسف سے بولا۔ ''بہت بُرا ہوا... بہت بُرا۔ اب نکلنا مشکل ہوگا۔'' اس دوران میں دھماکے سے پوری بس نے آگ پکڑ لی اور رہی سہی امید بھی ختم ہوگئی۔

ہم نے پلٹ کر پھاٹک کے پاس پوزیشنیں لے لیں اور فائرنگ شروع کر دی۔ قربان کا بے جان جسم میرے سامنے ہی پڑا تھا۔ لاش گولیوں سے چھلنی ہوچکی تھی۔ اس کی رائفل اب بھی ہماری دسترس سے دور تھی۔

''ایمونیشن دو۔'' جیلانی نے چلّا کر کہا۔

ایک شوٹر تین چار بھرے ہوئے میگزین لے کر آیا۔ وہ جھک کر دوڑتا ہوا ہم سے دس بارہ فٹ دور پہنچا تھا کہ اوندھے منہ گر گیا۔ کوئی گولی اسے چاٹ گئی تھی۔ بہرحال دو میگزین لڑھکتے ہوئے ہمارے پاس پہنچ گئے۔ دھوئیں میں سے ایک ریچھ برآمد ہوا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس کی ٹانگ خون آلود تھی۔ شاید زخمی ہو کر وہ مزید مشتعل ہوگیا تھا۔ اس کا وزن آٹھ دس من سے کم نہیں ہوگا۔ وہ ہمیں روند کر ہی گزر جاتا تو شاید ہم اٹھ نہ سکتے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ اس پر فائرنگ کی اور اسے ختم کر دیا۔

یہی وقت تھا جب ایک جیپ آندھی طوفان کی طرح دھوئیں کی چادر کو چیر کر ہماری طرف آئی۔ یہ وہی گرے جیپ تھی جو جاوا کے خاص استعمال میں ہوتی تھی۔ یہ خاصے بڑے سائز کی تھی اور اس کی نادر خصوصیات ہم دیکھ ہی چکے تھے۔ میں نے گن اس کی طرف سیدھی کی مگر اس پر فائر اثر نہیں کرتا تھا۔ فائر تو رہی دور کی بات، اس پر جگت کے ساتھیوں نے میرے سامنے کئی دستی بم پھینکے تھے۔ یہ واقعہ فرید کوٹ کے راستے میں رونما ہوا تھا۔ زوردار دھماکوں کے باوجود جیپ کو ذرا سا نقصان بھی نہیں پہنچا تھا۔

یکا یک مجھے اور جیلانی کو اندازہ ہوا کہ ہمیں جیپ پر فائر کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر

جاوا یا اس کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ خود عمران تھا۔ اس نے بریک لگائے اور آٹومیٹک دروازے کھول دیے۔ وہ ہمیں اندر بیٹھنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ نشستوں پر خون کے دھبے تھے۔ عمران اندرونی کمروں کی طرف بھاگا۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ اور جگت سنگھ لڑکیوں کو لیے ہوئے نمودار ہوئے۔ عمران نے گرے جیپ اس طرح کھڑی کی تھی کہ لڑکیوں کو زیادہ فاصلہ نہ طے کرنا پڑے۔ پھر بھی رسک تو موجود تھا۔ عمران کے علاوہ دو شوٹرز نے بھی لڑکیوں کو کور دیا ہوا تھا۔ وہ کبھی جھک کر چلتی اور کبھی گھٹنوں کے بل رینگتی گرے جیپ تک پہنچ گئیں۔ ثروت اور مہناز بھی شامل تھیں لیکن میڈم صفورا نظر نہیں آ رہی تھی۔

''میڈم صفورا؟'' جیلانی نے پوچھا۔

عمران نے نفی میں سر ہلا کر اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ ہم نے میڈم کو لڑکیوں کا نگہبان مقرر کیا تھا اور اس نے نگہبانی کا حق ادا کر دیا تھا۔ وہ آخری وقت تک شیرنی کی طرح حالات کے سامنے اور خوں خوار بھورے ریچھ کے سامنے ڈٹی رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے آخری بار دیکھوں لیکن اس کا موقع کہاں تھا۔ نصیر اور قربان علی کے چہرے دیکھنے کا بھی موقع نہیں تھا۔ ہمارے اردگرد لاشیں بچھی ہوئی تھیں۔ میں نے گرے جیپ اسٹارٹ کی تو وہ ہوئی نہیں۔ اندازہ ہوا کہ اس کے اندر کوئی آٹومیٹک سوئچ تھا جو آف ہو گیا ہے۔ قربان علی کا ایک ساتھی غالباً ایسے کام کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ وہ بونٹ اٹھا کر کوشش کرنے لگا۔

جیلانی نے پھاٹک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھیے جی... وہ لوگ پھنسے ہوئے ہیں۔''

ہم نے جیپ کی کھڑکیوں میں سے دیکھا۔ جیلانی درست کہہ رہا تھا۔ پھاٹک سے قریباً پچاس میٹر آگے ہمارے چار شوٹرز گھیرے میں تھے۔ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں وہاں کی مدھم جھلک نظر آ رہی تھی۔ یہ وہی چھوٹا سا ٹیلا تھا جہاں کچھ دیر پہلے ہم نے بھی پوزیشن لی تھی۔ ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ دو شوٹرز زخمی ہیں اور دو انہیں سہارا دے کر واپس ریسٹ ہاؤس کی طرف آنا چاہتے ہیں لیکن تابڑتوڑ گولیوں میں یہ ممکن نہیں تھا۔ ان چاروں کی جان کسی بھی وقت جا سکتی تھی۔ انہیں مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں فیصلہ ہوا۔ ایسے دیوانے فیصلے ہم پہلے بھی کرتے رہے تھے۔ جب ہم دونوں کے کندھے آپس میں چھوتے تھے اور نگاہیں اپنے ہدف پر جمتی تھیں... اور سانسوں کی لَے تیز ہوتی تھی... اور سینے میں دھڑکن کا نقارہ بجتا تھا تو وہ لازوال فقرہ ایک بازگشت کی طرح ہمارے کانوں میں گونجنے لگتا تھا... جب ڈرنا ہے تو مرنا ہے اور جب مرنا ہے تو ڈرنا کیا...

... ہاں موت تو ایک ہی بار آنی ہوتی ہے۔ جان نے تو ایک ہی بار نکلنا ہوتا ہے اور ہم اس فلسفے کو بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ عمران نے جیلانی سے کہا۔ ''یا شیخ! تم ادھر کا دھیان رکھو۔ ہم انہیں نکال کر لاتے ہیں۔''

جیلانی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ہمارے سامنے بولنے کی ہمت اسے نہیں ہوئی۔ ثروت کا چہرہ بھی خوف سے زرد تھا۔ یہ بڑی خطرناک کوشش تھی لیکن یہ بھی طے تھا کہ ہم اپنے ان چار شوٹرز کو یہاں موت کے منہ میں چھوڑ کر فرار نہیں ہوں گے۔

رائفلیں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ ہم ایک ساتھ جھک کر بھاگے اور گولیوں کی بارش میں ٹیلے کی طرف لپکے۔ موت کی طرف لپکنے کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے۔ جان کو ہتھیلی پر رکھنے کی اپنی ایک ترنگ ہوتی ہے۔ ایک گولی میرے سر کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ ایک عمران کے بازو میں لگی۔ میں نے گولی کے گوشت میں گھسنے کی آواز صاف سنی۔ وہ ایسے زخموں کی پروا کرنے والا نہیں تھا۔ ہم ٹیلے کے عقب میں اپنے ساتھیوں کے پاس اوندھے منہ گر گئے۔

ہماری کمک نے ان کے حوصلے جوان کر دیے۔ ایک شخص عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''سر! یہ دونوں زخمی ہیں۔ آپ ان کو پیچھے لے جانے کی کوشش کریں، ہم انہیں روکتے ہیں۔''

''نہیں... تم انہیں پیچھے لے جاؤ۔ ہم روکتے ہیں۔'' عمران نے حکم دیا۔

شوٹر کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ عمران کی بات مانتا۔ تب ہم نے دیکھا کہ زخمی ہونے والے دونوں ''شوٹرز'' نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک ماسٹر جواہر تھا۔ اس کی ٹانگ میں ران کے اوپری حصے پر گولی لگی تھی۔ زخم کاری تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے کراہ رہا تھا۔ دوسرا شخص بے ہوش تھا۔ عمران کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے دونوں شوٹرز نے دونوں زخمی ساتھیوں کو دھیرے دھیرے پیچھے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ وہ حتی الامکان خود کو زمین سے قریب رکھ رہے تھے تاکہ گولیوں کی زد سے بچ سکیں۔ میں اور عمران ڈٹ کر فائرنگ کا جواب دینے لگے۔ انڈین سپاہی تین اطراف سے اس چھوٹے سے ٹیلے کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی ایک طرف کی کوشش تو اس فائرنگ کی وجہ سے ناکام ہو رہی تھی جو جیلانی اور جگت سنگھ وغیرہ بلٹ پروف گرے جیپ کے اندر سے کر رہے تھے۔ مگر باقی دو طرف سے انہیں سخت مزاحمت دیے جانے کی ضرورت تھی۔

یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہم اپنی پوری فائر پاور استعمال کرنے لگے تاکہ دونوں زخمی اور دونوں شوٹرز ''ریٹریٹ'' کرتے ہوئے ریسٹ ہاؤس تک پہنچ جائیں اور جیپ میں سوار ہو جائیں۔ بعد میں ہم بھی یہ مورچا چھوڑ کر جیپ کی طرف دوڑ لگا سکتے تھے۔ لیکن انڈین سپاہی قریب آتے جا رہے تھے۔ اور پھر وہی ہوا جس کا خطرہ تھا۔ قریباً بیس میٹر پیچھے سے ایک شوٹر کی چلّاتی ہوئی آواز آئی۔ ''سر! عباس کو گولی لگ گئی ہے۔''

عمران نے دانت پیس کر منہ ہی منہ میں کچھ کہا۔ وہ رشین AEK999 چلا رہا تھا۔ وہ اس مورچے میں پہلے سے ہی موجود تھی۔ اس میں میگزین کی جگہ گولیوں کے طویل اسٹرپس استعمال ہو رہے تھے۔ بھرپور حملہ روکنے کے لیے ایسی گنز مفید ثابت ہوتی ہیں۔ عمران نے کہا۔ ''تابی! تم جاؤ، ان کی مدد کرو۔ میں یہاں روکتا ہوں انہیں۔''

''نہیں عمران! تم ہر جگہ حکم چلاتے ہو۔ تم جاؤ، میں روکتا ہوں۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''یار! میرا بازو زخمی ہے۔ میں کھینچ نہیں سکوں گا انہیں۔'' اس کا اشارہ زخمیوں کی طرف تھا۔

اس کی دلیل میں وزن تھا۔ ایسی وزنی دلیلیں ہر وقت اس کے پاس موجود رہتی تھیں۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ وہ یہ جگہ چھوڑنے پر تیار ہو جائے لیکن ناکامی ہوئی۔

میں پیٹ کے بل رینگتا ہوا واپس آیا۔ شوٹر عباس کے سر کا ایک حصہ اڑ چکا تھا۔ مغز بکھرا پڑا تھا۔ میں نے دوسرے شوٹر کی مدد کی اور دونوں زخمیوں کو دھیرے دھیرے پھاٹک کی طرف کھینچنا شروع کیا۔ ماسٹر جواہر تو خود بھی تھوڑا بہت آسرا کر رہا تھا مگر دوسرا ساتھی مکمل بے ہوش تھا۔ اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ ہم ٹیلے کے بالکل آڑ میں تھے اور ٹیلے پر عمران نے مورچا سنبھالا ہوا تھا۔ وہ ہمیں پورا کور دے رہا تھا۔ ہم دونوں زخمیوں کو ریتلی زمین پر کھینچتے ہوئے پھاٹک تک لے گئے۔ گرے جیپ کی عقبی لائٹس روشن تھیں لیکن وہ ابھی تک اسٹارٹ نہیں ہوئی تھی۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور عمران کی طرف دیکھا۔ پچاس ساٹھ میٹر دور وہ کسی چٹان کی طرح ڈٹا

ہوا تھا۔ انڈین سپاہی ٹیلے پر چڑھنے اور اسے پکڑنے میں ناکام تھے۔ پھر میں نے دیکھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا... ہر خطرے کو بالائے طاق رکھ کر... جیسے جنگلی کتوں میں گھرا ہوا شیر ہو۔ اس کی للکار دل ہلا دینے والی تھی۔ پچاس ساٹھ میٹر کی دوری سے بھی اس کی گونج میرے کانوں میں محسوس ہوئی۔ اس نے گن کو اس کے اسٹینڈ سے اٹھا لیا تھا اور تین اطراف میں حرکت دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے مثال جارحیت تھی۔ چاروں طرف دھماکے اور شعلے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں واپس اس کی طرف لپکتا، میں نے دیکھا کہ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا ہے۔ وہ اپنی نہایت مؤثر فائرنگ سے انڈین سپاہیوں کو تتر بتر... بلکہ شاید دہشت زدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میں اور میرا ساتھی شوٹر بھی ریسٹ ہاؤس کے پھاٹک سے تھوڑا آگے چلے گئے۔ ہم نے عمران کو بھرپور کور دیا لیکن ہمارے کور سے زیادہ عمران کی اپنی فائرنگ کارگر تھی۔ قریباً ایک منٹ کے اندر وہ پھاٹک کی آڑ میں ہمارے ساتھ تھا۔ یہی وقت تھا جب گرے جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی فرحت بخش آواز ہمارے کانوں میں آئی۔ قربان کا ساتھی اس کے انجن کو پھر سے حرکت میں لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

''تابی! تم جیپ ڈرائیو کرو۔'' عمران نے پکار کر کہا۔

ہم فائرنگ کرتے ہوئے الٹے قدموں جیپ کی طرف بڑھے۔ سب سے پہلے دونوں زخمی جیپ میں گئے۔ پھر جیلانی... پھر میں... عمران اب بھی باہر تھا اور وزنی گن کو اسٹینڈ سمیت اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے ایک آخری برسٹ چلایا اور جیپ میں آ گیا۔ دروازے بند ہو گئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

یہ آٹومیٹک اور جدید ترین گاڑی تھی۔ کلچ دبانے اور گیئر لگانے کی ضرورت سے بے نیاز۔ میں نے ریس دی۔ وہ بڑی طاقت سے آگے بڑھی۔ ہمیں ریسٹ ہاؤس کی عقبی جانب سے نکلنا تھا۔ یہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ چھ فٹ اونچی ایک خستہ حال دیوار تھی جس کے بالائی کنارے سے تعویذوں کی پوٹلیاں سی لٹک رہی تھیں۔ گاڑیاں دیواروں میں سے نہیں گزر سکتیں مگر یہ مختلف گاڑی تھی۔ انڈیا کا نامی گرامی ڈان اس کا مالک تھا۔ اس نے اسے اپنے لیے محفوظ ترین بنا رکھا تھا۔ یہ بلٹ پروف تھی اور بارودی دھماکے بھی اس پر اثر نہیں کرتے تھے اور اب یہ ہمارے ہاتھ میں تھی۔ میری ہدایت پر سب نے خود کو زوردار شاک کے لیے تیار کر لیا۔ قریباً چالیس کلومیٹر کی رفتار سے جیپ اور چار دیواری کا

تصادم ہوا۔ ہم راستہ بناتے ہوئے آگے نکلتے چلے گئے۔ ہیوی جیپ نے دیوار توڑ ڈالی تھی۔

یہ سڑک نہیں تھی۔ کھلا میدان تھا اور جھاڑ جھنکاڑ بھی تھا۔ ہمارا رخ مغرب کی طرف تھا۔ مغرب جہاں سرحد تھی۔ جہاں پاکستان کی مٹی تھی۔ جہاں مادرِ وطن کی آغوش تھی۔ ہم اس کے بیٹے تھے اور ہمارے جسموں پر خون کے چھینٹے تھے۔ ہم نے اپنے دشمنوں کو ایک نہایت کاری ضرب لگا کر ان کا گھیرا توڑا تھا اور اب اپنی مٹی کی طرف جا رہے تھے۔

یہ ہمارے دشمنوں کے لیے بہت بڑی شکست تھی اور وہ اسے ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے پاس موقع تھا کہ وہ بارڈر تک پہنچنے سے پہلے پہلے ہمیں روک لیں۔ ہمیں اور ہماری عورتوں کو اپنے انتقام کے شکنجے میں جکڑیں اور ان جسموں سے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑیں جنہوں نے ممبئی سے بھڑوچ تک اور سائل پور سے ریسٹ ہاؤس تک ان کی اَن گنت لاشیں بچھائی تھیں۔ وہ خاص طور سے عمران کو اپنی گرفت میں لانا چاہتے تھے۔ اسے اس کے ''جرائم'' کی پاداش میں مثالِ عبرت بنانا چاہتے تھے۔

وہ آندھی اور طوفان کی طرح ہمارے پیچھے آئے۔ درجنوں ہیڈ لائٹس تھیں جو اچھلتی کودتی ہماری طرف بڑھ رہی تھیں۔ دائیں بائیں بھی بہت سی متحرک روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ لوگ ہم پر فائر بھی کر رہے تھے لیکن اب ہماری خوش قسمتی یہ تھی کہ ہم ایک محفوظ گاڑی پر سوار تھے۔ قدرت نے دشمن کا سارا انتظام اسی پر الٹ دیا تھا۔ انڈرورلڈ کے سپر اسٹار جاوا نے نہ جانے کتنے ملین بلین خرچ کر کے اپنے لیے یہ نادر روزگار گاڑی بنوائی تھی اور یہ اب ہمارے استعمال میں تھی۔ یہ عمران کے پاس کیسے اور کیونکر پہنچی، یہ ابھی مجھے معلوم نہیں تھا مگر لگتا تھا کہ جب ریچھوں کی وجہ سے گھیرا ڈالنے والوں میں افراتفری پھیلی اور گاڑیوں کو لگنے والی آگ نے اس افراتفری کو بڑھایا تو عمران اور اس کے ساتھیوں نے اپنے مورچے چھوڑ کر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے دھوئیں والے گیس بم پھینکے تھے۔ یقیناً انہی لمحوں میں عمران نے اس گاڑی کو ٹارگٹ بنایا تھا یا ممکن تھا کہ وہ خود ہی اس کے نشانے پر آ گئی ہو۔ اس لگژری گاڑی کی نشستوں پر خون کے دھبے موجود تھے۔ پتا نہیں یہ کس کا خون تھا؟

میں نے مڑ کر دیکھا۔ عمران اس دیوہیکل جیپ کی درمیانی نشستوں پر موجود تھا... اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ ڈاکٹر مہناز لرزتے ہاتھوں سے پٹی باندھ کر اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں پاکستانی لڑکیاں ذہنی طور پر عمران کو اور مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھتی تھیں۔ خاص طور پر عمران پر تو وہ دونوں والہانہ یقین کرنے لگی تھیں۔ وہ دونوں اب بھی عمران کے دائیں بائیں موجود تھیں۔ آنکھیں بند کیے سسک رہی تھیں۔ عمران نے انہیں اپنے ساتھ لگایا ہوا اور تسلی بخش انداز میں تھپک رہا تھا۔ ان لمحوں میں وہ اپنی اور اپنے چلبلے پن سے کہیں آگے اور جدا نظر آ رہا تھا۔ جیسے خود ''پاکستان'' تھا اور ان لڑکیوں کو پناہ دے رہا تھا۔

''گولی اندر ہی ہے؟'' میں نے ڈاکٹر مہناز سے پوچھا۔

''ہاں... لیکن تقریباً آر پار ہے۔ تھوڑا سا چیرا دے کر نکالی جاسکے گی۔''

ظاہر ہے کہ یہ کام گاڑی رکنے کے بعد ہی ہو سکتا تھا۔ فی الحال ہمارے پیچھے بلا کی رفتار سے موت لپک رہی تھی۔ گاہے بگاہے گولیاں جیپ کی باڈی اور کھڑکیوں سے ٹکراتیں اور چنگاریاں چھوڑتی تھیں۔ جگت سنگھ کی آنکھوں میں شعلے تھے۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ وہ سن روف سے چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ غالباً چاہتا تھا کہ چھت کے چوکور خلا میں سے باہر نکل کر جوابی فائرنگ کرے۔ میں نے کہا۔ ''جگت سنگھ! بیٹھے رہو۔ کوئی ضرورت نہیں، ان کی فائرنگ سے کچھ نہیں بگڑ رہا ہمارا۔''

''پر بادشاہ زادے! یہ ٹائر پھاڑ دیں گے۔''

''نہیں پھٹیں گے ٹائر بھی۔'' عمران نے کہا۔

چند منٹ کی زبردست اچھل کود کے بعد ہم پختہ سڑک پر آ گئے۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی لیکن ہموار تھی۔ میں تیس ہارس پاور کی اس طاقتور جیپ کا ایکسلریٹر دباتا چلا گیا۔ وہ کمان سے نکلا ہوا تیر بن گئی۔ عقب میں آنے والی ان گنت گاڑیاں بدستور ہمارے پیچھے تھیں لیکن اب ہمیں ایک فائدہ تھا۔ اب ہم سڑک پر تھے۔ وہ ہمارے دائیں بائیں سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھیں۔ صرف پیچھے آ سکتی تھیں۔ گولیوں کی بوچھاڑ گاہے بگاہے گاڑی کے عقبی حصے سے ٹکراتی تھی۔ یہ سارا بارڈر ایریا تھا۔

''شاید چیک پوسٹ ہے آگے۔'' میں نے کہا۔

''راستہ بھی بلاک ہے۔'' جیلانی نے کہا۔

ایک فوجی جیپ سڑک پر آڑی کھڑی تھی۔ میں نے رفتار کم کرنے کے بجائے کچھ بڑھا دی۔ جیپ نے پہلے چیک پوسٹ کا بانس توڑا۔ پھر فوجی جیپ کے بونٹ کو ٹکر مار کر اسے ایک طرف لڑھکایا پھر ایک موٹر سائیکل کو روندتی ہوئی نکل گئی۔ ہم پر فائر بھی ہوئے لیکن یہ بے اثر تھے۔

اب صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ درختوں کے ہیولے اور زمین کے نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ ہوا چل رہی تھی۔ وہ بند گاڑی میں ہم سے ٹکرا نہیں رہی تھی لیکن یہ سوچنا بھی خوش گوار تھا کہ یہ پاکستان سے آنے والی ہوا ہے۔

میں نے ایک بار پھر عقب نما آئینے میں عمران کو دیکھا۔ اس نے آخر میں ناقابلِ بیان معرکہ لڑا تھا۔ ٹیلے کے عقب میں تقریباً پانچ منٹ تک اس نے تن تنہا انڈین فوجیوں اور جاوا کے خطرناک گرگوں کو روکا تھا۔ میں نے وہ ہر منظر دیکھا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب لگا تھا کہ وہ لوگ ٹیلے پر آجائیں گے اور عمران کو پکڑ لیں گے۔ مگر اسی وقت عمران کی شدید مزاحمت نے ان کے قدم روک دیے تھے اور یہی وجہ تھی کہ ہم بھی صحیح سلامت جیپ تک پہنچ پائے تھے۔

عمران نے فاخرہ نامی لڑکی کو اب بھی اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ اس کی چھاتی پر سر رکھے بند آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ ذرا مختلف لگا۔ عمران نے اس طرح اسے اپنے ساتھ کیوں لگا رکھا تھا؟ صرف وہی تو خوف زدہ نہیں تھی۔ سب ڈری ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر مہناز کے ہونٹ بھی بالکل خشک ہو رہے تھے۔ ہم نے ایک چیک پوسٹ تو پار کر لی تھی۔ آگے کیا کیا ہونا ہے، اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔

یکایک میں نے ڈاکٹر مہناز کو چونکتے دیکھا۔ عمران کے بازو کی پٹی کرنے کے بعد وہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

''یہ بلڈ کہاں سے آ رہا ہے؟'' مہناز نے تیزی سے پوچھا۔

تب وہ آگے جھک کر دیکھنے لگی۔ اس نے فاخرہ نامی لڑکی کو پیچھے ہٹایا۔ ''اوہ گاڈ!'' اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

جیلانی اور جگت سنگھ بھی عمران کی طرف جھک گئے۔ میں نے گاڑی ڈرائیو کرتے کرتے عقب نما آئینے میں دیکھا اور لرز گیا۔ عمران کے سینے پر گولی کا ایک بڑا زخم تھا۔ خون سے اس کی قمیص سرخ ہو رہی تھی۔ غالباً اسی زخم کو چھپانے کے لیے اس نے فاخرہ کو مسلسل اپنے ساتھ لگایا ہوا تھا۔

مہناز نے قینچی سے عمران کی قمیص کاٹی اور اس پر جھک گئی۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہ بڑے ''کیلیبر'' کی گولی تھی۔ تھوڑا دائیں جانب لگی تھی مگر پتا نہیں اس نے اندر سے کیا کیا زخمی کیا تھا۔

عمران نے مجھے عقب نما میں گھورتے ہوئے پایا تو زخمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''گھبراؤ نہیں جگر! میں اتنی جلدی مرنے والا نہیں اور وہ بھی صرف ایک گولی سے۔ بس ذرا فٹافٹ پاکستان پہنچا دو۔''

میں نے رفتار کچھ اور بڑھا دی۔ اب روشنی پوری طرح پھیل گئی تھی۔ میں ڈاکٹر مہناز سے مسلسل عمران کے زخم کی نوعیت پوچھ رہا تھا۔ وہ بس ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی اور پورے انہماک سے عمران پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے عمران کے چہرے پر کرب کے ہلکے سے آثار دیکھے۔

جیلانی مسلسل پچھلی اسکرین سے عقب میں آنے والی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ٹیلی اسکوپ اس کی آنکھوں سے لگی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ایک بڑی فوجی گاڑی سب سے آگے ہے۔ اس پر لانچنگ سسٹم ہے۔ میرے خیال میں دو بڑے راکٹ ہیں... نہیں تین بڑے راکٹ ہیں۔''

''اوہ، یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' عمران کے لہجے میں تشویش تھی۔

''لیکن یہ جیپ بم پروف ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہے مگر اتنی رفتار سے چلتی ہوئی گاڑی راکٹ لگنے سے الٹ جائے گی اور شاید وہ یہی چاہتے ہیں۔''

''بارڈر کتنی دور رہ گیا ہے اندازاً؟'' جیلانی نے پوچھا۔

''قریباً تین کلومیٹر۔'' عمران نے جواب دیا۔ آواز میں تکلیف کا عنصر تھا۔

جیلانی نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائے رکھی۔ وہ بولا۔ ''مجھے لانچرز کے آس پاس حرکت نظر آ رہی ہے جی۔ لگتا ہے وہ لوگ کچھ کرنے والے ہیں۔''

عمران نے ڈاکٹر مہناز کو پیچھے ہٹایا اور گھوم کر عقب میں دیکھا۔ میں اندر تک کانپ گیا۔ عقب نما آئینے میں مجھے جو کچھ نظر آیا، وہ میرا دل خون کرنے کے لیے کافی تھا۔ سینے پر لگنے والی گولی شاید عمران کی کمر کی طرف سے نکل گئی تھی۔ دونوں کندھوں کے قریباً درمیان زخم دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ لوہے کا انسان تھا۔ جب کچھ کرنے پر آتا تھا تو کر گزرتا تھا۔ اپنے زخم کی پروا کیے بغیر وہ پورا گھوما۔ اس نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائی اور سپاٹ آواز میں بولا۔ ''وہ جان بوجھ کر فاصلہ رکھے ہوئے ہیں تاکہ ہم عام ہتھیاروں سے انہیں نقصان نہ پہنچا سکیں۔''

''ظاہر ہے، ان کے راکٹ کی REACH تو ہم تک ہے۔'' جیلانی نے کہا۔

عمران کچھ دیر چپ رہنے کے بعد جیلانی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''شیخ! مجھے اسنیپر گن دو۔''

''کیا کریں گے اس سے؟''

''یار گن دو۔'' وہ اٹل انداز میں بولا۔

جیلانی نے ایک نشست کے نیچے سے گن نکال کر عمران کے حوالے کر دی۔

''کیا کرو گے اس سے؟'' میں نے ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔

''گن کا کیا کرتے ہیں؟'' وہ اس کا سیفٹی کیچ ہٹاتے ہوئے بولا۔

''لیکن اس کے راؤنڈ نہیں ہیں۔''

عمران نے سنی ان سنی کرتے ہوئے جیلانی کو اشارہ کیا۔ جیلانی نے ایک کھٹکا دبا کر ایک لیور کھینچا اور سن روف کھل گیا۔ یہ قریباً دو فٹ مربع کا خلا تھا۔ تیز ہوا اندر آنے لگی۔ ہمارے لباس پھڑپھڑانے لگے۔ میں نے دیکھا، ثروت کے بال اڑ اڑ کر اس کے زرد چہرے کو ڈھانپ رہے ہیں۔

عمران نے گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے خالی اسنیپر کندھے سے لگائی اور اس کی طاقتور ٹیلی اسکوپ میں سے پیچھے کا منظر دیکھا۔ گاڑی کم و بیش سو کلومیٹر کی رفتار سے جا رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ پیچھے والی گاڑیوں کی رفتار بھی یہی تھی۔

''میں اس لانچر والی گاڑی پر ایک فائر کرنا چاہ رہا ہوں۔'' عمران نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

میں نے جھلا کر کہا۔ ''گولی کے بغیر فائر کرنے کا کون سا طریقہ ایجاد کیا ہے تم نے؟''

''ایک گولی ہے میرے پاس۔'' اس نے انکشاف کیا اور اپنی کاٹرائے کی پتلون کا پائنچا اٹھا کر جراب کے اندر سے اسنیپر گن کی گولی نکال لی۔

میں حیران رہ گیا۔ ایک دم ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ جب احمد آباد سے آگے چلتی بس میں جاوا کے لوگ بی ایس ایف کے ساتھ مل کر ہمارا تعاقب کر رہے تھے تو اسی طاقتور اسنیپر کی مدد سے ہم نے انہیں بس سے دور رکھا ہوا تھا۔ آخری مرحلے میں گن مین کو اسنیپر کی ایک گولی نہیں ملی تھی۔ خیال تھا کہ وہ فائر ہو گئی ہے یا شاید نشستوں کے نیچے کہیں لڑھک گئی ہے۔ اب وہی چمکتی ہوئی گولی عمران کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اکثر اس طرح کی حرکات کرتا تھا اور کبھی کبھی ایسی حرکات حیرت انگیز طور پر سود مند ثابت ہوتی تھیں۔

''میں نے اس وقت یہ ایک گولی سنبھال لی تھی ورنہ اس نے بھی چل ہی جانا تھا۔ اب ہو سکتا ہے کام آ جائے۔'' وہ سپاٹ آواز میں بولا اور قریباً چار انچ لمبی گولی کو گن میں ایڈجسٹ کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ سن روف کے خلا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اس میں کھڑا ہو کر فائر کرنا چاہتا تھا شاید۔

ڈاکٹر مہناز کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ اس نے عمران کے زخم کی نوعیت دیکھ لی تھی۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ جگت سنگھ، جیلانی، قربان کے ساتھی شوٹرز سب پریشان تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''پلیز عمران صاحب! آپ کچھ نہ کریں، آپ کا خون تیزی سے نکلنے لگا ہے۔''

ساتھ ہی ڈاکٹر مہناز نے جگت سنگھ اور جیلانی وغیرہ کو اشارہ کیا کہ وہ عمران کو کوئی بھی حرکت کرنے سے روکیں۔ جگت اور جیلانی نے کوشش کی لیکن عمران نے انہیں بُری طرح جھڑک کر روک دیا۔ میں نے پہلی بار اسے اس طرح اپنا تحمل کھوتے ہوئے دیکھا تھا۔ خون بہنے کی رفتار واقعی تیز ہو گئی تھی۔ وہ پوری نشست کو بھگو رہا تھا۔

''شیخ! مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔'' عمران نے کہا۔

جیلانی نے سوالیہ نظروں سے مہناز کی طرف دیکھا۔

''یہ میرا حکم ہے شیخ! مجھے اٹھاؤ۔ میں فائر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے سہارا دو۔ جلدی کرو۔'' وہ تحکم سے بولا۔

اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ اس کا دیرینہ ساتھی جانتا تھا کہ اسے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ جیلانی اور جگت نے مل کر عمران کو سہارا دیا۔ اس نے اپنا ایک گھٹنا نشست کے ہتھے پر ٹکایا اور اپنا بالائی دھڑ سن روف کے چوکور خلا میں سے باہر نکال دیا۔ میں ایک سائڈ مرر سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس آٹومیٹک سائڈ مرر کو ایڈجسٹ کیا۔ اب جیپ کی چھت نظر آ رہی تھی۔ عمران کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس نے طاقتور اسنیپر گن کو چھت پر رکھ کر اس کا دستہ اپنے کندھے سے لگا رکھا تھا۔ وہ ٹیلی اسکوپ میں دیکھ کر نشانہ لے رہا تھا۔ وہ بلا کا نشانے باز تھا۔ میں نے اسے سرکس میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر درست نشانہ لگاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ لیکن یہاں معاملہ اور تھا۔ وہ ایک تیز رفتار گاڑی پر سوار تھا اور وہ جس ہدف کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا، وہ بھی متحرک تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کے پاس صرف ایک موقع تھا۔ اس دور مار رائفل کا صرف ایک راؤنڈ۔ اگلے آٹھ دس سیکنڈ میں اگر یہ راؤنڈ درست فائر ہو جاتا تو ہم ایک بھیانک خطرے سے بچ سکتے تھے۔

دفعتاً میں نے دیکھا کہ ہماری تیز رفتار جیپ کے سامنے ذرا دائیں جانب دس پندرہ فٹ کی دوری پہ چمک کے ساتھ زوردار دھماکا ہوا۔ ایک اونچے قد کی خودرو جھاڑی

اپنی جڑوں سے اکھڑ کر فضا میں بلند ہوئی۔ اس جھاڑی کے ساتھ شاید کئی من مٹی بھی اچھلی ہو گی۔ جیپ جیسے لہرا کر رہ گئی۔ میں نے اسے بمشکل سڑک پر رکھا۔ جیپ کے اندر لڑکیاں بُری طرح چلائیں۔ جیپ کے اچانک لہراؤ کے سبب جیلانی نشستوں کے درمیان گرا۔

یہ راکٹ فائر ہوا تھا۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگلا نشانہ سیدھا جیپ پر لگ سکتا تھا۔ یہ اب منٹوں کا نہیں، سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ میں نے سائڈ مرر میں دیکھا۔ عمران بدستور نشانہ لے رہا تھا۔ ان لمحوں میں اس کا جسم بالکل ساکت ہو گیا تھا جیسے وہ پتھر کا مجسمہ ہو۔ یہ نشانہ درست لگتا تو اس کی زندگی کا یادگار نشانہ ہوتا اور اگر خطا ہو جاتا تو پھر شاید زندگی ہی نہ رہتی، اس کی نہ ہماری۔ میرے اندازے کے مطابق وہ گاڑی کے ڈرائیور کو نشانہ بنا رہا تھا۔

... صرف ایک موقع تھا، صرف چند سیکنڈ تھے... ایک بہترین نشانے باز تھا اور ایک مشکل ترین ہدف تھا... کسی بھی وقت دوسرا راکٹ ہماری اس بلٹ پروف جیپ سے ٹکرا سکتا تھا اور اسے درجنوں قلابازیاں دے سکتا تھا۔ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اب چند سو میٹر کے فاصلے پر مجھے بارڈر کے آثار نظر آ رہے تھے۔ دو جھنڈے لہرا رہے تھے۔ ان میں سے ایک جھنڈا یقیناً میرا سبز ہلالی پرچم تھا۔ مجھے اس جھنڈے تک پہنچنا تھا۔ میری خواہش تھی کہ اگر ہم مریں تو اس جھنڈے کے سائے میں مریں۔ ہمارا خون ہماری مٹی میں جذب ہو۔ اور ان لمحوں میں مجھے لگا کہ اس بارڈر کے پار ایک ماں کی آغوش ہے۔ مادرِ وطن کی آغوش۔ ہم اس تک پہنچنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہمیں چھپا لے... ہمارے زخمی جسموں کو ڈھانپ لے اور ہماری سرخروئی پر فخر سے ہماری پیشانیاں چوم لے۔

اور زخمی عمران نشانہ لے رہا تھا۔ ہوا عقب سے آ رہی تھی اور اس کے بال آگے کی طرف اڑ رہے تھے... پھر اس نے ٹریگر دبایا۔ وہ بلا کا نشانے باز تھا... لیکن... وہ قسمت کا دھنی بھی تھا۔ بخت کا فرشتہ بھی تو اس کے سر پر سایہ فگن رہتا تھا۔ اس کی بانٹی ہوئی محبتیں اور چاہتیں مشکل میں اس کے لیے ایک نورانی توانائی بن جاتی تھیں۔ میں دیکھ نہیں سکا لیکن جیلانی اور جگت سنگھ نے ٹیلی اسکوپس آنکھوں سے لگا رکھی تھیں۔ ''ویل ڈن... ویل ڈن۔'' جیلانی کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

عقب میں کسی خوفناک دھماکے کی آواز آئی اور بہت فاصلے پر کچھ شعلے سے چمکتے دکھائی دیے۔

''کیا ہوا جیلانی؟'' میں نے پکار کر پوچھا۔

جیلانی سے پہلے ہی جگت بولا۔ ''الٹ گیا جی لانچر... آگ لگ گئی۔ پچھلی ایک گڈی بھی وجی (ٹکرائی) ہے اس میں۔ وہ بھی درختوں میں وڑ گئی۔ آگ لگ گئی ہے اسے بھی۔ دوسری گڈیاں کچے میں اتر کر آگے آ رہی ہیں... پر اب وہ دور ہیں...'' وہ رواں تبصرے کے انداز میں بول رہا تھا۔ آواز جوش سے کانپ رہی تھی۔

عمران نڈھال سا ہو کر واپس اپنی نشست پر ڈھے گیا۔ کرب کے ساتھ اس کے چہرے پر ایک اطمینان سا بھی تھا۔ خون سے اس کی شرٹ اور کاٹرائے کی براؤن پینٹ سرخ تھی۔ جیلانی نے سن روف کا خلا بند کر دیا۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ کر عمران کے پاس پہنچوں اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لوں۔ میں نے اسٹیئرنگ تھام رکھا تھا اور میری نظریں سڑک پر مرکوز تھیں۔ مجھے آخری تین چار سو گز کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ اور یہ کوئی عام فاصلہ نہیں تھا۔ یہ بھی موت کا گھیرا تھا۔ بارڈر پر موجود بی ایس ایف اہلکار جان چکے تھے کہ جو گرے جیپ تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہی ہے اسے روکنا ہے۔ ہر قیمت پر روکنا ہے لیکن اس جیپ کو روکنے کے لیے ان کے پاس پوری تیاری نہیں تھی۔ ان کے پاس چھوٹی بڑی گنیں تھیں اور وہ انہیں مسلسل چلا رہے تھے۔ گرے جیپ کی باڈی اور اسکرینز پر مسلسل چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں اور شدید تھرتھراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ جب کوئی بڑا برسٹ لگتا تھا تو دیوہیکل جیپ جیسے لہرا سی جاتی تھی۔

میں رفتار بڑھاتا جا رہا تھا۔ سامنے چیک پوسٹ کا ترنگا نظر آ رہا تھا۔ انڈین فوجی بھاگ بھاگ کر ریت کی بوریوں کے پیچھے پوزیشنیں لے رہے تھے۔ انہوں نے لوہے کے بڑے بڑے، دو پھاٹک بند کر دیے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ جیپ ان مضبوط پھاٹکوں کو توڑ سکے گی یا نہیں اور ٹکرانے کے بعد میں اسے سنبھال پاؤں گا یا نہیں... مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اگر ان آخری دو تین سو میٹرز میں کوئی راکٹ یا آرٹلری کا گولہ گاڑی سے آ ٹکرایا تو وہ ہمارا تحفظ کر سکے گی یا نہیں... یا اپنے پہیوں پر رہ سکے گی یا نہیں۔ میں بس اسے بھگاتا جا رہا تھا۔ اب جو کچھ کرنا تھا، مجھے ہی کرنا تھا۔

لوہے کے گیٹ پچاس ساٹھ میٹر دور رہ گئے تھے تو میں نے اچانک فیصلہ بدلا اور جیپ کو سڑک سے اتار دیا۔ اتنی رفتار سے دوڑتی جیپ کو ناہموار جگہ پر سنبھال کر رکھنا آسان

نہیں تھا۔ میں نے اپنی پوری صلاحیت صرف کر دی۔ جیپ کے اندر فاخرہ، مہناز اور ثروت وغیرہ کی آوازوں نے کہرام سا مچا دیا۔ ہر آن یہی لگا کہ جیپ الٹ جائے گی۔ کئی مواقع پر وہ کئی کئی فٹ زمین سے اچھلی۔ اب سامنے پھاٹک نہیں تھے۔ خاردار باڑ تھی، تارکول کے ڈرم وغیرہ تھے اور مسلح سنتری تھے۔ عقب میں بی ایس ایف اور جاوا کی گاڑیاں تھیں اور بے رحم فائرنگ تھی... پھر فیصلے کا لمحہ آیا۔ جیپ گولی کی رفتار سے خاردار باڑ اور دیگر رکاوٹوں سے ٹکرائی۔ ان کے پرخچے اڑاتی ہوئی وہ پار ہوئی اور قریباً چالیس پچاس میٹر کے "نومین لینڈ" کو پار کر کے پاکستانی علاقے میں داخل ہو گئی۔

ہمارے پاکستانی علاقے میں داخل ہونے سے پہلے ہی پاکستانی پوسٹ کی طرف سے کراس فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ یہ فائرنگ ہم پر نہیں بلکہ انڈین فوجیوں پر ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ بھارتیوں کی طرف سے جو فائر آ رہا تھا، وہ پاکستانی علاقے کی طرف آ رہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، پاکستانی فوجیوں کو خاص ذرائع سے یہ اطلاع بھی ہو چکی تھی کہ گرے جیپ میں اپنے لوگ آ رہے ہیں۔

دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر چمک رہی تھی۔ ہم پاکستانی علاقے میں یوں داخل ہوئے جیسے کبڈی کا کوئی ماسٹر کھلاڑی، مخالف کھلاڑیوں سے لڑنے بھڑنے اور انہیں پچھاڑنے کے بعد فاتحانہ ہاتھ اٹھاتا ہوا اپنی حدود میں پہنچ جاتا ہے... میں جیپ کو قریباً نصف کلومیٹر تک اسی طرح بھگاتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ پاکستانی فوجیوں اور رینجرز نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم رک گئے۔

کیپٹن رینک کے ایک آفیسر نے اندر جھانکا۔ جیلانی نے باہر نکل کر سرگوشیوں میں آفیسر سے بات کی۔ آفیسر نے فوراً ہمیں آگے بڑھنے کی اجازت دی اور اس کے ساتھ ہی وائرلیس پر آگے والی پوسٹوں کو ہمارے لیے ہدایات دینے لگا۔

گرے جیپ پھر روانہ ہوئی۔ اردگرد کے پاکستانی فوجی اور رینجرز اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ہم آگے بڑھتے گئے۔ یہ اپنی زمین تھی، یہ اپنی ہوا تھی، اپنے کھیت، اپنے درخت اور ہم زخموں سے چور... اور ہم سب سے زیادہ چور ہمارا ہیرو... ہمارا عمران۔ ڈاکٹر مہناز مسلسل اس کا خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ہولے سے مسکرایا۔ "گھبراؤ نہ یارو... اتنی جلدی نہیں مروں گا۔ لیکن اگر تم نے ایسے چہرے بنائے رکھے تو پھر ضرور کچھ سوچنا پڑے گا۔"

مہناز نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تابش صاحب! نزدیک ترین اسپتال کون سا ہے؟"

جیلانی نے کہا۔ "ہم اسپتال کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ وہ دیکھیں سامنے ایمبولینس کھڑی ہے۔ وہ ہمیں گائیڈ کرے گی۔"

یہ ایک فوجی ایمبولینس تھی۔ ہماری جیپ قریب پہنچی تو ایمبولینس نے ہماری راہنمائی شروع کر دی۔ اس کا سائرن پوری آواز سے بج رہا تھا۔

کچھ آگے جا کر ڈاکٹر مہناز میری طرف آئی اور میرے کان میں سرگوشی کی۔ "تابش! عمران صاحب کی حالت زیادہ اچھی نہیں۔ انہیں ایمبولینس میں شفٹ کرنا چاہیے۔ وہاں آکسیجن وغیرہ بھی ہو گی۔"

ہم نے ایمبولینس کے قریب پہنچ کر اسے روکا۔ یہ ایک بڑی گاڑی تھی۔ ہم نے عمران کے علاوہ زخمی شوٹر کو بھی اس ایمبولینس میں منتقل کر دیا۔ میں عمران کے ساتھ تھا۔ عمران کا چہرہ خون کے بہاؤ کے سبب زرد ہو گیا تھا لیکن اس کا حوصلہ اسی طرح جوان تھا۔ اسے ایمبولینس کے اسٹریچر پر لٹایا گیا تو کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ لیٹ گیا۔ میں نے اس کا زخمی بازو والا ہاتھ تھام لیا۔ میری آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ وہ بولا۔ "زیادہ بیوی بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔ بابا جلالی دیکھو کہاں پہنچ کر واپس آ گیا ہے۔ مجھے تو پھر ایک گولی لگی ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ بھینچ لیا۔ "تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ اگر ہوا تو پہلے مجھے ہو گا۔"

وہ مسکرایا۔ "ساری بیویاں ایسے ہی کہتی ہیں۔ بعد میں رنگ برنگے کپڑے پہنتی ہیں اور برسی کا دن بھی بھول جاتی ہیں۔ بہرحال، میں تمہیں ایسے کمینے پن کا موقع دینے والا نہیں ہوں۔ خاطر جمع رکھو۔"

"جاوا بچ گیا؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں... لیکن تمہارے لیے ایک چیز رکھی ہوئی ہے میں نے۔ جاوا کی جیپ میں ہی پڑی ہے۔ آخری سیٹ کے نیچے، بائیں طرف۔ ابھی اسے نکال لینا۔ مجھے تو اب شاید دو چار دن اسپتال کی دال روٹی کھانی پڑے گی۔"

"آٹھ دس دن کھا لینا مگر ٹھیک ہو جانا۔" میں نے اس کے گہرے زخم سے نگاہ چراتے ہوئے کہا۔

ایک فوجی مسلسل عمران کو گیس ماسک لگانا چاہ رہا تھا لیکن عمران نے یہ پیشکش قبول نہیں کی۔ دوسری طرف ڈاکٹر

مہناز، زخمی شوٹر رفیع کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ وہ مسلسل بے ہوش تھا اور اس کی سانس بھی اکھڑ رہی تھی۔ گیس اسے لگا دی گئی۔

ہم ایک عارضی فوجی اسپتال میں پہنچے۔ ایک سرجن نے ہنگامی طور پر جیپ کے اندر ہی عمران کا معائنہ کیا۔ اسے کچھ طبی امداد دی گئی۔ اسے خون کی فوری ضرورت تھی۔ یہ خون مہیا ہو گیا اور ایمبولینس کے اندر ہی عمران کو لگا بھی دیا گیا۔

اس دوران میں عمران نے ایک فون کال بھی موصول کی۔ پتا نہیں وہ کس سے بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "جی جناب! تارگٹس تقریباً اچیو ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر مہناز کو واپس لے آئے ہیں۔ تابش اور اس کی کزن ثروت بھی بہ خیریت آ گئے ہیں۔ ثروت کا شوہر یوسف پہلے ہی ایک ڈیل کے ذریعے پاکستان آ چکا ہے... یس سر... یس سر۔ دو لڑکیاں بھی ہیں۔ فاخرہ اور اس کی سہیلی۔ ممبئی کے فلمی مافیا کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھیں۔ ایک تیسری بھی تھی سویٹی... ایشوریا کے نام سے جانی جاتی تھی۔ وہ نہیں آ سکی۔ اسے ریسٹ ہاؤس میں گولی لگ گئی تھی..."

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا۔ غالباً عمران اور اس کی ٹیم کی کارکردگی کو سراہا جا رہا تھا۔ عمران نے جواب میں دو بار تھینکس کہا اور کال ختم ہو گئی۔ ایک ڈاکٹر نے اصرار کر کے عمران کو آکسیجن ماسک چڑھا دیا۔

گرے جیپ ہمارے ساتھ ہی یہاں پہنچی تھی۔ اس میں سے بھی زخمیوں کو نکال کر اس عارضی اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ باقی مرد و زن کو آرمی والوں نے اپنی حفاظتی تحویل میں لے لیا۔ ان میں جگت سنگھ بھی شامل تھا۔ اس دوران میں مجھے عمران کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ جیپ میں میرے لیے ایک چیز ہے۔

میں نے جیلانی کو اس بارے میں بتایا۔ وہ بولا۔ "مجھے بھی کہہ رہے تھے کہ جاوا تو انڈیا میں رہ گیا ہے لیکن میں اس کی ایک خاص چیز لے آیا ہوں۔ اس کے بغیر وہ بیکار ہی ہے۔"

ہم دونوں جیپ میں پہنچے۔ جیپ کی باڈی پر ان گنت گولیوں کے نشان تھے۔ لیکن یہ گولیاں جیپ کے اندر "پینی ٹریٹ" نہیں کر سکی تھیں۔ ڈان نے اپنے لیے جو سخت ترین حفاظتی انتظام کر رکھا تھا، وہ آج ہماری زندگیاں بچنے کا سبب بنا تھا۔ اس یونیک جیپ کو آرمی والوں نے گھیرا ہوا تھا۔ جیپ کے اندر زخمیوں کے خون کے دھبے تھے۔ سب سے زیادہ خون اس نشست پر تھا جہاں عمران بیٹھا تھا۔ میں اس خون سے نگاہ چراتا ہوا، پچھلی نشستوں تک پہنچا۔ ہم دونوں نے نیچے جھانکا۔ شروع میں تو کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر ایک فٹ بال سا نظر آیا۔ جیلانی نے اسے باہر نکالا۔ ہم سکتہ زدہ رہ گئے۔ یہ جاوا کا سر تھا۔ اسے ٹھوڑی کے بالکل نیچے سے کاٹا گیا تھا۔ سیاہی مائل رگیں لٹک رہی تھیں۔

"او گاڈ!" جیلانی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

میرے جسم میں بھی سرد لہر دوڑ گئی۔ تاہم اس لہر میں خوشی اور اطمینان کا ایک بے مثل احساس بھی تھا۔ جاوا کی منحوس آنکھیں کھلی تھیں۔ چربی دار جبڑا ذرا لٹکا ہوا تھا۔ سانولے سفاک چہرے پر کئی گہری خراشیں تھیں۔ لگتا تھا کہ آخری وقت میں اس نے کافی مزاحمت کی۔ پاکستانی ہیرو اور بھارتی ولن کا یہ مقابلہ ہماری نظروں سے اوجھل تھا مگر نتیجہ ہمارے سامنے تھا۔ لگتا تھا کہ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہوا اور انڈیا کے اس نامی گرامی ڈان کو چند سیکنڈ کے اندر موت سے ہمکنار کر گیا۔ مجھے محسوس ہوا، یہ واقعی کسی خون خوار ریچھ کا سر ہے جو ان گنت دوشیزاؤں کی رگِ عصمت سے خون پی چکا ہے اور گوبندر سنگھ جیسے بے شمار کڑیل جوان جس کی بربریت کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اب اس کا سر خاک و خون میں لتھڑا ہمارے سامنے پڑا تھا۔ نگاہوں پر بھروسا نہیں ہوا۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں اقبال، ابرار صدیقی، پورب کمار، قربان علی اور میڈم صفورا وغیرہ کے چہرے نگاہوں میں گھوم گئے۔ ہم نے ان کے خون کا بدلہ لے لیا تھا۔

مجھے یاد آیا کہ دھوئیں والے بموں سے حملہ کرنے سے تھوڑی دیر پہلے عمران نے جگت سے اس کی نہایت تیز دھار کرپان بھی مانگی تھی۔ یہی لگتا تھا کہ یہ اس وزنی کرپان کی کارروائی ہے۔

پاس ہی ریگ زین کا ایک بیگ تھا جس میں آٹومیٹک رائفلوں کا بچا کھچا ایمونیشن تھا۔ جیلانی نے یہ ایمونیشن جیپ کے فرش پر الٹا اور انڈیا کے خطرناک ڈان کا خون آلود سر اس بیگ میں ڈال کر زپ کھینچ دی۔

"ویل ڈن میرے یار!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "کلیجا ٹھنڈا کیا تو نے۔ اب زندگی کی طرف بھی واپس آ جانا۔ ہر مصیبت کو شکست دیتا ہے تو، اب اسے بھی دے دینا۔ ہمیں مایوس نہ کرنا۔ ہمیں بڑا مان ہے تجھ پر۔"

باہر کھڑے فوجی آفیسر دیکھ چکے تھے کہ ہم نے ریگ زین کے بیگ میں کیا رکھا ہے۔ جیلانی نے ایک طرف جا کر ان سے چند سرگوشیاں کیں اور بیگ ان کے حوالے کر دیا۔

دیکھنے میں بالکل یہی لگتا تھا کہ بیگ میں کوئی فٹ بال یا پھر تربوز قسم کی شے ہے جو ہم تحفے کے طور پر سرحد پار سے لائے ہیں۔

سنگین ترین صورتِ حال کے باوجود میں عمران کے فقرے سے محظوظ ہوا۔ اس نے کیپٹن جیلانی سے کہا تھا۔ ''جاوا، انڈیا میں ہی رہ گیا ہے لیکن اس کی ایک شے میں لے آیا ہوں۔ اس کے بغیر وہ تقریباً بیکار رہی ہے۔''

''ویل ڈن میرے یار!'' میں نے ایک بار پھر دل ہی دل میں کہا۔

ایک خوش شکل پاکستانی فوجی آفیسر میرے پاس آیا۔ وہ مکمل یونیفارم میں تھا۔ اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''کیپٹن ڈاکٹر شرجیل احمد۔''

''جی میں تابش ہوں۔ عمران صاحب کا ساتھی۔''

''مجھے معلوم ہے بلکہ ہم نے سب کچھ دیکھا ہے۔ گرے جیپ آپ ہی ڈرائیو کر رہے تھے نا؟''

''جی ہاں۔''

''آپ نے کمال کیا مسٹر تابش! ویری ویل ڈن۔ ہماری نظریں ٹیلی اسکوپ کے ذریعے آپ پر ہی جمی تھیں۔ آپ نے بڑے مشکل حالات میں جیپ کو سنبھالے رکھا۔ خاص طور پر کچے پر اترنے کے بعد۔ وہ بہت رفتار تھی۔''

''شکریہ۔''

''اور کچے پر اترنے کا آپ کا فیصلہ بالکل درست تھا۔ وہ دو پھاٹک تھے اور آپ انہیں توڑ نہیں سکتے تھے۔ فرض کیا ایک ٹوٹ بھی جاتا تو آپ کی رفتار اتنی کم ہو جاتی کہ دوسرا آپ کا راستہ روک لیتا۔''

''عمران صاحب کا کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''عمران صاحب ایمبولینس میں ہیں۔ لیکن اب ان کے بارے میں صورتِ حال کچھ تبدیل ہوئی ہے۔ ہم ہیلی کاپٹر منگوا رہے ہیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟''

''ان کی حالت اتنی اچھی نہیں۔ انہیں جلد از جلد کراچی پہنچنا چاہیے۔ باقی دونوں زخمیوں کو بھی ارجنٹ ٹریٹ منٹ کی ضرورت ہے۔''

ابھی بات ہو ہی رہی تھی کہ ہیلی کاپٹر کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ عمران کے لیے میری تشویش بڑھ رہی تھی اور کچھ یہی کیفیت باقی ساتھیوں کی بھی تھی۔

☆☆☆

ہم گیارہ بجے کے لگ بھگ کراچی پہنچ گئے۔ ہیلی کاپٹر سے عمران اور دیگر دونوں زخمیوں کو جدید ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور سرآغا خان اسپتال پہنچایا گیا۔ میں اس تمام عرصہ عمران کے ساتھ رہا۔ وہ ہوش میں تھا اور ہمیشہ کی طرح حوصلہ مند بھی۔ بہرحال اس کے منہ پر آکسیجن ماسک چڑھا تھا اور بلڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ اب بھی باتوں کی پھلجڑیاں چھوڑنا چاہ رہا ہے مگر فی الحال حالت اجازت نہیں دے رہی تھی۔

جب وہ لوگ اسے اسٹریچر پر بھگاتے ہوئے آپریشن تھیٹر کی طرف لے جا رہے تھے، میں بھی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ پھر مجھے روک دیا گیا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا گیا۔ وہ اسٹریچر کو دوڑاتے ہوئے بھول بھلیوں میں گم ہو گئے۔ میں وہیں ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ''عمران! مجھے چھوڑنا مت... مجھے چھوڑنا مت۔ نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔'' میں نے دکھ کے عالم میں زیرِلب کہا اور میری آنکھوں سے گرم پانی کے سوتے پھوٹ نکلے۔

شام چار بجے کے قریب ہمارے باقی ساتھی بھی بذریعہ سڑک کراچی پہنچ گئے۔ فوجی حکام کی ہدایت پر انہیں کلفٹن میں ایک اچھے ہوٹل میں ٹھہرایا گیا اور وہاں ان کی سیکیورٹی رینجرز کو سونپ دی گئی۔ میں ہوٹل پہنچا تو مین گیٹ پر میڈیا کے لوگوں کا ہجوم نظر آیا لیکن انہیں اندر نہیں جانے دیا جا رہا تھا۔

ہوٹل کی لابی میں ہی میری ملاقات جگت سنگھ سے ہو گئی۔ اس کے ایک ہاتھ اور چہرے پر معمولی زخم تھے۔ ان کی بینڈیج ہو چکی تھی۔ اس نے سب سے پہلے مجھ سے عمران کے بارے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا۔ ''اس کا دوسرا آپریشن ہو رہا ہے۔ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ اس کے لیے دعا کرو۔''

''آپاں کا تو رواں رواں اس کے لیے دعا کرتا ہے بادشاہ زادے۔ وہ شیر مرد ہے۔ گیدڑوں کے کاٹنے سے اسے کچھ نہیں ہوگا۔ واہگرو کی کرپا ہوگی۔''

''ثروت کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''چھوٹی وہ سامنے اٹھارہ نمبر کے کمرے میں ہے۔ بہت رو رہی ہے۔ اس نے ابھی کہیں فون کیا ہے۔ اس کو پتا لگیا ہے کہ اس کی نکی بہن کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے اور اسے کسی باہر کے ملک لے جایا گیا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ ثروت کو نصرت کی حالت کا پتا چل گیا ہے۔ یقیناً یہ اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ یعنی ایک بہت بڑی مصیبت سے نکلنے کے فوراً بعد وہ ایک اور بڑے صدمے کا شکار ہو گئی تھی۔

میں نے دروازے پر دستک دی۔ ڈاکٹر مہناز نے دروازہ کھولا۔ مہناز کی اپنی آنکھیں بھی نم تھیں۔ اس کے ہاتھ میں خالی سرنج تھی۔ غالباً اس نے ابھی ثروت کو کوئی انجکشن دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر مہناز باہر نکل گئی تاکہ میں اکیلے میں ثروت سے بات کر سکوں۔

ثروت صوفے پر بیٹھی تھی اور اس نے اپنا ماتھا صوفے کے ہتھے پر ٹیک رکھا تھا۔ وہ ہولے ہولے رو رہی تھی۔

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر ایک دم اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ جیسے میں نے اسے چھوا نہ ہو، اس کے کندھے پر انگارہ رکھ دیا ہو۔

''کیا بات ہے ثروت؟''

''کچھ نہیں... کچھ نہیں... پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔ جو کچھ ہو رہا ہے میری وجہ سے ہو رہا ہے۔ آپ کی وجہ سے ہو رہا ہے... آپ کی نیت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ وہ اسپتال میں ہے۔ وہ مر رہی ہے۔ اس کا کچھ نہیں ہو سکے گا۔ کچھ نہیں۔'' وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔

''ثروت! خود کو سنبھالو۔ یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ ہوٹل ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ اسے پھر آسٹریا لے گئے ہیں۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے... ابھی جانا ہے۔''

''سب کچھ ہو جائے گا ثروی! تم حوصلہ رکھو۔''

''بس آپ یہاں سے چلے جائیں۔ پلیز، میرے کمرے سے چلے جائیں۔''

پھر میرے اٹھنے سے پہلے ہی وہ خود اٹھی اور بھاگ کر اٹیچ کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کر لیا۔

میں سکتہ زدہ بیٹھا رہا۔ پھر ایک گہری سانس لی اور اٹھ کر مردہ قدموں سے باہر آ گیا۔

سامنے جیلانی آتا نظر آیا۔ اس کا زخمی بازو اب اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس نے بھی سب سے پہلے عمران کے بارے میں پوچھا۔ میں نے وہی بتایا جو ابھی جگت کو بتایا تھا۔ جیلانی بھی میرے ساتھ ہی اسپتال جانا چاہتا تھا مگر یہاں مقامی حکام کی ایک ہنگامی میٹنگ ہو رہی تھی۔ دو تین فوجی افسران بھی اس میں شریک تھے۔ جیلانی کو یہاں سارے واقعے کی رپورٹ دینا تھی۔ جیلانی نے مجھے ایک اخبار بھی دکھایا۔ شام کے اس اخبار میں دو خبریں اہم تھیں۔ پہلی، انڈین ڈان جاوا کے قتل کی خبر تھی۔ لکھا گیا تھا کہ جاوا کے قتل پر ممبئی میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ وہاں کی انڈر ورلڈ ہل کر رہ گئی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ جاوا کو بہیمانہ طریقے سے قتل کرنے والا وہی میجر کا گروپ ہے جو اس سے پہلے بھی انڈیا میں کئی اہم لوگوں اور خاص طور سے حساس ادارے کے افراد کو قتل کر چکا ہے۔ اس قتل کے بعد انڈیا کے نیوز چینلز پر بہت ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔

دوسری خبر کھوکھراپار بارڈر پر دوطرفہ فائرنگ کی تھی۔ بتایا گیا تھا کہ یہ فائرنگ قریباً دس منٹ جاری رہی۔ اشتعال انگیزی انڈین فورسز کی طرف سے ہی ہوئی۔ پاکستانی فوجیوں نے اس کا جواب دیا۔ کسی CASUALTY کی اطلاع نہیں تھی۔ ہاں، خبر میں یہ بتایا گیا تھا کہ اس فائرنگ کے دوران میں ایک گاڑی انڈین فائرنگ سے بچتی بچاتی پاکستانی علاقے میں داخل ہو گئی۔ اس مکمل بلٹ پروف گاڑی کو قبضے میں لے لیا گیا ہے۔ گاڑی یا گاڑی سواروں کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''جیلانی! میں دوبارہ اسپتال جا رہا ہوں۔ تم ذرا ثروت کا خیال رکھو۔ وہ بہت تناؤ میں ہے۔''

''ہاں، مجھے بھی لگ رہا ہے لیکن ابھی ان کے شوہر بھی تو پہنچ رہے ہیں۔'' جیلانی نے اطلاع دی۔

''کیا مطلب؟''

''ڈاکٹر مہناز بتا رہی تھیں کہ ان کے شوہر یوسف صاحب سے رابطہ ہو گیا ہے۔ وہ لاہور سے آنے والی فلائٹ پر آ رہے ہیں۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

جیلانی میٹنگ میں چلا گیا۔ میں اسپتال روانہ ہوا تو جگت سنگھ بھی ساتھ ہو لیا۔ ہم سب کے دل عمران کی حالت کے لیے دھڑک رہے تھے۔ اسپتال میں کافی لوگ آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھے۔ یہ سب عمران سے تعلق رکھتے تھے۔ آرمی کے کچھ لوگ بھی دکھائی دیے۔ پتا چلا کہ عمران کا دوسرا آپریشن مکمل ہو گیا ہے اور اسے ''آئی سی یو'' میں منتقل کیا جانے والا ہے۔ کیپٹن شرجیل بھی یہاں موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ ایک نہیں دو گولیاں تھیں جو بالکل پاس پاس لگی تھیں۔ ایک گولی زیادہ آگے نہیں جا سکی اور ایک ٹوٹی ہوئی، پسلی کے قریب سے نکال لی گئی۔ دوسری گولی نے زیادہ نقصان کیا۔ اس نے ایک پھیپھڑے کے علاوہ ریڑھ کی ہڈی

کو بھی متاثر کیا ہے۔ اگلے پندرہ بیس گھنٹے عمران کی صحت یابی کے لیے بہت اہم ہیں۔

”وہ ہوش میں ہے کیپٹن؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، انہیں ٹرنکولائزرز کے زیراثر رکھا گیا ہے۔ یہی ان کے لیے بہتر ہے۔“

جیلانی بھی میٹنگ سے فارغ ہو کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ہم سب عمران کے لیے بے چین تھے۔

رات دس بجے کے قریب کیپٹن شرجیل ہمیں زبردستی ہوٹل واپس لے آیا تاکہ ہم کچھ کھا پی سکیں اور ذرا آرام کر لیں۔ ہوٹل کے برآمدے میں ہی میری ملاقات اس شخص سے ہو گئی جس کا سامنا کرنا میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ یہ یوسف تھا۔

انڈیا سے رفوچکر ہونے کے بعد وہ پہلی بار اپنی صورت دکھا رہا تھا۔ بہرحال، اس کے چہرے پر کسی طرح کی ندامت یا جھجک نہیں تھی۔ اس کی اونچی لمبی ناک لشکارے مار رہی تھی اور وہ بہترین تراش کے لباس میں تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ ”کیا حال ہے آپ کے دوست عمران صاحب کا؟“ وہ مصنوعی تفکر سے بولا۔

”آپریشن ہو چکا ہے، حالت بہتر ہو رہی ہے۔“ میں نے رسمی جواب دیا۔

”آپ کے ساتھیوں اور میڈم صفورا وغیرہ کا سن کر بہت بہت افسوس ہوا۔ شکر ہے کہ اللہ نے آپ کی جان بچالی اور آپ پھر سے ہمارے درمیان ہیں۔“

”ہم تو پہلے بھی سب کے درمیان ہی تھے۔ آپ کی خاطر نکلنا پڑا۔“

”بس اللہ حفاظت کرنے والا ہوتا ہے۔“

”بے شک... مگر اپنے بچاؤ کے لیے آپ نے خود بھی زبردست کوشش کی۔“ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”میں مسلسل پاکستانی سفارت خانے سے ان ٹچ رہا ہوں۔ پرسوں میں خود انڈیا جانے والا تھا۔ بہرحال تھینکس گاڈ! آپ لوگ سلامتی سے واپس آ گئے۔ میں اور ثروت خاص طور سے آپ کے بہت زیادہ ممنون ہیں۔ کاش وہاں وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہے گا۔“

وہ بہروپیا اس واقعے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جب اس نے باقاعدہ مجھ پر گولی چلائی تھی۔

مجھے اندیشہ تھا کہ میں کہیں طیش میں اس سے کچھ کہہ نہ بیٹھوں۔ میری مشکل ایک خوش پوش لڑکی نے آسان کی۔ وہ تیزی سے میری طرف آئی۔ وہ عمران کی ساتھی شاہین تھی۔ وہ آتے ساتھ ہی میرے بازو سے لگ گئی اور سسکنے لگی۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ رونے والی کوئی بات نہیں۔ بس دعا کرو۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

”میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں تابش بھائی! پلیز مجھے وہاں لے چلیں۔“

”ابھی تو میں بھی اس سے نہیں مل سکا۔ لیکن امید ہے کہ کل صبح تک ہم اسے دیکھ سکیں گے اور شاید بات بھی کر سکیں گے۔ کیپٹن شرجیل بتا رہا تھا کہ اس کے دونوں آپریشن کامیاب رہے ہیں۔“

اسی دوران میں مجھے سرکس کے مالک جان محمد صاحب اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے مجھے گلے سے لگا کر بھینچا اور تھپکی دی۔ میرے شانے تھام کر بولے۔ ”تم لوگوں نے انڈین ایجنسیوں کو یادگار سبق سکھایا ہے۔ وہاں کے ٹی وی چینلز پر کہرام مچا ہوا ہے۔ جاوا کی موت کی خبر بھی بار بار نشر ہو رہی ہے۔ انڈین فوج کے ذرائع اپنے اصل نقصان کو چھپا رہے ہیں پھر بھی اندازہ ہوتا ہے کہ درجنوں مرے ہیں۔ کئی گاڑیاں تباہ ہوئی ہیں۔“

تب انہوں نے عمران کی حالت کے بارے میں پوچھا۔ میں نے بتایا کہ آپریشنز کے بعد وہ بہتر ہے۔ میں نے شاہین سے فرح اور عاطف کے بارے میں پوچھا۔ شاہین ایک دم چپ ہو کر جان محمد صاحب کی طرف دیکھنے لگی۔ میرے ذہن میں ان گنت اندیشے کلبلائے اور جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ ”کیا ہوا؟ کہاں ہیں وہ؟“

”پریشانی کی بات نہیں۔ وہ خیریت سے ہیں۔“ جان صاحب نے کہا۔ ”لیکن... پاکستان میں نہیں ہیں۔“

”نہیں ہیں؟“

”میں نے پانچ دن پہلے ان دونوں کو تمہارے بچے سمیت دبئی بھجوا دیا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا ہے ان کے حق میں۔ اقبال کے قتل کے بعد یہاں جاوا کے بندوں کے حوصلے بڑے بڑھ گئے تھے۔ وہ ہر جگہ دندنا رہے تھے۔ سلطان چنا نے ایک روز عاطف کو مال روڈ کے ایک جم سے نکلتے دیکھ لیا اور اسے للکارا۔ عاطف بڑی مشکل سے بچ کر نکلا۔ میں سمجھ گیا کہ اب تمہارے بھائی بہن کا یہاں رہنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ میں نے بالو سمیت انہیں دبئی بھجوا دیا ہے۔ بالو کی آیا صفیہ اور زری بھی ساتھ ہی گئی ہیں۔ کہو گے تو کل تمہاری ان سے بات بھی کروا دوں گا۔“

اس دوران میں جان محمد صاحب کے فون پر بیل

ہوئی۔ انہوں نے اسکرین دیکھی اور ہولے سے بولے۔ ”لو بھئی، بڑی لمبی عمر ہے ان دونوں کی۔ انہی کی کال ہے۔“

پہلے جان صاحب نے خود تھوڑی سی بات کی۔ اس کے بعد فون میری طرف بڑھا دیا۔

”ہیلو۔“ مجھے عاطف کی آواز سنائی دی۔

”میں تابش ہوں عاطف... کیسے ہو تم؟“

”تابش بھائی جان! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟ ہم تو بہت پریشان تھے۔ ٹی وی پر بڑی بُری بُری خبریں آ رہی تھیں۔ عمران بھائی کے بارے میں انڈیا کے ٹی وی چینلز پر کہا جا رہا ہے کہ ان کا تعلق فوج سے رہا ہے اور وہ ایک گروہ بنا کر انڈیا میں لوگوں کو ٹارگٹ کرتے رہے ہیں۔ طرح طرح کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ فرح کا تو رو رو کر بُرا حال ہے۔ لیں اس کو اپنی آواز سنائیں۔“

دو سیکنڈ بعد فرح کی سسکتی ہوئی صدا ابھری۔ ”بھائی جان! آپ سچ بتائیں آپ پاکستان میں ہیں نا؟ آپ ٹھیک ہیں نا؟ زخمی تو نہیں ہیں آپ؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کوئی درجن بھر سوال کر دیے۔

میں نے اسے تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں خیریت سے پاکستان پہنچ گیا ہوں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر میرے پاس پہنچ جائے اور مجھ سے لپٹ کر اپنے دل کی بھڑاس آنکھوں کے راستے نکال دے۔ میں اسے کسی بچی کی طرح پچکارتا رہا، سمجھاتا رہا۔ اس نے مجھے چھوٹے بالو کی آواز سنائی۔ اس کی توتلی زبان... اس کی پیاری سی کلکاری۔ وہ سلطانہ کا جگر گوشہ تھا۔ اس کے جسم کا حصہ تھا۔ میں جب بھی اس کی آواز سنتا تھا، میرے سارے بھولے بسرے زخم لَو دینے لگتے تھے۔

عاطف اور فرح نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں دبئی میں خود کو بالکل محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔ جان محمد صاحب نے ان کے لیے اچھی سیکیورٹی بھی مہیا کر رکھی ہے۔ ان دونوں کو عمران کے زخمی ہونے کی اطلاع مل چکی تھی اور وہ اس کے لیے بے حد فکرمند تھے۔ عمران بھائی... عمران بھائی کہتے ان کی زبان سوکھتی تھی۔ میں نے ان کو عمران کے بارے میں حتی الامکان تسلی دی اور یہ بھی کہا کہ یہاں کے معاملات سے فارغ ہو کر میں بہت جلد ان سے ملنے کے لیے آ رہا ہوں۔

... شاہین تو فوراً اسپتال جانا چاہ رہی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ابھی کوئی فائدہ نہیں۔ میں نے اور جیلانی نے متعلقہ ڈاکٹرز سے فون پر رابطہ رکھا ہوا ہے۔ وہ صورتِ حال سے آگاہ رکھے ہوئے ہیں۔

وہ جو ہمہ وقت عمران سے دست و گریباں رہتی تھی، اس وقت یاس کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ وہ جیسے اڑ کر اس تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ ہم نے جیسے تیسے رات گزاری۔ اس دوران میں بھی ڈاکٹر شرجیل سے میری بات ہوتی رہی۔ آخری دو گھنٹوں میں ڈاکٹر بھی شاید کچھ دیر کے لیے سو گیا تھا۔ ہم چھ بجے ہی ہوٹل سے نکل کر اسپتال روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں میرے ساتھ جگت، جان محمد صاحب اور شاہین بھی تھے۔ شاہین کی خوب صورت آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ وہ غمزدہ حسن کا نمونہ نظر آتی تھی۔ پچھلے تین چار ماہ میں اس کے نقوش میں کچھ اور بھی نکھار آیا تھا۔ شبنم سے دھلے دھلائے پھول جیسا چہرہ اور نہایت متناسب جسم... ترشے ہوئے نفیس بال اس کے چہرے پر بہت جچتے تھے۔ پچھلے کئی ماہ سے وہ ARCOBAT والا جاب مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی۔ یوں اس کی شخصیت میں سنجیدگی اور وقار کا تناسب کچھ بڑھا تھا۔

ہم اسپتال پہنچے تو سب سے پہلے جیلانی ہی نظر آیا۔ اس کا اڑا اڑا سا رنگ دیکھ کر میرا کلیجا جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ ”خیریت ہے جیلانی؟“ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے جی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہم سے بہت کچھ چھپایا گیا ہے۔ عمران صاحب کی حالت کل شام سے ہی اچھی نہیں تھی۔ ان لوگوں نے راتوں رات انتظام کیا ہے اور انہیں پاکستان سے لے گئے ہیں۔“

”پاکستان سے لے گئے ہیں؟“ میں بھونچکا رہ گیا۔

”جی ہاں، انہیں اسپیشل انتظام کے ذریعے میونخ روانہ کر دیا گیا ہے۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی کو کافی نقصان پہنچا ہے۔ رات نو بجے ہی سرجنز نے کہہ دیا تھا کہ ان کی زندگی بچانے کے لیے انہیں فوراً بیرونِ ملک بھیجنا پڑے گا۔ ابھی کوئی ایک گھنٹا پہلے وہ کراچی ائرپورٹ سے امارات کی پرواز کے ذریعے روانہ ہو گئے ہیں۔ دو ڈاکٹروں کی ٹیم بھی یہاں سے ان کے ساتھ گئی ہے۔“

میں بے دم سا ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اردگرد کی ہر شے گھومتی محسوس ہوئی۔ ایک دم شور سا اٹھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ شاہین ایک تپائی سے ٹکرانے کے بعد فرش پر گری تھی۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

”شاہین... شاہین!“ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بند اور چہرہ ہلدی تھا۔

دو نرسیں بھاگی ہوئی آئیں۔ ایک ملازم اسٹریچر لایا۔ شاہین کو اسٹریچر پر لٹا کر ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔

میرا اپنا سر گھوم رہا تھا۔ یہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا تھا؟

شام کے بعد تو ہمیں کچھ اور صورتِ حال بتائی گئی تھی۔ کہا جا رہا تھا کہ آپریشنز کامیاب ہوئے ہیں۔ اسی دوران میں پژمردہ ڈاکٹر شرجیل بھی نظر آ گیا۔ میں نے اسے شانوں سے تھام لیا۔
''یہ ہم کیا سن رہے ہیں ڈاکٹر... عمران کہاں ہے؟''
''آپ ٹھیک سن رہے ہیں تابش صاحب! انہیں ایمرجنسی میں باہر بھیجا گیا ہے اور یہ شکر کا مقام ہے کہ راتوں رات اس کا انتظام ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے بہت بروقت فیصلہ کیا ہے۔ یہاں علاج بہت مشکل تھا۔ بیس تیس گھنٹوں کے اندر زندگی داؤ پر لگ سکتی تھی۔ ان کے اسپائنل میرو میں سوزش پیدا ہو رہی تھی۔''
''لیکن آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ انہیں لے جایا جا رہا ہے؟ ہم انہیں مل لیتے، ایک بار دیکھ لیتے۔''
''یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ وہ بے ہوش تھے۔ ویسے بھی سب کچھ آناً فاناً ہوا، یہ ایک عام فلائٹ تھی۔ اس میں ہنگامی طور پر خصوصی انتظام کیا گیا ہے۔ آپ کو پتا ہی ہوگا، دو سینئر ڈاکٹرز بھی ساتھ گئے ہیں۔ اب امید ہے کہ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں تابش صاحب! ہی از اے لکی مین۔ ورنہ اتنی جلدی یہ سب کچھ ہونا ممکن نہیں تھا۔''
اسی اثنا میں مزید ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ سب اس ڈرامائی تبدیلی پر ششدر تھے۔ پندرہ بیس منٹ بعد شاہین کو ہوش آ گیا۔ وہ ایمرجنسی وارڈ کے بستر پر تھی۔ اس کی پیشانی پر ایک نیلگوں گومڑ نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے ہاتھ تھام کر سسکنے لگی۔ ''وہ بچ جائے گا نا تابش بھائی؟''
''اسے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' میں نے پورے یقین سے کہا۔ ''وہ ایک فائٹر ہے۔ لڑنا جانتا ہے۔ وہ اپنی تکلیف سے بھی لڑے گا اور شکست دے گا۔''
''یہاں اس کا علاج کیوں نہیں ہو سکا؟ اس کا مطلب ہے، اس کی حالت سیریس ہے؟''
''میری بات کیپٹن ڈاکٹر شرجیل سے ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ فی الحال حالت سیریس نہیں تھی۔ لیکن ڈر تھا کہ اگلے ایک دو دن میں ہو سکتی ہے۔ کیپٹن کا کہنا ہے کہ عمران کا باہر جانا اس کے لیے بہت اچھا ثابت ہوگا۔ علاج کے بعد اس کی بحالی میں بھی زبردست مدد ملے گی۔''
''میں تو اسے دیکھ بھی نہ سکی۔ سوری بھی نہ کہہ سکی۔ کتنی مجری ہوں میں۔ آخری بار کتنا لڑی ہوں اس سے۔ یہ جانے بغیر کہ وہ زخمی ہے، انڈینز کے گھیرے میں ہے، لڑ رہا ہے۔''
میں زبردستی مسکرایا۔ ''تمہیں سوری کہنے اور پھر سے لڑنے کا پورا موقع ملے گا۔ اب خود کو سنبھالو۔ ورنہ ہم دہری مشکل کا شکار ہو جائیں گے۔''
اس نے اپنے ہونٹ بھینچ کر سسکیاں روکنے کی کوشش کی۔ پھر اپنے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر کچھ مڑے تڑے نیلے نوٹ نکالے۔ یہ سات آٹھ ہزار روپے تھے۔ شاید اس نے اپنے روزمرہ خرچ سے بچائے ہوئے تھے۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے یہ میرے حوالے کیے اور بولی۔ ''پلیز آپ اس کے لیے کوئی صدقہ وغیرہ دے دیں۔ ابھی اسی وقت۔ خود جائیں یا کسی کے ذمے لگا دیں... پلیز۔''
میں نے روپے اس سے لے کر جیب میں رکھ لیے۔ دل کے اندر دھواں سا بھر رہا تھا۔ پیار کی اصل حقیقت کا پتا مشکل اور تکلیف کے وقت چلتا ہے۔ جذبوں کی پرکھ آزمائش کی کسوٹی پر ہی ہوا کرتی ہے۔
میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی اڑ کر عمران کے پاس پہنچ جاؤں لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ سفری کاغذات کی تیاری میں ہی کئی دن لگ سکتے تھے۔ اب کراچی میں رکنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ہمیں لاہور جانا تھا۔ اسپتال چھوڑنے سے پہلے ہم نے ان دو افراد کی تیمارداری کی جو عمران کے ساتھ ہی زخمی ہوئے تھے اور اب اسی اسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ وہ دونوں اب روبہ صحت تھے۔ ان میں سے ایک تو وہی ماسٹر جواہر تھا۔ ممبئی چھوڑنے کے بعد ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا اصل ذمے دار تو یہی شخص تھا۔ اس نے اپنی محبوب بیوی سریتا کو بچانے کے لیے ہمیں ایک ایسا دھوکا دیا جس نے ہم سب کو جاوا اور بی ایس ایف کے خونی چنگل میں پھنسا دیا۔ ابرار صدیقی، قربان علی، سویٹی اور میڈم غفور سمیت کئی ساتھیوں کی جان گئی اور عمران بھی شدید زخمی ہوا۔ اس سب کے باوجود مجھے یا عمران کو اس شخص سے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے نکتۂ نظر سے شاید ٹھیک ہی کیا تھا۔ اس نے سریتا کو اس ساری خونی کشمکش سے بچانے کی کوشش کی... اور یہ ثابت بھی ہو گیا کہ اس نے جو کیا درست کیا۔ سریتا کی جگہ جو لڑکی اس خونی کشمکش میں شامل ہوئی، وہ ریسٹ ہاؤس میں ماری گئی تھی۔
ماسٹر جواہر بستر پر لیٹا تھا اور اس کی آنکھوں کے گوشوں سے آنسو رس رہے تھے۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔
''مجھے شما کر دیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔
میں نے اس کا شانہ تھپکا اور کہا۔ ''جواہر! جب تم انڈیا جاؤ گے تو تمہیں بہت کچھ بدلا ہوا ملے گا... اور ہو سکتا ہے کہ تمہاری قسمت زور مارے اور تمہیں تمہاری بیوی اور بچی بھی واپس مل جائیں۔''
وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے تہ کیا ہوا تازہ اخبار کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں جاوا کی موت کی خبر جلی حروف میں موجود تھی۔ جاوا کی ایک مدھم سی تصویر بھی چھاپی گئی تھی۔ خبر کی تفصیل میں کافی کچھ لکھا تھا جس میں یہ بات بھی موجود تھی کہ جاوا، پریم چوپڑا اور ان کے کئی قریبی ساتھیوں کی موت کے بعد اس گروہ کے خلاف پورے ''مہاراشٹر'' میں کریک ڈاؤن ہوا ہے۔ بہت سی گرفتاریاں ہوئی ہیں اور کئی لوگ زیرِ زمین چلے گئے ہیں۔ بہت سی لڑکیوں کو حبسِ بے جا سے نکالے جانے کی اطلاع بھی ہے۔ جاوا کے ایک ٹھکانے سے فاسٹنگ بدھا کی وہ نادر مورتی بھی سرکاری تحویل میں لے لی گئی ہے جس کی قیمت کروڑوں ڈالرز میں ہے اور جس کی تلاش میں کئی گروپ انڈیا میں سرگرمِ عمل تھے۔
ماسٹر جواہر خبر پڑھ رہا تھا اور اس کی بھیگی آنکھوں میں آس کی ایک مدھم سی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ میں اسے اخبار اور اس مدھم روشنی کے ساتھ چھوڑ کر وہاں سے چلا آیا۔
میں، شاہین اور جگت سنگھ بارہ بجے واپس ہوٹل پہنچے تو وہاں ایک نئی اطلاع میری منتظر تھی۔ میں نے ثروت اور یوسف والے کمرے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دروازہ کھلا تھا اور باوردی ملازم صفائی کر رہا تھا۔ جیلانی نے کہا۔ ''ثروت صاحبہ اور ان کے شوہر چلے گئے۔''
''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔
''ابھی تو لاہور گئے ہیں۔ وہاں سے انہیں آج رات آسٹریا کے لیے فلائٹ پکڑنی ہے۔ یوسف صاحب ہی بتا رہے تھے۔''
پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے لگا کہ آج میں نے ثروت کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ آس کی ہر روشنی آج بجھ گئی ہے۔ میرا دل چاہا کہ آج آخری بار ثروت کے پیچھے جاؤں۔ اس کو شانوں سے تھام کر اس سے پوچھوں... ثروت! تمہاری اور یوسف کی خاطر میں تمہارے ساتھ دربدر ہوا۔ عمران انڈیا پہنچا، اس کے ساتھی پہنچے، اب ہم سب زخموں سے چور مختلف اسپتالوں میں پڑے ہیں۔ تم سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ جاتے ہوئے رسمی شکریہ ہی ادا کر دیتیں... بتا ہی دیتیں کہ میں جا رہی ہوں۔ کیا تم بھی یوسف کی طرح ہی بالکل بے حس ہو چکی ہو؟

لیکن اس میں کوئی فائدہ نہیں تھا... نہ ثروت کے پیچھے جانے میں کچھ حاصل تھا۔ لگتا تھا وہ بے مروتی اور لاتعلقی کی ہر حد پار کر چکی ہے اور جو لوگ اس طرح آگے چلے جاتے ہیں، انہیں روکنا یا آواز دینا بیکار ہوتا ہے۔ وہ نہیں رکتے۔ انہیں چھوڑ دینا چاہیے، آزاد کر دینا چاہیے۔ ان کے تصور کی پیشانی پر ایک الوداعی بوسہ دے کر ان کے خیال کی پلکوں کو آخری بار چوم کر انہیں رخصت کر دینا چاہیے۔ یہی محبت کا چلن ہے، یہی عشق کا وتیرہ ہے۔ پیار میں جبر نہیں ہے۔ یہ تو شیشے سے پتھر کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی کرشمے کے سبب کامیاب ہو جائے تو سربسجود ہوتا ہے، ناکام ہو جائے تو گلہ نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ کچھ بھی نہ ملا تو ''درد کی دولت'' تو اسی کی ہے۔ محبوب کے شیریں ہونٹ نہ پائے لیکن زہر کا پیالا تو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ کسی کا ریشمی پیکر گلے سے نہ لگا لیکن تختۂ دار کا پھندا تو اسی کا ہے۔ کانٹے، زخم، کرب کے کوڑے، انگارے، زہر میں بجھے تیر... انتظار کی زہریلی برچھیاں، سب... ہاں سب کے سب اس کی ملکیت ہیں... اس کی جاگیر ہیں۔
میں ثروت کے خالی کمرے کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

☆☆☆

ہم لاہور پہنچے۔ لاہور کیا تھا؟ میرے لیے ایک ویرانہ تھا۔ گلیوں میں جیسے خاک اڑ رہی تھی۔ یہاں ثروت نہیں تھی۔ فرح اور عاطف نہیں تھے... یہاں عمران نہیں تھا۔ وہ ہزاروں میل دور میونخ کے ایک اسپتال میں آنکھیں بند کیے ایک سفید بستر پر پڑا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ مجھے ہر پل اس کی خبر ملتی رہے۔ ساتھ ساتھ میں اپنے سفری کاغذ بھی تیار کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کے خوب صورت گڑھے کو اپنی انگلی سے چھو کر کہنا چاہتا تھا، میں آ گیا ہوں عمران۔ اب اپنے سارے دکھ اور تکلیف مجھے سونپ دو۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مسکرائے گا اور کہے گا۔ ''دیکھ لے، اب پھر بول رہا ہے نا کسی بیوی کی طرح۔''
لاہور پہنچنے کے اگلے روز میں نے اپنی اور شاہین کی طرف سے اس کا صدقہ وغیرہ دیا۔ پھر میں میانی صاحب قبرستان گیا۔ وہاں ہمارا پیارا دوست اقبال ایک قبر میں ابدی نیند سو رہا تھا۔ میں کتنی ہی دیر وہاں بیٹھا آنکھیں بھگوتا رہا۔ جیلانی اور امتیاز بھی میرے ساتھ تھے۔ جیلانی کے تین چار مسلح ساتھی ہمارے قریب ہی اندرونی سڑک پر ایک گاڑی میں بیٹھے تھے۔ امتیاز نے ہمیں بتا دیا تھا کہ لاہور میں باہر

نکلتے ہوئے ہمیں بہت احتیاط کرنا پڑے گی۔

عمران کے اندرونِ شہر والے گھر کی چابی امتیاز کے پاس ہی تھی۔ ہم اسی گھر میں شفٹ ہوئے۔ شاہین کو جان محمد صاحب اپنے ساتھ لے گئے۔ عمران کی طرح وہ شاہین سے بھی بہت شفقت رکھتے تھے۔ وہ اسے لاہور ہی میں کسی محفوظ جگہ پر ٹھہرانا چاہتے تھے۔ میں نے شاہین سے کہا کہ میں جان صاحب کو اور اسے ہر وقت صورتِ حال سے باخبر رکھوں گا۔

ہم اندرونِ شہر والے گھر پہنچے تو ساتھ ہی لوگ اکٹھے ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انہیں عمران کے زخمی ہونے کا علم ہو چکا تھا اور وہ اس کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ یہ سب عام لوگ تھے۔ کوئی خوانچہ فروش تھا، کوئی کریانہ فروش... دودھ دہی والا بالا پہلوان، پان سگریٹ والا توفیق... پڑوسی زاہد حسین، چاچا رفیق، پھل فروش عبدالکریم اور کئی دوسرے۔ وہ رسمی طور پر نہیں آئے تھے۔ ان کے چہروں پر وہی پریشانی تھی جو اپنے کسی قریبی عزیز کی تکلیف پر ہوتی ہے۔

ہیرو بھائی کس شہر میں ہیں؟ کس اسپتال میں ہیں؟ ہیرو پتر کب تک ٹھیک ہوگا؟ وہ کب واپس آئے گا؟ اس قسم کے بہت سے سوال ہم سے پوچھے جا رہے تھے۔

اس دوران میں بہرا چاچا نذیر آیا۔ وہ گھر کے صحن میں داخل ہوا تو رو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر بولا۔ ”کہاں چھوڑ آئے ہو ہمارے ہیرو پتر کو... کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟“

میں نے اسے دلاسا دیا۔ اس کے کان کے پاس بلند آواز سے کہا۔ ”آپ کا ہیرو پتر بالکل ٹھیک ہے چاچا! آپ کی دعائیں اسے بالکل بھلا چنگا کر دیں گی۔ وہ پھر سے ہمارے درمیان ہوگا۔“

”کب آئے گا؟ تمہیں اسے ساتھ لے کر آنا تھا۔ اسے کہنا تھا، میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ وہاں سب تیری راہ دیکھ رہے ہیں۔ تیری دید کو ترسے ہوئے ہیں۔“ چاچے کی ادھیڑ عمر لیکن نو بیاہتا بیوی بھی ساتھ تھی اور غم کی تصویر نظر آتی تھی۔

لوگوں میں سے کچھ رو رہے تھے، کچھ مشتعل تھے۔ ”ہم مار دیں گے اسے جس نے ہیرو بھائی پر گولی چلائی ہے۔“ ایک مزدور ٹائپ شخص نے بلند آواز میں کہا۔ اس کے جذباتی انداز سے دو چار اور افراد بھی اشک بار ہو گئے۔

قاری حبیب اللہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہمیں عمران بھائی کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ ان کے لیے پڑھنا چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔“

اسی دوران میں جیلانی کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بات کرتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے واپس آ کر کہا۔ ”ایس پی حمزہ صاحب کا فون تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ کچھ لوگ وہاں میو اسپتال کے باہر جمع ہو گئے ہیں۔ کسی نے جھوٹی خبر اڑائی ہے کہ عمران صاحب یہاں اس اسپتال میں لائے گئے ہیں۔ یہ لوگ اندر جانا چاہ رہے ہیں اور ڈاکٹروں سے بدتمیزی کر رہے ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے حیران ہو کر کہا۔

”حمزہ صاحب نے ہم دونوں کو بلایا ہے تاکہ لوگوں کو حقیقت بتائیں اور سنبھالیں۔ وہ اپنی گاڑی بھی بھیج رہے ہیں۔“

قریباً بیس منٹ بعد پولیس کی گاڑیوں کے ہوٹر سنائی دیے۔ یہ دو گاڑیاں تھیں۔ میں اور جیلانی پولیس جیپ میں اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ جیلانی کے اپنے مسلح ساتھی بھی ہمراہ تھے۔ ہم اسپتال پہنچے تو دنگ رہ گئے۔ وہاں عجیب نقشہ نظر آیا۔ کم و بیش تین سو افراد یہاں جمع ہو چکے تھے۔ یہ سارا ہجوم لاہور کے گلی کوچوں کا سرمایہ تھا... یہ عام شخص تھا جو فٹ پاتھوں پر سوتا ہے، چمکتی دھوپ میں پسینا بہاتا ہے، رکشا یا تانگا چلاتا ہے۔ مختلف ضرورتوں کے لیے لمبی قطاروں میں لگتا ہے اور رات کو اکثر صبر کے نوالے کھا کر امید کا پانی پی لیتا ہے۔ یہ سب عمران کے پرستار تھے۔ اس کی تکلیف کا سن کر اس اسپتال کے گرد امڈ آئے تھے۔ وہ اپنے زخمی ہیرو کو دیکھنا چاہتے تھے۔ کچھ جذباتی افراد نے زبردستی ایمرجنسی میں جانے کی کوشش کی تھی، عملے نے انہیں زدوکوب کیا۔ اس کے بعد اور لوگ یہاں جمع ہو گئے اور اچھا خاصا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ اب بھی ہجوم میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

حمزہ صاحب خود وہاں موجود تھے۔ صلاح مشورے کے بعد انہوں نے میگا فون پر لوگوں کو پرسکون رہنے کے لیے کہا اور بتایا کہ عمران کے دو قریبی دوست یہاں موجود ہیں۔ وہ اصل حقیقت آپ لوگوں کو بتائیں گے۔

حمزہ صاحب کے کہنے پر میں ایک ایمبولنس کی چھت پر کھڑا ہو گیا اور میگا فون کے ذریعے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں عمران کا ساتھی تابش آپ کے سامنے ہوں۔ آپ میں سے کئی لوگ مجھے جانتے ہوں گے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ عمران بالکل خیریت سے ہے اور اس کا بہترین علاج ہو رہا ہے۔ لیکن وہ اس اسپتال میں موجود نہیں ہے۔

میں آپ کو پوری ذمے داری کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ وہ اس اسپتال میں نہیں ہے۔ وہ پاکستان میں ہی نہیں ہے۔ اسے کل رات کراچی سے جرمنی پہنچایا گیا ہے۔ وہاں کے بہترین اسپتال میں اس کی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔ ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے اس کے ڈاکٹروں سے میں نے خود بات کی ہے۔ آپ لوگ اس کے لیے دعائے خیر کریں۔ اللہ کرے وہ چند دن میں پھر سے ہم سب کے درمیان موجود ہو۔"

کچھ احتجاجی آوازیں ابھریں جن سے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ اب بھی یقین نہیں کر رہے۔ میرے ساتھ کیپٹن جیلانی بھی چھت پر چڑھ آیا۔ اس نے بھی میری تائید کی۔ آخر میں، میں نے ایک دو فقرے کہے۔ لوگ جاننا چاہتے تھے کہ عمران ہیرو کے ساتھ اصل میں کیا ہوا ہے۔ انڈیا میں کن لوگوں نے اسے زخمی کیا اور وہ کیونکر یہاں پہنچ سکا، وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے کوئی بھی عمران کی اس حیثیت سے آگاہ نہیں تھا جو مجھے بھی بس چند دن پہلے ہی معلوم ہوئی تھی۔ وہ خفیہ طور پر ایک ایسی مسلح آرگنائزیشن چلا رہا تھا جس نے انڈین ایجنسیوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے اور ان کے ملک میں گھس کر ان کے پنجوں سے بے گناہ پاکستانیوں کو رہائی دلائی تھی۔ مجھے رہ رہ کر یاد آتا تھا کہ جب میں بھانڈیل اسٹیٹ میں پھنسا تھا تو مجھے ہرگز ہرگز امید نہیں تھی کہ کوئی انڈیا آئے گا اور اس دور دراز گمنام جگہ پر مجھ تک پہنچے گا۔ عمران پہنچا تھا اور اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اس کا ایک سیٹ اپ تھا اور وہ ایک عرصے سے اسی طرح کی کارروائیاں کر رہا تھا۔

ہم سارے ہجوم کو تو عمران کی صحت کے حوالے سے تفصیل نہیں بتا سکتے تھے۔ ہم نے چند لوگوں کو منتخب کیا اور انہیں ایک علیحدہ کمرے میں لے جا کر صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ کچھ دیر بعد ہجوم منتشر ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن اگر ہم یہ سمجھتے تھے کہ لوگ مکمل طور پر تتر بتر ہو جائیں گے تو یہ غلط تھا۔ ان میں سے اکثر لوگ ٹولیوں کی شکل میں اندرون شہر کی طرف چل پڑے۔ اندازہ ہوا کہ وہ عمران کی رہائش گاہ کے بارے میں جانتے ہیں اور وہاں جا رہے ہیں۔

رات تک عمران کی رہائش گاہ کے اردگرد بہت سے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ کئی سو کا مجمع تھا۔ یہ وہی لوگ تھے جن پر وہ اپنی محبتیں اور چاہتیں نچھاور کرتا تھا۔ راتوں کے اندھیرے میں اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر نکلتا تھا اور چپکے سے ان کی مدد کرتا تھا، مصیبت میں ان کے کام آتا تھا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے اپنے اہم ترین کام پسِ پشت ڈال دیتا تھا۔ یہ بے لوث تعلق تھا... اور اس تعلق کی بدولت آج سیکڑوں آنسو اس کی صحت یابی کے لیے گر رہے تھے۔ ان گنت ہاتھ اس کو دعا دینے کے لیے اٹھائے گئے تھے۔ بوڑھے، نادار، معذور، مفلس سب طرح کے لوگ اس ہجوم میں شامل تھے۔ اس کی کھٹارا موٹر سائیکل گھر کے برآمدے میں کھڑی تھی۔ میں نے ایک ملنگ نما بوڑھے کو دیکھا، اس نے موٹر سائیکل کو باقاعدہ چوما اور پھر اپنی گدڑی سے اسے صاف کرنے لگا۔

قاری حبیب اللہ نے قریبی مسجد میں سورۂ یٰسین کا اہتمام کر رکھا تھا۔ وہاں مدرسے کے بچے اور بہت سے دیگر افراد جمع تھے۔ کوئی شخص چاول کی تین چار دیگیں پکوا کر لے آیا تھا جو لوگوں میں تقسیم کی جا رہی تھیں۔

رات نو بجے کے قریب پھر شاہین نے فون کال کی۔ "تابش بھائی! کوئی فون آیا میونخ سے؟"

"ہاں، ابھی پندرہ منٹ پہلے آیا ہے۔ اس کی حالت اب بہتر ہے۔"

"وہ تو کہہ رہے تھے کہ خطرے سے باہر نہیں۔"

"نہیں، اب ایسی بات نہیں۔"

اسی دوران میں جگت سنگھ اندر آیا۔ اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ جیلانی صاحب باہر گاڑی میں بلا رہے ہیں۔

میں شاہین سے بات ختم کر کے باہر نکلا۔ گھر کے دروازے سے باہر پہنچا تو ہجوم میری طرف امڈ آیا۔ وہ مجھ سے عمران کی حالت کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آس و امید کے دیے ٹمٹما رہے تھے۔ میں نے بمشکل ان کے درمیان سے راستہ بنایا اور بتایا کہ ابھی کچھ دیر میں فون آنے والا ہے پھر آپ کو تازہ صورتِ حال بتائیں گے۔

میں جگت سنگھ کے ساتھ باہر سڑک پر پہنچا۔ یہاں ٹی وی چینلز کی چند گاڑیاں بھی کھڑی نظر آئیں۔ ان سے پہلو بچاتے ہوئے میں اور جگت ملحقہ سڑک پر گئے۔ یہاں جیلانی اسٹیشن وین میں موجود تھا۔ جگت باہر رہا، میں اندر گیا۔ جیلانی بالکل گم صم بیٹھا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔

"کیا اطلاع ہے جیلانی؟"

"عمران صاحب کی حالت ٹھیک نہیں... ابھی فون آیا ہے... ان کی ریڑھ کی چوٹ انہیں سنبھلنے نہیں دے رہی۔ وہ... بہت... نازک حالت میں ہیں۔" جیلانی کی آواز ٹوٹ رہی تھی۔

میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ میری رگوں

میں خون جمنے لگا۔ اردگرد کی ہر شے گردش کرتی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے شانوں سے پکڑا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"جیلانی... کہاں ہے عمران؟ سچ بتاؤ... جھوٹ نہ بولنا۔"

جیلانی نے یکایک مجھے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ کرب کی انتہا کو چھو کر بلند آواز میں بولا۔ "وہ چلا گیا... وہ چلا گیا تابش صاحب... چھوڑ گیا ہم سب کو۔ وہ مر گیا تابش صاحب... وہ مر گیا..."

جیلانی کی دردناک پکار اسٹیشن وین کے خلا میں گونجنے لگی۔ میرا ذہن جیسے ماؤف ہو گیا۔ مجھے لگا میرے کان بند ہو گئے ہیں۔ حسیات دم توڑ گئی ہیں۔ جیلانی چلا رہا تھا، رو رہا تھا، بول رہا تھا لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے پوری شدت سے اس کے بازوؤں کا حلقہ توڑا اور اتنے زور سے اسے دھکا دیا کہ وہ وین کی درمیانی نشست پر جا گرا اور کھڑکی ٹوٹ گئی۔ "بکواس بند کرو۔" میں سینے کی پوری قوت سے دہاڑا۔ "تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے، وہ نہیں مر سکتا... وہ نہیں مر سکتا۔"

جیلانی ایک بار پھر میری طرف آیا اور مجھے سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے بند کر دیا۔ "خبردار، اگر تم نے ایک لفظ بھی کہا تو... تمہیں کسی نے غلط بتایا ہے۔ کس نے بتایا ہے؟ کس نے بتایا ہے؟"

کوئی چیز لگنے سے کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔ ہماری آوازیں باہر جا رہی تھیں۔ لوگ اسٹیشن وین کی طرف لپکے۔ میڈیا والے بھی دوڑے آئے۔ کیمرے حرکت کرنے لگے۔ لائٹیں چمکنے لگیں۔

یہی وقت تھا جب میں نے جان محمد صاحب کو دیکھا۔ وہ بھی روتے ہوئے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ جو بھیانک ترین خبر ہم تک پہنچی ہے، وہ درست ہے۔ جس قیامت کا ڈر تھا، وہ ہم پر ٹوٹ چکی ہے۔

میں نے قمیص کے نیچے سے پستول نکال لیا۔ لیکن مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ مجھے اس پستول کو کیا کرنا ہے۔ خود کو گولی مارنی ہے، خبر سنانے والے کو مارنی ہے یا پھر کسی ایسے دشمن کو جو اس خبر کا ذمے دار ہے۔ دل کے کسی گوشے میں یہ آس بھی سر اٹھا رہی تھی کہ کاش یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب ہو۔ ابھی میں اٹھ بیٹھوں اور یہ سب کچھ بکھر جائے۔ اردگرد کی ہر چیز دھندلا رہی تھی۔ چہرے، آوازیں، روشنیاں، سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھاما اور زمین کی طرف جھکتا چلا گیا۔ میرے اردگرد آہ و بکا کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

عمران مر گیا۔ ایک روشن ستارہ بجھ گیا۔ ایک مسکراتا چہرہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گیا۔ دعائیں، التجائیں، تمنائیں، سسکیاں، کچھ بھی اسے جانے سے نہ روک سکا۔ یہی قدرت کا اصول ہے۔ وہ اوپر والا جب کسی کو لے جانے کا فیصلہ کرتا ہے تو پھر دنیا کے بہترین دماغ، جدید ترین طبی سہولتیں اور تمام مادی قوتیں مل کر بھی اسے روک نہیں سکتیں۔ وہ لے جاتا ہے اور کہتا ہے، یقین کرو میری قدرت پر۔

بے شک موت اٹل ہے اور سب کے لیے ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی کس طرح مرتا ہے۔ بقول شاعر... جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے

جس بانکپن سے کوئی اجل کو گلے سے لگاتا ہے، وہ بانکپن زندہ لوگوں کے لیے امر ہو جاتا ہے اور ان کو جینے مرنے کی راہیں دکھاتا ہے۔

وہ خطروں کا کھلاڑی تھا۔ ہر روز موت سے اس کی ملاقات ہوتی تھی۔ بارڈر ایریا کے ریسٹ ہاؤس کے سامنے اس ٹیلے پر جہاں اس نے قریباً پانچ منٹ تک تن تنہا درجنوں بھارتی فوجیوں کا راستہ روکا تھا۔ وہ ایک چٹان کی طرح ڈٹ گیا تھا۔ گرتے جیپ اور گولیوں کی بوچھاڑوں کے درمیان ایک دیوار بن گیا تھا۔ یوں لڑا تھا کہ چشم فلک نے بھی مرحبا کہا ہوگا۔ وہ منظر ایسا نہیں تھا کہ کبھی اسے فراموش کیا جا سکتا۔

سب کچھ ہو چکا تھا۔ مصدقہ خبریں آ چکی تھیں۔ پھر بھی نہ جانے دیوانہ دل مانتا کیوں نہیں تھا۔ یہی لگتا تھا کہ ابھی میرے فون کی بیل ہو گی۔ اس کی مسکراتی آواز سنائی دے گی۔ "جگر! چکر دے دیا نا سب کو۔ یہاں میونخ میں ریما اور نرگس کے ساتھ شوٹنگ فرما رہا ہوں... سوئمنگ کر رہا ہوں اور فائیو اسٹار بوفے کھا رہا ہوں۔ بس جلدی سے آ جاؤ تم بھی۔ بڑی لمبی چوڑی پلاننگ کرنی ہے... ایک دو کڑاکے دار پروگرام بنانے ہیں۔"

لیکن فون خاموش تھا۔ اب اس پر ایسی کوئی کال نہیں آنا تھی، نہ ہی اس کی اسکرین پر کبھی عمران کا نام چمکنا تھا۔ رو رو کر میرے آنسو خشک ہو چکے تھے مگر سینے کے الاؤ مدھم نہیں ہو رہے تھے اور نہ ہی یقین آ رہا تھا کہ وہ مر چکا ہے... یہاں تک کہ دو دن بعد اس کا تابوت لاہور پہنچ گیا۔ میں نے اس کی شکل دیکھ لی۔ تابوت کے شیشے میں اس کی ٹھوڑی کا گڑھا کسی نگینے کی طرح چمکتا تھا۔ بند آنکھیں دیکھ کر لگتا تھا جیسے شرارت کر رہا ہو۔ بے شمار سوگوار اس کے اردگرد موجود تھے۔ اس کے تابوت سے لپٹ رہے تھے، دھاڑیں مار

رہے تھے۔ وہ ان کا غم خوار اور مسیحا تھا... اور شاید محافظ بھی۔ وہ ان کے لیے دشمن کے قلب میں گھستا تھا۔ دشمن کی پناہ گاہوں میں گھس کر ان کو مارتا تھا۔ وہ برسوں اپنی بچھڑی ماں کو ڈھونڈتا رہا پر وہ انڈین جیلوں کے اندھیروں میں گم ہو گئی۔ وہ تو اسے نہ مل سکی لیکن اس نے اور بہت سی ماؤں، بہنوں اور بھائیوں، بیٹوں کو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے انہیں انڈین ایجنسیوں کے بے رحم چنگل سے نکالا، ان کی جیلیں توڑیں اور انہیں پاکستان کی آزاد فضاؤں میں پہنچایا۔ وہ وطن کا بیٹا تھا۔ اس کی ساری دشمنیاں اپنے وطن کے حوالے سے تھیں۔ وہ کسی اور روپ میں جیتا تھا۔ لوگ اسے سرکس کے نڈر شومین کے طور پر جانتے تھے۔ وہ ریوالور کے نہایت خطرناک کھیل کھیلتا تھا۔ ایسے شوز کے لیے وہ انڈیا بھی جاتا تھا مگر اس کا اصل روپ تو یہی تھا۔ دشمن کے ملک میں گھس کر اس کو مات دینا اور اس کے سینے پر اپنی برتری کا جھنڈا گاڑنا۔ اس نے اَن گنت جھنڈے گاڑے اور جب ایک رات وہ گھیر لیا گیا، اس خونی ٹیلے کے گرد اس کے سارے دشمن یکجا ہو کر اس پر پل پڑے تو اس نے وہی کیا جو شیر کرتا ہے اور شیر دل کرتے ہیں۔ اس نے انہیں للکارا اور فقط ”پانچ چھ منٹ“ کے اندر ان کو عذاب اور ہلاکت کی پانچ چھ صدیوں میں سے گزار دیا۔ چاروں طرف ان کی لاشیں بکھیر دیں۔ بتا دیا ان کو کہ کس طمطراق سے جیا جاتا ہے اور جب وقت آن پڑے تو کس شان سے مرا جاتا ہے۔

میری حسیات جیسے کند ہو چکی تھیں۔ میرے اردگرد سب کچھ دھندلا دھندلا سا تھا۔ آوازیں کہیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ میرے یار کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا تھا۔ چاہنے والوں نے اسے پھولوں سے لاد دیا تھا، دولہا بنا دیا تھا۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ میں ایک حقیر تنکے کی طرح اس سمندر میں بہا جا رہا تھا... تم بہت آگے نکل گئے عمران! میں بہت پیچھے رہ گیا۔ تم ہر جگہ جیت جاتے تھے، تم آج بھی جیت گئے... یار! ایک بار تو مجھے جینے کا موقع دے دیتے۔ ازراہِ مروت ہی سہی... اخلاقاً ہی سہی، اس وقت کہہ دیتے... اس ٹیلے پر اس وقت کہہ دیتے، تم فائرنگ کرو۔ میں زخمیوں کو پیچھے لے کر جاتا ہوں۔ تم اس وقت بھی خطروں کے ٹھیکیدار بنے... تم نے اس وقت بھی سب کچھ اپنے سینے پر جھیلا... بڑی ناانصافی کی تم نے میرے ساتھ۔ بہت بُرا کیا... اب کیا کروں گا میں؟ کہاں ڈھونڈوں گا تمہیں؟ اس شہر کی گلیاں مجھے کھانے کو آئیں گی۔ اس کے ریستوران، اس کے باغ، اس کے بازار... اور تیری وہ کھٹارا موٹر سائیکل... کیا یہ سارے منظر جینے دیں گے مجھے؟ یہ نہیں جینے دیں گے۔ اب مجھے بھی مر جانا چاہیے۔ اب یہاں کچھ نہیں میرے لیے۔

میں نے روتے روتے سوچا... ہاں ٹھیک ہے۔ میں اپنے اس دولہے کو دفن کر لوں۔ پھر میں بھی نکلوں گا، میں بھی مر جاؤں گا۔ مجھ سے اب نہیں جیا جائے گا۔

عمران میانی صاحب میں سپردِ خاک ہو گیا۔ اپنی ساری مسکراہٹوں، چہکاروں اور قہقہوں سمیت نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اپنے دیرینہ دوست اقبال کے پہلو میں اس کی قبر بنی۔ راوی روڈ بازار کے ایک لڑکے نے اس کی گل پوش قبر کے نزدیک ایک کتبہ لگا دیا۔ شہید کی جو موت ہے، وہ قوم کی حیات ہے۔

میری سماعت میں وہی بول گونجنے لگے جو ہر شہیدِ وطن کی رحلت پر فضاؤں میں سرایت کرتے ہیں۔ اے راہ حق کے شہیدو... وفا کی تصویرو، وطن کی ہوائیں تمہیں سلام کہتی ہیں۔

میرا دولہا دوست پہلے مٹی اور پھر پھولوں میں چھپ گیا۔ میں اب یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر جیلانی سائے کی طرح ساتھ لگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہم سب کی سیکیورٹی کے مسائل ہیں۔ وہ مجھے پھر سے عمران کے گھر لے آیا۔ دس مرلے کا وہ گھر جس میں اس نے اپنی زندگی کے اہم سال گزارے تھے۔ میں ان در و دیوار کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کوئی میرے ساتھ لپٹ گیا۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ یہ شاہین تھی۔ میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک اپنی آنکھوں کا پانی نچوڑتی رہی۔ میرے پاس کہنے کو کیا تھا جو اس سے کہتا۔ میرے پاس تو شاید آنسو بھی نہیں بچے تھے۔ میں بس خاموشی کی زبان میں اسے دلاسا دیتا رہا۔ ایک فوجی آگے آیا۔ یہ کیپٹن ڈاکٹر شرجیل تھا۔ اس نے ایک لفافہ شاہین کے حوالے کیا۔ اس میں عمران کی ذاتی اشیا تھیں۔ یہ اشیا کراچی میں آپریشن تھیٹر میں لے جاتے ہوئے عمران سے علیحدہ کی گئی تھیں۔ اس کا چرمی پرس، اس کی رسٹ واچ، سگریٹ کا پیکٹ، لائٹر، ایک رنگ اور اس طرح کی کچھ چیزیں۔ کیپٹن ڈاکٹر شرجیل نے کہا۔ ”میڈم! عمران صاحب نے کہا تھا، یہ آپ کو دے دی جائیں۔“

شاہین نے یہ سب کچھ دیکھا۔ اپنی اوڑھنی کے پلو میں باندھ کر اسے گرہ لگائی اور اس گرہ کو سینے سے لگا کر ہجوم میں گم ہو گئی۔

نہ جانے کیوں اس وقت عمران کے وہ آخری الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے جو اس نے فون پر شاہین سے کہے تھے۔ ہم اس وقت ریسٹ ہاؤس کے سامنے بی ایس ایف والوں سے برسرِپیکار تھے۔ فائرنگ ہو رہی تھی۔ عمران نے حسبِ معمول مذاق کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ شوٹنگ کی فائنگ ہے۔ آخر میں وہ بولا تھا... اچھا ڈیئر! اگلا شاٹ تیار ہو گیا ہے... ڈائریکٹر صاحب بلا رہے ہیں... خدا حافظ۔ اگلا شاٹ اس کی موت کا شاٹ تھا۔

جیلانی اور امتیاز کو بھی عمران کے غم نے نڈھال کر رکھا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہم تینوں میں سے کس کا غم زیادہ ہے۔ رات کو میں نیم جان سا چٹائی پر لیٹ گیا۔ جگجیت سنگھ میرے قریب ہی صوفے پر سویا ہوا تھا۔ جیلانی اور امتیاز کچھ فاصلے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ شاید انہوں نے سمجھا کہ میں سو گیا ہوں۔ جیلانی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”اس کا بچنا محال تھا۔ منگل کے روز ہی اس کی حالت بڑی نازک تھی، بالکل بے ہوش پڑی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کی نالیاں اور دوسرے ہیلپنگ انسٹرومنٹس اتار دیے تھے۔ بے چاری کی بدقسمتی یہ رہی کہ عمران صاحب خود زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئے، ورنہ لگتا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ کریں گے۔ وہ ڈونیشن کے لیے بھاری رقم کا انتظام بھی کر چکے تھے۔ بس سارے قدرت کے کھیل ہیں۔“

میں جان گیا کہ یہ گفتگو ثروت کی بہن نصرت کے بارے میں ہو رہی ہے۔ اسے نہایت نازک حالت میں ویانا پہنچایا گیا تھا۔ ثروت اور یوسف بھی اس کے پیچھے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہم انسان کو کھا جاتے ہیں۔ کیا نصرت کو بھی واہموں نے ہی کھایا تھا؟ بہرحال پتا نہیں کیوں اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ یہاں تک کہ ثروت کا خیال بھی اب ذہن سے کہیں بہت دور جا چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے اور یوسف کے حالات سے مجھے کوئی غرض ہی نہیں ہے۔ بارو بندا جیکی نے کبھی کہا تھا... ہر کہانی کا انجام مرضی کے مطابق نہیں ہوتا۔ مگر ہر انجام میں زندگی موجود ہوتی ہے اور اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ اپنا رستہ خود ڈھونڈتی ہے۔ وہ کہتا تھا کہ زندگی دکھ ہے اور خود ہی اس کا مداوا بھی ہے۔

رات پچھلے پہر ہم چاروں جاگ گئے۔ دیر تک بیٹھے رہے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔ میں بہت کم سگریٹ پیتا تھا لیکن اب پی رہا تھا... بالکل کسی ”چین اسموکر“ کی طرح۔ اور یہ سگریٹ بھی عمران ہی کے تھے۔ ہمارے سینوں میں ایک آگ روشن تھی۔ غیظ و غضب کی ایک لہر تھی جو جسم کے ہر حصے میں پھیلتی تھی اور سر ٹکراتی تھی۔ صبح تین بجے کے قریب ہمیں وہ فون کال آئی جس کا انتظار تھا۔ جیلانی کے ایک ساتھی نے ایک خاص اطلاع دی۔ یہ اطلاع سلطان چنا، سیکریٹری ندیم اور ان کے دو خاص ساتھیوں کے بارے میں تھی۔ عمران کی موت کے فوراً بعد سے یہ لوگ اپنے ٹھکانوں سے غائب تھے۔ آج تیسرے روز ہمیں یہ کامیابی ملی تھی۔ ہم پہلے ہی پوری طرح تیار تھے۔ ایک تاریک شیشوں والی کرولا میں بیٹھ کر نکل گئے۔ ہمیں لاہور سے باہر جانا پڑا۔ قلعہ ستار شاہ کے قریب چاولوں کا ایک بہت بڑا گودام تھا اور ساتھ میں شیلر بھی تھا۔ یہ جگہ ایک سیاسی پارٹی کے اہم رکن کی ملکیت تھی۔ ہماری اطلاع کے مطابق سلطان چنا یہیں موجود تھا۔ ہم نے تیزی سے کارروائی کر کے دو چوکیداروں کو رسیوں سے باندھ دیا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے۔ اس کے بعد ہم اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ عمران کا سائیلنسر لگا پستول اس وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ یہ پستول میرے ہاتھ میں جیسے اس کی نمائندگی کر رہا تھا۔ گودام کے ساتھ ہی ایک اینیکسی نما عمارت تھی۔ اس عمارت میں بڑی بڑی خوفناک مونچھوں والا ایک مسلح شخص ہمارے سامنے آیا۔ وہ بہت خطرناک نظر آتا تھا مگر اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ جو بندے اس کے سامنے آئے ہیں وہ اس وقت کس آگ میں جل رہے ہیں اور کتنے جان لیوا ثابت ہوں گے۔ میرے سائیلنسر لگے پستول سے یکے بعد دیگرے دو گولیاں نکلیں اور وہ رائفل سیدھی کرنے کی حسرت دل میں ہی لے کر فرش بوس ہو گیا۔

ہم ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ یہاں سیکریٹری ندیم سے ملاقات ہو گئی۔ بظاہر نفیس نظر آنے والا یہ شخص پرلے درجے کا رنگ باز تھا۔ شروع شروع میں سویٹی عرف ایشوریا رائے کے حسن سے اسی نے شب و روز خراج وصول کیا تھا۔ اب بھی اس کی حالت سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کچھ دیر پہلے کسی بنت حوا کے قرب سے حظ اٹھاتا رہا ہے۔ ایک بڑی ٹرے میں چکن کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور شراب کی تقریباً خالی بوتل پڑی تھی۔ گلاس فرش پر لڑھکا ہوا تھا۔ کمرے میں کوئی لڑکی موجود نہیں تھی لیکن نسوانی پرفیوم کی خوشبو موجود تھی۔ سیکریٹری ندیم بستر پر اوندھا پڑا تھا۔ وہ عریاں تھا۔ فقط اس کے جسم کے درمیانی حصے پر ایک تولیا نما کپڑا پڑا تھا۔ جیلانی نے آگے بڑھ کر پستول کے بیرل سے یہ کپڑا ہٹا دیا۔ وہ سرتاپا عریاں ہو گیا۔ لیکن اسی طرح مدہوش

پڑا رہا۔ اس نے سمجھا، شاید یہ اس کی ساتھی لڑکی ہے۔ مدہوشی میں ہی بولا۔ ”اوئے کیا کرتی ہے بدبختے! اب ذرا دو گھنٹے ٹھونکا لگانے دے (آرام کرنے دے)۔“

میں نے اس کی پشت پر زوردار لات رسید کی۔ وہ تڑپ کر سیدھا ہوا۔ ”تجھے ٹھونکا لگوانے کے لیے ہی آئے ہیں۔ بڑا لمبا ٹھونکا ہوگا اس دفعہ۔“ میں نے کہا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چندھیائی ہوئی نظروں سے ہمیں دیکھا۔ پھر وہ تولیا ڈھونڈا جس نے اس کا ستر چھپا رکھا تھا۔ تولیا جیلانی کے پستول کے بیرل سے جھول رہا تھا۔ عینک کے بغیر بھی اس نے کم از کم تولیا تو دیکھ ہی لیا۔ تب اس نے مڑ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ یہاں ایسا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف گیا۔ اس کی ٹانگ کچھ عرصہ پہلے راجا نے توڑی تھی۔ پہلی گولی اسے میں نے ماری اور یہ اسی جگہ تھی جہاں اس نے کچھ دیر پہلے تولیا رکھا ہوا تھا۔ دوسری گولی جیلانی نے چلائی۔ یہ بھی سائیلنسر لگا پستول تھا اور صرف ٹھک کی مخصوص آواز پیدا کرتا تھا۔ یہ گولی ندیم کی گردن کے پچھلے حصے میں لگی اور دانت توڑ کر منہ کی طرف سے نکل آئی۔ مزید تسلی کے لیے میں نے تیسری گولی اس کے سینے میں اتار دی۔

لڑکی کمرے میں ہی موجود تھی۔ وہ واش روم میں تھی۔ اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا پھر دروازہ بند کیا اور مدد کے لیے چلانے لگی۔ بند واش روم سے اس کی آواز بھلا کس کے کانوں تک پہنچنی تھی۔ اس نے اندر سے کنڈی لگائی تھی۔ ہم نے باہر سے بھی لگا دی اور اس دوسرے کمرے کی طرف بڑھے جہاں سلطان چٹا کی موجودگی کا امکان تھا۔ سلطان چٹا بھی جہازی سائز کے بیڈ پر مدہوش پڑا تھا۔ یہاں کسی عورت کے آثار نہیں تھے، تاہم سلطان چٹا کا بالائی جسم عریاں تھا۔ اس کے بازوؤں کی توانا مچھلیوں پر بے ہودہ ٹیٹوز بنے ہوئے تھے۔ وہ گونج دار خراٹے لے رہا تھا۔ نائٹ بلب کی روشنی میں سائڈ ٹیبل پر دو پاسپورٹ پڑے نظر آئے۔ جیلانی نے پاسپورٹ اٹھائے۔ ایک سلطان چٹا کا تھا، دوسرا ایک معروف پاکستانی ایکٹریس کا۔ پاسپورٹوں پر ترکی کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں او کے ٹکٹ بھی تھے، ان پر روانگی کی تاریخ کل دوپہر کی تھی۔ ہم نے دیکھا، کمرے میں دو تین تیار اٹیچی کیس بھی پڑے ہیں۔

جیلانی نے ہولے سے کہا۔ ”لگتا ہے جناب چٹا صاحب فرار ہو رہے ہیں... استنبول میں موجیں کرنے کے لیے۔“

”اور نقلی نہیں اصلی ایکٹریس کے ساتھ۔“ امتیاز نے کہا۔

جگت سنگھ نے اپنی مونچھ کو مروڑا دیا۔ ”دوجوں کے لیے نقلی مال اپنے لیے اصلی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی کرپان چبھو کر سلطان چٹا کو جگایا۔ وہ چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا پھر یہی لگا جیسے اس نے موت کے فرشتوں کو روبرو دیکھا ہے۔ اس کا رنگ لیموں سے زیادہ زرد ہو گیا۔ اس کے کان میں گولی کا سوراخ عمران کے باکمال نشانے کی یادگار تھا۔ ”کک... کیا بات ہے؟“ وہ ہکلایا۔

”تمہیں جہاز پر بٹھانے کے لیے آئے ہیں۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

جگت بولا۔ ”پر یہ جہاز جب اڈے گا تو اوپر ہی اوپر جائے گا... سیدھا رب سوہنے کے سامنے جا کر اتارے گا تجھے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کرپان کا ایک وار سلطان کے پہلو میں کیا۔ سلطان تڑپا۔ میں نے امتیاز کے ہاتھ سے آٹومیٹک رائفل لی اور سلطان کو بھون کر رکھ دیا۔ سلطان اور اس کے بستر میں درجنوں سوراخ ہو گئے ہوں گے۔ جیلانی نے اس کے منہ پر تھوکا اور ایک گولی عین اس کی پیشانی میں اتاری۔ وہ اپنے جہازی سائز کے بستر کو لہو رنگ کرنے لگا۔ یہ اقبال کی موت کا بدلہ بھی تھا۔

یہی وقت تھا جب بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ جگت نے لات مار کر دروازہ کھولا اور امتیاز نے رائفل سے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ کئی افراد زخمی ہو کر گرے۔ جگت سنگھ کے پاس اب تک دو کالے انار (دستی بم) موجود تھے۔ پتا نہیں اس نے کیسے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ اسے عشق تھا ان ”اناروں“ سے۔ یہاں بھی وہ یہ بم استعمال کرنے سے نہیں چوکا اور اس نے ٹھیک ہی کیا تھا۔ ورنہ جتنے لوگ یکایک گودام کی طرف سے آئے تھے، ان سے نمٹنا مشکل ہو جاتا۔ دھماکوں اور شعلوں سے قرب و جوار لرز اٹھے۔ گودام کے ایک حصے میں آگ لگ گئی۔ ہم فائرنگ کرتے ہوئے واپس اپنی گاڑی کی طرف بھاگے... اور نکلنے میں کامیاب رہے۔ جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ یہ دو تین گاڑیاں تھیں۔ ہم نے تیز رفتاری سے شیخوپورہ کی طرف سفر جاری رکھا۔ کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ ان گاڑیوں کے ساتھ پولیس کی گاڑیاں بھی شامل ہو گئی ہیں۔ ان کی نیلی بتیاں دکھائی دے رہی تھیں اور ہوٹرز بھی سنائی دیتے تھے۔ یقیناً وائرلیس پر پیغام چل گئے تھے۔ عین ممکن تھا کہ یہ پولیس والے اس سیاسی لیڈر کے زیرِ اثر ہوں

جس کے ڈیرے پر سلطان چٹا نے پناہ لے رکھی تھی۔ میں نے چلتی گاڑی سے حمزہ صاحب کو فون کرنا چاہا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ وہ فون بند کر کے سو رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ جاگتے بھی ہوتے تو خاطر خواہ مدد نہ کر سکتے۔ مخالف پارٹی کا اثر و رسوخ تو ظاہر ہونا ہی تھا، خاص طور سے جب اتنی بڑی واردات ہو چکی تھی۔

گاڑی جیلانی ڈرائیو کر رہا تھا۔ آٹھ دس میل آگے جا کر اچانک گاڑی کو جھٹکے لگنے لگے۔ ”اوگاڈ!“ جیلانی نے کہا۔ ”پیٹرول ختم۔“

ہم نے گاڑی کو درختوں میں گھسا دیا اور روشنیاں بجھا دیں۔ وہ کافی آگے تک چلی گئی۔ جونہی وہ رکی، ہم چھلانگیں لگا کر نکلے۔ جیلانی نے کہا۔ ”ہمیں دو ٹولیوں میں نکلنا چاہیے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اور جگت شمال کی طرف گئے جبکہ جیلانی اور امتیاز جنوب مشرق کی طرف نکلے۔ درختوں میں بہت سی ہیڈ لائٹس چمکنا شروع ہو گئی تھیں۔ ٹارچیں بھی تھیں۔ وہ لوگ ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ جگت سنگھ پاؤں دبا کر چل رہا ہے۔ اس کی ٹانگ میں گولی لگ چکی تھی اور یہ گولی گودام والی جھڑپ میں ہی لگی تھی۔

☆☆☆

رات کے پچھلے پہر کی خنکی میں یہ ایک طویل تعاقب ثابت ہوا۔ ہم کیچڑ میں لت پت تھے، لگا ہے بگا ہے میں جگت کو سہارا بھی دے رہا تھا۔ اچانک ایک سوئے (چھوٹی نہر) کے کنارے مجھے ایک لوڈر اور ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ میں اور جگت جیپ کی طرف بڑھے۔ یہ دو تین شکاری تھے جو سحری کے وقت یہاں مچھلیوں کی تاک میں بیٹھے تھے۔ میرا ارادہ ان پر پستول تاننے اور گاڑی حاصل کرنے کا تھا لیکن پھر ایک شخص کو دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ یہ سہراب جلالی صاحب تھے... جنہیں عمران بابا جلالی کہتا تھا۔ بابے جلالی نے بھی مجھے پہچان لیا اور اپنی بیکال شکاری رائفل نیچے رکھ دی۔ ”اوہ تابش باور چی تم؟“ وہ حسبِ عادت بولا۔

”جلالی صاحب! ہمارے پیچھے لوگ ہیں۔ ہم یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں فوراً۔“

ضعیف ہونے کے باوجود جلالی کمال کا باہمت شخص تھا۔ ”اسٹینڈ“ لینا جانتا تھا۔

اس نے چھوٹے لوڈر پر فوراً ہمیں اپنے دو کارندوں کے ساتھ روانہ کر دیا اور خود پیچھے آنے والوں کے سوال جواب کے لیے تیار ہو گیا۔ بوڑھے جلالی سے یہ ملاقات کسی کرشمے سے کم نہیں تھی۔ ورنہ زخمی جگت کی وجہ سے مجھے لگ رہا تھا کہ شاید ریسٹ ہاؤس کی طرح ہم آج یہاں بھی نرغے میں آ جائیں گے۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ہم بھاگ دوڑ میں جلالی فارم ہاؤس کے قریب آ چکے ہیں۔ صرف بیس منٹ کے سفر کے بعد ہمیں فارم ہاؤس کے آثار نظر آ گئے... کچھ ہی دیر بعد جلالی کے نجی چڑیا گھر کے جانوروں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ دس منٹ بعد ہم فارم ہاؤس کے اندر رہائشی حصے میں موجود تھے۔ ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ ڈاکٹر مہناز کی شکل بھی نظر آ گئی۔ اسے بابے طفیل نے نیند سے جگایا تھا۔ ڈاکٹر مہناز بھی ہمیں یہاں دیکھ کر ششدر ہوئی۔ اس نے فوری طور پر جگت سنگھ کا معائنہ کیا۔ گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیر کر نکلی تھی۔ چربیلے جسم کی وجہ سے بہت خون بھی نہیں بہا تھا۔ مہناز نے اچھی طرح اس کی مرہم پٹی کر دی اور درد کش گولیاں بھی دے دیں۔ دیگر افراد کے سامنے اس نے ہم سے زیادہ سوال جواب نہیں کیے۔ بابے جلالی کی آمد صبح سات بجے کے قریب ہوئی۔ انہوں نے حسب عادت نیکر پہن رکھی تھی جس میں ان کی سوکھی سڑی ٹانگیں دو بیساکھیوں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ سر پر سرخ پی کیپ تھی۔ جلالی صاحب نے ہمیں تسلی دی کہ سب ٹھیک ہے۔ خوش قسمتی سے، ہمارا تعاقب کرنے والے اس جگہ پہنچے ہی نہیں تھے جہاں بابا جلالی موجود تھے۔

بابے جلالی کے دبلے پتلے جسم کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ یہ بندہ اپنی ظاہری حالت سے کہیں زیادہ مضبوط تھا اور اس سے زیادہ اس کا ارادہ مضبوط تھا۔ وہ جس بات پر اڑ جاتا تھا، بس لوہے پتھر کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر مہناز سے کہا کہ وہ کمرے میں رکھا ہوا ٹی وی آن کرے۔ مہناز نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے کچھ دیر پہلے کوئی خبر دیکھی ہے جو اب ہمیں بھی دکھانا چاہتا ہے۔ یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ ایک نیوز چینل پر رات آخری پہر والے واقعے کی دھواں دھار نیوز چل رہی تھی۔ سابق ایم این اے مشتاق گورایا کے شیلر پر خوفناک واردات ہوئی تھی۔ اس واردات میں سلطان چٹا اور سیکریٹری ندیم کے علاوہ گورایا کے جواں سال بیٹے کی موت کی خبر بھی تھی۔ بتایا جا رہا تھا کہ حملہ کرنے والوں نے خودکار رائفلیں اور دستی بم استعمال کیے اور تباہی مچا دی۔ اس واردات کے ڈانڈے بڑے وثوق سے عمران دانش کی موت سے جوڑے جا رہے تھے۔ واضح

طور پر میرا، جیلانی اور امتیاز وغیرہ کا نام لیا جا رہا تھا۔

آخر میں جلتے ہوئے گودام اور سر پیٹتے گورایا کی ویڈیو بھی دکھائی گئی اور بتایا گیا کہ پورے شہر کی پولیس حرکت میں ہے اور ملزمان کی تلاش میں چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ رات کی واردات کے بعد میرے سینے میں فروزاں شعلوں پر چند چھینٹے پڑے تھے۔ ایم این اے کا نام سن کر کچھ چھینٹے اور پڑے۔ یہ مجھے ایک بونس کی طرح لگا۔ یہ مشتاق گورایا وہی تھا...... جس نے پانچ سال قبل ثروت کی گمشدگی کے موقع پر سیٹھ سراج وغیرہ کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور ہماری کوئی پیش نہیں چلنے دی تھی۔

ٹی وی بند کرنے کے بعد جلالی نے بڑے جوش سے میری پیٹھ ٹھونکی۔ ”بہت خوب... سینہ ٹھنڈا کیا تم نے۔ میرے بس میں ہو تو اس چٹے کی لاش کو شیخوپورہ کی سڑکوں پر گھسیٹوں۔“ جلالی صاحب غصے سے ہانپنے لگے۔ مہناز نے جھٹ ایک چھوٹی سی گولی نکال کر میز پر رکھ دی تاکہ اگر کام زیادہ بگڑے تو وہ گولی نگل سکیں۔

میں جلالی صاحب کے اس جوش کی وجہ سمجھتا تھا۔ قریباً پانچ ماہ پہلے یہ سلطان چٹا ہی تھا جس نے نادر ٹی کو فارم ہاؤس پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔

جلالی صاحب نے اپنی نیکر کے گیلوز سیدھے کیے۔ پھر اپنے استخوانی ہاتھوں سے بڑی مضبوطی کے ساتھ میرے دونوں شانے جکڑے اور بولے۔ ”پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے تم دونوں کو پناہ دی ہے... اور جب پناہ دی ہے تو بس دی ہے۔ اب جان بھی چلی جائے گی تو تمہاری حفاظت کروں گا۔ دیکھوں گا کون مائی کا لال یہاں پہنچتا ہے اور تمہیں گرفتار کرتا ہے یہاں سے۔“ عمر رسیدہ سہراب جلالی کا وجود جوش اور غصے سے تھرتھر کانپنے لگا۔ گلے کی رگیں دھڑا دھڑ بج رہی تھیں اور نظر آ رہی تھیں۔

ڈاکٹر مہناز نے جلدی سے گولی اور پانی کا گلاس جلالی کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے گولی نگل لی اور اپنی غصیلی گفتگو جاری رکھی۔ ہم نے جو کچھ جاوا اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ کیا تھا، اس کی تفصیل انہیں ڈاکٹر مہناز سے معلوم ہو ہی چکی تھی۔ وہ بار بار میرے شانے تھپکتے تھے اور تعریفی کلمات ادا کرتے تھے۔ ڈاکٹر مہناز نے مجھے اشارے سے کہا کہ فی الحال میں ان کی کسی بات پر اختلاف نہ کروں اور خاموش رہوں۔

کچھ دیر بعد جلالی صاحب ہمیں پوری حفاظت کا یقین دلا کر چلے گئے تو جگت سنگھ نے حیران ہو کر کہا۔ ”بادشاہ زادے! یہ بابا جی سچ مچ کے ہیں یا بجلی وغیرہ سے چلتے ہیں؟“

میں بابے جلالی کے مزاج کو بڑی اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ جس طرح کچھ عرصہ پہلے جلالی صاحب کو آیا کوئے صورتی ملی تھی اور انہوں نے اس کے تحفظ کی قسم کھالی تھی، اسی طرح آج انہوں نے ہمیں پناہ دی تھی اور اس پناہ کی خاطر ہر خطرہ مول لینے کا برملا اظہار کر دیا تھا لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اس بوڑھے کمزور لیکن نہایت باہمت شخص کو کسی اور آزمائش میں نہیں ڈالوں گا... ہرگز نہیں۔

جلالی صاحب کے پاس ایک بہترین کمپنی کے سیکیورٹی گارڈز موجود تھے۔ انہوں نے شام تک کچھ مزید گارڈز منگوا لیے۔ انہوں نے ہماری خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ ہمیں لمبے عرصے تک یہاں چھپانے اور ٹھہرانے کا پکا ارادہ کر چکے تھے لیکن میری دلی کیفیت کچھ اور تھی۔ میں ہر اس چیز اور منظر سے دور چلا جانا چاہتا تھا جس کا تعلق کسی بھی صورت عمران سے ہو۔ وہ مجھے ہر شے میں اپنی جھلک دکھاتا تھا، مسکراتا تھا اور میرا دل خون کرتا تھا۔ یہاں اس فارم ہاؤس میں بھی ہر طرف اس کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔

رات کو جب سب سو گئے تو میں نے ڈاکٹر مہناز کے نام ایک مختصر خط لکھا۔ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر! میں آپ کی محبتوں کا متحمل نہیں ہوں۔ میں ان در و دیوار میں گھٹ کر مر جاؤں گا۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کیجیے گا اور جلالی صاحب کو بھی اس سے باز رکھیے گا۔ میرا ساتھی جگت سنگھ ابھی زخمی ہے۔ یہ بھی یہاں سے ننکانہ صاحب جانا چاہتا ہے لیکن امید ہے کہ آپ چار پانچ دن اس کی میزبانی کر لیں گے تاکہ یہ ٹھیک سے چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے۔ آپ کو زندگی کا نیا سفر مبارک۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں (یہ مہناز اور جلالی صاحب کی شادی کی طرف اشارہ تھا) خدا حافظ۔“

یہ خط میں نے مہناز کے میڈیکل باکس میں ایسی جگہ رکھ دیا جہاں اس کی نظر کا پڑنا لازمی تھا۔ جگت سنگھ دھسکی کا کوارٹر پی کر چت لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اس کے خراٹوں کی گونج تھی۔ وہ ایک دلیر اور بے لوث ساتھی تھا۔ لڑنا مرنا جانتا تھا اور مرنے والوں کا بدلہ لینا بھی۔ اس نے آشا کور اور گوبندر کی موت کا قرار واقعی بدلہ لیا تھا۔ ”خدا حافظ جگت سنگھ!“ میں نے دل ہی دل میں کہا اور جلتی ہوئی نم آنکھوں کے ساتھ نکل آیا۔ فارم ہاؤس کے گارڈز کو علم تھا کہ میری نقل و حرکت میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی۔ موسم سرد تھا۔ میرے پاس ایک پستول اور شکاری چاقو تھا۔ میں نے چادر کی بکل مار رکھی تھی اور شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ میں درختوں کے نیچے پھیلی ہوئی تیرگی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہر خطرے سے بے نیاز۔

☆☆☆

میرے لیے زندگی میں اب کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ لگتا تھا کہ میں دماغی طور پر مر چکا ہوں۔ اردگرد کے ہر منظر میں اجنبیت اور ویرانی تھی۔ پتا نہیں میں کن کن راستوں پر چلتا، کن کن سواریوں پر سفر کرتا اور کہاں کہاں رکتا، لاہور اور شیخوپورہ سے بہت دور نکل آیا۔ میں بس چلتا ہی جا رہا تھا۔ کوئی مقصد تھا اور نہ کوئی منزل۔ پیٹ کا دوزخ، ایندھن مانگتا تھا تو جو ملتا تھا کھا لیتا تھا۔ ایک روز میں نے خود کو اس جگہ پایا جو دنیا میں جنت کا نمونہ تھی۔ یہ دریائے کنہار کی گزرگاہ تھی۔ کاغان سے آگے ناران کے بلند و بالا سرسبز پہاڑ تھے۔ یہ جنت ارضی تھی لیکن مجھے اس میں بھی ذرہ بھر کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن میرے موبائل فون پر بیل ہوئی۔ یہ جیلانی کی کال تھی۔ میں نے کال ریسیو کی لیکن پھر بات کرنے کا ارادہ بدل دیا اور موبائل توڑ کر دریائے کنہار کے پُرشور پانی میں پھینک دیا۔ میں جب تک زندہ تھا، اپنے ماضی سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

ناران کے مضافات میں ایک کھٹارا بس کے سفر کے دوران میں ایک مشفق بزرگ سے میری جان پہچان ہو گئی۔ پتا نہیں ان کے دل میں کیا آئی کہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔

انہوں نے ناران کی آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک شاندار باغ لگا رکھا تھا۔ وہیں پر مکان بھی تعمیر کیا ہوا تھا۔ ہر طرح کے پھل یہاں موجود تھے۔ انہوں نے دو گائے اور کچھ بکریاں پال رکھی تھیں۔ گھر میں ان کی بیوی اور چوبیس پچیس سال کے ایک معذور بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ یہ نوجوان ذہنی طور پر پسماندہ تھا اور اسے چلنے پھرنے میں بھی دشواری ہوتی تھی۔

میں عبدالغفور نامی ان بزرگ کے ساتھ ہی رہنے لگا۔ میری موجودگی سے انہیں ایک عجیب سے تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں اور کان ماضی کی طرف سے بالکل بند کر لیے تھے۔ فرح اور عاطف کی آوازیں، بالو کی کلکاریاں، ثروت کی مسکراہٹ اور سب سے بڑھ کر عمران کا چہرہ... میں کچھ یاد رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ میں یہ سب کچھ کھو چکا تھا اور جو میرا نہیں تھا، وہ میرے دل و دماغ کو کیوں اتنی بے رحمی سے زخمی کرتا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میرے جسم کو محنت مشقت اور اذیت سہنے کی عادت ہو چکی تھی۔ سردی گرمی مجھ پر بہت کم اثر کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے یخ بستہ سردیوں نے ناران کی فضاؤں کو ڈھانپ لیا۔ میں اس موسم میں بھی اکثر بغیر کسی گرم لباس کے گھومتا تھا۔ عبدالغفور صاحب اور ان کی بیوی کے بہت منع کرنے کے باوجود میں باغبانی میں ہاتھ بٹاتا تھا۔ گھنٹوں اور پہروں کی جان توڑ مشقت مجھے پسینے میں شرابور کر دیتی۔ میں اپنی جان لیوا سوچوں سے دور رہنے کے لیے اپنے جسم کو بالکل نڈھال کر لیتا۔ وہ بوڑھے میاں بیوی مجھے روکتے ہی رہ جاتے۔

دن گزرتے رہے... اندھیرے اور اجالے کے پنچھی ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے رہے۔ سورج پہاڑوں کی چوٹیوں پر ابھرتا اور ڈوبتا رہا۔ یخ بستہ ہوائیں وادیوں کو تہ و بالا کرتی رہیں۔ میں ان ویرانوں میں گھومتا رہا۔ عمران کی یادوں سے پیچھا چھڑاتا رہا اور اپنے لیے قبر کی کوئی اچھی سی جگہ تلاش کرتا رہا۔ مجھے اب موت کے سوا کسی کا انتظار نہیں تھا۔ میں کبھی کبھی شام کے وقت ڈائری میں کچھ لکھنے بھی بیٹھ جاتا۔ چند دن پہلے کا لکھا ہوا ایک صفحہ میرے سامنے تھا۔

”مجھے یہاں آئے ہوئے اب آٹھ مہینے سے اوپر ہو چکے ہیں۔ مجھے پیچھے کی کچھ خبر نہیں اور نہ ہی میں رکھنا چاہتا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ یہیں کہیں میری سانس پوری ہو جائے اور میں چیڑ اور دیودار کے بلند درختوں کے نیچے کسی قبر میں سو جاؤں۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہو سکا تو شاید میں یہاں سے واپس نہ جا سکوں۔ کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زندگی کا نظام چلتا ہی رہتا ہے۔ بالو بھی پروان چڑھ جائے گا۔ عاطف اور فرح کی زندگیاں بھی اپنی ڈگر پر چلنے لگیں گی۔ میں ان کے لیے زندگی گزارنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ آیا ہوں۔ لیکن میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میرا عمران نہیں ہے... اس کا چوڑا سینہ اور روشن آنکھیں نہیں ہیں۔ میرے پاس ثروت نہیں ہے، اس بے وفا کی آس نہیں ہے۔ مجھے اب نہیں پر مرنا زیادہ اچھا لگتا ہے...

”جیکی نے کہا تھا، سب کہانیوں کا انجام مرضی کے مطابق نہیں ہوتا لیکن ہر انجام میں زندگی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے موقع دیا جائے تو اپنے رستے خود ڈھونڈ لیتی ہے لیکن کبھی کبھی زندگی کو موقع دینا بہت مشکل ہو جاتا ہے، بہت مشکل۔

”آہ سلطانہ! تم نے مجھ سے زندگی کا وعدہ لیا تھا لیکن اب یہ وعدہ نبھانا میرے لیے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ میں

بہت شرمندہ ہوں تم سے۔ میں تمہارے بچے کے لیے بھی شرمندہ ہوں۔ بے شک بالو محفوظ ہاتھوں میں ہے لیکن میں اسے وہ محبت اور وہ زندگی نہیں دے سکا جو تم چاہتی تھیں۔ یہ سب کچھ میرے بس میں ہی نہیں ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔ اے بھانڈیل اسٹیٹ کے اس دور دراز قبرستان میں ابدی نیند سونے والی... مجھے معاف کر دینا۔"

میں نے ڈائری بند کی اور کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا۔ ایک آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ یہ عبدالغفور صاحب کی بیوی کی آواز تھی۔ میں انہیں خالہ کہتا تھا۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹے! ایک موٹر آئی ہے۔ مہمان ہیں، تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں بے طرح چونک گیا۔ میں نے قمیص کے نیچے بھرا ہوا پستول ٹٹولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ گھوما تو میری نگاہ ساکت رہ گئی۔ میں نے ایک خوش پوش لڑکی کو دیکھا... یہ نصرت تھی... ہاں نصرت تھی اور زندہ تھی۔ میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ وہ پھولوں کے تختوں کے درمیان نیم پختہ سیڑھیاں اترتی ہوئی میری طرف چلی آئی۔ اس کی ساڑی اور شال دھیرے دھیرے ہوا میں لہرا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ آگے آئی اور تابش بھائی کہہ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے شانوں سے ٹٹولا اور خود کو یقین دلایا کہ یہ جاگتی آنکھوں کا خواب نہیں۔ تب میری نگاہ اوپر گئی اور میں کیپٹن جیلانی کو دیکھ کر چونک پڑا۔ وہ بھی سیڑھیاں اتر کر میرے پاس آ گیا اور بغل گیر ہو گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ خود کو جیلانی سے چھڑاؤں، اسے دھکا دوں اور بھاگتا ہوا باغ کے ملگجے اندھیرے میں گم ہو جاؤں۔ یہ دونوں میرا ماضی تھے اور میں ماضی کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔

"بڑی مشکل سے ڈھونڈا ہے آپ کو۔ بہت گھمایا ہے آپ نے ان پہاڑوں میں۔" جیلانی کی آواز شکوہ کناں تھی۔

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے نصرت کو دیکھا۔

"میں نے تو سنا تھا کہ... کہ..."

"... میں مر گئی ہوں۔" اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ میرا فقرہ مکمل کیا۔ "ہاں بھائی! میں مر ہی گئی تھی۔ بس سانس کی ڈور ٹوٹنا باقی رہ گئی تھی... ایک... مسیحا آگے آیا اور اس نے مجھے بچا لیا۔ مجھے زندگی دے دی۔" وہ سسکیوں سے رونے لگی پھر روتے روتے بولی۔ "آپ کو پتا ہے وہ کون تھا... کون تھا جس نے مجھے موت سے چھینا؟"

میں ہکا بکا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

کیا وہ عمران کے بارے میں کچھ کہنے والی تھی؟ لیکن وہ نصرت کے لیے کیا کر سکا ہوگا۔ وہ تو خود بستر مرگ پر تھا... اپنی زندگی کے لیے لڑ رہا تھا۔ نصرت سسکیاں لیتی ہوئی ایک بار پھر میرے گلے لگ گئی... اور گلے لگے بولی۔ "عمران بھائی... انسان کے روپ میں فرشتہ تھے۔ وہ مرتے مرتے مجھے زندگی دے گئے۔ وہ خود منوں مٹی کے نیچے چلے گئے لیکن میرے اندر ان کا جگر زندہ ہے تابش بھائی۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ رہی تھی اور جسم پتھرا گیا تھا۔ یہ کیا کہہ رہی تھی نصرت؟ میں تو اسے مردہ جان چکا تھا اور وہ عمران کی بات کر رہی تھی۔ اس کے جگر کی بات۔ وہ ایسی صورتِ حال تھی کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہوا ہے۔ تب نصرت آسٹریا میں تھی اور عمران جرمنی کے شہر میونخ میں۔ دونوں مقامات میں بہت زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ یورپی یونین کے زیر اثر آزادانہ نقل و حرکت ہے، جیسے ایک ہی ملک ہو۔ ایک دم کئی کڑیاں میری نگاہوں کے سامنے ملنے لگیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ نصرت میں جگر کی ٹرانسپلانٹیشن ہوئی ہے... اور اس کے لیے شاید عمران کا جگر استعمال ہوا ہے۔

میرے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ایک دم میرا دھیان ثروت اور یوسف وغیرہ کی طرف گیا۔ "ثر... و... ت کہاں ہے نصرت؟"

نصرت نے پلٹ کر اوپر چیڑ اور دیودار کے بلند درختوں کی طرف دیکھا جن کے نیچے شام کی ہوا آہستہ روی سے بہہ رہی تھی۔ میں نے بھی اس کی نگاہ کا تعاقب کیا۔ ایک چمکیلی جیپ کے قریب مجھے ثروت کی جھلک نظر آئی۔ اس کی گود میں کوئی بچہ تھا... دو ڈھائی سال کا نہایت روشن چہرے والا۔ یہ کس کا بچہ تھا؟... یہ بالو تھا، یقیناً یہ بالو تھا۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ مجھے لگا، یہ سب ایک سپنا ہے، ابھی ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ ریزہ ریزہ ہو جائے گا اور میرے گرد تاریکیوں اور موت کی آہٹوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

ثروت مجھے دیکھ رہی تھی اور میں اسے۔ ہمارے درمیان پندرہ بیس زینے تھے اور کچھ ڈھلوان زمین تھی۔ بہت قربت تھی اور بہت دوری بھی۔ مجھے لگا ثروت کے تابندہ چہرے پر، اس کی جھیل آنکھوں میں آنسوؤں کا پانی ہے۔ میں بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ گلابی رنگ کے پھول دار لباس میں تھی۔ بالو کو اٹھائے وہ سنبھل سنبھل کر زینے اترنے لگی۔ اس کے بالوں کی لٹیں آگے کی طرف جھول رہی تھیں۔

☆☆☆

وہ جادوئی رات تھی۔ وہ انکشافات کی گھڑیاں تھیں۔ ماضی میری طرف پلٹا تھا اور بہت تہلکہ خیز انداز میں۔ میرے لیے سب سے بڑی حیرت کی بات نصرت کا زندہ بچ جانا تھا... بے شمار سوالات تھے ان گنت جوابات تھے۔ یہ تفصیل بہت لمبی ہے۔ جیلانی نے اکیلے میں مجھے اختصار کے ساتھ جو کچھ بتایا، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارا ہیرو زندگی کے آخری لمحوں تک بھی ہیرو ہی رہا۔ ایک لکی ہیرو۔ اسے آخر تک اپنی لک پر بے پناہ بھروسا تھا۔ جب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی، اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے قدرے بہتر محسوس کیا تھا۔ اس کے اصرار پر ویڈیو لنک کے ذریعے اس کا رابطہ ویانا میں ثروت سے کرایا گیا تھا۔ اس نے ثروت کو اطلاع دی تھی کہ اپنی موت کی صورت میں وہ اپنا لیور نصرت کو عطیہ کرنا چاہتا ہے۔ بعد از موت ایسی ڈونیشن کو DECREASED ORGAN DONATION کہا جاتا ہے۔ ایک مخصوص ٹائم کے اندر جگر نکال کر مریض میں ٹرانسپلانٹ کر دیا جاتا ہے۔

ثروت نے کہا تھا۔ "عمران بھائی! اللہ آپ کو زندگی دے... لیکن اگر خدانخواستہ خدانخواستہ کوئی ایسی بات ہوتی بھی ہے تو ضروری تو نہیں کہ آپ کا جگر نصرت کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے۔"

"ضرور ثابت ہوگا۔" عمران نے نحیف آواز میں کہا تھا۔ "ہمارا بلڈ گروپ ایک ہے اور سب سے بڑی بات ارادے کی ہے۔ ہمارا ارادہ مضبوط ہے۔"

ثروت نے کہا۔ "اس کے لیے کئی طرح کی میچنگ ہوتی ہے عمران بھائی! ٹشو میچنگ... سیل میچنگ اور پتا نہیں کیا کچھ۔"

وہ بستر مرگ پر مسکرایا تھا۔ "تم بھول رہی ہو بہن۔ تم اس وقت ایک بہت لکی بندے سے مخاطب ہو۔ اس کی لک ہر جگہ میچ کرتی ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہاں بھی کرے گی اور اگر ایسا ہو جائے اور میرے جسم کا حصہ نصرت کے جسم میں لگ جائے اور اس کی زندگی بچ جائے تو پھر ایک کام ضرور کرنا میری بہن۔ اپنے "وہم" کو توڑ دینا۔ اس کو توڑ پھوڑ کر کسی قبر میں دفن کر دینا... اور میرے دوست کی زندگی بچا لینا... میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ میرے آخری الفاظ ہیں میری بہن! خدا تمہیں اور نصرت کو زندگی اور خوشی دے۔"

اپنی موت سے چار پانچ گھنٹے پہلے اس نے پھر پورے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ اس کا جگر ضرور نصرت کے ساتھ میچ کرے گا۔ بصورتِ دیگر اس نے اپنا یہ باڈی پارٹ کسی بھی ضرورت مند کو لگانے کی اجازت دی تھی۔ چار پانچ گھنٹے بعد وہ چلا گیا تھا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ شاید دنیا کے چند خوش قسمت ترین لوگوں میں سے ایک تھا جو پانسا پھینکتا تھا، سیدھا پڑتا تھا۔ اس نے جو آخری پانسا پھینکا، وہ بھی سیدھا پڑا۔ ڈاکٹرز اور سرجن ششدر رہ گئے۔ سب کچھ تقریباً ویسا ہی ہوا جیسا اس نے چاہا تھا۔ آؤٹ آف فیملی ہونے کے باوجود ساری کراس میچنگ پازیٹو رہیں۔ عمران کا جگر، نصرت کے لیے بہترین ثابت ہو رہا تھا۔ اسے تمام ٹیسٹوں سے گزارا گیا اور پھر دم توڑتی نصرت کے جسم کا حصہ بنا دیا گیا۔ وہ لکی مین کا جگر تھا اور "لک" کہاں اپنی جگہ نہیں بناتی۔ اس نے نصرت کے جسم کے اندر بھی جگہ بنائی۔ اس کے اعضا نے اس ٹرانسپلانٹیشن کو کمال خوبی سے قبول کیا اور دو تین ماہ کے اندر ہی وہ تیزی سے روبہ صحت ہونے لگی اور آج وہ یہاں تھی، میرے سامنے... میرے عمران کے جگر کے ساتھ۔

رات کو باقی لوگ تو سو گئے، میں بالو کو گود میں لے کر بیٹھا رہا اور انگیٹھی کے سامنے جیلانی سے باتیں کرتا رہا۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ جیلانی کو میرا سراغ اس ایک فون کال سے ملا تھا جس کو سنے بغیر میں نے فون توڑ ڈالا تھا۔ جیلانی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی کال فلاں علاقے سے ریسیو ہوئی تھی۔ اس نے بہت سے دیہات اور قصبوں کی خاک چھانی اور آخر مجھ تک آن پہنچا۔ اس سے پہلے وہ لوگ دبئی بھی گئے تھے۔ اس خیال سے کہ شاید میں وہاں فرح اور عاطف کے پاس موجود ہوں۔ لیکن ناکامی ہوئی۔ وہاں فرح اور ثروت کے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان باتوں کے دوران میں فرح نے اپنی صاف گو فطرت کے عین مطابق ثروت سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ یہاں تک کہ سلطانہ اور بالو کے بارے میں بھی سب کچھ ثروت کے گوش گزار کر دیا۔ اس نے ثروت کو بتایا کہ بھانڈیل اسٹیٹ کی سلطانہ سے میری شادی کیسے اور کن حالات میں ہوئی تھی اور سلطانہ کی موت کے بعد بالو کس طرح پاکستان پہنچا...

میں نے جیلانی سے کہا۔ "یوسف کہاں ہے؟"

"کون یوسف؟"

"ثروت کا شوہر۔"

"وہ اب اس کا شوہر نہیں ہے... اور نہ ہی اب پاکستان میں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ثروت اس سے خلع حاصل کر چکی ہے اور یہ کام کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ یوسف پیش ہی

نہیں ہوا۔ یوسف کی جرمن بیوی نے بھی اس سے طلاق حاصل کرلی ہے۔ نہ صرف جرمنی میں اس کی ساری پراپرٹی وہ لڑکی کورٹ کے ذریعے ہڑپ کرگئی ہے بلکہ اب وہ وہاں جیل کی ہوا کھا رہا ہے۔“

”اوگاڈ...“ میں نے سر تھام لیا۔

یہ زندگی مجھے مار کر پھر کیوں زندہ کررہی تھی۔ میں اب لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ میں نے کہا۔ ”جیلانی! مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا ہے۔ ثروت نے یوسف سے خلع حاصل کرلیا ہے؟“

اس نے انگیٹھی کے انگاروں کو گھورا اور کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ ”ہاں تابش صاحب! آپ نے خود ہی بتایا تھا ناکہ ثروت صاحبہ واہموں میں جکڑی ہوئی ہیں... واہموں کو توڑنے کے لیے پیغمبر اور ولی آئے ہیں یا پھر ہم جیسے عام انسانوں میں کبھی کبھی عمران دانش جیسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی محبت اور خداداد صلاحیتوں سے فرسودہ عقیدوں کے بتوں کو پاش پاش کرتے ہیں۔ یہ بس انہی باکمال لوگوں کے بس کا کام ہوتا ہے ورنہ ان عقیدوں اور واہموں سے ڈھیٹ اور سخت شے دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتی۔“

میں نے جیلانی کو پہلی بار اس طرح بولتے دیکھا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”آپ کی خوش قسمتی تھی کہ ”ثروت کے وہم کو توڑنے کی جنگ“ میں آپ کو عمران کا ساتھ ملا۔ اس نے اپنے آخری وقت میں یہ کر دکھایا۔ ثروت کو اس خوف نے جکڑا ہوا تھا ناکہ آپ سے ملاپ اس کی بہن کو زندگی سے دور لے جائے گا مگر جب وہ واقعی مر رہی تھی تو آپ... یعنی آپ اور عمران کی وجہ سے اسے زندگی مل گئی۔ اور یہی وہ موڑ تھا جہاں اس وہم کا بت چکنا چور ہوا اور ملیا میٹ ہوا۔“

...رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں کمرے میں جاکر اوندھے منہ چٹائی پر گر گیا اور عمران کے لیے ٹوٹ کر روتا رہا۔ وہ میرے اندر یوں رچ بس گیا تھا کہ نکل نہیں سکتا تھا۔ وہ عجب شخص تھا۔ وہ آخر تک دوسروں کے لیے جیتا رہا اور مر کر بھی ایثار اور قربانی کا ٹھیکیدار خود ہی بنا۔ وہ مجھے جگر کہتا تھا اور میرے لیے ہی جگر دے گیا۔ مجھے پتا نہیں کہ کب تک ویسے ہی پڑا سسکتا رہا۔ آج کے انکشاف نے میرے کندھوں پر عمران کے احسانوں کا بوجھ کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ میرا چہرہ تکیے پر تھا۔ آنکھوں میں جلن اور سینے میں شعلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ باہر برف باری ہورہی تھی۔ سردی عروج پر تھی لیکن میں ننگی چٹائی پر بغیر کسی لحاف کے پڑا تھا۔ آگ تو میرے اندر تھی جو بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی...

اچانک مجھے اپنی کمر پر کسی کے لمس کا احساس ہوا۔ کسی نے ایک نرم کمبل میری پشت پر ڈال دیا اور پھر خود بھی اس کمبل کے ساتھ لگ گیا۔ یہ ثروت تھی۔ میں دیکھے بغیر ہی جان سکتا تھا کہ وہ ثروت ہے۔ اس کے جسم کا گداز کمبل میں اور پھر میرے جسم میں منتقل ہورہا تھا۔ وہ عقب سے میرے ساتھ لگ گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ خاموشی کی زبان سب سے طاقتور ہوتی ہے۔ وہ بہت کچھ کہہ سکتی تھی۔ اپنے سابقہ رویے پر شرمندگی ظاہر کرسکتی تھی۔ اپنے کہنہ واہمے پر پشیمانیوں کا اظہار کرسکتی تھی، مجھ سے معافی مانگ سکتی تھی۔ مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس میرے ساتھ لگ کر، میرے اوپر ڈھے کر ہولے ہولے سسکتی رہی۔ یہ خاموشی اس کے ہر اظہار پر حاوی تھی۔ ہر فقرے سے زیادہ متاثر کن۔ پتا نہیں کتنی ہی دیر اسی طرح گزری۔ پھر اس نے میرا رخ اپنی طرف پلٹا۔ میں نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔ وہ سرتاپا محبت تھی۔

محبت میں ہارے ہوئے لوگوں کی باتوں میں بہت گہرائی ہوتی ہے۔ بارونداجیکی کے ساتھ بھی تو کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ہر کہانی کا انجام بندے کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا لیکن ہر کہانی کے بُرے سے بُرے انجام میں بھی زندگی موجود ہوتی ہے۔ اس زندگی کو موقع دیا جائے تو وہ اپنے رستے خود ڈھونڈتی ہے۔ شاید میری زندگی نے بھی رستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

ان لمحوں میں مجھے لگا کہ ٹھوڑی کے گڑھے والا وہ خوب صورت عمران کہیں میرے آس پاس ہے۔ مجھے دیکھ رہا ہے... اور مسکرا رہا ہے۔ کہہ رہا ہے... کوئی بات نہیں تابی! اداس مت ہونا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ میں تمہارے اندر رچ بس چکا ہوں۔ میں تم سب کے اندر رچ بس چکا ہوں۔ تم لوگ جب جب محبت کروگے، جب جب سکھ بانٹو گے، ایثار کروگے اور قربانی دوگے، مجھے اپنے بالکل قریب پاؤ گے اور جب بہار کی سہانی شاموں میں اور سرما کی نرم گرم راتوں میں تم زندگی کے گہرے دکھ سینے میں چھپا کر مسکراؤ گے، ہنسو گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہنسوں گا۔ تمہارے بالکل پاس آجاؤں گا۔ ہاں میرے دوست، اداس مت ہونا۔

کھلی آنکھ

بابر نعیم

بعض واقعات اتنی تیزی سے ظہور پزیر ہوتے ہیں کہ کچھ سمجھ نہیں آتاکہ ... کیسے اور کیا ہوگیا... خود کشی کے کیس سے شروع ہونے والی پر تجسس کہانی ... جس نے دیکھتے ہی دیکھتے رنگ بدلنا شروع کردیا۔

جرم و سراغرسی کی ہمراہی... ایک ماہر سراغرساں کی باریک بینی

سان فرانسسکو میں کوئی واقعہ پیش آجائے تو وہاں ایڈریان مونک کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی ہے۔ وہ بھی ایک غیر معمولی واقعہ تھا کہ ایک عمارت کی سترھویں منزل سے دوسو پاؤنڈ وزنی چیز سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی بی ایم ڈبلیو پر گری جس کے نتیجے میں اس کی ابھری ہوئی چھت چپٹی ہوگئی اور کھڑکیوں کے شیشے چکنا چور ہوگئے۔ وہ کوئی چیز نہیں بلکہ انسانی جسم تھا۔ راہ چلتے لوگوں نے حیرت کے عالم میں یہ منظر دیکھا اور چند منٹوں بعد ہی وہ جگہ کرائم سین میں تبدیل ہو

گئی اور اسے پولیس اہلکاروں کے علاوہ سراغ رسانوں اور دیگر متعلقہ افراد نے گھیرے میں لے لیا۔ انہی لوگوں میں ایڈریان مونک بھی تھا جو بی ایم ڈبلیو کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا لیکن اس کی توجہ لاش پر نہیں تھی بلکہ اس کی نظریں اس سلور کلر کی مرسیڈیز پر جمی ہوئی تھیں جو سڑک پر آڑی ترچھی کھڑی ہوئی تھی۔ مونک نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ 2004ء ماڈل کی کار تھی۔

میری بائیس سالہ بیٹی جولی اس سے دوگز کے فاصلے پر کھڑی آئی پیڈ پر اپنی ای میل چیک کر رہی تھی۔ ان دنوں وہ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران مونک کی اسسٹنٹ کے طور پر عارضی ملازمت کر رہی تھی کیونکہ میں نیوجرسی میں پولیس میں بھرتی ہونے کی وجہ سے مونک کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اس کے بعد بھی مونک نے کئی مرتبہ فون کیا۔ وہ زیادہ تر جولی کے بارے میں ہی بات کیا کرتا اور اپنی عادت کے مطابق اس نے کبھی براہِ راست اپنا مدعا بیان نہیں کیا بلکہ ہمیشہ گھما پھرا کر گفتگو کیا کرتا اور اس کی کوشش ہوتی کہ سننے والا خود ہی اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرے۔ گفتگو کے آغاز میں وہ جولی کی تعریف کرتا۔ اس کے خیال میں وہ ایک اچھی اسسٹنٹ تھی پھر شکایتوں کا دفتر کھل جاتا۔ مثلاً یہ کہ اس کی کار کے چاروں ٹائر مختلف برانڈ کے تھے اور ان کی ساخت آپس میں نہیں ملتی تھی یا یہ کہ وہ رنگ برنگے مشروب پیا کرتی تھی۔ میں بھی اس کی اس عادت سے پریشان تھا لیکن جولی کو دودھ سے چڑ تھی اور نہ ہی وہ فروٹ جوس پینا پسند کرتی تھا۔ مونک کو یہ بھی شکایت تھی کہ جولی پہننے اوڑھنے کے معاملے میں کافی بے پروا تھی اور کسی سلیقے یا شائستگی کا بالکل خیال نہیں رکھتی تھی۔ مثلاً اس کی دونوں کلائیوں کے بریسلیٹ الگ الگ ڈیزائن کے ہوا کرتے تھے۔ اسی طرح ٹراؤزر اور بلاؤز کی بھی کوئی میچنگ نہیں ہوتی تھی۔ مونک ان تمام خرابیوں کا ذمے دار مجھے ٹھہراتا تھا اور سمجھتا تھا کہ میں نے اس کی تربیت پر پوری توجہ نہیں دی تھی۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ اس کی زبان سے ایسی باتیں سن کر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں گا کہ اس کی پہنچ سے بہت دور تھا تاہم جولی کے بارے میں ایسی باتیں سننے کے بعد میرے غصے اور جھلاہٹ میں اضافہ ہونا فطری امر تھا اور اس کیفیت میں مجھے گھر کی یاد ستانے لگتی۔ حالانکہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ جولی وہی کرتی جو اس کے دل میں آتا، تاہم یہ حقیقت تھی کہ ملازمت شروع کرنے کے بعد وہ کافی سمجھ دار ہو گئی تھی اور جائے واردات پر جانے سے نہیں گھبراتی تھی۔ البتہ وہ لاشوں کے قریب جانے سے گھبراتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ لاش کا معائنہ کرنا اس کی ذمے داری نہیں بلکہ وہ صرف مونک کی مدد کے لیے اس کے ساتھ ہے۔ میرے برعکس اسے ان کیسوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جو مونک نے حل کیے تھے۔

لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اسے مونک کے ساتھ رہ کر اسے سہولت پہنچانا ہے تاکہ وہ یکسوئی سے اپنے کیس پر توجہ دے سکے چنانچہ اس نے ایک لمحے کے لیے آئی پیڈ سے نظر ہٹائی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ مونک لاش کا معائنہ کرنے کے بجائے اس سے دور کھڑا ہوا ہے۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔ فون بند کر کے پتلون کی جیب میں رکھا اور اس کے پاس جا کر بولی۔

”کیا مسئلہ ہے مسٹر مونک؟“

”مجھے الجھن ہو رہی ہے۔“ مونک نے کہا لیکن اب بھی اس کی نظریں لاش کی جانب نہیں تھیں۔

”ہاں، تم لاش کو نہیں دیکھ سکتے کیونکہ اس پر ترپال ڈال دی گئی ہے۔ صرف اس کے پاؤں باہر نکلے ہوئے ہیں لیکن اس کے جوتے بالکل صاف ہیں اور ان کے تسمے بھی بندھے ہوئے ہیں۔“

”میں لاش کی بات نہیں کر رہا۔“ مونک بولا۔

جولی نے چونک کر دیکھا۔ مونک کی نظریں سڑک کی دوسری طرف کھڑی مرسیڈیز پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اسی جانب دیکھنے لگی۔ اس وقت اگر میں جولی کی جگہ ہوتا تو یہ اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کرتا کہ مونک کو اس کار میں ایسی کیا قابلِ اعتراض بات نظر آئی ہے کہ وہ لاش پر توجہ دینے کے بجائے اسی جانب دیکھے جا رہا ہے اور اسے بتاتا کہ وہ کار اس لاش کے مقابلے میں قطعی غیر اہم ہے جو اس کے سامنے بی ایم ڈبلیو کی چھت پر پڑی ہوئی ہے۔ بھلا سڑک کے دوسری جانب کھڑی ہوئی مرسیڈیز کا اس واقعے سے کیا تعلق ہو سکتا تھا؟

ممکن ہے کہ میرا اعتراض رائگاں جاتا اس لیے پہلے میں کار کے مالک کو تلاش کر کے اس کا حدود اربعہ جاننے کی کوشش کرتا۔ وہ کون تھا، کہاں سے آیا تھا اور اس نے اپنی گاڑی اتنے بے ڈھنگے انداز میں کیوں کھڑی کی تھی کہ مونک جیسا شخص بھی اپنا اصل کام بھول کر اس کار کی جانب توجہ دینے پر مجبور ہو جائے۔ یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی میں مونک کو مطمئن کر سکتا تھا تاکہ وہ پُرسکون ہو کر اپنی توجہ تحقیقات پر مرکوز کر دے۔

میری بیٹی نے مختلف طریقہ اختیار کیا۔ اس نے کندھے سے اپنا بیگ اتار کر زمین پر رکھا اور کچھ فاصلے پر کھڑی فارنسک یونٹ کی وین کی جانب چلی گئی اور دروازہ کھول کر اس میں یوں داخل ہو گئی جیسے وہ اس کی اپنی وین ہو۔ تھوڑی دیر بعد باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک تہ کی ہوئی نیلے رنگ کی ترپال تھی جسے اس نے بڑی احتیاط سے مرسیڈیز پر اس طرح پھیلا دیا کہ وہ پوری طرح ڈھک گئی۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ فاتحانہ انداز میں چلتی ہوئی مونک کے پاس آئی اور بولی۔ ”کیا یہ بہتر نہیں ہے؟“

”شکریہ۔“ مونک نے روایتی انداز میں کہا جیسے اس کی نظر میں وہ کوئی غیر اہم کام تھا پھر بولا۔ ”لیکن تمہیں ایک پولیس آفیسر کو بلا لینا چاہیے تاکہ وہ ہمارے جانے سے پہلے اس معاملے سے نمٹ سکے۔“

”ٹھیک ہے، میں ایسا ہی کروں گی۔“

”تم نہیں جانتیں کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں؟“ مونک نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

جولی نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور بولی۔ ”ان سے یہی کہوں گی کہ اس کار کو کھینچ کر یہاں سے لے جائیں تاکہ یہ مسئلہ حل ہو جائے۔“

”تم نے دیکھا نہیں کہ کار کی اگلی سیٹوں کی پشت الگ الگ زاویہ پر ہے اور اسی طرح سرہانے کی اونچائی بھی مختلف ہے۔“

”ہاں لیکن یہ کار زیادہ دیر اس سڑک پر نہیں رہے گی۔“ جولی نے کہا۔ ”اس کے ہٹ جانے سے کار کے مالک کو اچھا سبق ملے گا اور وہ آئندہ کار چھوڑ کر جانے سے پہلے اس کی نشستوں کی ترتیب ٹھیک کرے گا۔“

مونک نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو، اچھی ترکیب سوچی ہے۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں صرف اپنا کام کر رہی ہوں۔“

جولی کی یہ ملازمت زیادہ سے زیادہ ایک یا دو ہفتے کے لیے تھی تاوقتیکہ مونک کو میری جگہ کوئی مناسب شخص نہ مل جاتا لیکن ان دنوں کیلی فورنیا میں معاشی حالات خراب ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے اور جولی جیسی ناتجربہ کار لڑکی کو کام ملنا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے وہ اس ملازمت سے چپکی ہوئی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے عملی زندگی میں آ گئی تھی۔ اسے کہیں درخواست نہیں دینا پڑی، کوئی انٹرویو نہیں ہوا اور نہ ہی کسی کام میں مہارت حاصل کرنا پڑی۔ مونک کی حیثیت ہمارے فیملی ممبر جیسی تھی چنانچہ جب جولی نے اس کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو وہ پہلے سے ہی اس کے مزاج اور عادتوں سے واقف تھی چنانچہ وہ نہ تو اس کے رویّے سے حیران ہوئی اور نہ ہی اس کے غیر مبہم اور غیر واضح اصولوں نے اسے پریشان کیا۔ اس کے نزدیک یہ سب باتیں مونک کے معمول کا حصہ تھیں۔

پولیس والوں کے درمیان رہ کر بھی وہ بے آرام نہیں تھی۔ کیپٹن اسکاٹ اس کے لیے انکل جیسا تھا اور اس کے خیال میں کیپٹن کا دایاں بازو لیفٹیننٹ ایمی ڈیولن جس کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ کشیدہ رہے، روئے زمین پر سب سے زیادہ ٹھنڈے مزاج کی عورت تھی۔ مونک کے لیے بھی یہ تبدیلی ہموار ثابت ہوئی، وہ جولی کو اس کے بچپن سے جانتا تھا۔ جولی نے اسے میری غیر موجودگی محسوس نہیں ہونے دی اور ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود مونک مجھے اپنی زندگی کا حصہ سمجھ رہا تھا۔ ویسے بھی وہ تبدیلی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ جولی کو اپنے ساتھ رکھنے کا مطلب تھا کہ اسے کسی دوسرے شخص کو تلاش کرنے کے لیے کوشش نہیں کرنا پڑے گی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اجنبی اس کی زندگی میں آئے۔

جولی کے ساتھ اس کے کام کا رشتہ میری نسبت بہت مختلف تھا کیونکہ جولی میری طرح اس کی باتوں سے پریشان نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی کوئی ذہنی دباؤ قبول کرتی تھی۔ وہ آنکھ بند کر کے بے چون و چرا مونک کے احکامات کی تعمیل نہیں کرتی تھی۔ اس نے اپنے رویّے سے مونک پر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اس کے زیرِ نگرانی نہیں بلکہ معاون ہے اور دنیا اس ملازمت پر ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ مجھے اور مونک کو دیکھتے ہوئے جوان ہوئی تھی اور وہ غلطیاں نہیں کر رہی تھی جو مجھ سے سرزد ہوئی تھیں۔

جب مونک نے بی ایم ڈبلیو کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنا شروع کیا تو اس نے دونوں ہاتھ اس طرح آگے پھیلا لیے جس طرح کوئی فلم کا شاٹ لیتے وقت کرتا ہے۔ جولی سڑک کے کنارے کھڑی رہی۔ اس نے آئی پیڈ کے ذریعے ڈیولن کو پیغام بھیجا جو اس وقت کیپٹن اسکاٹ کے ساتھ عمارت کی سترھویں منزل پر تھی۔ جولی جاننا چاہ رہی تھی کہ وہ دونوں وہاں کیا کر رہے ہیں۔

ڈیولن نے اسے جوابی پیغام بھیجا کہ مونک جیسے ہی جائے وقوعہ کا معائنہ کر لے تو وہ دونوں جتنی جلد ممکن ہو سکے اوپر آ جائیں۔ اگر میں جولی کی جگہ ہوتا تو ایک طرف کھڑے

ہو کر پیغام رسانی کرنے کے بجائے مونک کے ساتھ رہ کر اپنے طور پر تمام ثبوت و شواہد اکٹھے کرتا۔ میں ہمیشہ اپنے آپ کو پوری طرح کیس میں شامل کر لیا کرتا تھا لیکن جولی ایسا نہیں کر رہی تھی بلکہ اسے گھر جانے کی جلدی تھی تاکہ تھوڑا بہت وقت اپنے بوائے فرینڈ رکی کے ساتھ گزار سکے جو کہ ایک ابھرتا ہوا گلوکار تھا اور اس وقت بھی ہمارے لیونگ روم میں جولی کے انتظار میں وقت گزاری کے لیے فلمیں دیکھ رہا تھا۔ آج جولی کا اس کے ساتھ ڈیٹ پر جانے کا پروگرام تھا لیکن کیپٹن اسکاٹ کے فون نے سارا پروگرام چوپٹ کر دیا۔

مونک نے اپنی جیب سے موچنا نکالا اس کے ذریعے سڑک پر سے پڑا ہوا چشمہ اٹھایا جس کے دونوں شیشوں میں بال آ گیا تھا اور ایک کمانی بھی ٹوٹ چکی تھی۔ اس نے وہ چشمہ اپنی آنکھوں کے سامنے کیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا پھر اس نے ہاتھ ہلا کر جولی کو اشارہ کیا... وہ جان گئی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔

اس نے اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹی تھیلی نکالی جو عام طور سے ثبوت جمع کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ مونک نے وہ چشمہ اس میں ڈال دیا تو وہ تھیلی کا منہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''کچھ نہیں۔'' مونک نے کہا۔ ''یہ ایک عام سا چشمہ ہے جو پڑھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔''

''پھر تم نے اسے محفوظ کیوں کر لیا؟''

''میرا خیال ہے کہ جب یہ شخص اوپر سے گرا تو اس نے یہ چشمہ پہن رکھا تھا۔''

جولی کو اس کی منطق پر ہنسی آ گئی۔ وہ بولی۔ ''ظاہر ہے ایسا ہی ہوا ہوگا۔ یہ چشمہ خود بخود تو زمین پر نہیں گر سکتا۔ لیکن اس شخص کی موت سے چشمے کا کیا تعلق ہے؟''

مونک نے کندھے اچکائے۔ وہ عام طور پر غیر ضروری سوالوں کے جواب دینا پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر اس نے گردن گھما کر لاش کے پیروں کی جانب دیکھا جو کہ کار کی چھت پر پڑی ہوئی ترپال سے باہر نکلے ہوئے تھے۔

''اس نے آٹھ نمبر کے جوتے پہن رکھے ہیں۔'' مونک بولا۔ ''یہ بالکل نئے اور قیمتی معلوم ہو رہے ہیں۔''

''ان جوتوں میں تمہیں کیا نظر آیا؟''

''بہت صاف ہیں اور کسی مشہور کمپنی کے لگتے ہیں۔'' مونک نے جواب دیا۔

''اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہی کہ یہ ایک نفیس شخص تھا اور اپنے پہننے اوڑھنے کا خاص خیال رکھتا تھا۔'' مونک نے کہا۔ ''ہمارے پاس اس کے بارے میں اور کیا معلومات ہیں؟''

''بتایا گیا ہے کہ اس کا نام ڈیوڈ روز ویلو تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی بالکونی سے چھلانگ لگائی، گر پڑا یا کسی نے اسے دھکا دیا۔''

''اس کا اپارٹمنٹ کون سا ہے؟''

جولی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''سترھویں منزل پر بائیں جانب دوسری بالکونی۔''

مونک پیچھے ہٹا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بلندی سے اسے خوف آتا تھا اور زمین پر کھڑے ہو کر اوپر کی جانب دیکھنے سے بھی اسے چکر آنے لگتے تھے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''اتنی بلندی پر جانے کے لیے مجھے پانی کی چار بوتلوں اور پچاس ٹشو پیپرز کی ضرورت ہوگی۔''

جولی جانتی تھی کہ وہ لفٹ میں سوار ہونے سے ڈرتا ہے اور اوپر جانے کے لیے سیڑھیوں کا استعمال کرے گا۔ وہ ایک ایک سیڑھی گنتا ہوا اوپر چڑھے گا اور ہر سیڑھی پر رک کر ٹشو پیپر سے زینے کی ریلنگ صاف کرتا جائے گا۔ وہ پینے کے لیے منرل واٹر ہی استعمال کرتا تھا اور اتنی ساری سیڑھیاں چڑھنے کے دوران اسے کم از کم چار بوتلوں کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

اگر وہ ہفتہ کی سہ پہر ہوتی تو جولی اپنے بوائے فرینڈ کو فون کر کے بتا سکتی تھی کہ وہ اس سے شام میں ملاقات کرے گی اور اوپر جانے سے پہلے قریبی کافی شاپ سے گرم گرم کافی پیتی۔ دو چار فون کرتی اور تازہ دم ہو کر اوپر جانے کے لیے تیار ہو جاتی لیکن شام ہو چکی تھی اور اس کا بوائے فرینڈ ہمارے لیونگ روم میں کاؤچ پر لیٹا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ لہٰذا وہ سیڑھیوں کے ذریعے سترہ منزلیں چڑھنے میں وقت ضائع نہیں کر سکتی تھی۔

''میرے پاس ایک بہتر آئیڈیا ہے۔'' اس نے یہ کہہ کر اپنے آئی فون کا بٹن دبایا اور اس کا رابطہ اپارٹمنٹ کے وائرلیس نیٹ ورک سے ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے پردے پر ڈیولن کی شبیہ ابھری۔ اب وہ ایک دوسرے کو دیکھنے کے علاوہ آپس میں گفتگو بھی کر سکتی تھیں۔

''کیا تم دونوں اوپر آنے کے لیے تیار ہو؟'' ڈیولن نے پوچھا، اس کے بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے اس نے خود ہی بال کاٹے ہوں۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو اپنے آپ پر بہت زیادہ توجہ دیتی تھیں اور جن ہی اسے

اس کی ضرورت تھی۔ وہ خوب صورت چہرے اور متناسب جسم کی مالک تھی اور اس کی جلد بھی بہت صاف تھی۔ ماسوائے چند زخموں کے نشانات کے جو مجرموں سے لڑائی کے دوران اسے آئے تھے۔

''مسٹر مونک لفٹ استعمال نہیں کرتے لہٰذا انہیں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آنا ہوگا لیکن یہ اپارٹمنٹ سترھویں منزل پر ہے۔ اس لیے غیر ضروری خطرہ مول لینا ٹھیک نہیں۔''

مونک اسے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ اس بات پر خوش ہو رہا تھا کہ جولی بہت کم وقت میں اسے سمجھ گئی ہے۔

''کیسا خطرہ؟'' ڈیولن چونکتے ہوئے بولی۔ اس کی حیرانی بجا تھی کیونکہ پولیس والوں کو تو کسی بھی صورتِ حال میں ہر قسم کے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

مونک اس کی پریشانی سمجھ گیا اور آئی فون کے کیمرے کے سامنے اپنا چہرہ لاتے ہوئے بولا۔ ''میں ایڈریان مونک بول رہا ہوں۔''

''جانتی ہوں۔'' ڈیولن بولی۔ ''اور مجھے آواز کے ساتھ ساتھ تمہاری شکل بھی نظر آ رہی ہے۔''

''تمہیں معلوم ہے کہ ڈیوڈ کے ساتھ کیا ہوا؟'' مونک نے کہا۔

''لیکن تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' ڈیولن بولی۔ ''وہ ایک حادثہ تھا۔''

''ہو بھی سکتا ہے۔'' مونک بولا۔ ''بلکہ شاید اس سے بھی بُرا۔''

''موت سے بُرا کیا ہو سکتا ہے؟'' ڈیولن نے پوچھا۔

''میں نے اس طرح کے واقعات کی ایک فہرست بنا رکھی ہے۔ تم اس کی نقل کیپٹن اسکاٹ سے حاصل کر سکتی ہو۔''

''نہیں، یہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' کیپٹن اسکاٹ، ڈیولن کے نزدیک ہوتے ہوئے اس طرح جھکا کہ اس کا چہرہ کیمرے کے سامنے آ گیا۔ ڈیولن نے کیمرا ایسی پوزیشن میں کر دیا کہ دونوں اس کے فریم میں آ جائیں۔

''وہ کوئی خفیہ دستاویز نہیں۔ ڈیولن جب چاہے اسے دیکھ سکتی ہے۔''

مونک کے لیے یہ طنز بیکار ثابت ہوا۔ وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھا اور نہ ہی سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ اس پر طنزیہ فقرے کسنے سے باز نہیں آتے تھے۔ شاید اس طرح وہ اس ذہنی دباؤ سے نکلنا چاہتے تھے جو مونک کی الٹی سیدھی حرکتوں سے انہیں برداشت کرنا پڑتا تھا۔

''اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں اوپر کیوں نہیں آ سکتا؟'' مونک نے کہا۔ ''اگر یہ اپارٹمنٹ سولہویں یا اٹھارویں منزل پر ہوتا تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔''

''اس اپارٹمنٹ کو دیکھے بغیر تم یہ کیسے جان سکتے ہو کہ مرنے والا کس طرح گرا ہوگا؟'' کیپٹن اسکاٹ نے کہا۔

''اس کا ایک سادہ حل ہے۔ اس بلڈنگ کے سارے اپارٹمنٹ ایک جیسے ہیں۔'' مونک نے کہا۔ ''صرف ان کی سجاوٹ مختلف ہے۔ چودھویں منزل پر ایک خالی اپارٹمنٹ ہے۔ تم وہاں اس اپارٹمنٹ جیسا منظر بنا سکتے ہو۔ جب یہ کام مکمل ہو جائے تو مجھے فون کر دینا۔''

''یہ تمہارا سادہ حل ہے۔'' اسکاٹ جھلّاتے ہوئے بولا۔

''اس کے لیے تم بعد میں میرا شکریہ ادا کر سکتے ہو۔''

''سیدھی طرح اوپر آ جاؤ ورنہ میں دو پولیس والوں کو بھیج رہا ہوں جو تمہیں ہتھکڑی لگا کر لفٹ کے ذریعے اوپر لے آئیں گے۔''

''اس کی ضرورت نہیں پیش آئے گی لی لینڈ۔'' جولی بولی۔ وہ تھوڑے عرصے میں ہی اسکاٹ سے بے تکلف ہو گئی تھی اور اس کا پہلا نام لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی تھی۔ اسکاٹ کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوا لیکن میں جانتا تھا کہ مونک کو یہ بے تکلفی پسند نہیں تھی۔

''تم آئی فون کیمرے کے ذریعے بھی اپارٹمنٹ کے مختلف حصے دکھا سکتے ہو۔ مسٹر مونک ان جگہوں کے بارے میں تمہیں بتا سکتے ہیں۔''

''یقیناً! ہم ایک کوشش کر سکتے ہیں۔'' اسکاٹ بولا پھر اس نے ڈیولن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟''

''کیوں نہیں۔'' ڈیولن بولی۔ ''اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو شاید آئندہ کبھی وہ جائے واردات پر آنے کی ضرورت محسوس نہ کرے۔''

جولی نے مونک کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیا تم اس پر رضامند ہو؟''

مونک نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈیولن بولی۔ ''ہم کہاں سے شروع کریں؟''

''بیرونی دروازے سے شروع کرو بالکل اس طرح جیسے میں اندر آتا۔'' مونک نے ہدایات دینا شروع کیں اور

بولا۔ ''تمہارے پاس مرنے والے کے بارے میں کیا معلومات ہیں؟''

''وہ اس اپارٹمنٹ میں تنہا رہتا تھا۔ ریٹائر ہونے سے پہلے تیس سال تک وال نٹ کریک میں واقع نارتھ گیٹ ہائی اسکول میں حساب پڑھاتا رہا۔'' دروازے کی طرف جاتے ہوئے ڈیولن نے کیمرا اپنے چہرے پر مرکوز کرلیا تھا۔

''اسے یہ اپارٹمنٹ ماں کی جانب سے ورثے میں ملا تھا۔''

''تمہارے خیال میں اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہوگا؟''

''بظاہر تو یہ ایک حادثہ ہی نظر آتا ہے۔'' ڈیولن نے کہا۔ ''وہ کرسی پر کھڑے ہو کر دیوار پر لگا ہوا بلب تبدیل کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور بالکونی کی ریلنگ پر جا گرا۔''

ڈیولن بیرونی دروازے پر پہنچ کر مڑی اور کیمرے کا رخ اپارٹمنٹ کے اندرونی حصے کی جانب کردیا۔ اب مونک اور جولی کو وہ سب کچھ نظر آرہا تھا جو ڈیولن دیکھ رہی تھی۔ دروازے کے ساتھ ہی ایک تنگ سی راہداری تھی جس کے اختتام پر بائیں جانب کچن اور دائیں طرف ایک بڑا کمرا تھا جو بیک وقت ڈائننگ اور لیونگ روم کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ اس کی سامنے والی دیوار میں شیشے کا سلائڈنگ دروازہ لگا ہوا تھا جو بالکونی میں کھلتا تھا اور وہاں سے سڑک کے پار دفتر کی عمارت صاف نظر آرہی تھی۔ کیپٹن اسکاٹ، کچن کاؤنٹر کے ساتھ رکھے ایک اسٹول پر بیٹھا ہوا تھا جو کچن اور لیونگ روم کو جدا کرتا تھا۔ لیونگ روم میں بائیں جانب ایک کاؤچ اور اس کے سامنے کافی کی میز رکھی ہوئی تھی۔

''آہستہ آہستہ آگے بڑھو۔'' مونک نے کہا۔

ڈیولن نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کیمرے کا رخ کچن کی طرف کردیا اور مختلف زاویوں سے وہاں رکھی ہوئی چیزوں کی عکاسی کرنے لگی۔ اس سے کہا گیا کہ وہ اسی طرح فرش کا بھی جائزہ لے اور چھت کے ساتھ دیوار پر لگی ہوئی تصویروں کو بھی فوکس کرے۔ اسی طرح ہال میں لگی الماری کھول کر اس کی بھی منظرکشی کی جائے جہاں بہت سے کوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ یہ ایک اکتا دینے والا عمل تھا۔ شاید اس طرح وہ جولی اور ڈیولن کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ دنیا کو کس طرح دیکھنا چاہیے۔

اس جگہ کا بور جائزہ لینے کے بعد مونک نے ڈیولن سے کہا کہ وہ کیمرا لیونگ روم میں لے کر جائے جہاں اس نے دیکھا کہ ڈائننگ ٹیبل کے بالکل کنارے پر جوناتھن فرانزن کا ناول رکھا ہوا ہے۔ مونک نے کیپٹن اسکاٹ سے کہا کہ کتاب اٹھا کر کیمرے کے سامنے کرے۔ اسکاٹ نے ایسا ہی کیا اور سب نے دیکھا کہ اس کتاب کا ایک صفحہ مڑا ہوا ہے۔

''برائے مہربانی یہ صفحہ کھولو۔'' مونک نے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ فرانزن کو پڑھ کر بہت سے لوگوں کا دل خودکشی کرنے کو چاہتا ہے۔'' اسکاٹ نے کہا۔

''مجھے شبہ ہے کہ یہاں بھی ایسا ہی کوئی معاملہ نہ ہو۔''

''اتنی جلدی ہم کوئی نتیجہ اخذ نہیں کرسکتے۔''

اسکاٹ نے کتاب کا وہ صفحہ کھولا اور مونک کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے کیا پڑھ رہا تھا؟''

''ہاں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' مونک نے جواب دیا۔

''پھر ہم اس صفحے کو کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' اسکاٹ نے پوچھا۔

''تاکہ ہم اس مڑے ہوئے صفحے کو سیدھا کردیں۔''

اسکاٹ نے کتاب بند کی اور اسے واپس میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''اب آگے چلیں؟''

''ٹھیک ہے۔ ہم اسے بعد میں دیکھ لیں گے۔'' مونک نے کہا۔ ''کیا تم نے میز کے سرے پر رکھی ہوئی کرسی ہٹائی تھی؟''

''نہیں۔'' اسکاٹ نے جواب دیا۔

''اسے بھی بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال ایک نظر کاؤچ پر ڈالتے ہیں۔''

ڈیولن کاؤچ کی طرف بڑھی۔ وہاں دو تکیے نظر آئے۔ ایک الٹے ہاتھ پر اور دوسرا سرہانے کی طرف۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ڈیوڈ نے کتاب پڑھتے وقت اپنا سر ایک تکیے اور بازو دوسرے تکیے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں سائڈ ٹیبل پر کافی کی پیالی رکھی ہوئی تھی۔

''کیا تم نے یہ دو تکیے دیکھے؟'' مونک نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''سرہانے والا تکیہ اٹھاؤ اور اسے کاؤچ کی دوسری جانب رکھ دو۔''

کیپٹن اسکاٹ جھلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم تمہیں اپارٹمنٹ دکھا رہے ہیں۔ اس کی تزئین و آرائش نہیں کررہے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' مونک نے اطمینان سے کہا۔ ''تم نے غور کیا کہ سیپیوں کا پیالہ اور دوسری اشیا کافی کی میز پر بے

ترتیب حالت میں رکھی ہوئی ہیں۔“

بظاہر یہ چیزیں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ اس لیے کیپٹن اسکاٹ کا منہ بن گیا۔ ”تم تو ابھی کہہ رہے تھے کہ میری بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہے۔“

”ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔“ مونک بولا۔ ”لیکن اس کا تعلق تزئین و آرائش سے نہیں ہے۔ میرا اشارہ بے ترتیبی کی جانب تھا۔“

اسکاٹ نے ڈیولن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اب بالکونی کی طرف چلتے ہیں۔ میری نظر میں وہ جگہ سب سے اہم ہے کیونکہ مرنے والا وہیں سے گرا تھا۔“

”ابھی میں نے اندر سے پورا اپارٹمنٹ نہیں دیکھا۔“ مونک نے تھوڑا احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”میرے خیال میں تم سب کچھ دیکھ چکے ہو، بس واش روم رہ گیا ہے۔ کیا اسے بھی دیکھنا چاہو گے؟“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔“ مونک نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ”آگے چلو۔“

اسکاٹ سلائڈنگ دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھول دیا۔ اب اس کے سامنے ایک تاریک اور تنگ بالکونی تھی جس میں لوہے کی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ وہاں دو کرسیاں اور ایک بہت ہی چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی جس پر بلب کا ڈبا نظر آرہا تھا۔ ان میں سے ایک کرسی الٹی پڑی ہوئی تھی اور اس کی سیٹ میں ایک بڑا سا سوراخ نظر آرہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ڈیوڈ کے وزن سے بید کی بنی ہوئی سیٹ ٹوٹ گئی اور جس جگہ ڈیوڈ نے پاؤں رکھا، وہاں ایک سوراخ ہو گیا تھا۔ بالکونی کے فرش پر ایک ٹوٹا ہوا بلب بھی پڑا ہوا تھا۔

”مجھے گری ہوئی کرسی دکھاؤ۔“ مونک نے کہا۔

ڈیولن نے اپنے آئی فون کا کیمرا اس کرسی پر فوکس کر دیا۔ اس کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مونک نے کہا۔

”اب مجھے بلب ہولڈر دکھاؤ۔“

ڈیولن نے کیمرے کو اوپر کی جانب کیا اور بالکونی کی چھت پر لگے ہوئے ساکٹ پر فکس کر دیا۔

”اب مجھے وہ بلب دکھاؤ جو میز پر رکھا ہوا ہے۔“

وہ سو واٹ کا بلب ابھی تک گتے کے ڈبے میں رکھا ہوا تھا۔

مونک کو اس پر بھی اطمینان نہیں ہوا۔ وہ بولا۔ ”مجھے وہ ٹوٹا ہوا بلب بھی دکھاؤ۔“

ڈیولن نے کیمرا فرش پر ٹوٹے ہوئے بلب پر فوکس کر دیا۔

”میں اس کا وہ حصہ بھی دیکھنا چاہتا ہوں جس کی چوڑی ساکٹ میں بیٹھتی ہے۔“

کیپٹن اسکاٹ فرش پر جھکا اور بڑی احتیاط سے اسے اٹھالیا۔ اس کے ساتھ ٹوٹے ہوئے بلب کا شیشہ لگا ہوا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ مونک بولا۔ ”صاف ظاہر ہے کہ یہاں کیا ہوا تھا؟“

”میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔“ ڈیولن بولی۔

”نہیں، تم نے بتایا تھا کہ بلب تبدیل کرتے ہوئے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور اس کا پاؤں کرسی کی ٹوٹی ہوئی سیٹ میں پھنس گیا۔ کرسی ایک طرف لڑھک گئی اور وہ ریلنگ سے ہوتا ہوا نیچے گر گیا۔“

ڈیولن نے کیمرے کا رخ اپنی جانب کر لیا۔ اب مونک اور جولی اس کے چہرے پر ناراضی اور غصے کے آثار دیکھ سکتے تھے۔ وہ جھلاتے ہوئے بولی۔ ”اس واقعے کے تمام ثبوت اور شواہد تمہارے سامنے ہیں۔“

”ہاں۔“ مونک نے کہا۔ ”اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ شخص بالکونی سے گر کر نہیں مرا بلکہ اسے قتل کیا گیا ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ ڈیولن چلاتے ہوئے بولی۔ وہ جانتی تھی کہ مونک نے نتیجہ اخذ کیا ہے۔ اس پر مزید بحث کرنا لاحاصل ہوگا کیونکہ قتل کے کیس میں اس کی رائے کبھی غلط نہیں ہوتی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو نہ روک سکی۔ یہ اس کی عزت نفس کا سوال تھا کیونکہ اس ہفتے میں یہ دوسری موت تھی جسے ابتدا میں اس نے حادثہ قرار دیا لیکن مونک نے فوراً ہی انہیں قتل ثابت کر دیا۔

کیپٹن اسکاٹ جانتا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے لیکن اس نے عرصہ ہوا مونک کے مشاہدے اور سراغ رسانی کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے اور وہ اس کے اخذ کردہ نتائج تسلیم کرنے کو ترجیح دیتا تھا لیکن ڈیولن کو کیپٹن اسکاٹ کی سمجھ بوجھ اور ذہانت تک پہنچنے کے لیے ابھی کافی وقت درکار تھا۔ وہ اسے ہمیشہ اپنی بے عزتی سمجھتی کہ اس کے کچھ کرنے سے پہلے مونک نے کوئی نتیجہ کیسے اخذ کر لیا۔ اسی لیے وہ اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی تھی۔ کیپٹن اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سوالات مونک کا نتیجہ قبول کرنے کے لیے کتنے ضروری ہیں۔ مونک نے ڈیولن کے سوالوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور صرف اتنا کہا۔ ”اس کے علاوہ اور کوئی وضاحت ممکن نہیں۔“

”میں تمہیں ساری بات تفصیل سے بتا چکی ہوں“

اس کے باوجود تم ایک مختلف نتیجہ اخذ کر رہے ہو جس کا اصل واقعے سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔“

جولی اس بحث سے اکتاہٹ محسوس کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ڈیولن کسی اعتراض کے بجائے مونک کا موقف تسلیم کر لے۔ اسی میں سب کے لیے آسانی تھی۔ اگر تمام لوگ کسی نتیجے پر متفق ہو جاتے تو اسے بھی چھٹی مل جاتی اور وہ بقیہ وقت اپنے دوست کے ساتھ گزار سکتی تھی۔

”ذرا اپنے ارد گرد نظر دوڑاؤ۔“ مونک نے ڈیولن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کتنی چیزیں بکھری پڑی ہیں؟“

”مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔“ ڈیولن بیزاری سے بولی۔ ”ہر چیز صاف اور ترتیب سے رکھی ہوئی ہے اور نہ ہی ایسا لگ رہا ہے کہ کوئی یہاں زبردستی گھس آیا ہو یا کوئی جدوجہد ہوئی ہو۔“

”میں نے یہ نہیں کہا کہ کسی نے حملہ کیا ہے یا کوئی لڑائی ہوئی ہے۔“

”لیکن تم تو کہہ رہے ہو کہ یہاں چیزیں بکھری ہوئی ہیں؟“

”ہاں، میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔“ مونک بولا۔

”لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں ہوا۔“ ڈیولن بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

کیپٹن اسکاٹ نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”اگر تم دونوں اسی طرح بحث کرتے رہے تو ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ مونک! تم بتاؤ کہ یہاں کیا واقعہ پیش آیا اور ڈیوڈ کی موت کس طرح ہوئی؟“

”میں بتاتا ہوں کہ کیا ہوا۔“ مونک اعتماد سے بولا۔ ”مسٹر ڈیوڈ کاؤچ پر نیم دراز کتاب پڑھ رہے تھے کہ کسی نے ڈور بیل بجائی۔ مسٹر مونک نے کتاب میز پر رکھی اور دروازہ کھولنے کے لیے اٹھے۔ دروازے پر ان کا ایک دوست کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے اس سے مصافحہ کیا اور اسے اندر لے آئے۔ جیسے ہی وہ میز کے پاس سے گزرے تو ان کے دوست نے وہ کتاب اٹھالی۔ مسٹر ڈیوڈ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ان کے دوست نے پوری قوت سے وہ کتاب ان کے چہرے پر دے ماری اور مسٹر ڈیوڈ وہیں ڈھیر ہو گئے۔“

”یہ محض قیاس آرائی ہے۔“ ڈیولن نے کہا۔

”پھر تم ہی بتاؤ کہ مسٹر ڈیوڈ کا چشمہ کس طرح ٹوٹا؟“

”کون سا چشمہ؟“ اسکاٹ نے پوچھا۔

”وہ پڑھنے کا چشمہ استعمال کرتے تھے جسے جلدی میں اتارنا بھول گئے تھے۔“ یہ کہہ کر مونک نے جولی کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے بیگ سے وہ چھوٹی سی تھیلی نکالی جس میں ٹوٹا ہوا چشمہ رکھا ہوا تھا اور کیمرے کے سامنے کر دی تاکہ اسکاٹ اور ڈیولن اسے دیکھ سکیں۔

”مجھے یہ چشمہ لاش کے پاس سے ملا تھا۔“ مونک نے کہا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بالکونی سے گرتے وقت ڈیوڈ نے یہ چشمہ لگا رکھا ہو اور جب اس کا جسم کار کی چھت سے ٹکرایا تو یہ چشمہ الگ ہو کر سڑک پر جا گرا ہو۔“

”مجھے یقین ہے کہ گرتے وقت انہوں نے یہ چشمہ نہیں پہنا ہوا تھا بلکہ قاتل نے اسے بالکونی سے نیچے اس لیے پھینک دیا تاکہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ یہ چشمہ کتاب کی ضرب لگنے سے پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ اگر تم غور سے دیکھو تو ٹوٹے ہوئے فریم کے کچھ ٹکڑے میز کے نزدیک قالین پر نظر آجائیں گے۔“

”لیکن میں نے تو اس دوران کیمرے کا رخ فرش کی جانب نہیں کیا پھر تمہیں یہ ٹکڑے کس طرح نظر آگئے؟“ ڈیولن نے کہا۔

”تم بھول رہی ہو جس وقت کیپٹن اسکاٹ نے میز پر سے کتاب اٹھائی تھی تو تم نے میرے کہنے پر کیمرے کا رخ فرش کی جانب بھی کیا تھا؟“

”اور تم نے اس مختصر سے لمحے میں آئی فون کی چھوٹی سی اسکرین پر وہ ٹکڑا دیکھ لیا جسے تم لاش کے پاس سے ملے ہوئے چشمے سے جوڑ رہے ہو؟“ ڈیولن نے طنزاً کہا۔

”میں تو زمین پر گرے ہوئے توس کے وہ بھورے بھی دیکھ سکتا ہوں جو اس نے ناشتے میں کھایا تھا۔“

”تم شیخی بگھار رہے ہو۔ اتنی چھوٹی چیزیں تو سپر مین کو بھی نظر نہیں آتیں۔“

”اس کے بعد جو ہوا، وہ دھیان سے سنو۔“ مونک بولا۔ ”قاتل کی نظر بالکونی کی چھت پر لگے ہوئے بلب پر گئی جو ٹوٹا ہوا تھا۔ قاتل نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو کوئی شک ہو چنانچہ اس نے الماری سے ایک نیا بلب نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا پھر اس نے اپارٹمنٹ کی ساری بتیاں بجھا دیں تاکہ بلب بدلنے کے دوران باہر سے کوئی اسے نہ دیکھ سکے۔ اس نے بید کی کرسی پر کھڑے ہو کر ٹوٹا ہوا بلب نکالنے کی کوشش کی لیکن اس کے وزن سے سیٹ ٹوٹ گئی اور اس میں اس کے جوتے کے سائز کے برابر سوراخ ہو گیا پھر اس نے ڈائننگ ٹیبل سے ایک کرسی اٹھائی اور اس پر کھڑے ہو کر اس نے چھت پر لگے ہوئے ہولڈر سے ٹوٹا ہوا بلب نکالا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا۔ اپارٹمنٹ کے باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے جلدی سے کرسی اٹھا کر اپنی جگہ پر رکھی۔ ڈیوڈ کی لاش کو اٹھایا اور اسے بالکونی

سے نیچے پھینک دیا۔“

”یہ تو کوئی من گھڑت کہانی لگتی ہے۔“ ڈیولن نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو یہاں کوئی ایسا ثبوت نظر نہیں آرہا جس سے تمہاری بیان کردہ کہانی کی تائید ہوسکے۔“

”تمہیں کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کرنا چاہیے۔“ مونک بولا۔ ”کیونکہ یہاں ایک نہیں بلکہ کئی ثبوت ہیں۔“

”مثلاً؟“ ڈیولن نے پوچھا۔

”تمہیں بید کی کرسی کی سیٹ میں سوراخ نظر آرہا ہے؟“

”ہاں، لیکن تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ ڈیوڈ نے خود ہی اس کرسی پر کھڑے ہوکر بلب بدلنے کی کوشش نہیں کی ہوگی؟“

”اس کی چار وجوہات ہیں۔ پہلا جوتے کا سائز ..... جس کسی نے بھی بلب بدلنے کی کوشش کی، اس نے بارہ نمبر کا جوتا پہن رکھا تھا۔ دوسرا قد..... گو کہ میں نے لاش نہیں دیکھی لیکن الماری میں لٹکی ہوئی جیکٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا قد پانچ فٹ دو انچ ہے اور اس قد کا آدمی کرسی پر کھڑے ہونے کے باوجود بالکونی کی چھت پر لگے ہوئے بلب تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور تیسری وجہ بلب ہیں۔ پرانا بلب 65 واٹ کا تھا جبکہ نیا بلب سو واٹ کا ہے۔ گویا قاتل نے الماری میں سے غلط بلب کا انتخاب کیا۔ ڈیوڈ کبھی ایسی غلطی نہ کرتا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اس ہولڈر میں زیادہ سے زیادہ پچھتر واٹ کا بلب لگ سکتا ہے اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ کافی کی میز پر بے ترتیبی نظر آرہی ہے۔“

ڈیولن نے میز کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”مجھے تو یہاں ہر چیز ٹھیک ٹھاک نظر آرہی ہے۔“

”مجھے حیرت ہے کہ تمہیں ڈرائیونگ لائسنس کیسے مل گیا؟“ مونک بولا۔ ”تمہیں تو قریب کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں۔ مسلسل دھوپ پڑنے سے میز کا رنگ اڑ گیا ہے اور جب اندھیرے میں قاتل کی ٹانگ میز سے ٹکرائی تو میز پر رکھی ہوئی سب چیزیں بکھر گئیں اور میز پوش کے نیچے سے لکڑی نظر آنے لگی۔“

ڈیولن نے ایک بار پھر کیمرا میز کی جانب کیا اور اسے یقین آگیا کہ مونک ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ جولی نے پہلی مرتبہ میں اس جانب توجہ نہیں دی تھی اور دوسری بار بھی اس نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ اس کا کام نہیں تھا کہ وہ ثبوت اکٹھا کرے۔ اس کام کے لیے وہاں کئی پولیس والے موجود تھے۔ وہ صرف مونک کی معاونت کے لیے آئی تھی۔ اس کی طرح ڈیولن اور کیپٹن اسکاٹ نے بھی اس نکتے پر توجہ نہیں دی تھی۔

”تم اس کرسی کو غور سے دیکھو جسے قاتل نے استعمال کیا تھا۔ وہ اس طرح نہیں رکھی گئی جیسا کہ اسے ہونا چاہیے تھا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی نے اس کرسی کو اپنی جگہ سے ہٹایا اور کام مکمل ہوجانے کے بعد واپس لاکر رکھ دیا۔“

ڈیولن نے آئی فون کا کیمرا دوبارہ اپنے اور اسکاٹ کی جانب کردیا جو تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”میں تمہارے مشاہدے کی داد دیتا ہوں کہ تم نے اوپر آئے بغیر آئی فون کی چھوٹی سی اسکرین پر یہ سب کچھ دیکھ لیا۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس میں آدھی حقیقت ہے۔ باقی وہ اندازے کی بنیاد پر کہہ رہا ہے۔“ ڈیولن اب بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

”ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔“ اسکاٹ بولا۔ ”لیکن میں شرط لگانے کے لیے تیار ہوں کہ فارنسک رپورٹ سے ثابت ہوجائے گا کہ اس نے فرش اور کرسی کے بارے میں جو کہا وہ بالکل درست ہے۔ وہ اپنی ننگی آنکھ سے حشرات الارض بھی دیکھ سکتا ہے۔“

”تمہیں ایسے فحش الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔“ مونک نے اعتراض کیا۔

”چلو میں اس کی جگہ کھلی آنکھ کہہ دیتا ہوں۔“ اسکاٹ بولا۔ ”میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم کسی چشمے یا دوربین کے بغیر سب کچھ دیکھ لیتے ہو۔“

اس سے پہلے کہ ڈیولن کچھ کہتی، جولی بول پڑی۔ ”لی لینڈ! کیا ہمارا کام ختم ہوگیا؟“

”ہاں، صرف مونک سے یہ پوچھنا باقی ہے کہ قاتل کون تھا؟“

جولی نے کیمرا مونک کے سامنے کردیا۔ اس نے سر ہلایا اور اس کی آنکھیں سڑک پار کھڑی مرسیڈیز پر جم گئیں۔ جولی اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے کیپٹن اسکاٹ سے بولی۔ ”اس کار کے ذریعے تم قاتل تک پہنچ سکتے ہو۔“

”یہ بھی بتادو کہ اسے کیوں قتل کیا گیا؟“ ڈیولن نے ایک بار پھر طنز کیا۔

اس بار جواب دینے کی باری جولی کی تھی۔ وہ تڑخ کر بولی۔ ”ہم سراغ رساں ہیں۔ تفتیشی افسر نہیں۔ یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے۔“

مونک نے پیار سے اس کا شانہ تھپتھپایا اور بولا۔ ”تم واقعی بہت ذہین ہو۔“

محبت اور جنگ

کاشف زبیر

محبتوں کے راستے پُرخار ہی نہیں پُردرد بھی ہوتے ہیں... کسی کو اپنی محبت آگ کا دریا پار کیے بغیر مل جاتی ہے... اور کسی کی راہ میں سمندروں کی دوری حائل ہو جاتی ہے... دو ایسے ہی پروانوں کے گرد گھومتی پُرنم کہانی ... جو محبت اور جنگ دونوں محاذوں پر ڈٹے ہوئے تھے۔

مشرقی جذبات میں گندھی مغربی تہذیب میں رنگی ایک سنگین و رنگین کہانی

آرتھر ایلن نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور اپنی چھاگل کو ہلایا۔ اس میں تھوڑا پانی باقی رہ گیا تھا.... درحقیقت بچنے والے تقریباً پچاس افراد کے پاس پانی نہ ہونے کے برابر تھا۔ قلعے میں جس جگہ پانی کا کنواں تھا وہ فصیل بمباری سے تباہ ہوچکی تھی اور اب کنواں محاصرہ کرنے والی فوج کی زد میں تھا۔ دو دن میں فرانسیسی فوج کے ایک درجن آدمی کنوئیں سے پانی حاصل کرنے کی کوشش میں قبائلیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ اس کے بعد کسی نے ہمت نہیں کی کہ پانی حاصل کرنے

کی کوشش کرے۔ دوسری طرف شدید گرمی اور صحرا کا خشک موسم رفتہ رفتہ ان کے جسموں سے نمی چوس رہا تھا۔ آرتھر جانتا تھا کہ اگر قبائلیوں نے کچھ نہ کیا، تب بھی یہ پیاس ان کی جان لینے کے لیے کافی ہوگی۔ ان کا بچنا مشکل ہی نہیں ناممکن لگ رہا تھا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد شمال مغربی افریقا میں یورپی استعمار تیزی سے پھیل رہا تھا اور اسی حساب سے اس کے خلاف مزاحمت بھی ہو رہی تھی۔ مراکش کے ساحلی اور وسطی حصے فرانس کے قبضے میں آچکے تھے۔ اس نے اسپین کی فوج کو شمال مغربی افریقا سے پسپا کر دیا تھا لیکن اب بربر اور مراکشی عرب قبائل اس کے لیے دردِ سر بن گئے تھے۔ آرتھر کا دستہ دو مہینے پہلے اس قلعے میں آیا تھا۔ یہ چھوٹا سا قلعہ مراکش میں فرانسیسی فوج کا مستقر تھا اور وہ یہاں سے آس پاس کے علاقوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن حالات اتنے خراب ہو گئے تھے کہ یہاں بھیجی جانے والی فوج کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ لڑائی کے دوران آخری گولی اپنے لیے بچا کر رکھے کیونکہ دشمن کے قبضے میں جانے کی صورت میں موت بہت مشکل اور سسک سسک کر آتی ہے۔

آرتھر اور اس کے تین ساتھی ایک نیم تباہ شدہ کمرے میں موجود تھے۔ کسی گولے نے اس کی چھت میں سوراخ کر دیا تھا۔ پیاس اور شدید گرمی کے باوجود وہ پوری طرح چوکس تھے۔ ایک ہفتہ پہلے قبائلیوں نے قلعے کا محاصرہ کر لیا تھا۔ قلعے کے کمانڈنٹ کرنل شائن کا خیال تھا کہ قبائلیوں نے ان کی رسد کے راستے بند کر دیے تھے۔ محاصرہ کرنے والوں کی تعداد کم سے کم بھی دو ہزار تھی اور قلعے میں صرف پانچ سو فرانسیسی سپاہی تھے۔ حملہ آور رسد حاصل کرنے کے لیے آزاد تھے اور وہ محاصرے میں تھے۔ کرنل شائن نے اپنے افسروں سے مشورہ کیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ آخری دم تک مقابلہ کریں گے اور جیتے جی ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔

ان کے پے در پے حملوں کے نتیجے میں فرانسیسی فوج نے خاصا ایمونیشن ضائع کیا اور یہی شاید دشمن کا مقصد تھا پھر وہ فرانسیسیوں کو بے آرام کر رہے تھے۔ ہر حملے کے موقع پر سب کو الرٹ کر دیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ سپاہی بے آرامی کا شکار ہونے لگے۔ ان میں سے اکثر مورچوں پر سوتے ہوئے پائے جاتے۔ تقریباً سارے حملے آدھی رات کو یا صبح سویرے ہوتے تھے۔ قبائلی اب دن میں نہیں لڑتے تھے۔ فرانسیسی سوائے چوکنا ہونے کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

دو دن پہلے قبائلیوں نے بڑا حملہ کیا۔ اس میں انہوں نے توپیں استعمال کیں اور سارے دن کی شدید لڑائی کے بعد قلعہ تقریباً تباہ ہو گیا۔ سب سے بڑا نقصان گولہ بارود کے ذخیرے میں آگ لگنے سے ہوا۔ اس نے نہ صرف نصف قلعہ اڑا دیا بلکہ کم سے کم نصف فرانسیسی سپاہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ قلعے میں پانی کے لیے ایک ہی کنواں تھا اور جس چھت اور دیوار کی آڑ میں یہ کنواں تھا، وہ بھی تباہ ہو گئی۔ اب کنواں دور سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس شدید تباہی نے آرتھر سمیت سب کو بدحواس کر دیا تھا۔ آرتھر کا خیال تھا کہ اب قبائلی آخری حملہ کریں گے اور بچ جانے والے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے لیکن حیرت انگیز طور پر قبائلیوں نے حملے روک دیے اور ان کی توپیں بھی خاموش ہو گئیں۔

کرنل شائن کے دونوں نائب مارے جا چکے تھے۔ اس نے فی الحال سارجنٹ بیمر کو اپنا نائب بنا لیا تھا۔ وہ نقصان دیکھ رہا تھا۔ پانچ سو میں سے صرف سو افراد بچے تھے اور بچنے والوں میں سے تیس شدید زخمی تھے۔ مرنے والوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ سب سے پہلے انہیں دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ اگر چوبیس گھنٹے یہ لاشیں یہاں پڑی رہتیں تو ان کی بو سے یہاں رہنا محال ہو جاتا۔ قبریں کھودنے کا نہ وقت تھا اور نہ حوصلہ۔ قلعے کے شمالی حصے میں ایک تہ خانہ تھا جس میں داخلے کا راستہ تباہ ہو گیا تھا اور ایک طرف چھت میں سوراخ بھی ہو گیا تھا۔ تمام مرنے والوں کی لاشیں اس سوراخ سے تہ خانے میں ڈال دی گئیں اور پھر ملبے کی مدد سے اس سوراخ کو بھی بھر دیا گیا تھا۔ شدید زخمیوں میں سے نصف اسی دوران میں مر گئے تھے۔ ان کی لاشیں بھی تہ خانے میں ٹھکانے لگا دی گئیں۔

آخری حملے میں قلعے کے چاروں برج تباہ ہو گئے تھے جن پر توپیں لگی تھیں۔ دو توپیں صحیح سلامت تھیں لیکن انہیں استعمال کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ یہ جنگ ہار چکے تھے اور بس آخری حملے کے منتظر تھے مگر اس سے پہلے ہی پیاس نے ان کی جان نکالنا شروع کر دی تھی۔ پانی کا کنواں کھلی جگہ آ گیا تھا اور جو فرانسیسی کنوئیں کی طرف آتا، اسے قبائلیوں کی فائرنگ کا سامنا کرنا پڑتا۔ آرتھر نے تجویز پیش کی کہ وہ آہستہ آہستہ اینٹیں لگا کر کنوئیں تک ایک حفاظتی دیوار کھڑی کر دیں اور کنوئیں سے پانی حاصل کریں۔ کرنل شائن کی دانست میں یہ کوئی اچھا خیال نہیں تھا مگر اس نے اجازت دے دی کیونکہ اس کے سوا اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ ایک درجن سپاہی ملبے کی اینٹوں کی مدد سے دیوار سی کھڑی کرکے کنوئیں کے پاس پہنچنے لگے لیکن عین اس وقت جب

کنوئیں کے پاس پہنچ گئے تھے، اچانک قبائلی توپوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ دوسرے اور تیسرے گولے نے دیوار اڑا دی اور اس کے پیچھے موجود سپاہیوں کے بھی پرخچے اڑ گئے۔ اس کے بعد کسی نے کنوئیں کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سب اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔

آرتھر سپاہی تھا اور اس کا کام حکم کی تکمیل کرنا تھا۔ صرف چار مہینے پہلے وہ پیرس میں تھا۔ اس وقت اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے کسی صحرا میں موت کا سامنا ہوگا۔ وہ تین مہینے سے اس دستے کے ساتھ تھا اور انہوں نے ایک ساتھ ہی تربیت حاصل کی تھی۔ آرتھر خاموش طبع تھا۔ اس کی خاموشی کی وجہ سے اس کے ساتھی اسے مسٹر چپ کہتے تھے اور وہ برا نہیں مانتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ تمام سرگرمیوں میں شامل ہوتا تھا۔ بس وہ بولتا کم تھا۔ کمرے میں موجود تینوں افراد اس کے قریب تھے۔ جولیس افریقی نژاد فرانسیسی تھا۔ جیک انگریز تھا اور فرانس کی طرف سے لڑنے کے لیے فوج میں بھرتی ہوا تھا جبکہ ایمارے خالص فرانسیسی تھا۔ نازک اندام اور محبت کرنے والا لیکن اس کی قسمت تھی کہ وہ سفاک صحرائی قبائلیوں کے مقابل تھا جو محبت تو کیا رحم و مروت سے بھی نا آشنا تھے۔

”میرا خیال ہے کہ زیادہ سے زیادہ کل تک کہانی ختم ہو جائے گی۔“ جیک نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ گری ہوئی اینٹوں کے ملبے پر دراز تھا۔

”بربروں کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ جولیس نے اس کی تائید کی۔ ”وہ صرف یہ دیکھنے آئیں گے کہ ہم میں سے کوئی زندہ تو نہیں ہے۔“

”خدا کے لیے۔“ ایمارے کراہا۔ ”کیا تم لوگ کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟“

”یہ حقیقت ہے۔“ آرتھر بولا۔ ”لیکن اس کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”شتر مرغ والا رویہ۔“ جولیس ہنسا۔ ”لیکن اس سے جان نہیں بچے گی۔“

”ایک امکان تو ہے۔“ آرتھر نے کہا۔ ”اس قلعے کے لیے ہر دو مہینے بعد نیا دستہ بھیجا جاتا ہے۔“

”کیونکہ پرانا دستہ دنیا سے رخصت ہو گیا ہوتا ہے۔“ جولیس نے لقمہ دیا۔ ”تم بھول رہے ہو ہمیں یہاں آئے ہوئے دو مہینے نہیں ہوئے ہیں۔“

”آج ایک مہینا اور ستائیس دن ہوئے ہیں۔“ ایمارے نے ایک ایک دن کا حساب رکھا ہوا تھا۔ ”کاش میں اپنی محبوبہ کی بات مان لیتا مگر اس وقت مجھ پر جلد از جلد دس ہزار فرانک جمع کرنے کا بھوت سوار تھا۔ ہماری شادی کے لیے دس ہزار فرانک کی ضرورت تھی اور اتنی رقم سال کے اندر صرف اس ملازمت سے ہی مل سکتی تھی۔“

”مجھے رقم کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں جنگ میں حصہ لینا چاہتا تھا۔“ جیک بولا۔ ”میرا باپ جنگِ عظیم میں برطانیہ کی طرف سے لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ مرنا مارنا ہمارے خون میں شامل ہے۔“

”فی الحال برطانیہ کسی سے جنگ نہیں کر رہا ہے اس لیے تم نے فرانسیسی فوج کا انتخاب کیا۔“ جولیس ہنسا۔ ”جہاں تک میرا تعلق ہے، میں افریقا کی سرزمین دیکھنا چاہتا تھا۔ میں سیاہ فام ہوں لیکن فرانس میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔ میں نے آج تک افریقا نہیں دیکھا۔“

جیک نے آرتھر سے کہا۔ ”تم نے آج تک نہیں بتایا کہ تم فوج میں کیوں آئے؟“

آرتھر نے چھاگل ہلا کر اس میں موجود پانی محسوس کیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”میں جان بچانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔“

وہ تینوں مسکرا دیے۔ جولیس نے کہا۔ ”دوست! تم نے اٹکا مارا ہے۔ لوگ جان بچانے کے لیے کسی پُرامن جگہ جاتے ہیں اور تم یہاں آ گئے جہاں سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے۔“

”میں نے انتخاب نہیں کیا تھا لیکن میرے پاس کوئی اور انتخاب نہیں تھا۔“

جیک نے التجا کی۔ ”میں نے سنا ہے کہ فرانسیسی مشکل انداز میں گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں لیکن کیا تم مجھ جیسے سادہ انگریز کے لیے آسان الفاظ میں وضاحت کرو گے؟“

”آسان الفاظ میں؟“ آرتھر نے پُرخیال انداز میں کہا۔

☆☆☆

یہ محبت کی ازلی تکون تھی۔ غریب لڑکا، دولت مند کی شہزادی جیسی بیٹی اور اس کے پائے کا دولت مند رقیب۔ غریب لڑکا آرتھر تھا۔ دولت مند شہزادی جولیا تھی اور اس کے مقابل دولت مند رقیب الیکس مینائے تھا۔ جوآن ہیکٹر پیرس کے دولت مند ترین افراد میں سے ایک تھا، وہ صرف دولت مند نہیں تھا بلکہ طاقتور بھی تھا کیونکہ اس کے آس پاس درجنوں مسلح بدمعاشوں کی فوج تھی۔ قانون سمیت کسی میں اس سے ٹکرانے کی ہمت نہیں تھی۔ جوآن نے یہ دولت شرافت سے نہیں کمائی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ بیسویں صدی کے

پیرس میں ہونے والے ہر غیر قانونی کام میں کم سے کم بیس فیصد حصہ جوآن ہیکٹر کا ہوتا تھا۔

آرتھر ایک ابھرتا ہوا باکسر تھا اور اس نے اپنی ابتدائی چند فائٹس میں دھاک بٹھا دی تھی۔ جولیا نے اسے ایک فائٹ میں دیکھا۔ جب آرتھر کے زوردار مکّے نے اس کے حریف کو چت کیا تو ساتھ ہی جولیا بھی اپنا دل ہار گئی۔ جب کوئی لڑکی کسی لڑکے کے سامنے دل ہار جائے تو وہ اس تک رسائی کے راستے نکال لیتی ہے۔ جولیا نے پیش قدمی کی اور مزاحمت کے باوجود آرتھر اس کے سامنے ہار ماننے پر مجبور ہوگیا۔ یہ اس کی پہلی شکست بھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ غریب طبقے سے تعلق رکھتا ہے اس لیے جولیا کا باپ جوآن کبھی نہیں مانے گا۔ اس سے زیادہ جولیا یہ بات سمجھتی تھی۔ اس نے آرتھر سے کہا کہ وہ فرانس سے بھاگ کر امریکا چلے جاتے ہیں۔ امریکا دور دراز ملک ہے۔ وہاں چھپنے کی بہت جگہیں ہیں اور وہاں روزگار کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔

آرتھر مان گیا۔ جولیا کے پاس خاصی نقد رقم تھی لیکن اس سے کہیں زیادہ مالیت کے قیمتی زیورات اور جواہرات تھے جو امریکا میں بہت اچھی قیمت پر بک سکتے تھے مگر عین موقع پر جب وہ فرار ہونے والے تھے، نہ جانے کیسے جوآن کے بھائی جون ہیکٹر کو معلوم ہوگیا اور وہ اپنے بدمعاش لے کر ان کے پیچھے آگیا۔ اس نے جولیا کو زبردستی روک لیا اور اس کے آدمی آرتھر کو قتل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی کشمکش کے دوران آرتھر جس آدمی سے الجھا ہوا تھا اس سے گولی چل گئی اور وہ جون کے سینے میں اتر گئی۔ آرتھر جون کے آدمیوں کی بدحواسی کا فائدہ اٹھا کر فرار ہوگیا۔ وہ کچھ دیر سے اس کے پیچھے آئے۔ انہوں نے جلد اسے ایک علاقے میں گھیر لیا۔ آرتھر نے محسوس کیا کہ وہ اسی طرح بھاگتا رہا تو جلد پکڑا جائے گا۔ وہ بھاگ رہا تھا کہ اچانک پیرس میں فوج کی بھرتی کے دفتر کے سامنے پہنچ گیا۔ دفتر دیکھ کر اسے جان بچانے کا خیال آیا اور وہ اندر داخل ہوگیا۔

☆☆☆

”میرا خیال ہے اس سے زیادہ آسان الفاظ میں یہ کہانی سنانا ممکن نہیں تھا۔“ آرتھر نے اپنی داستان سنانے کے بعد کہا۔

”تم فرانسیسی نثر میں بھی شاعری کرتے ہو۔“ جیک نے شکایت کی۔ ”بہرحال، میں تم سے متفق ہوں کہ تمہارے پاس جان بچانے کے لیے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔“

ایمارے نے کہا۔ ”بے شک ہمیں فرانس سے جانوروں کی طرح قید کر کے لایا گیا ہے لیکن اگر تم کوشش کرتے تو راستے میں فرار ہو سکتے تھے۔“

آرتھر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ میری عزتِ نفس کے خلاف ہوتا۔ میرے فرار کی صورت میں مجھے بزدل اور بھگوڑا تصور کیا جاتا اور میں کسی صورت یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کے بدلے مجھے دردناک موت بھی قبول ہے۔“

”یہاں تمہیں دردناک موت ہی ملے گی۔“ جیک اٹھتے ہوئے بولا پھر رک گیا۔ ”ہاں، تم نے اپنے رقیب کے بارے میں تو بتایا ہی نہیں۔“

”الیکس۔“ آرتھر نے گہری سانس لی۔ ”وہ بھی ایک سپاہی کا بیٹا ہے۔ اس کے باپ نے بہت دولت کمائی اور وہ عیش کرتا ہے۔ اس نے ایک دوبار مجھے دھمکانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مجھے اصل خطرہ جوآن اور اس کے بھائی کی طرف سے تھا۔“

”جون کی موت پر اس کے بھائی کا کیا ردِعمل ہو گا؟“ جولیس نے پوچھا۔

”خوفناک... وہ دنیا میں اپنے بھائی سے زیادہ کسی سے محبت نہیں کرتا ہے۔ وہ میرے خون کا پیاسا ہوگا۔ اگر اس کا بس چلے تو مجھے دس بار قتل کرے اور ہر بار زیادہ اذیت سے مارے۔“

جولیس ہنسا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ جوآن کی خواہش پوری ہو جائے گی کیونکہ اس جگہ مرنا دس بار مرنے کے برابر ہے اور ہر بار پہلے سے زیادہ اذیت ہوگی۔“

ایمارے نے جولیس کو گھورا۔ ”تمہیں موت کے سوا کوئی اور لفظ یاد نہیں ہے؟“

”یہاں اس کے سوا اور ہے ہی کیا؟“ جولیس نے سرد آہ بھری۔

اس بار جیک اٹھ گیا۔ ”میرا خیال ہے کہ ہماری ڈیوٹی کا وقت ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ سارجنٹ بیمر ہمارے سر پر آ کر بھونکے، ہمیں خود ڈیوٹی پر پہنچ جانا چاہیے۔“

کرنل شائن اپنے تقریباً تباہ شدہ دفتر میں ایک نقشے پر جھکا ہوا تھا۔ سارجنٹ بیمر اس کے ساتھ تھا۔ اس نے کرنل سے کہا۔ ”فیس سے آنے والے راستے پر بے شمار مقامات ایسے ہیں جہاں قبائلی گھات لگا کر رسد لانے والے قافلوں پر حملے کر سکتے ہیں اس لیے ہمیں زیادہ امید نہیں لگانی چاہیے۔“

کرنل شائن کے خیال میں اس جنگ میں گھوڑے کلیدی کردار ادا کر رہے تھے۔ ان خوفناک صحراؤں میں عربی گھوڑوں سے بہتر سواری کوئی نہیں ہے۔ تیز رفتاری اور

برداشت میں یہ اونٹوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ قبائلیوں کے پاس گھوڑے تھے اور وہ ان سے محروم تھے۔ سارجنٹ بیمر نے کہا۔ ”سر! ہمیں پانی چاہیے۔ یہ رسد سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے ورنہ یہ سڑے لوگ رسد کے انتظار میں زندہ نہیں رہیں گے۔“

”ہم کیا کر سکتے ہیں؟“ کرنل نے شانے اچکائے۔ ”کنوئیں تک جانا ممکن نہیں۔ اگر ہم دوسرا کنواں کھودتے ہیں تو اس کے لیے وقت اور بہت سی توانائی چاہیے۔ دونوں چیزیں ہمارے پاس نہیں ہیں۔ صحرا میں کنواں کھودنا ویسے بھی مشکل کام ہے اور یہاں پانی دو سو فٹ کی گہرائی میں ہے۔“

سارجنٹ بیمر بھی یہ حقیقت جانتا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ اجازت دیں تو میں چند آدمیوں کو ساتھ لے کر پانی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”بیکار ہے، وہ رائفل کے بجائے توپ استعمال کریں گے اور میں اپنے آدمیوں کے مزید ٹکڑے دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا۔ رسد آنے میں ابھی دو دن ہیں۔ اگر وہ آگئی تو اس کے ساتھ کم سے کم ڈیڑھ سو سپاہی بھی آئیں گے۔“

”فائدہ سر؟“ سارجنٹ بیمر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”دشمن کو ڈیڑھ سو شکار اور مل جائیں گے۔“

کرنل شائن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے اکثر آدمی یہاں سے پسپائی چاہتے تھے لیکن کرنل شائن نے یہیں رک کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ پسپائی بھی انہیں موت سے نہیں بچا سکتی تھی۔ قبائلی راستے میں زیادہ آرام سے انہیں گھات لگا کر ہلاک کرتے۔ یہاں انہیں حملہ کرنا پڑتا تھا اور ان کا جانی نقصان بھی ہو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو ڈیڑھ سو آتے، وہ بھی موت کے منہ میں آ پہنچتے لیکن وہ ان کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں، ان کی آمد سے انہیں کچھ وقت مل جاتا۔ ممکن ہے، وہ قلعے کی دیوار مرمت کر کے کنوئیں کو محفوظ بنا لیتے۔ کرنل کو حیرت تھی کہ دیوار ٹوٹ جانے کے باوجود قبائلیوں نے حملہ کیوں نہیں کیا تھا؟ یہ بہت آسان تھا کہ ان کے گھوڑے چڑھ دوڑتے اور بچے کھچے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے میں انہیں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ لیکن اس حملے میں انہیں خود بھی بہت نقصان اٹھانا پڑتا اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ حملے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ سکون سے منتظر تھے کہ کب پیاس فرانسیسی سپاہیوں کو ہلاک کرتی ہے یا انہیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتی ہے۔

کرنل باہر آیا تو آرتھر اور اس کے ساتھی ٹوٹی ہوئی فصیل کے سامنے پہرا دے رہے تھے۔ ان سب کے چہرے پیاس اور خوف سے ستے ہوئے تھے۔ کرنل ان کا معائنہ کرتا ہوا چلا گیا۔ جولیس نے کہا۔ ”اگر میں بچ نکلا تو دوبارہ کسی جنگ میں شامل نہیں ہوں گا۔“

”میں تو پیرس سے باہر بھی نہیں جاؤں گا۔“ ایمارے بولا۔ ”اگر کوئی فوج پیرس تک آئی تو میں وہاں سے بھی بھاگ جاؤں گا۔“

”انسان اپنی تقدیر سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا ہے۔“ آرتھر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”دیکھو، موت ہمیں کہاں سے کھینچ کر کہاں لے آئی ہے۔“

”لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہم سب مارے جائیں۔ ممکن ہے کوئی بچ بھی جائے۔“ جیک بولا۔

”جو بچ جائے، وہ ہماری چیزیں اور پیغام ہمارے گھر والوں کو پہنچا دے۔“ ایمارے نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ مائرل کی یہ تصویر اس تک پہنچا دی جائے اور اسے بتایا جائے کہ میں زندگی کی آخری سانس تک اس سے محبت کرتا رہا۔“

”میرا باپ کٹر کرسچین ہے۔“ جولیس بولا۔ ”میں اتنا مذہبی نہیں ہوں لیکن باپ کے اصرار پر یہ لاکٹ پہن لیا تھا۔“ اس نے گلے میں لٹکا لاکٹ دکھایا جس پر مصلوب مسیح کی چھوٹی سی شبیہ تھی۔ ”میں چاہتا ہوں کہ یہ میرے باپ تک پہنچا دیا جائے۔“

جیک کی ماں زندہ تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی سی سفری بائبل اپنی ماں تک پہنچانے کی خواہش ظاہر کی۔ آرتھر نے گہری سانس لی۔ ”میری خواہش ہے کہ میں خود بچ کر جولیا کے پاس پہنچ جاؤں۔“

جولیس ہنسا۔ ”اس سے پہلے اس کا باپ تمہارا منتظر ہو گا۔ ہتھیار بدست اور کفن دفن کی تیاری کے ساتھ۔“

یہ رات بھی خیریت سے گزری۔ مگر صبح تقریباً سب کے پاس پانی ختم ہو چکا تھا۔ جنہوں نے اپنا پانی گزشتہ رات ختم کر دیا تھا، ان کی حالت زیادہ بُری تھی۔ آرتھر نے صبر کیا تھا اور جب پیاس برداشت سے باہر ہونے لگتی تو ذرا سا پانی منہ میں ڈال لیتا اور اسے پینے کے بجائے چوستا رہتا۔ اس ترکیب سے وہ اب تک اپنا پانی بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ جولیس اور جیک کا پانی بھی ختم ہو گیا تھا۔ البتہ ایمارے کے پاس کچھ پانی تھا۔ سپاہیوں نے دن کی دھوپ میں پہرا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ویسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اگر وہ

حملے سے باخبر بھی ہو جاتے تو مدافعت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے خود کو حالات اور دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ البتہ فصیل کے گر جانے والے حصے پر ایک درجن سپاہی موجود تھے۔ وہ چاروں واپس اپنے کمرے میں آگئے۔ ایمارے کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہ آخری دن ہے، کل شاید ہی ہم میں سے کوئی زندہ بچے۔''

''آدمی بہت سخت جان ہوتا ہے۔ اگر وہ زندہ رہنے کا فیصلہ کر لے تو اتنی آسانی سے نہیں مرتا۔'' جیک نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ عرب کے بدو صحرا کی شدید گرمی میں تین دن بغیر پانی کے آرام سے رہ لیتے ہیں اور وہ سفر بھی کرتے ہیں جبکہ ہمیں صرف اس جگہ رہنا ہے۔''

''وہ صحرا کے رہنے والے ہیں، یہاں کے ماحول کے عادی ہوتے ہیں۔'' ایمارے نے کہا۔

آرتھر نے سر ہلایا۔ ''ہمیں حوصلہ کرنا چاہیے۔''

''اگر مدد آگئی تو ہم مزید ایک سے ڈیڑھ ہفتے مدافعت کر سکتے ہیں۔'' جولیس نے کہا۔

ایمارے پھر بولا۔ ''مدد آنے کا امکان نہیں ہے۔ یہ اتنے سکون سے محاصرہ اس لیے کر کے بیٹھے ہیں کہ انہیں معلوم ہے اب یہاں کوئی مدد نہیں آئے گی۔''

''ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔'' آرتھر نے نرمی سے کہا۔ ''زندہ رہنے کے لیے کوشش کرنا ہوگی۔''

کرنل شائن نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جو فارغ ہوں، وہ زیادہ سے زیادہ وقت سو کر گزاریں۔ اس طرح وہ پانی کی کمی پر کسی حد تک قابو پا سکتے تھے۔ آرتھر شام کے وقت کرنل کے پاس آیا۔ ''سر! ہمیں اجازت دیں کہ ہم رات کے وقت پانی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔''

''وہ کیسے؟''

''ہم اس بار زمین میں خندق کھودتے ہوئے پانی تک جائیں گے۔ رات میں نظر آنے کا امکان کم ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، تم خندق کھود کر کنوئیں کے نزدیک چلے جاؤ گے لیکن پانی نکالنے کے لیے تو اوپر اٹھنا پڑے گا۔''

''اتنا خطرہ تو مول لینا ہوگا۔ ہم میں سے ایک دو افراد خاموشی سے کنوئیں کے اندر لٹک جائیں گے اور پانی نکال کر دیتے رہیں گے۔''

منصوبہ بہت خطرناک تھا مگر ناگزیر تھا۔ کرنل شائن نے منظوری دے دی۔ شام ہوتے ہی انہوں نے باہر سے نظر نہ آنے والے حصوں میں ایک فٹ گہری اور اتنی ہی چوڑی خندق کی کھدائی شروع کر دی۔ ایک آدمی آگے کھودتا اور مٹی کو پیچھے دھکیلتا۔ دوسرا اسے جمع کر کے اپنے پیچھے والے کو دیتا۔ وہ مٹی کپڑے کے تھیلوں میں جمع کر رہے تھے۔ یہ صحرائی ریت تھی، اس لیے اس کی کھدائی آسان تھی۔ جہاں ریت بالکل خشک تھی، وہاں خود ہی آرام سے نکل رہی تھی۔ مگر رازداری کی وجہ سے وہ بہت آہستگی اور خاموشی سے کام کر رہے تھے۔ ہر آدھ گھنٹے بعد ٹیم بدل جاتی تھی۔ شروع میں کم افراد تھے لیکن جیسے جیسے خندق کنوئیں کے پاس جا رہی تھی، زیادہ افراد کام میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔

نصف رات سے پہلے وہ خندق کنوئیں تک لے جا چکے تھے۔ چاند نکل آیا تھا لیکن اس کی روشنی ابھی یہاں نہیں تھی۔ دو سیاہ کپڑوں میں ملبوس افراد کنوئیں کی دیوار سے رسّی لگا کر اندر اتر گئے۔ وہ رسّی سے بندھے تھے اس لیے ان کے ہاتھ آزاد تھے اور وہ لکڑی کے بنے ڈول سے پانی کھینچ کر چمڑے کی مشکوں میں بھرنے لگے۔ جب ایک مشک بھر جاتی تو وہ اسے کنوئیں سے باہر خندق میں پھینک دیتے۔ مگر ابھی چند مشکیں ہی بھری ہوں گی کہ دشمن کو علم ہو گیا اور اس کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولہ باری کے خوف سے وہ عجلت میں کنوئیں سے دور بھاگے مگر خیریت رہی، دشمن نے صرف گولیاں برسانے پر اکتفا کیا۔ وہ رات کو توپ استعمال نہیں کرتے تھے۔ اس تھوڑے سے پانی سے ان کی پیاس تو نہیں بجھ سکتی تھی لیکن انہیں ایک دن اور زندہ رہنے کا آسرا ہو گیا تھا۔

اگلے دن صبح ہوتے ہی قبائلیوں کی طرف سے نقل و حرکت شروع ہو گئی۔ کرنل شائن نے اپنے تمام آدمیوں کو چوکس کر دیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دشمن فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ مگر حملے کے بجائے دشمن ایک طرف سے ہٹ گیا اور کچھ دیر بعد فرانسیسی امدادی قافلہ نمودار ہوا جس میں دو سو سے زیادہ سپاہی تھے۔ ان کے ساتھ رسد کے خچر اور گدھے بھی تھے اور وہ دو عدد توپیں بھی ساتھ لائے تھے۔ وہ قبائلیوں کی طرف سے پوری طرح چوکس ہو کر قلعے تک آئے۔ آنے والے سپاہیوں کا کمانڈر میجر ہینسن تھا۔ اس مدد کے آتے ہی قلعے میں موجود لوگ جیسے پھر سے جی اٹھے۔ سب سے پہلے مناسب پوزیشن پر دونوں توپیں نصب کی گئیں۔ اوپر ناکارہ پڑی توپوں کو بھی نیچے لایا گیا۔ اس کے بعد مرمت کا کام شروع ہوا۔ دشمن کی طرف سے خاموشی تھی اس لیے انہیں موقع مل گیا کہ وہ چند دن میں قلعے کے تباہ ہو جانے والے حصوں کی مرمت کر لیں۔ اس مرمت کے لیے ملبے سے اینٹیں حاصل کی گئیں اور گارے کے طور پر مٹی استعمال

کی گئی تھی۔ گولہ بارود اور ایمونیشن کی صورتِ حال بھی بہتر ہوئی تھی۔

پہرے داروں کو چھوڑ کر باقی تمام افراد مزدور بنے ہوئے تھے۔ خود کرنل شائن بھی کام کر رہا تھا۔ تمام افراد چھ گھنٹے کام کرتے تھے، اس کے بعد انہیں چھ گھنٹے کا آرام دیا جاتا تھا۔ سب سے پہلے کنوئیں کی طرف فصیل اٹھا کر کنواں محفوظ بنایا گیا۔ پانی ملنے کے بعد کام آسان ہو گیا تھا۔ چھ اور آٹھ افراد کے گروپ بنا کر انہیں مختلف کام سونپے گئے تھے۔ آرتھر اور اس کا گروپ ایمونیشن اور گولہ بارود کی پیٹیاں ایک محفوظ جگہ پہنچا رہے تھے۔ اس نے ایک پیٹی اٹھا کر شانے پر رکھی تھی کہ اچانک کسی نے اس کے شانے پر زور سے ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور پھر سن رہ گیا۔ اس کے سامنے الیکس کھڑا تھا اور اس کے ساتھ اس کا نوکر اور مصاحب میگور بھی تھا۔ ان دونوں نے فرانسیسی فوج کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ الیکس معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''بالآخر ہم نے تمہیں تلاش کر لیا۔''

آرتھر نے ایک جھٹکے سے اپنا شانہ چھڑوایا اور پیٹی لے کر آگے چلا گیا۔ اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن اندر سے وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ الیکس یہاں آسکتا ہے۔ الیکس کی یہاں موجودگی کا مطلب تھا کہ اسے جوآن نے بھیجا ہے۔ اسی کے مجبور کرنے پر الیکس اس جہنم میں کود سکتا تھا اور اسے مجبور کرنے کی جوآن کے پاس ایک نہایت مناسب ترکیب تھی۔ جولیا کے لیے الیکس جہنم جانے کو بھی تیار ہو جاتا۔ اسے یقین تھا کہ الیکس جولیا کی خاطر اسے قتل کرنے یہاں آیا ہے۔ جیک اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اس نے تاڑ لیا۔ ''خیریت ہے؟''

آرتھر نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ اس کا رقیب روسیاہ الیکس مع اپنے نوکر کے یہاں موجود ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے وہ فوج میں بھرتی ہو کر یہاں تک چلا آیا ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس کے خاتمے کے لیے کتنا بے چین ہے۔ جیک بھی فکر مند ہو گیا، اس نے کہا۔ ''تمہیں پوری طرح ہوشیار رہنا ہوگا۔ یہ جنگ ہے اور یہاں کسی کو قتل کرنا بہت آسان ہے۔ کوئی شبہ بھی نہیں کرے گا۔''

آرتھر فکر مند ہو گیا۔ جیک ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اگر جنگ کے دوران الیکس یا اس کا نوکر موقع پا کر اسے شوٹ کر دیتے تو ان پر الزام نہیں لگ سکتا تھا۔ اس کی موت کو یقیناً دشمن قبائل کے کھاتے میں ڈالا جاتا۔ الیکس نئے آنے والوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ چار دن تک وہ قلعے کی مرمت کرتے رہے۔ آرتھر کو اطمینان تھا کہ جب تک جنگ نہیں چھڑتی، وہ محفوظ رہے گا۔ قبائلی بھی فی الحال غائب ہو گئے تھے لیکن سب کو یقین تھا کہ وہ آس پاس موجود ہوں گے۔ پانچویں دن کرنل شائن نے ایک درجن افراد پر مشتمل ایک ریکی دستہ تیار کیا۔ اس میں جیک اور آرتھر بھی شامل تھے۔ الیکس نہیں تھا لیکن میگور تھا۔ ان کا کام آس پاس دشمن کی موجودگی کا پتا چلانا تھا۔ وہ قلعے سے نکلے اور مشرق کی طرف واقع ریت کے ٹیلوں کی طرف بڑھے۔ اس جگہ سب سے مناسب مقام یہی تھا، یہاں بڑی سے بڑی فوج کو چھپایا جا سکتا تھا۔

وہ ایک مقام پر پہنچ کر اس طرح بیٹھ گئے کہ چاروں طرف نظر رکھ سکتے تھے۔ آرتھر کا رخ جنوب کی طرف تھا اور اس کے عقب میں جیک تھا اس لیے اسے عقب سے خطرہ نہیں تھا لیکن میگور جنوب میں تھا اور شمال میں ایک تند مزاج سپاہی ہینس تھا۔ آرتھر سے کئی بار اس کی منہ ماری ہو چکی تھی کیونکہ وہ ایمارے پر بلاوجہ کی دھونس جماتا تھا۔ تین سپاہی دائیں طرف اور تین بائیں طرف چلے گئے جبکہ دو سامنے گئے تھے۔ جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے، میگور نے مسکرا کر آرتھر کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر معنی خیز تاثرات تھے۔ جواب میں آرتھر نے رائفل کی لبلبی پر موجود انگلی دکھائی کہ وہ بھی پوری طرح تیار ہے اس کی کسی بھی شرارت کا جواب دینے کے لیے۔ اس نے کھٹکا چڑھا لیا تھا۔ اچانک عقب سے کھٹکا چڑھانے کی آواز آئی تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یہ جیک تھا جس کی رائفل کا رخ اس کی طرف تھا۔ وہ اس کا دوست تھا اور زندگی و موت کے معرکوں میں وہ اس کے ساتھ رہا تھا۔

''جیک تم...؟''

''ہاں میں۔'' وہ سخت اور بے تاثر لہجے میں بولا۔

''لیکن کیوں؟''

''رقم کے لیے۔'' جیک نے جواب دیا۔

''تب انتظار کس بات کا ہے۔'' آرتھر کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''اپنا کام کرو بلکہ تم اگر بتائے بغیر شوٹ کر دیتے تو مجھے اس اذیت سے نہ گزرنا پڑتا کہ میں اس شخص کے ہاتھ سے مر رہا ہوں جسے میں اپنا دوست سمجھتا تھا۔''

جیک کے چہرے پر اب تذبذب کے آثار تھے۔ میگور نے سانپ کی طرح پھنکار کر کہا۔ ''شوٹ کر دو اسے... پیرس میں ایک لاکھ فرانک کا انعام تمہارا منتظر ہے۔''

ہینس بھی بکا ہوا تھا کیونکہ وہ اس سارے معاملے میں خاموش تھا۔ اس نے آرتھر کی رائفل قبضے میں کر لی تھی۔ آرتھر

دیکھ رہا تھا کہ جیک کی آنکھوں میں قاتل چمک نمودار ہو رہی ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی فیصلہ کرتا، اچانک سامنے سے فائرنگ کے دھماکوں کی آواز آئی۔ وہ سب چونک گئے۔ ریکی کے لیے جانے والے سپاہی دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ پھر ان کے پیچھے گھوڑوں پر سوار قبائلی نمودار ہوئے۔ وہ بھاگنے والے سپاہیوں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ وہ سب بے ساختہ اٹھ کر قلعے کی طرف بھاگے۔ سامنے والے دونوں سپاہی تو فوراً مارے گئے۔ دائیں بائیں جانے والے چھ سپاہی اپنی جان بچانے کے ساتھ ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ بھی کر رہے تھے۔ سب سے آگے وہی چار تھے۔ آرتھر نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے مزاحمت نہ کی تو سب مارے جائیں گے۔ اس نے ہینس سے کہا۔ ''میری رائفل دو۔''

اس وقت سب کی جان پر بنی ہوئی تھی اس لیے ہینس نے رائفل اس کی طرف اچھال دی۔ آرتھر نے آگے آنے والے دو گھڑسواروں کو نشانہ بنایا۔ وہی سب سے زیادہ خطرہ تھے۔ وہ گرے تو چھ میں سے چار بچنے والوں کو موقع مل گیا اور وہ دوڑتے ہوئے ان کے پاس سے گزرے۔ آرتھر کی وجہ سے جیک اور ہینس بھی رک گئے تھے، البتہ میگور بھاگتا چلا گیا۔ کم سے کم نصف درجن گھڑسوار اور آرہے تھے اور ان کی رائفلیں رہ رہ کر شعلے اگل رہی تھیں۔ اچانک ایک گولی ہینس کی ران میں لگی اور وہ گر گیا۔ اس نے چلّا کر کہا۔ ''تم لوگ جاؤ، میں انہیں روکتا ہوں۔''

''نہیں۔'' آرتھر نے کہا۔

''جاؤ... میں نہیں جا سکتا، تم لوگ جا سکتے ہو۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' جیک نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ مجبوراً آرتھر اس کے ساتھ قلعے کی طرف بھاگا۔ ہینس نے دو گولیاں چلائیں اور اس کی رائفل خالی ہو گئی۔ اس کے بعد حملہ آوروں نے اسے گولیوں کی باڑھ پر رکھ لیا۔ اس کی چیخیں آرتھر اور جیک تک آئیں مگر وہ قلعے تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ فصیل کے اوپر موجود سپاہی حملہ آوروں پر گولیاں برسا رہے تھے۔ اس وجہ سے بھی وہ صحیح سلامت قلعے تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ دروازے کے سامنے ایلکس موجود تھا اور اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ آرتھر کے بچ کر آنے پر اسے مایوسی ہوئی ہے۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے میگور کو دیکھ رہا تھا جو کتے کی طرح ہانپ رہا تھا اور اپنے آقا سے نظریں چرا رہا تھا۔ اندر آنے کے بعد سامنے سے جولیس اور ایمارے بھاگتے ہوئے آئے۔

''تم دونوں ٹھیک تو ہو؟'' جولیس نے پوچھا تو آرتھر اور جیک نے ایک دوسرے کی طرف دیکھے بغیر سر ہلایا اور الگ الگ چلے گئے۔ جولیس نے حیرت سے ایمارے کی طرف دیکھا۔ ''انہیں کیا ہوا ہے؟''

ایمارے نے شانے اچکائے۔ کرنل شائن بچ کر آنے والوں سے سوالات کر رہا تھا اور ان کے جوابات سے ایک مایوس کن صورتِ حال سامنے آئی تھی۔ ٹیلوں کے پیچھے قبائلیوں کی پوری فوج موجود تھی بلکہ اس میں اضافہ ہوا تھا اور ان کی سرگرمیوں سے لگ رہا تھا کہ وہ قلعے پر فیصلہ کن حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ کرنل شائن فکر مند ہو گیا۔ میجر بینسن نے بتایا تھا کہ فرانسیسی حکومت نے اس علاقے پر مستقل قبضے کے لیے ایک بڑی فوج بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے جس میں مشین گاڑیاں اور جدید توپیں شامل ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ حریت پسند قبائل اس فوج کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے۔ اس فوج کے لیے سپاہیوں کی تربیت جاری تھی اور وہ آنے والے ایک مہینے میں یہاں پہنچ جاتی۔ مگر کرنل شائن کا خیال تھا کہ ایک مہینا بہت زیادہ تھا۔ اس وقت تک یہاں ان کی لاشیں ہی باقی رہ جاتیں۔ ریکی مشن میں پانچ سپاہیوں کی جان گئی تھی لیکن انہیں دشمن کی پوزیشن اور عزائم کا پتا چل گیا تھا۔

رات بھی جب آرتھر اور جیک ایک دوسرے سے دور رہے تو جولیس اور ایمارے کو فکر لاحق ہو گئی۔ انہوں نے باری باری دونوں سے بات کی لیکن ان کی خاموشی نہیں ٹوٹی۔ آنے والے دنوں میں بھی یہ خاموشی برقرار رہی۔ دوسرے دن کرنل شائن نے انہیں اپنے دفتر میں طلب کیا۔ اس نے میجر بینسن کے ساتھ مشورہ کیا اور طے پایا کہ کسی کو تیس بھیجا جائے کیونکہ اب وقت نہیں رہا۔ اگر مدد نہ آتی تو یہ قلعہ یقیناً فرانسیسی فوج کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ کرنل شائن کا خیال تھا کہ اگر کسی سفید فام کو بھیجا گیا تو وہ خود کو چھپا نہیں سکے گا لیکن جولیس سیاہ فام تھا اس لیے اس کے بچ نکلنے کے امکانات تھے۔ بنیادی طور پر وہ افریقی تھا اس لیے اسے دیکھتے ہی اس پر شک نہیں کیا جاتا۔ آرتھر نے اعتراض کیا۔ ''اسے بھی اتنا ہی خطرہ ہے۔ صرف سیاہ رنگ کی وجہ سے یہ نہیں بچ سکے گا۔ اسے عربی یا بربری نہیں آتی ہے اور نہ ہی یہ مقامی رسم و رواج سے واقف ہے۔''

''پھر بھی چانس زیادہ ہے۔'' کرنل شائن نے اصرار کیا۔ ''ہم فیصلہ کر چکے ہیں۔''

''ٹھیک ہے کرنل، میں جاؤں گا۔'' جولیس نے کہا۔

''میں بھی اس کے ساتھ جاؤں گا۔'' آرتھر نے کہا۔

کرنل نے انکار کیا۔ ''نہیں... تم اسے بھی پکڑوا دو

گے۔ اسے خود کوشش کرنے دو۔''

''کوشش یا خودکشی۔'' آرتھر نے تلخ لہجے میں کہا اور کرنل کے دفتر سے نکل آیا۔ رات کے وقت جولیس جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے مقامی لباس پہنا ہوا تھا اور سر پر کپڑا باندھا ہوا تھا۔ ایمارے نے کہا۔

''بالکل بربر لگ رہے ہو۔''

''کاش میں ہوتا۔'' جولیس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''تب مجھے ان کی زبان تو آتی۔ اب تو مجھے گونگا بننا پڑے گا۔''

جولیس نے جانے سے پہلے اپنا لاکٹ آرتھر کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے باپ کو پہنچا دے۔ اسے ہتھیار نہیں دیے گئے تھے ورنہ وہ پکڑے جانے کی صورت میں ہتھیاروں سے پہچانا جا سکتا تھا۔ اس کے پاس بس ایک مقامی ساختہ خنجر تھا۔ یہ یہاں ہر آدمی کے پاس ہوتا تھا۔ نصف رات کے قریب جولیس کو قلعے کی فصیل سے رسّی کے سہارے نیچے اتارا گیا کیونکہ دروازے کے بارے میں یقین تھا کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہوگی۔ جولیس ایک طویل چکر کاٹ کر شمال مغرب کی طرف روانہ ہوتا۔ اس کے پاس خوراک، پانی اور کچھ طلائی سکے تھے جن سے وہ راستے میں سواری کے لیے کوئی جانور لے سکتا تھا، اگر اسے قبائل کے حصار سے نکل جانے کا موقع ملتا۔ آرتھر، جیک اور ایمارے نے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ آرتھر نے ایک بار پھر کوشش کی تھی کہ جولیس کے ساتھ اسے جانے کا موقع دیا جائے لیکن کرنل شائن نے اس کی درخواست مسترد کر دی۔

دو دن گزر گئے۔ قلعے میں اور آس پاس خاموشی تھی۔ فصیل کی مرمت کے بعد کنوئیں سے پانی نکال کر ذخیرہ کیا گیا تھا تاکہ اگر دوبارہ اس طرف کی فصیل بمباری کا نشانہ بنے تو انہیں پانی ملتا رہے۔ اس صحرا میں گولہ بارود اور ہتھیاروں سے زیادہ پانی کی اہمیت تھی۔ تیسرے دن صبح کا سورج طلوع ہوا اور اس کے ساتھ ہی دشمن کی طرف سے پیش قدمی کے آثار نظر آنے لگے۔ ریت کے ٹیلوں کی سرحدوں پر سر جھانکنے لگے تھے اور پھر قلعے کے عین سامنے والے حصے میں توپیں نمودار ہوئیں۔ فرانسیسیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب فصیل پر جمع ہونے لگے۔ ایمونیشن اور گولہ بارود کے بکس باہر نکالے جانے لگے۔ آرتھر اور ایمارے فصیل کے دائیں طرف اوپری حصے میں لگے ہوئے تھے کیونکہ دونوں کا نشانہ بہت اچھا تھا اس لیے انہیں سامنے والے حصے میں لگایا گیا تھا۔

''وہ کیا ہے؟'' ایمارے بولا۔ آرتھر نے چونک کر دیکھا۔ دائیں طرف کے ایک ٹیلے سے ایک ننگا سیاہ سر نمودار ہو رہا تھا۔ قبائلیوں کے سر ڈھکے ہوتے تھے۔ پھر چہرہ سامنے آیا اور آرتھر کو لگا اس کا دل رک گیا ہے۔ وہ جولیس تھا مگر اچھی بات یہ تھی کہ اس کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ قدم گھسیٹنے کے انداز میں چل رہا تھا اور اس کے جسم پر مقامی لباس کے بجائے فوجی کرتہ اور پتلون تھی۔ پھر وہ پوری طرح سامنے آیا تو اس کے پیروں میں بندھی رسّی سامنے آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پیچھے سے نصف درجن گھڑسوار قبائلی نمودار ہوئے۔ ایک گھڑسوار کے ہاتھ میں رسّی تھی جس کا دوسرا سرا جولیس کے پیروں میں بندھی رسّی سے جڑا ہوا تھا۔ آرتھر نے اس قبائلی کا نشانہ لیا لیکن وہ رائفل کی مار سے دور تھا۔ پھر اس نے گھوڑا دوڑایا اور جولیس جھٹکے سے زمین پر گرا۔ وہ ریت پر گھسٹتا ہوا جا رہا تھا۔ باقی گھڑسوار اس کے آس پاس دوڑ رہے تھے۔ وہ جولیس کو کھینچتے ہوئے قلعے کے عین سامنے لائے۔ اس کی رسّی چھوڑ دی اور اب وہ تلواریں لہراتے ہوئے اس کے اردگرد گھوم رہے تھے۔ وہ ان کے سامنے اسے قتل کرنے لائے تھے۔ جولیس نے فصیل کے اوپر آرتھر کو دیکھ لیا تھا۔ اس نے چلّا کر کہا۔

''شوٹ کر دو۔''

ایک قبائلی نے عقب سے تلوار ماری، وہ گرا لیکن ہمت کر کے پھر اٹھ گیا اور اس نے آرتھر کی طرف دیکھ کر دوبارہ شوٹ کرنے کو کہا۔ ایمارے بولا۔

''میں ان کو گولی مارنے جا رہا ہوں۔''

''نہیں۔'' آرتھر نے نشانہ لیتے ہوئے کہا۔

''وہ شوٹ کرنے کو کہہ رہا ہے۔'' ایمارے تیز لہجے میں بولا۔

آرتھر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ انہیں شوٹ کرنے کو نہیں کہہ رہا ہے۔''

ایمارے کی آنکھیں پھیل گئیں۔ آرتھر نے دوبارہ رائفل سیدھی کی۔ ایک گھڑسوار نے فیصلہ کن وار کے انداز میں تلوار بلند کی تھی کہ آرتھر نے فائر کیا اور جولیس جھٹکے سے ریت پر گر کر ساکت ہو گیا۔ آرتھر نے رخ موڑتے ہوئے پشت دیوار سے لگا لی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔ ایمارے رو رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر جیک بھی ویران نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک کرنل شائن کی دہاڑ سنائی دی۔ وہ سپاہیوں کو توپیں تیار کرنے کا حکم دے رہا تھا۔ وہ جلدی سے مستعد ہو گئے۔ قبائلیوں کے انداز سے لگ

رہا تھا کہ وہ فیصلہ کن حملہ کرنے والے ہیں۔ قلعے کے برجوں سے توپیں لگا دی گئی تھیں۔ جیسے ہی توپیں تیار ہوئیں، قبائلیوں کی طرف سے پہلا حملہ ہوا۔ گھڑ سوار۔۔۔ دوڑتے ہوئے آئے۔ ان کی طرف سے رائفلوں نے شعلے اگلے مگر کم نشانے پر لگے اور قریب آتے ہوئے گھڑ سواروں نے مہارت سے بارودی تھیلے قلعے کے اندر اچھال دیے۔ دھماکے ہوئے۔ اندر تباہی ہوئی اور مرنے والوں کی چیخیں بارود کے دھوئیں میں گم ہو گئیں۔ ان کی طرف سے جوابی گولہ باری ہوئی لیکن قبائلی ریت کے محفوظ پشتوں کے پیچھے تھے۔

فرانسیسی توپچی توپوں کا رخ بدل کر گولے داغ رہے تھے مگر قبائلیوں کی توپیں زیادہ کارگر ثابت ہو رہی تھیں۔ ایک گھنٹے کی شدید گولہ باری نے قلعے کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ فصیل کا ایک حصہ گر گیا تھا۔ اگرچہ اس میں ابھی اندر آنے کا راستہ نہیں بنا تھا۔ رائفلوں اور دست بدست لڑائی کا مرحلہ دور تھا۔ جس جگہ آرتھر اور اس کے ساتھی تھے، یہاں بھی چند گولے گرے تھے اور نقصان ہوا تھا۔ جیک کی آنکھ میں کوئی چیز لگی تھی اور آنکھ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ ایمارے نے اس کی آنکھ پر پٹی باندھ دی تھی۔ گولہ باری میں وقفہ آیا تو کرنل شائن نے نقصان کا اندازہ لگایا۔ اس کے چالیس آدمی جان سے گئے تھے اور ایک توپ نشانہ بنی تھی۔ باقی توپوں کے لیے بھی زیادہ گولے باقی نہیں رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں قبائلیوں کا نقصان نہ ہونے کے برابر تھا۔ دو درجن سپاہی شدید زخمی تھے۔

شام کے وقت جب سورج مغرب کی طرف جا چکا تھا قبائلیوں نے لڑائی روک دی۔ یہ ان کا دستور تھا۔ وہ رات کو نہیں لڑتے تھے، ہاں شب خون مارتے تھے۔ سارے دن کے تھکے ہارے سپاہی اب قلعے کی مرمت میں لگے ہوئے تھے۔ مورچے مضبوط کیے جا رہے تھے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کا کام جاری تھا۔ آرتھر اور ایمارے خشک ڈبل روٹی پانی کے ساتھ حلق سے اتار رہے تھے۔ یہ صبح کے بعد پہلا کھانا تھا جو ان کے حلق سے اترا تھا۔ ایلکس کچھ دور میگور کے ساتھ تھا۔ میگور کو بازو میں چوٹ آئی تھی۔ ان دونوں کے چہرے بھی مرجھائے ہوئے تھے۔ شاید انہیں اب اندازہ ہوا تھا کہ انتقام کے چکر میں وہ کس جہنم میں آ پھنسے ہیں۔ ایلکس آرتھر کے پاس آیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ہم کس مقصد کے تحت یہاں آئے ہیں؟"

"تم لوگ بہت غلط جگہ ایک غلط مقصد لے کر آئے ہو۔"

ایلکس کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے جوآن نے تمہارے لیے کیا پیشکش کی ہے؟"

"مجھے معلوم ہے، اس نے کہا ہو گا کہ تم مجھے قتل کر دو تو وہ جولیا کی شادی تم سے کر دے گا۔"

"تم جانتے ہو؟" ایلکس حیران ہوا۔

آرتھر نے سر ہلایا۔ "جب انسان موت کا سامنا کرتا ہے تو بہت ساری باتیں اسے خود بہ خود پتا چل جاتی ہیں۔ لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جوآن کو کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں موجود ہوں؟"

"ایک اخبار میں تمہاری تصویر چھپی تھی جس میں تمہیں مشین گن چلاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد جوآن کے لیے پتا چلانا مشکل نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔"

"تمہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ کتنی جوکھم والی جگہ ہے؟ یہاں آنے والے سپاہی عام طور سے تابوت میں بھی واپس نہیں جاتے کیونکہ ان کی لاشیں اسی صحرا میں دفنا دی جاتی ہیں۔"

"پہلے نہیں معلوم تھا، اب معلوم ہو گیا ہے۔" ایلکس نے صاف گوئی سے کہا۔

آرتھر مسکرایا۔ "جوآن کا کام ہو جائے گا اور اسے اپنا وعدہ بھی پورا نہیں کرنا پڑے گا۔"

"ایسا ہی لگ رہا ہے۔" ایلکس نے کہا۔ "کل ہمارے پاس شاید آخری دن ہے۔"

"امکان تو یہی ہے کہ ہم کل کا سورج طلوع ہوتے ضرور دیکھ سکیں گے لیکن اسے غروب ہوتا نہیں دیکھ سکیں گے۔"

ایلکس کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ "تم صحیح معنوں میں ایک شریف انسان ہو۔ میرا تم سے وعدہ ہے کہ اس جنگ کے دوران تمہیں مجھ سے اور میگور سے کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ ہاں اگر کوئی معجزہ ہوا اور ہم بچ گئے تو پھر حساب کتاب کریں گے۔"

"اگر کوئی معجزہ ہوا تو۔" آرتھر نے پُرخیال انداز میں کہا۔

اس رات ان میں سے شاید ہی کسی کو نیند آئی تھی۔ اکثر کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی اور جو سونا چاہتے تھے، انہیں زخمیوں کے رونے کراہنے نے سونے نہ دیا۔ صبح کی روشنی نمودار ہوئی تو سب آخری معرکے کے لیے تیار ہونے لگے۔ سب سے پہلے گزشتہ روز کے مقتولین کو دفنایا۔ پھر ناشتا کر

کے وہ مورچوں میں آ گئے۔ اب ریت کے ٹیلوں پر سیاہ پرچم لہرا رہے تھے۔ آرتھر نے دیکھا کہ توپوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ سب سے کارگر ہتھیار تھا جس سے خود نقصان اٹھائے بغیر دشمن کو تباہ کیا جا سکتا تھا۔ آرتھر، ایمارے، جیک، ایلکس اور میگور اب ایک ہی جگہ تھے۔ ایلکس کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن میگور رہ رہ کر آرتھر کو کینہ توز نظروں سے دیکھتا تھا۔ آرتھر کو اس کی پروا نہیں تھی۔ کرنل شائن نے انہیں حکم دیا۔

"توپچیوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کرو۔"

اس وقت توپچی ہی سامنے تھے۔ باقی قبائلی ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ اگرچہ تقریباً تین سو گز دور سے نشانہ لینا آسان نہیں تھا مگر وہ کوشش تو کر سکتے تھے۔ آرتھر کا نشانہ سب سے اچھا تھا۔ ایمارے کا بھی بہتر تھا، البتہ جیک کا نشانہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ آرتھر نے ایمارے سے کہا۔ "ہم دونوں ایک ساتھ نشانہ لیں گے تاکہ چانس زیادہ ہو اور ایک ساتھ فائر کریں گے۔"

ایمارے نے سر ہلایا۔ اسی لمحے پہلا گولہ آ کر قلعے کے دروازے کے سامنے گرا۔ دشمن حرکت میں آ گیا تھا۔ آرتھر اور ایمارے نے سب سے آگے موجود توپچی کو نشانہ بنایا لیکن دونوں کا نشانہ خطا گیا۔ انہوں نے دوبارہ کوشش کی۔ اس بار توپچی گر گیا۔ اس پر دوسرے توپچی محتاط ہو گئے۔ وہ اب آڑ میں رہ کر گولہ باری کر رہے تھے۔ ایک گھنٹے کی گولہ باری کے بعد ان کی طرف سے گھڑ سواروں کا حملہ ہوا۔ فرانسیسی تیار ہو گئے تھے۔ گولہ باری سے نقصان ہوا تھا مگر وہ قلعے کی حفاظت کے لیے مستعد تھے۔ گولہ باری سے ماحول پہلے ہی دھواں دھار ہو رہا تھا۔ اب رائفلیں چلنے لگیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ مرنے اور زخمی ہونے والوں کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ قبائلی گھڑ سوار ایک کے بعد ایک لہر کی صورت میں حملہ کر رہے تھے۔ وہ فصیلوں پر موجود سپاہیوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔

اچانک ایک گولی آ کر ایمارے کی گردن سے پار ہو گئی۔ وہ گردن پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹا اور خون روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ آرتھر اور جیک جھپٹ کر اس کے پاس آئے لیکن وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکے۔ ایک منٹ میں اس نے دم توڑ دیا۔ آرتھر بوجھل دل کے ساتھ اسے بازوؤں میں لیے ہوئے تھا۔ جیک واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ آرتھر نے ایمارے کی جیب سے اس کی محبوبہ کی تصویر نکال کر اس جیب میں رکھ لی جس میں پہلے جولیس کا لاکٹ موجود تھا۔ اس کے پاس امانتیں بڑھ گئی تھیں اور پتا نہیں وہ انہیں ان کے حق داروں تک پہنچا سکتا تھا یا نہیں۔ دشمن کی توپیں وقفے وقفے سے گولے برسا رہی تھیں۔ اچانک ایک گولہ آ کر مرکزی دروازے پر لگا اور اس کے پرخچے اڑ گئے۔ کرنل شائن چلا چلا کر اپنے آدمیوں کو دروازے کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کرنے کو کہہ رہا تھا۔ جنگ آخری مرحلے میں داخل ہو گئی تھی۔ دروازہ ٹوٹتے ہی دشمن گھڑ سوار حملہ کرتے اور ایک بار وہ اندر داخل ہو جاتے تو انہیں روکنا ناممکن ہو جاتا۔ فصیلوں پر موجود سپاہی دروازے کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کرنے کے لیے بھاگے۔۔۔ ان میں آرتھر اور جیک بھی تھے۔ سب نے لکڑی پتھر اور جو ملا وہ دروازے کے سامنے ڈھیر کرنا شروع کر دیا۔ کچھ سپاہی حملہ آوروں کو روکنے کے لیے باہر نکل گئے تھے۔

قبائلی گھڑ سوار دستے طوفانی انداز میں حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ سپاہی کچھ دیر مدافعت کرتے رہے لیکن جب نصف آنے والوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے تو باقی مجبوراً اندر آ گئے۔ ابھی وہ رکاوٹیں لگا رہے تھے کہ ایک گولہ اور آ کر گرا اور یہاں موجود سپاہیوں کے پرخچے اڑ گئے۔ چاروں طرف دھواں اور بارود کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ آرتھر کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے چلا کر جیک کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ آرتھر لڑکھڑاتا ہوا کمروں کی طرف آیا۔ گولے کا ٹکڑا اس کے بازو پر لگا تھا اور اس سے خون بہہ رہا تھا۔ چھوٹے موٹے زخم تو پورے جسم پر آئے تھے۔ اچانک عقب سے شور اٹھا۔ قبائلی اندر گھس آئے تھے۔ ان کے گھوڑے رکاوٹ پھلانگ کر اندر آ گئے تھے۔ رائفلوں کے ساتھ اب دست بدست لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ آرتھر ایک ستون کی آڑ سے حملہ آوروں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اس نے دو گھڑ سوار گرائے۔ تیسرے نے اس پر تلوار سے وار کرنے کی کوشش کی۔ آرتھر نے رائفل سامنے کی۔ تلوار نے اس کے دو ٹکڑے کر دیے تھے لیکن آرتھر بچ گیا۔ اس نے آدھی رائفل کا دستہ گھما کر حملہ آور کو مارا۔ وہ گرا تو نال والے حصے کی سنگین اٹھا کر اس کے سینے میں گھونپ دی۔ گھڑ سوار مسلسل اندر آ رہے تھے اور فرانسیسی ان سے مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے۔ اس لیے قلعے کے اندرونی حصوں کی طرف پسپا ہو رہے تھے۔

آرتھر نے مرنے والے کی تلوار اٹھائی اور ایک کمرے کی طرف بڑھا۔ اس سے ایک گھڑ سوار برآمد ہوا۔ آرتھر نے اس پر وار کیا تو وہ نیچے گر گیا۔ وہ اندر آیا تو یہاں دو سپاہی مردہ حالت میں پڑے تھے۔ وہ دوسرے کمرے

میں آیا، یہاں بھی حالت مختلف نہیں تھی۔ قبائلی چن چن کر فرانسیسیوں کو ہلاک کر رہے تھے۔ تیسرے کمرے میں میجر بینسن کی لاش پڑی تھی۔ اسے کئی گولیاں لگی تھیں۔ اس طرف کے کمروں میں درجنوں لاشیں تھیں اور ایک بھی زندہ فرد نہیں تھا۔ قبائلی کسی کو زندہ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ آرتھر کو کرنل شائن کا خیال آیا تو وہ باہر نکلا۔ حملہ آور گھوڑوں سے اتر آئے تھے اور اب دست بدست لڑ رہے تھے۔ سپاہی بھی ایمونیشن ختم ہونے پر چاقوؤں اور خنجروں سے مقابلہ کر رہے تھے۔ مگر یہ یک طرف مقابلہ تھا کیونکہ قبائلی تعداد میں کہیں زیادہ اور غالب تھے۔

آرتھر لڑکھڑاتے قدموں سے کرنل شائن کے دفتر میں داخل ہوا۔ حسب توقع یہاں بھی لاشیں تھیں اور ان میں ایک کرنل شائن کی تھی۔ قبائلیوں نے اسے قابو کر کے تلواروں سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ آرتھر کوئی ہتھیار تلاش کرنے لگا۔ اسے ایک سپاہی کی رائفل اور کارتوسوں کا پاؤچ مل گیا۔ وہ اسے لے کر چھت پر ہونے والے سوراخ کے سہارے اوپر آیا۔ یہاں سے نشانہ لینے میں آسانی ہوتی۔ گھڑسوار اوپر نہیں آسکتے تھے اور وہ انہیں بہتر طور پر نشانہ بنا سکتا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے دو گھڑسواروں کو مار گرایا۔ ان کی طرف سے جواباً گولیوں کی بوچھاڑ آئی لیکن اوپر وہ محفوظ تھا۔ جیسے ہی فائرنگ تھمی، اس نے مزید دو گھڑسواروں کو نشانہ بنایا۔ اس کے بعد ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ تیزی سے پسپا ہوئے۔ ویسے بھی انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا۔ چند ایک کے سوا کوئی فرانسیسی باقی نہیں رہا تھا۔ چند منٹ میں قلعہ حملہ آوروں سے خالی ہو گیا۔

آرتھر کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر محتاط قدموں سے نیچے آیا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں کوئی قبائلی چھپا نہ ہو مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کسی زندہ فرد کو تلاش کرنے لگا۔ ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں، ان میں اکثریت فرانسیسیوں کی تھی۔ کچھ حملہ آور بھی تھے۔ پھر اسے جیک کی لاش دکھائی دی۔ وہ ایک پتھر کے سہارے ٹکنے کے انداز میں بیٹھا تھا اور اس کی رائفل اس کے سینے پر رکھی تھی۔ اس کے سینے میں کئی سوراخ تھے۔ آرتھر کو لگا جیسے اس کی ٹانگیں جواب دے گئی ہوں۔ وہ تھک جانے والے انداز میں ایک طرف ٹک گیا۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد قبائلی دوبارہ آئیں گے تاکہ اس بات کو یقینی بنا سکیں کہ ان کے پیچھے کوئی زندہ باقی نہیں رہا ہے۔ اچانک ملبے میں سے آواز آئی اور آرتھر نے میگور کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس نے رائفل اٹھا رکھی تھی اور اس کا رخ آرتھر کی طرف تھا۔ اس کے پاس موقع نہیں تھا کہ وہ اپنی رائفل کا رخ میگور کی طرف کرتا۔ وہ اس سے پہلے ہی اسے شوٹ کر دیتا۔

''تم کیسے بچے؟''

میگور دانت نکوس کر مسکرایا۔ ''جیسے تم بچ گئے۔ ابھی میری قضا نہیں آئی لیکن تمہاری قضا میرے ہاتھوں آگئی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے تم جوآن سے انعام لینے کے لیے بچ جاؤ گے؟''

''ہاں، میں بچ جاؤں گا۔ میں نے یہاں ایک خفیہ جگہ بنالی ہے، میں وہیں چھپا ہوا تھا۔ تمہیں مار کر دوبارہ وہاں چھپ جاؤں گا اور اس وقت تک چھپا رہوں گا جب تک مدد نہیں آجاتی۔''

''یا تمہاری بھی موت نہیں آجاتی۔'' آرتھر نے تلخی سے کہا۔ ''انتظار کس بات کا ہے، گولی چلاؤ۔''

میگور نے رائفل شانے سے لگائی اور پھر فائر کی آواز آئی۔ آرتھر کو جھٹکا لگا لیکن گولی اسے نہیں لگی۔ میگور حیرت سے اپنے سینے پر عین دل کے مقام پر ابلتا ہوا خون دیکھ رہا تھا، پھر وہ اوندھے منہ ملبے پر گرا اور ساکت ہو گیا۔ آرتھر نے مڑ کر دیکھا، جیک کی رائفل کی نال سے دھواں نکل رہا تھا۔ وہ شدید زخمی تھا اور اس کا لباس خون میں تر بتر تھا لیکن وہ زندہ تھا۔ آرتھر تیزی سے اس کے پاس آیا۔ جیک کی رائفل گر گئی تھی۔ ایک گولی چلانے کے بعد اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

''تم نے مجھے بچایا حالانکہ تم ان کے ساتھ تھے؟''

جیک پھیکے انداز میں مسکرایا۔ ''دیر سے سہی لیکن مجھے احساس ہو گیا کہ دوست دولت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایلکس بھی مر گیا ہے اور آخری وقت میں وہ شرمندہ تھا کہ ایک شرمناک مقصد لے کر آیا تھا۔ اس نے کفارے میں اپنی جان دے دی۔''

آرتھر نے اس کا زخم دیکھنا چاہا لیکن اس نے روک دیا۔ ''بیکار ہے، مجھے معلوم ہے میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا۔''

''زندہ تو میں بھی نہیں رہوں گا۔'' آرتھر نے باہر سے آنے والے قبائلیوں کے فاتحانہ نعروں کی آوازیں سنتے ہوئے کہا۔

''لیکن میری خواہش ہے کہ تم زندہ رہو۔ اگر مرتے ہوئے آدمی کی خواہش پوری ہوتی ہے تو میری واحد خواہش یہی ہے۔''

جیک نے اپنی چھوٹی سی بائبل نکال کر اس کے حوالے کی۔ ''اگر تم بچ جاؤ تو اسے میری ماں تک پہنچا دینا۔ اسے بتانا کہ اس کا بیٹا جنگ میں لڑتے ہوئے مارا گیا اور اس نے کسی بھی موقع پر بزدلی نہیں دکھائی۔''

آرتھر نے بائبل پکڑ لی۔ جیک گہرے سانس لے رہا تھا۔ اچانک اس نے آخری سانس لی اور دم توڑ دیا۔ آرتھر نے اس کی کھلی آنکھیں بند کیں۔ باہر سے آنے والی نعروں کی آوازیں بڑھ گئی تھیں۔ اس کے دوستوں نے اس پر ساری ذمے داری ڈال دی تھی۔ پتا نہیں وہ اسے پورا کر بھی سکتا تھا یا نہیں۔ اس نے ایک جگہ ریت کھودی اور تینوں چیزیں اس میں ڈال کر اوپر سے ریت برابر کر دی.... پھر اس نے اپنی وردی ممکنہ حد تک ٹھیک کی۔ اس کے چہرے پر معمولی زخموں کے نشانات تھے اور وردی میں کئی جگہ خون لگا ہوا تھا۔ وہ باہر کی طرف بڑھا۔ وہ باہر آیا۔ چاروں طرف قبائلی جمع تھے۔ اسے دیکھ کر ان کے نعرے فلک شگاف ہو گئے لیکن انہوں نے اسے کچھ کہا نہیں، صرف راستہ چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھا اور قبائلیوں کے سربراہ کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہ سرخ و سفید رنگت اور پُرخمار آنکھوں والا بارعب شخص تھا۔ اس نے سیاہ لباس اور سیاہ عمامہ پہن رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ اوپر کیا تو اس کے شور کرتے ساتھی یک دم خاموش ہو گئے۔

''یہ ہماری سرزمین ہے۔'' اس نے گونجتی آواز میں کہا۔ ''ہم یہاں صدیوں سے رہتے ہیں۔ اس لیے اس پر ہمارا حق ہے۔ کوئی باہر سے آکر ہمارے اس حق کو غصب کرنے کی کوشش کرے گا تو ہم لڑیں گے۔ میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں۔ تم جا کر اپنے لوگوں کو بتاؤ، وہ اپنے ملک میں خوش رہیں اور ہمیں ہمارے ملک میں خوش رہنے دیں۔ اگر وہ یہاں آئیں گے تو نہ ہم خوش ہوں گے اور نہ وہ... تم نے یہاں جو دیکھا ہے، وہ ان کو بتا دینا۔ اگر وہ دوبارہ یہاں آئے تو یہی سب دوبارہ ہوگا۔''

اس نے اپنی بات مکمل کر کے گھوڑا پلٹایا اور اس کے ساتھی اس کے ساتھ گھوڑے دوڑاتے وہاں سے روانہ ہو گئے۔ وہ دوبارہ شور مچا رہے تھے اور فاتحانہ نعرے لگا رہے تھے۔ آرتھر دم بخود کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے قبائلی صحرا میں غائب ہو گئے اور وہ وہاں اکیلا رہ گیا۔

☆☆☆

جوآن ہیکٹر کاغذ کو مٹھی میں بھینچے بیٹھا تھا۔ اس میں ایلکس کی موت کی خبر تھی۔ یہ رقعہ اسے ایلکس کے باپ نے بھیجا تھا۔ اسے ایلکس کی موت کی فکر نہیں تھی۔ وہ آرتھر کی موت کی خبر نہیں سن سکا تھا۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا۔ ایلکس اور آرتھر جس قلعے میں تعینات تھے، وہاں موجود کوئی فرانسیسی سپاہی زندہ نہیں رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ آرتھر بھی مارا گیا تھا۔ یہ سوچ کر اس کے دل میں کچھ ٹھنڈ پڑی تھی۔ اس نے اپنے سیکریٹری کو طلب کیا اور اسے حکم دیا۔ ''جولیا سے کہو تیار رہے، ہمیں ایلکس کے گھر اس کی تعزیت کے لیے جانا ہے۔''

مگر جب یہ پیغام جولیا تک پہنچانے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے کمرے بلکہ پیلس میں کہیں نہیں تھی۔ جوآن یہ سن کر پریشان ہو گیا اور اس کے حکم پر جولیا کی تلاش شروع کی گئی۔ کئی گھنٹے کی جدوجہد کے بعد بس اتنا پتا چلا کہ وہ پیرس ریلوے اسٹیشن کی طرف گئی تھی۔ اس سے آگے وہ کہاں گئی کسی کو معلوم نہیں تھا۔ جوآن اور اس کے آدمی بے خبر تھے کہ جولیا اس وقت ایک چھوٹے بحری جہاز میں آبنائے انگلستان میں لندن کی طرف محوِ سفر تھی اور آرتھر اس کے ساتھ تھا۔ وہ لندن سے گلاسگو جاتے اور وہاں سے امریکا جانے والے بحری جہاز پر سوار ہو جاتے۔ آرتھر نے جولیس کے باپ اور ایمارے کی محبوبہ تک ان کی امانتیں پہنچا دی تھیں اور اب اسے جیک کی ماں سے ملنا تھا۔ وہ اور جولیا بحری جہاز کے عرشے پر کھڑے شمال کی طرف سے آنے والی سرد ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جولیا نے کہا۔

''تم نے قبائلی سردار کا پیغام فرانسیسی فوج کے حکام تک کیوں نہیں پہنچایا؟''

''اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو میں اپنی زندگی کا ثبوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ دوسرے مجھے معلوم ہے کہ فرانس اس خطے پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس کے لیے بے دریغ اپنا اور دشمن کا لہو بہانے کے لیے تیار ہے۔ اس صورت میں فوجی حکام پر میری بات کیا اثر کرتی؟ مجھے معلوم ہے کہ فرانس جو اگلی فوج بھیجے گا وہ جدید ترین اسلحے اور مشینی گاڑیوں سے لیس ہوگی۔ قبائلی اس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ لیکن جولیا... میں ان لوگوں کا جذبۂ حریت دیکھ چکا ہوں۔ فرانس ان کے ملک پر قبضہ کر سکتا ہے لیکن وہ انہیں غلام نہیں بنا سکتا۔ جلد یا بدیر وہ واپس اپنا ملک حاصل کر لیں گے۔''

''اب یہ سب پیچھے رہ گیا ہے۔'' جولیا نے اس کے شانے سے سر ٹکا دیا۔ ''ہم سب چھوڑ کر آگے جا رہے ہیں۔''

''ہاں، کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔'' آرتھر بولا اور اپنا بازو اس کے گرد حمائل کر دیا۔ ان کے سامنے ایک نئی زندگی تھی۔

پرندہ

بشریٰ امجد

وہ ایک پیشہ ور قاتل تھا... اس کا کاروبار کامیابی سے چل رہا تھا... اس دفعہ بھی اَن دیکھے باس کی طرف سے اسے ٹارگٹ ملا تھا... مگر اچانک ہی اس کے دل میں ایک تمنا انگڑائی لینے لگی...

جرم کی بلندیوں پر محوِ پرواز ایک آزاد پرندے کے قید ہوجانے کا قصہ

ونسی تھامپسن نے اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی دروازے کے نیچے مختصر سے سفید کاغذ کے ٹکڑے کو دیکھ لیا تھا۔

کام کا وقت آگیا ہے... اس مرتبہ کام کیے بغیر ایک ماہ گزر چکا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کاغذ کا ٹکڑا اٹھالیا۔ یہ گزشتہ کاغذات کی طرح تھا۔ بس ایک فون نمبر اور ایک حرف ''آر'' ٹائپ کیا گیا تھا۔ اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ونسی تھامپسن نے لائٹر کے ذریعے کاغذ کو راکھ میں تبدیل کردیا پھر وہ فون کی جانب بڑھا۔

''ونسی؟'' "R" کی آواز سرد اور سپاٹ تھی۔

''ہاں، مجھے پیغام مل گیا ہے۔''

''کام کے لیے تیار ہو؟''

''یقیناً۔''

''آج رات، بیل ایئر روڈ کی بلندی پر سورج غروب ہونے کے بعد... بلندی پر، بائیں جانب ایک مسطح میدان ملے گا۔ وہاں پہاڑی کے قریب ایک سفید گھر نظر آئے گا۔ سامنے کی جانب دو کار گیراج ہوں گے... تمہیں گیراج میں گھات لگانی ہے... دروازے غیر مقفل ہوں گے، لہٰذا تم کار میں داخل ہوسکتے ہو... تمہارا پرندہ گیارہ بجے پہنچے گا۔ تم پونے گیارہ بجے اپنی پوزیشن سنبھال لینا۔''

''ٹھیک ہے، پرندے کا حلیہ؟''

''لمبا، دبلا پتلا... عمر چالیس سال کے قریب۔''

''اور کچھ؟''

''کچھ نہیں۔'' آر نے فون منقطع کردیا۔

ونسی تھامپسن، فون رکھ کر کاؤچ پر دراز ہوگیا۔ وہ خوش تھا... ایک رات کے کام کے عوض دو لاکھ ڈالرز و لما کتنی خوش ہوگی، جب میں اس کا پسندیدہ کوٹ اسے خرید کردوں گا... کل ہم دونوں جشن منائیں گے۔ ناچ گاتا، پینا پلانا...

ونسی نے سگریٹ سلگا کر دھواں پھیپھڑوں میں بھر لیا۔ آر کسی بھوت کے مانند تھا، کون تھا؟ کس تنظیم سے متعلق تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کسی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ونسی کے احساسات اس پراسرار آدمی کے لیے کام کرتے ہوئے کچھ ٹھیک نہیں ہوتے تھے... کاغذ کا ٹکڑا، فون نمبر، احکامات، قتل... اور ہزاروں ڈالرز۔ عجیب گورکھ دھندا تھا۔ سیدھا، مضبوط اور صاف ستھرا... نہ ادائیگی میں کوئی بددیانتی۔ چنانچہ وہ آر کے لیے کام کرتا تھا۔ تاہم بعض

اوقات سوچ میں پڑ جاتا۔

ونسی نے خاموشی سے اپنے بھروسے کے آدمیوں سے معلومات کی کوشش بھی کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ آر محض ایک آواز تھی۔ بہرحال اسے اچھا معاوضہ ملتا تھا اور جاب بھی صاف تھی۔ لہٰذا وہ اپنے تجسس کو اکثر پسِ پشت ڈال دیتا۔

اس نے گھڑی دیکھی اور تیاری شروع کردی۔

☆☆☆

دس بجے وہ بیل ایئر پہنچ چکا تھا۔ جمعے کی رات تھی۔ اچھا خاصا رش تھا۔ وہ راستہ بناتا ہوا بار میں رک گیا اور پانی کے ساتھ اسکاچ کا آرڈر دیا۔

وہ دھیرے دھیرے گھونٹ لیتا ہوا ہجوم کا جائزہ لے رہا تھا، آج رات ایک شخص کو زندگی کے ہنگاموں سے دور چلے جانا تھا۔ ممکن ہے وہ آدمی اس ہجوم میں شامل ہو۔ اس نے اس کے متعلق سوچا۔

وہ اب تک کامیابی کے ساتھ آر کے لیے دس قتل کرچکا تھا۔ شاید بارہ۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ دس بارہ... یہ بھی ایک کاروبار تھا۔ ایک برس قبل جب وہ لاس اینجلس میں وارد ہوا تو اس کے دوست مِیچ نے آر کو ونسی تھامپسن کے متعلق بتایا تھا۔ جب سے ہی وہ اس انوکھے گروپ کا حصہ تھا جس کا باسی ہمیشہ اندھیرے میں رہتا تھا۔

اس نے ایک پیگ ختم کرکے دوسرا منگوایا اور کچھ دیر بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ بار چھوڑنے کے بعد وہ پُرسکون تھا۔ اسے عادت ہوگئی تھی۔ نیز اس کا اعتماد بھی فزوں تر تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کام نمٹا کر نصف شب تک لوٹ جائے گا اور ولما کو خبر کردے گا۔

مطلوبہ مقام تک پہنچنے میں اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ کار اس نے ایک مناسب جگہ پر کھڑی کی۔ اطراف میں سناٹا تھا۔ کوئی دوسری کار نظر نہیں آرہی تھی۔

ڈیش بورڈ سے اس نے چپٹا اٹالین ریوالور برآمد کیا۔ میگزین چیک کرنے کے بعد ونسی نے بریشا کوٹ کی جیب میں منتقل کردیا۔ یہاں سے وہ بے موری ہلز اور ہالی ووڈ کی جگمگ کرتی روشنیاں دیکھ سکتا تھا۔

اپنی ''مرکری'' سے باہر آکر اس نے انگڑائی لی۔ فضا میں ٹھنڈک تھی۔ ہمیشہ کی طرح آر نے بہترین اسٹیج تیار کیا تھا۔ قرب و جوار میں کوئی گھر نہیں تھا۔ سڑک اور گیراج کے درمیان مسطح میدان تھا۔ اگر کوئی فائر کی آواز سن بھی لیتا تو بل کھاتی بلند ہوتی سڑک پر وہ کسی کار کا بیک فائر ہی معلوم ہوتا۔

ونسی نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ 10:44۔ وہ حرکت میں آگیا۔ وہ ایک گیراج میں داخل ہوا۔ آر کی اطلاع کے مطابق کار لاک نہیں تھی... گیراج دراصل ایک ہی تھا تاہم اتنا وسیع تھا جیسے دو گیراج ہوں...

گھڑی کی سوئیاں آگے کھسک رہی تھیں۔ سگریٹ سلگانا خطرناک تھا۔ ریوالور اس کے دائیں ہاتھ میں منتقل ہوچکا تھا۔ انگلی ٹریگر پر تھی۔ اس نے آرام دہ پوزیشن اختیار کی اور چوکس ہوگیا۔

☆☆☆

سڑک پر کسی کار کی آواز آئی۔ میدان میں آنے کے بعد کار کا شور کچھ بلند ہوگیا۔ کار کا دروازہ کھلا اور قدموں کی آواز بلند ہوئی۔

ونسی کے اعصاب تن گئے... کوئی لمحہ جاتا تھا... گیراج کا سلائڈنگ ڈور اوپر کی جانب اٹھ رہا تھا۔ ونسی نے گہری سانس لی اور پوری طرح حملے کی پوزیشن میں آگیا۔

وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کسی کار کی دو طاقتور ہیڈ لائٹس نے گیراج کے اندرونی منظر کو روشن کردیا تھا۔

دفعتاً ونسی کا حلق خشک ہوگیا۔ دل ڈرم کے مانند سینے میں بج رہا تھا۔ اس نے چندھیائی ہوئی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کی۔ کچھ بھی نہیں۔ طاقتور روشنیاں، ہوا کی سرسراہٹ اور انجن کی مدھم آواز... گاڑی نیوٹرل گیئر میں تھی۔

اچانک اس کے ذہن میں آر کی سرد اور سپاٹ آواز گونجی۔ ''دبلا پتلا، لمبا قد... عمر چالیس کے قریب۔''

ونسی کو احساس ہوا کہ یہ تو اس کا اپنا حلیہ ہے... سیکنڈ کے دسویں حصے میں اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ اس نے ایک خطرناک غلطی کی تھی... آر کی حقیقت جاننے کی کوشش... حالانکہ اس کی ضرورت تھی نہ کوئی فائدہ...

نتیجتاً وہ آر کی فہرست میں بطور ''رسک'' شامل ہوگیا تھا۔ جبکہ آر رسک پر یقین نہیں رکھتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' ونسی بڑبڑایا۔ ''یہاں سے نکلو۔'' اگر وہ اپنی مرکری کار تک پہنچ گیا تو شاید بچ نکلنے میں کامیاب ہوجائے لیکن پہلے سامنے کار کی ہیڈ لائٹس کا بندوبست کرنا پڑے گا۔

دو گولیوں نے ہیڈ لائٹس کے شیشے کو پاؤڈر میں تبدیل کردیا۔ تاریکی میں وہ دوسری جانب کے دروازے سے نکلا اور سرپٹ دوڑا... اسے پتا نہیں چلا کہ وہ کس چیز سے ٹکرا کر گرا تھا۔ ریوالور گولیاں اگلنے کے لیے تیار تھا۔ قبل اس کے کہ وہ کوئی متبادل ایکشن ترتیب دیتا... اس کی بینائی رخصت ہوگئی۔

درجن بھر گاڑیوں کی لائٹس نے اسے وقتی طور پر اندھا کردیا تھا۔

''پرندے کو گھیرنے کے لیے ''آر'' نے ایک دو نہیں، کئی گاڑیوں میں شکاری بھیجے تھے۔'' آخری وقت اس کے ذہن میں آخری سوچ ابھری...

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب سے خفیہ نکاح کر لیتی ہے۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ چودھری، آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کر لیتا ہے۔ شہریار کی ملاقات میجر ذیشان سے ہوتی ہے تو وہ اسے بتاتا ہے کہ ایک اسپیشل فورس قائم کر لی گئی ہے اور وہ خود اس میں شامل ہو گیا ہے۔ یہ فورس ایک سیکیورٹی ایجنسی کے طور پر خفیہ کام کرتی ہے۔ واپسی میں شہریار کو ماہ بانو کا فون موصول ہوتا ہے۔ وہ اس سے ایک ریسٹورنٹ میں ملتی ہے اور اسلم سے شادی کی خبر سنا کر اس سے اپنے شناختی کاغذات بنوانے کے لیے اس کی مدد چاہتی ہے۔ اسلم اور ماہ بانو شادی کے بندھن میں بندھ جاتے ہیں۔ ماریا، کرنل توحید کو رجھانے کی کوشش میں پکڑی جاتی ہے تاہم راستے میں را کے ایجنٹوں کی فائرنگ سے گاڑی میں آگ لگنے کے سبب ماریا بری طرح جھلس جاتی ہے اور اسپتال میں پوچھ گچھ کے دوران دم توڑ دیتی ہے۔ شہریار اس کی لاش کو لاوارثوں میں شامل کرنے کا حکم دیتا

اسما قادری

قسط 47

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور با اثر سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہو جاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزر نا پڑتا ہے۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے۔ جرم، افسر شاہی، جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

ہے۔ ادھر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ورما سے انتقامی کارروائی کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ شہریار اللہ آباد اور نور پور دورے کے لیے نکلتا ہے۔ اس کی گاڑی کو بم سے اڑا دیا جاتا ہے لیکن وہ محفوظ رہتا ہے۔ شہریار کو کرنل توحید اپنی فورس میں شامل ہونے کا کہتے ہیں۔ شہریار فورس میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہریار کی شناخت چھپانے اور فورس میں آزادانہ کام کرنے کے لیے طے ہوتا ہے کہ شہریار کے فرضی ایکسیڈنٹ کی افواہ پھیلائی جائے گی۔ شہریار، ماہ پارہ اور اسلم کو امریکا بھجوا دیتا ہے۔ شہریار انڈر گراؤنڈ ہو جاتا ہے اور اس کی ٹریننگ اور حلیے میں تبدیلی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ کشور اور آفتاب بھی نیویارک پہنچ جاتے ہیں مگر وہاں ایک شاپنگ سینٹر میں ان کی ملاقات مراد شاہ سے ہو جاتی ہے۔ ادھر شہریار کے کہنے پر ذیشان سی ایف پی کے نوجوان کو خواجہ سراؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے بھیجتا ہے۔ جاوید علی نامی سی ایف پی کا نوجوان خواجہ سراؤں میں شامل ہو کر کراچی نوازش علی نامی شخص کی کوٹھی میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں تمام ملازم خواجہ سرا تھے۔ وہاں جاوید علی کو پتا چلتا ہے کہ شائنی کسی چکر میں ملوث ہے۔ ادھر جاوید علی شاز مین سے معلومات حاصل کرتا ہے۔ نوازش علی کی کوٹھی پر آپریشن کیا جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہاں موجود انتہا پسند کوٹھی کو بارودی مواد سے اڑا دیتے ہیں۔ جاوید علی شدید زخمی ہو کر اسپتال پہنچ جاتا ہے جبکہ نوازش علی زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں البتہ شاز مین اور اس کی دونوں والدہ محفوظ رہتی ہیں۔ ادھر شہریار، ورما کے ٹھکانے پر پہنچ کر اسے قابو کر لیتا ہے۔ شاز مین دارالامان پہنچ جاتی ہے۔ وہ جاوید علی سے ملنے کے لیے اسپتال جاتی ہے۔ راوالے شاز مین کی گاڑی کا پیچھا کرتے ہیں اور اسپتال سے واپسی میں اسے اغوا کر لیتے ہیں۔ سنتھیا، شاز مین سے پوچھ گچھ کرتی ہے اور کسی واضح صورت حال سے آگاہ نہ کرنے پر اس پر جنسی تشدد کا حربہ آزماتی ہے۔ پھر اس کو ایک مردہ سمجھ کر سنسان جگہ پھنکوا دیا جاتا ہے تاہم شاز مین بچ جاتی ہے اور اسپتال میں طبی امداد کے بعد اس کی حالت بہتر ہو جاتی ہے مگر شاز مین وہاں خودکشی کر لیتی ہے۔ مراد شاہ، کشور اور آفتاب کو کھانے پر گھر بلاتا ہے۔ وہاں اچانک واپسی پر اس کا کشور سے سامنا ہو جاتا ہے اور وہ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر مراد شاہ، کشور کو چودھری سے بچاتا ہے۔ ادھر شہریار کو ایکٹو کر دیا جاتا ہے اور اسے سلو والے مشن پر کراچی بھیجا جاتا ہے۔ چودھری کشور اور آفتاب کو ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے آدمیوں کا سہارا لیتا ہے۔ تاہم وہ بچ جاتے ہیں اور انہیں مارنے کی نیت سے آنے والے لوگ پکڑے جاتے ہیں۔ سلو، وزیر اعلیٰ کے بیٹے کی دعوت ولیمہ میں وہ ایک اہم شخصیت کو مارنے کی کوشش کرتا ہے تاہم اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ شہریار کو بھارت ایک اہم مشن پر بھیجنے کا فیصلہ ہوتا ہے جہاں سے اسے ڈاکٹر فرحان نامی شخص کو رہا کرانے کا مشن سونپا جاتا ہے۔ سلو کو سی ایف پی والے جیل سے نکال کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ سلو کو شہریار کے پاس پہنچا دیا جاتا ہے۔ شہریار اسے اپنے مقاصد سے آگاہ کرتا ہے اور سلو، شہریار کے ساتھ مشن پر جانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ اسمگلروں کے ایک قافلے کے ساتھ غیر قانونی سرحد عبور کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ سلو اور شہریار دہلی پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں ان کے مددگار ان کے حلیے میں تھوڑی بہت تبدیلی کرتے ہیں۔ انہیں اب اپنی دستاویزات بنوانی تھیں۔ جاوید علی، رائے چند نامی ہندو کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو مبینہ را کا ایجنٹ ہوتا ہے۔ ادھر سلو اور شہریار ایک ہوٹل میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ وہاں ایک لڑکی کی عزت بچانے میں ان کا جھگڑا اونامی بدمعاش سے ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں سے نکل کر اپنے مددگاروں کے ذریعے ایک سرائے میں ٹھہر جاتے ہیں۔ وہ سونے کے لیے لیٹتے ہیں کہ دروازے پر دستک ہوتی ہے اور وہاں پولیس پہنچ جاتی ہے۔ مگر پولیس وہاں ڈکیتوں کی تلاش میں آتی ہے اور ڈکیتوں کو گرفتار کر کے چلی جاتی ہے۔ جاوید علی، رائے چند سے حاصل شدہ معلومات کے مطابق ایک مساج سینٹر میں پہنچتا ہے۔ وہاں اسے عالیہ نامی عورت ملتی ہے جو مبینہ را کی ایجنٹ ہوتی ہے۔ جاوید علی کے ساتھی وہاں آپریشن کرتے ہیں اور اس عورت کو اٹھا لاتے ہیں۔ ادھر سلو اور شہریار کو کچھ لوگ اٹھا لے جاتے ہیں تاہم اندو نامی لڑکی کی مدد سے وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اندو انہیں دوبارہ دہلی کی ٹرین میں سوار کروا دیتی ہے لیکن وہ بیچ راستے میں اتر جاتے ہیں۔ وہ ایمبولینس کے ڈرائیور کو قابو کرتے ہیں مگر ایک شخص اچانک ان پر گن تان لیتا ہے۔ سلو اور شہریار کو گرفتار کر لیا جاتا ہے اور انہیں را کے ایک ٹھکانے پر پہنچا دیا جاتا ہے۔ تاہم جب پوچھ گچھ کا وقت آتا ہے تو سلو اور شہریار اندو اور اس کے اہلکاروں پر قابو پا لیتے ہیں اور انہیں مار کر وہاں سے نکلتے ہیں۔ وہاں متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد وہ را کے ٹھکانے کو تباہ کر دیتے ہیں۔ شہریار اور سلو اپنے حلیے میں تبدیلی کر لیتے ہیں اور کلام نامی ایجنٹ سے ملاقات کرنے جاتے ہیں اور وہاں ایک مشکوک بندے کو پیچھا کرنے پر پکڑ کر ممبئی کے ایک علاقے میں واقع خالی گھر میں لے آتے ہیں۔ وہ شخص پولیس کا مخبر ہوتا ہے۔ اس لیے اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ کلام لاش ٹھکانے لگانے کے لیے انتظامات کرنے جاتا ہے مگر تھوڑی دیر میں وہاں پولیس پہنچ جاتی ہے اور میگا فون پر انہیں باہر آنے کا کہا جاتا ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

وہ بڑی نازک صورتِ حال میں پھنسے ہوئے تھے۔ باہر پولیس کی خاصی بڑی نفری موجود تھی اور وقفے وقفے سے قاتلوں کو باہر نکلنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ باہر نکل کر گرفتاری دینا ان کے لیے کسی طور ممکن نہیں تھا لیکن یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ باہر نہ نکلے تو پولیس خود انہیں گرفتار کرنے کے لیے اندر گھس آئے گی اور ایک عدد لاش کی موجودگی کے باعث وہ کسی صورت صحتِ جرم سے انکار نہیں کر سکیں گے۔ لاش بھی کسی ایسے ویسے بندے کی نہیں تھی۔ وہ تو پولیس مخبر تھا اور جب وہ گرفتار کر لیے جاتے تو لازماً پولیس کھوج لگاتے ہوئے کلام تک بھی پہنچ جاتی۔ ایک دفعہ ان کے ہاتھ سرا آ جاتا تو پھر تھوڑی سی تگ و دو کے بعد وہ جان لیتے کہ ان سب کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے ساتھ سلو بھی تھا جسے کئی برس تک را والوں نے تربیت دی تھی۔ فی الحال تو وہ اپنے بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن جب انہیں گرفتار کیا جاتا تو جلد یا بدیر یہ راز بھی کھل جاتا کہ پاکستان کو دہشت گردی کا نشانہ بنانے کے لیے تیار کیا جانے والا سلو

اب انڈیا کے خلاف کام کر رہا ہے۔ را والے تھے بھی بہت مکار اور چالباز۔ وہ یہ تو کسی صورت تسلیم نہیں کرتے کہ سلو کو انہوں نے دہشت گردی کی تربیت دی ہے لیکن الٹا یہ الزام لگا دیتے کہ سلو پاکستان کا ایجنٹ ہے جو برسوں پہلے بھی دہشت گردی کے لیے بھارت میں داخل ہوا تھا لیکن گرفتار ہو جانے کے باعث کچھ نہیں کر سکا اور اب پاکستان نے دوبارہ اسے دہشت گردی پھیلانے کے لیے بھارت بھیج دیا ہے۔ وہ دنیا کے سامنے شور مچاتے کہ دیکھو ہم تو اتنے اچھے ہیں کہ جس شخص پر جاسوسی کا شک تھا، اسے خیر سگالی کے طور پر رہا کر دیا لیکن پاکستان ایسا بدمعاش ہے کہ ہمارے اس جذبے کی قدر نہیں کی اور ایک بار پھر ایسے خطرناک بندے کو ہمارے ملک میں بھیج دیا۔ اپنے مشن کی ناکامی کے ساتھ ساتھ وطن کی بدنامی شہریار کو کسی صورت منظور نہیں تھی چنانچہ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کسی صورت بھی گرفتار نہیں ہونا ہے۔

”ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ اس نے تیز سرگوشی میں سلو سے کہا اور مکان کے مختصر صحن میں پہنچ گیا۔ یہاں چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں موجود نہیں تھیں لیکن چھت اتنی بلند بھی نہیں تھی کہ اس تک رسائی ممکن نہ ہو۔ اس نے ایک کمرے کی سلاخ دار کھڑکی پر پاؤں جمائے اور لمحوں میں کھڑکی پر بنے چھجے پر پیر رکھتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔ سلو نے بھی اس کی پیروی کی۔ چھت پر پہنچ کر وہ اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔ یہ مکان گلی کے تقریباً وسط میں تھا اس لیے اس کے دائیں بائیں مکانات موجود تھے۔ اتفاق سے دونوں اطراف بنے مکانات اس مکان کے مقابلے میں خاصے اونچے تھے اور وہ دونوں میں سے کسی تک بھی رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ وہ کسی مہم جوئی کے ارادے سے ہوٹل سے نہیں نکلے تھے اس لیے ان کے ساتھ کوئی ساز و سامان بھی نہیں تھا ورنہ کمند ڈال کر کسی ایک مکان تک پہنچ جانا ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

”پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں۔“ سلو نے سرگوشی میں کہا اور رینگتا ہوا چھت کی پچھلی طرف چلا گیا۔ دائیں بائیں بلند مکانات کی وجہ سے دیوار اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی تھی لیکن آگے اور پیچھے کی طرف ڈھائی تین فٹ اونچی دیواریں موجود تھیں۔ انہوں نے پیچھے والی دیوار تک پہنچ کر احتیاط سے جھانکا۔ وہ ایک تنگ سی گندی گلی تھی جس میں اتنا کیچڑ پڑا ہوا تھا کہ اگر وہ وہاں چھلانگ لگا دیتے تو چوٹ لگنے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن وہ چھلانگ لگا ہی نہیں سکتے تھے کہ انہوں نے ایک ہی منظر میں گندی گلی کے دونوں سروں پر چوکس کھڑے مسلح پولیس اہلکاروں کو دیکھ لیا تھا۔ لگتا تھا پولیس والے پوری طرح منصوبہ بندی کر کے یہاں پہنچے تھے کہ کسی صورت اپنے شکار کو وہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔

”ادھر سے نکلنا تو مشکل ہے۔“ پولیس والوں کے چہرے دیکھ کر سلو نے قدرے مایوسی سے کہا۔

”مشکل ہے، ناممکن تو نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دونوں اطراف میں کل پانچ چھ افراد ہی موجود ہوں گے۔ ہم احتیاط اور پھرتی سے کام لے کر ان افراد سے جان چھڑا سکتے ہیں۔ ہتھیار تو ہیں نا ہمارے پاس۔“ یہ شہریار بھی سمجھتا تھا کہ وہاں سے نکلنا آسان نہیں ہوگا لیکن ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔

”اوکے باس، جیسا تم کہو۔“ شیردل سلو نے انکار نہیں کیا۔

”باہر کودتے ہی تم رائٹ والوں کو سنبھالنا، میں لیفٹ والوں کو دیکھ لوں گا۔ چاہے اندھا دھند فائرنگ کرنی پڑے لیکن ہمیں ہر حال میں یہاں سے نکلنا ہوگا۔ کسی کو یرغمال بنا سکے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔“ وہ جانتا تھا کہ اس ایکشن کا کوئی بھی نتیجہ نکل سکتا ہے لیکن رسک لیے بغیر بھی گزارہ نہیں تھا۔ ان کے درمیان طے ہوا کہ وہ تین تک گنتی گنے گا اور تین کہتے ہی وہ دونوں بیک وقت نیچے کود جائیں گے۔

”ایک... دو...“ اس نے گنتی گننی شروع کی۔ ابھی دو منہ میں ہی تھا کہ فضا میں فائر کی آواز گونجی اور پھر تو گویا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چند ایک گولیاں ان کے قریب سے بھی گزریں۔ دونوں فوراً لیٹ گئے۔ فائرنگ کی آوازوں اور سمت کا اندازہ لگاتے ہوئے انہوں نے فوراً جان لیا کہ یہ گولیاں ان پر نہیں برسائی جا رہیں۔ نہ ہی یہ یکطرفہ فائرنگ ہے۔ یہ دو گروپ تھے جو آپس میں متصادم تھے۔ ایک کے بارے میں تو انہیں پتا تھا کہ وہ پولیس والے ہیں لیکن دوسرے کے بارے میں کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ یہاں ان کے کسی ہمدرد کے آنے کا تو امکان نہیں تھا۔ ہمدرد کا خیال آنے پر ذہن خود بخود کلام کی طرف چلا گیا۔ وہ کافی دیر پہلے سوٹ کیس خریدنے کے لیے وہاں سے نکلا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ ایک دفعہ تو یہ بات ذہن میں آئی تھی کہ شاید پولیس سے مقابلہ کرنے والے وہ اور اس کے آدمی ہوں لیکن یہ زیادہ قرین از قیاس نہیں لگتا تھا۔ کلام اور اس کے دیگر ساتھی جس حیثیت اور مقصد کے تحت یہاں مقیم تھے، اس میں پولیس سے اس قسم کے مسلح تصادم کی گنجائش مشکل سے ہی نکلتی تھی۔ عقل نے فوراً ہی انکار کیا۔ نہیں... یہ کلام نہیں ہو سکتا تھا۔

"نیچے چلتے ہیں۔ یہاں خوامخواہ ہی کسی گولی کی زد میں آجائیں گے۔" سلو نے مشورہ دیا تو اس نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ نیچے چلے جائیں۔ اردگرد برستی گولیوں کی وجہ سے کھڑا ہونا ممکن نہیں تھا۔ وہ دونوں سینے کے بل رینگتے ہوئے چھت کے اس حصے تک پہنچے جہاں سے صحن میں اترا جاسکتا تھا۔ صحن میں اترنے کے بعد وہ سیدھے کمرے میں پہنچ گئے۔ کمرے میں ونود کی لاش ہنوز اسی حالت میں پڑی ہوئی تھی۔

"یہ کلام پتا نہیں کہاں ہے؟" شہریار نے آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے موبائل فون.... نکالا لیکن اس پر سگنل نہیں آرہے تھے۔

"شٹ.... یہ تو کام ہی نہیں کررہا۔" وہ جھنجلایا۔

"پولیس نے ریڈ کرنے سے پہلے موبائل سروس جام کردی ہوگی۔" سلو نے خیال ظاہر کیا تو اسے اتفاق کرنا پڑا۔ باہر فائرنگ، بھاگ دوڑ اور لوگوں کی چیخ وپکار کی آوازیں ہنوز اسی طرح سنائی دے رہی تھیں۔

"لگتا ہے پولیس کسی اور چکر میں یہاں آئی ہے۔" سلو نے اپنی پہلے والی جگہ سنبھالتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"مجھے بھی یہی لگتا ہے۔ اس علاقے میں جرائم پیشہ افراد کی اکثریت ہے۔ پولیس نے یقیناً کسی پکی اطلاع پر یہاں کارروائی کی ہے اور وہ لوگ گرفتاری سے بچنے کے لیے بھرپور مزاحمت کررہے ہیں۔ اگر پولیس کا نشانہ ہم ہوتے تو ان کے لیے اس گھر کے دروازے کو توڑ کر اندر گھس آنا بالکل مشکل نہیں تھا۔" ابتدائی جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد وہ اس قابل ہوچکے تھے کہ حالات کا درست تجزیہ کرسکیں۔

"ہمیں اس لاش کو کہیں چھپادینا چاہیے۔ اگر پولیس ان لوگوں پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئی تو ہوسکتا ہے کہ اردگرد کے گھروں کی تلاشی بھی لے۔ اس صورت میں یہ لاش ہمارے لیے مسئلہ بن جائے گی۔" سلو کی بات دل کو لگنے والی تھی۔ انہوں نے باہمی مشاورت سے فیصلہ کیا کہ لاش کو فی الحال کسی ترکیب سے انڈرگراؤنڈ ٹینک میں اس طرح اتار دیا جائے کہ پہلی نظر میں کسی کو دکھائی نہ دے لیکن وہ خود اسے آسانی سے وہاں سے نکال سکیں۔ ترکیب پہلے سلو کو سجھائی دی اور وہ اس پر عمل کرنے کے لیے ضروری سامان کے ساتھ ٹینک کا ڈھکن کھول کر اندر اتر گیا۔ ٹینک کا نصف حصہ پانی سے بھرا ہوا تھا۔ یہ پانی یقیناً کئی دنوں سے ٹینک میں مستقل موجود تھا اس لیے اس سے ہلکی سی ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ سلو کو وہاں جو کام انجام دینا تھا، اس کے لیے پانی میں اترنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ٹینک میں اترنے کے لیے بنائی گئی سیڑھیوں میں سے پہلی سیڑھی پر ہی رک گیا اور اپنا کام انجام دینے لگا۔ مشکل سے دو منٹ کے وقت میں اس نے کام مکمل کرلیا اور اس طرح ٹینک سے باہر آیا کہ اس کے ایک ہاتھ میں رسی دبی ہوئی تھی اور رسی کے دونوں سرے ٹینک کے اندر تھے۔ اصل میں وہ ٹینک کے اندر گیا ہی اس لیے تھا کہ رسی کے دونوں سروں کو ٹینک کی چھت پر اندر کی طرف سے ٹھونک سکے۔ ٹھونکا پیٹی کی آواز باہر جاری فائرنگ کی آوازوں میں دب گئی تھی اور وہ دونوں مطمئن تھے کہ باہر کسی کو اس مکان میں جاری غیر معمولی سرگرمیوں کا علم نہیں ہوسکا ہوگا۔ سلو کے ٹینک سے باہر آنے کے بعد وہ دونوں کمرے میں گئے اور ونود کی لاش کو وہاں سے اٹھا کر صحن میں لے آئے۔ ونود یوں تو زیادہ بھاری بدن کا نہیں تھا لیکن لاش میں تبدیل ہونے کے باعث خاصا بھاری محسوس ہورہا تھا۔ ان دونوں نے اس کی لاش ٹینک کے ڈھکن کے قریب رکھی اور پھر رسی کا پھندا سا بنا کر اس کی کمر کے گرد لپیٹ دیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر انہوں نے ونود کی لاش کو احتیاط کے ساتھ ٹینک میں اتار دیا۔ یہ کام ذرا مشکل اور محنت طلب ثابت ہوا کیونکہ کسی زندہ شخص کے مقابلے میں لاش کو ٹینک میں اتارنا بڑا ٹیکنیکل کام تھا لیکن بہرحال انہوں نے اسے انجام دے ڈالا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ لاش رسی سے بندھی تاریک ٹینک کی تہ میں اس طرح پڑی ہوئی تھی کہ کوئی ٹینک کا ڈھکن ہٹا کر جھانکتا تو اسے کچھ نظر نہیں آتا لیکن وہ جب چاہتے رسی کھینچ کر لاش کو باہر نکال سکتے تھے۔ سلو نے رسی لٹکائی بھی ڈھکن سے کافی اندر کی طرف تھی اس لیے ڈھکن کھول کر ایک نظر میں اس کے نظر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ خود کو کافی مطمئن محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ٹینک کے ڈھکن کو ایک بار پھر اس کی جگہ پر لگادیا۔ ڈھکن لگا کر ابھی وہ پلٹے بھی نہیں تھے کہ انہیں اپنے پیچھے ہلکی سی دھپ کی آواز سنائی دی۔ وہ دونوں ہی بیک وقت چونک کر پھرتی سے آواز کی سمت پلٹے۔ ان کے سامنے ایک دبلا پتلا، لمبا سا آدمی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں موجود خطرناک گن کا رخ انہی کی طرف تھا جبکہ وہ خود ونود کو محفوظ جگہ پر چھپانے کے چکر میں اپنے ہتھیار ایک طرف رکھ چکے تھے۔ ہتھیاروں کے بارے میں انہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر پولیس نے اس گھر کا رخ کیا تو دونوں میں سے ایک پولیس والوں کو دروازے پر کچھ دیر روکنے کی کوشش کرے گا جبکہ دوسرا ہتھیاروں کو بھی ٹینک کی تہ میں پہنچادے گا۔ یہاں انہیں کوئی پوزیشن نہیں مل سکی تھی چنانچہ ہنگامی حالات میں ہی کھلے ہتھیاروں کو ٹینک میں

ٹینک کر ان کے ناکارہ ہونے کا خطرہ مول لیا جاسکتا تھا۔ بہرحال ابھی تو وہ بالکل نہتے تھے اور ان کے مقابل ایک مسلح شخص آن کھڑا ہوا تھا۔

"اپن کی تم لوگوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے پر اپن چاہتا ہے کہ تم اپن کے ساتھ کوآپریٹ کرو۔" ان دونوں میں سے کسی کے کچھ بولنے سے قبل گن بردار شخص نے لب کشائی کی۔

"گن تو تم نے دشمنوں کی طرح ہی اٹھا رکھی ہے۔" شہریار نے محسوس کرلیا تھا کہ اس شخص کا لہجہ نرم ہے اس لیے کھل کر اپنی ناگواری کا اظہار کیا۔

"یہ اپن کی مجبوری ہے۔ اگر اپن کے ہاتھ میں یہ گن نہیں ہوتی تو تم بات سننے کے بجائے ابھی ہم پر چڑھ دوڑتے۔" وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ اس کے ہاتھ میں موجود ہلاکت خیز گن ہی تھی جس نے ان دونوں کے قدموں کو باندھ دیا تھا اور وہ بنا سوچے سمجھے اس پر حملہ نہیں کرسکتے تھے۔

"ٹھیک ہے ہم تمہارے ساتھ کوآپریٹ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ تم بتاؤ کہ ہم سے کیا چاہتے ہو؟" شہریار نے اس کی بات مان لینا ہی مناسب سمجھا۔

"یہ تم نے عقل کی بات کی ہے۔ چلو کمرے کے اندر چلتے ہیں پھر بات ہوگی۔" اس نے تجویز پیش کی جو معقول ہی تھی۔ اگر نہ بھی ہوتی تو فی الحال وہ انکار کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

"یہ جو فائرنگ کی آوازیں سن رہے ہو اس کی وجہ جانتے ہو؟" کمرے میں پہنچ کر اس نے سوال کیا، جواب میں بے ساختہ ان دونوں کے سر نفی میں ہل گئے۔

"یہ سالا سارا ارجن اور لکھن کا پھیلایا ہوا لفڑا ہے۔ اشوک صاحب کے بندوں سے ان دونوں بھائیوں کا کوئی اپھل رہا تھا۔ سالوں نے باہر معاملہ نمٹانے کے بجائے دو بندوں کو اغوا کیا اور ادھر اپنے ٹھکانے پر لاکر ان سے پوچھ تاچھ کرنے کے لیے اتنا مارا کوٹا کہ وہ جان سے چلے گئے۔ اب اپن کا اندازہ یہ ہے کہ ادھر ان کے بندوں میں اشوک صاحب کا بھی کوئی آدمی تھا جس نے اپنے ساتھیوں کے مرنے کی مخبری کردی۔ حرام کا جنا اشوک بڑا چالاک بندہ ہے۔ اس نے خود سامنے آنے کے بجائے پولیس کو اس طرف دوڑا دیا۔ ممبئی کی پولیس میں ایسے کئی حرام کے جنے ہیں جو اشوک کے تلوے چاٹتے ہیں۔ اپنے مالک کے حکم پر وہ ادھر چڑھ دوڑے۔ اب یہ اپن کی قسمت تھی کہ اپن بھائی جی کے حکم پر ارجن سے دھندے کی بات کرنے ادھر آیا ہوا تھا اس لیے فائرنگ شروع ہوئی تو پھنس گیا۔ ارجن اور لکھن اپنے بندوں کے ساتھ مل کر پولیس کا مقابلہ کررہے ہیں لیکن اپن جانتا ہے کہ وہ چوہے دان میں پھنس گئے ہیں اور اپن ان کے ساتھ پھنسنا نہیں چاہتا اس لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر وہاں سے نکل پڑا۔ یہاں سے چوتھا مکان ہے ارجن کا اور اپن گولیوں کی برسات میں چھتیں پھلانگتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔ گولی مولی لگ کر مرجاتا تو خیر تھی لیکن زندہ گرفتار ہوکر بھائی جی کو تو مشکل میں ڈالنے کا تو نہیں تھا نا۔" وہ جو کہانی انہیں سنا رہا تھا اس میں اشوک صاحب اور بھائی جی کے نام ان کے لیے جانے پہچانے تھے۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو ممبئی میں داخل ہوتے ہی انہیں اندو نامی لڑکے کی وجہ سے ان دو ناموں سے واقفیت حاصل ہوئی تھی اور اب پھر یہ دونوں نام سامنے آگئے تھے۔ باہر جاری فائرنگ میں ممبئی کے ان دونوں غنڈوں کا نام سننا زیادہ عجیب بھی نہیں لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، اتنی کہانی تو ہمیں سمجھ میں آگئی لیکن یہ سمجھ نہیں آرہا کہ ہم تم سے کیا کوآپریٹ کرسکتے ہیں۔ باہر جو ہنگامہ جاری ہے اس میں تو ہم خود بھی یہاں سے نہیں نکل سکتے اس لیے تمہاری مدد کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" ہمیشہ کی طرح گفتگو کی ذمے داری شہریار نے سنبھالی تھی اور سلو اس معاملے سے بے نیاز نظر آرہا تھا لیکن شہریار جانتا تھا کہ حقیقت میں وہ پوری طرح چوکنا ہے اور ضرورت پڑنے پر فوری طور پر ایکشن میں بھی آسکتا ہے۔

"نکلنے کا راستہ ہوتا تو اپن خود نکل جاتا۔ ابھی تو اپن یہاں چھپنے کی جگہ مانگتا ہے۔ فائرنگ کی آواز کو غور سے سنو تو سمجھ جاؤ گے کہ بس اب کھیل ختم ہی ہونے والا ہے۔ پولیس والے اس لفڑے میں جیتیں گے اور ارجن کے گھر کے ساتھ ساتھ آس پاس کے مکانوں کی بھی تلاشی لیں گے۔ اس ٹیم (وقت) تمہیں اپن کو چھپانا ہوگا۔" اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"لیکن ہم تمہیں چھپائیں گے کہاں؟ اس گھر میں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔" شہریار نے پہلو بچانا چاہا۔

"ادھر ہی چھپانا جدھر تم نے وہ لاش چھپایا ہے۔" وہ معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا تو شہریار بے ساختہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ یقیناً جب وہ شخص چھت پر تھا تو اس نے ونود کی لاش کو ٹینک میں اتارے جانے کا منظر اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

"وہاں تم کیسے چھپو گے، ٹینک میں پانی بھرا ہوا ہے؟"

"کتنا پانی ہے؟" اس نے استفسار کیا۔

"تقریباً آدھا ٹینک۔"

"پھر کوئی پرابلم نہیں۔ اپن سیڑھی پر کھڑا ہوجائے گا۔ پولیس والا سالا ڈھکن اٹھانے لگے تو تم اشارہ کردینا۔ اپن پانی میں کود جائے گا۔ پانی کے اندر تین منٹ کے لیے

سانس روک لینا اپن کے لیے کوئی مشکل نہیں۔" اس نے خود ہی سارا منصوبہ ترتیب دے دیا۔ ان کے لیے اس منصوبے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اگر وہ اس سے تعاون نہیں کرتے اور وہ گرفتار ہو جاتا تو لازماً ٹینک میں چھپی لاش کی نشاندہی کر دیتا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ وہ اسے بھی ونود کے پاس پہنچا دیتے۔ لیکن بے وجہ انسانی خون سے ہاتھ رنگنے کی بھی کوئی تک نہیں بنتی تھی البتہ یہ ممکن تھا کہ اس تعاون کے بدلے میں وہ اس شخص کی ہمدردی حاصل کر لیتے اور وہ کبھی نہ کبھی ان کے کام آجاتا۔ ویسے بھی بھائی جی کے بارے میں انہیں جو معلومات حاصل ہوئی تھیں، ان کے مطابق وہ مسلمانوں اور پاکستانیوں کا ہمدرد تھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟" شہریار نے اس سے دریافت کیا۔ اس گفت وشنید کے دوران وہ فائرنگ کی آوازوں پر بھی توجہ رکھے ہوئے تھا۔ فائرنگ کی شدت میں کمی آگئی تھی اور واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ایک گروپ پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

"عبدالرحمن... پر ادھر سارا لوگ اپن کو عبدل بھائی بولتا ہے۔" اس نے اطمینان سے بتایا۔

"ٹھیک ہے عبدالرحمن... ہم تمہارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر پولیس نے گھر گھر تلاشی لینا شروع کی اور اس مکان تک پہنچی تو تم وہی کرنا جو سوچ رکھا ہے۔ آگے قسمت کی بات ہوگی کہ تم اور ہم بچ پاتے ہیں یا نہیں۔" آخرکار شہریار نے اسے تعاون کی یقین دہانی کروا ہی دی۔

"قسمت کی تم فکر نہ کرو، قسمت کا اپن دھنی ہے۔ پہلے بھی کئی بار موت کے منہ میں سے نکلا ہے، اب بھی انشاءاللہ نکل جائے گا۔" اس نے یقین سے کہا اور پھر یکدم ہی موضوع گفتگو بدل ڈالا۔

"سالا تم لوگ تو بتاؤ کہ تم کون ہے؟ اپن کو تو اس بستی کا رہنے والا نہیں لگتا۔" اس کی چھوٹی چھوٹی ذہین آنکھیں بہت غور سے ان دونوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"ہم جو بھی ہیں، تمہارے لیے جاننا ضروری نہیں۔ ابھی ہم اپنی مجبوری کی وجہ سے ایک دوسرے سے کوآپریٹ کرنے پر مجبور ہیں لیکن ایک دوسرے سے ایسا کوئی تعلق نہیں ہے کہ آپس میں اپنے بارے میں گفتگو کریں۔ ہاں تم اپنی سہولت کے لیے ہمیں نوشاد اور قمرو کہہ سکتے ہو۔" شہریار نے اسے ذرا بے مروتی سے جواب دیا اور خود اٹھ کر اس کھڑکی تک گیا جہاں سے باہر گلی میں جھانکا جا سکتا تھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچ کر اس نے پہلے ہی کی طرح بے حد احتیاط سے کھڑکی کے پٹ میں جھری بنائی اور باہر کا منظر دیکھنے لگا۔ فائرنگ کا سلسلہ اب تقریباً رک چکا تھا اور گلی میں کئی پولیس والے دوڑتے ہوئے نظر آرہے تھے۔

"میرے خیال میں اب تمہیں ٹینک میں چھپ جانا چاہیے۔ پولیس نے اپنی ابتدائی کارروائی مکمل کر لی ہے اور اب یقیناً وہ لوگ کسی بھی وقت اردگرد کے گھروں کی تلاشی لینا شروع کر سکتے ہیں۔" کچھ دیر باہر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے عبدالرحمن عرف عبدل کی طرف پلٹتے ہوئے... مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے لیکن ٹینک کا ڈھکن اس وقت تک کھلا رکھوں گا جب تک پولیس والے دروازہ نہ کھٹکھٹائیں۔ اس دوران میں پوری طرح ہوشیار رہوں گا۔" اس نے اپنی گن کو اس طرح تھپتھپایا جیسے انہیں دھمکی دے رہا ہو۔ وہ خاصا ہوشیار آدمی تھا اور اس مکان میں وارد ہونے کے بعد ایک بار بھی اس نے ان دونوں کو اپنی گن کی زد سے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔ اب بھی وہ پوری طرح محتاط نظر آرہا تھا۔

"جیسا چاہتے ہو کرو، بہرحال ہمارا تمہیں دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" شہریار نے بے لاپروا انداز میں اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کا جواب سن کر عبدل نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور نہایت پھرتی سے ان کے ہتھیاروں کو اپنے قبضے میں کر لیا۔ یہ ہتھیار وہ خود ونود کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے کمرے میں ایک جانب ڈال کر چلے گئے تھے۔ عبدل کی تمام تر ہوشیاری کے باوجود ان کے پاس گنجائش تھی کہ وہ ان ہتھیاروں تک رسائی حاصل کرنے کا موقع نکال لیں لیکن ان دونوں ہی کے نزدیک موجودہ صورت حال میں ہتھیار بے کار تھے اس لیے ان کے حصول کے لیے کوشش بھی نہیں کی تھی۔ عبدل کا معاملہ البتہ الگ تھا۔ وہ غول سے بچھڑے ہوئے کسی جانور کی طرح وحشت زدہ تھا اور ہر ممکنہ احتیاط کر رہا تھا۔ الٹے قدموں کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے خود ہی صحن میں موجود واٹر ٹینک کا ڈھکن ہٹایا اور اندر داخل ہو گیا۔ شہریار اور سلو نے اس کے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور اپنی جگہ پر موجود رہ کر کمرے کا جائزہ لینے لگے۔ ونود کو عین دل کے مقام پر گولی ماری گئی تھی اور فوری موت واقع ہو جانے کی وجہ سے بہت زیادہ خون نہیں بہا تھا۔ جو خون نکلا تھا، اس کو بھی انہوں نے اس کے سینے پر موٹا کپڑا رکھ کر ادھر ادھر بہنے سے روک دیا تھا چنانچہ کمرا تقریباً صاف تھا، بس چند ایک ہی خون کے قطرے پڑے نظر آرہے تھے۔ ان قطروں کو شہریار نے خود آگے

بڑھ کر صاف کر دیا۔ اس کے بعد وہ دونوں تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ گئے۔ پولیس تلاشی کے لیے اس مکان تک آتی یا نہ آتی، وہ بہرحال ابھی باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ اگر نکلتے تو فوراً پولیس والوں کی نظر میں آجاتے۔ شہریار نے انتظار کے جاں گسل لمحات کو گزارتے ہوئے ایک بار پھر اپنا موبائل نکال کر چیک کیا۔ اس پر ابھی تک سگنل نہیں آرہے تھے چنانچہ وہ کلام سمیت کہیں کسی شخص سے رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ یقیناً کلام کا بھی یہی حال ہوگا۔ وہ سوٹ کیس خریدنے کے بعد واپس پلٹا ہوگا تو علاقے میں پولیس کی بھاری نفری دیکھ کر دور ہی رک گیا ہوگا اور موبائل سگنلز بند ہونے کی وجہ سے ان سے رابطہ بھی نہیں کر سکا ہوگا۔

اللہ اللہ کر کے انتظار کے لمحات ختم ہوئے اور دروازے پر پولیس والوں کی مخصوص زوردار دستک سنائی دی۔ دستک کی آواز سن کر سلو نے خودکار انداز میں صحن کا رخ کیا جبکہ شہریار دروازہ کھولنے کے لیے بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولنے میں اتنا وقت لگایا کہ سلو ٹینک کا ڈھکن لگا کر خود وہاں سے ہٹ جائے۔ معمولی سی تاخیر بھی پولیس والوں پر گراں گزری اور انہوں نے بری طرح دوازے کو پیٹ ڈالا۔

"اتنی دیر کیوں لگائی دوازہ کھولنے میں سالے۔ ہم تیرے باپ کے نوکر ہیں جو باہر انتظار میں کھڑے رہیں۔" جونہی اس نے دروازہ کھولا، دو پولیس والے اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور بدزبانی کرنے لگے۔ حالات کی وجہ سے شہریار نے ان کی اس بدزبانی کو خاموشی سے برداشت کر لیا اور خوشامدانہ انداز میں بولا۔

"سوری سر! ہم باہر کی پچویشن کی وجہ سے ڈرے ہوئے تھے اس لیے تھوڑا ٹائم لگایا۔" پولیس کا معمولی سپاہی اپنے لیے سر کا لفظ سن کر پھول کر کپا ہو گیا اور مزید نخوت سے بولا۔

"بکواس نہ کر اوئے اور یہ بتا کہ یہاں کوئی فراری بندہ تو نہیں آیا؟"

"یہاں ہم دونوں بھائیوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو تلاشی لے لیں۔" اس کی بدتمیزی کے باوجود شہریار نے اسے مہذبانہ لہجے میں جواب دیا۔

"وہ تو ہم لیں گے ہی پر تو بتا کہ تو کون ہے؟" اس کی اکڑ کسی طور ختم نہیں ہو رہی تھی۔

"میں جگدیش ہوں اور یہ میرا چھوٹا بھائی وریندر ہے۔ یہ گھر ہمارے دوست مترا کا ہے۔ وہ ہمیں جاگنگ کے بعد پارک سے اپنے گھر میں لے آیا تھا اور ہمارے لیے باہر سے ناشتا لینے گیا تھا کہ آپ لوگوں نے یہاں آپریشن شروع کر دیا۔ ہم لوگ یہاں پھنس گئے اور مترا ابھی واپس نہیں آسکا۔" اس نے پولیس والے کو پہلے سے سوچی ہوئی کہانی سنا دی جو کہ ان کے جسم پر موجود جاگنگ کے لباس کی وجہ سے حقیقت کے قریب معلوم ہوتی تھی۔

"زیادہ بھولا نہ بن اوئے۔ ہمیں سب معلوم ہے کہ ادھر اس علاقے میں کوئی شریف بندہ نہیں رہتا پر اس سے ہمیں کسی اور سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہم بس ارجن کے ساتھیوں کو تلاش کر رہے ہیں۔" وہ پولیس والا تھا اس لیے اس کے انداز سے دھوکا کھانے کو تیار نہیں ہوا اور بُری طرح لتاڑ کر رکھ دیا۔

"چلو بھئی، تلاشی شروع کرو۔" اس بار اس کا مخاطب اس کا اپنا ساتھی تھا جو فوراً ہی حرکت میں آگیا۔ چھوٹے سے تقریباً خالی پڑے مکان کی تلاشی لینا کیا مشکل تھا۔ دونوں نے لمحوں میں کام نمٹا لیا۔ شہریار کے خدشات کے برعکس انہیں انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک میں جھانکنے کا خیال بھی نہیں آیا اور وہ اپنا کام بھگتا کر روانہ ہو گئے۔ جاتے جاتے البتہ انہوں نے ان دونوں کو یہ ضرور جتایا تھا کہ وہ دونوں انہیں شکل سے چارسوبیس لگتے ہیں لیکن اس وقت کیونکہ وہ محدود آپریشن کر رہے ہیں اس لیے ان جیسے کئی بدمعاشوں کو نظرانداز کرنے پر مجبور ہیں۔ آسانی سے جان چھوٹ جانے پر انہوں نے پولیس والوں کی اس بکواس کو میٹھے شربت کے گھونٹ کی طرح پی لیا اور دروازے کو ایک بار پھر اندر سے بند کرنے کے بعد سلو نے جا کر ٹینک کا ڈھکن ہٹا دیا۔ عبدل پلک جھپکتے میں باہر آگیا۔ اس کے ہاتھوں میں اپنی گن سمیت ان دونوں کے ہتھیار بھی موجود تھے۔ وہ جرم کی دنیا کا آدمی تھا اس لیے ہتھیار کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے یقیناً پہلے سے ہتھیاروں کو پانی میں پھینکنا دانش مندی نہیں سمجھی ہوگی اور یہ طے کیا ہوگا کہ ناگزیر حالات میں ہی ان کارآمد چیزوں کا نقصان برداشت کرے گا۔ خوش قسمتی سے اس کی نوبت ہی نہیں آئی تھی اور اس نے اپنے ساتھ ان دونوں کے ہتھیار بھی ضائع ہونے سے بچا لیے تھے۔ وہ ٹینک سے باہر نکلا تو وہ لوگ دوبارہ اسی کمرے میں جا بیٹھے۔ یہاں آکر شہریار نے ایک بار پھر اپنا موبائل چیک کیا۔ ابھی تک اس پر سگنلز موصول نہیں ہو رہے تھے۔ یقیناً پولیس اپنی کارروائی مکمل ہونے سے قبل موبائل سروس بحال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ ان حالات میں انہیں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ونود کی لاش کو انہوں نے جان بوجھ کر ابھی ٹینک سے باہر نہیں نکالا تھا۔ اب وہ یہ کام کلام

کے واپس آنے کے بعد ہی کرنا چاہتے تھے۔ دوسری طرف ان کا ہتھیاروں سے لیس عبدالرحمٰن کو بھی چھیڑنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ ان کا حریف نہیں تھا، بس اپنی جان کی حفاظت کے لیے احتیاطاً ہتھیار سنبھال کر بیٹھا ہوا تھا اور باہر کے حالات موافق ہوتے ہی یہاں سے نکل جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایسے میں اس سے خوامخواہ بھڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر کیا جانے والا انتظار ایک گھنٹے کی مدت پر جا کر ختم ہوا اور باہر کی سن گن لینے پر انہیں اندازہ ہوگیا کہ پولیس اب اس علاقے سے نکل رہی ہے۔ ساتھ ہی موبائل فونز کے سگنل بھی جاگ گئے۔ شہریار کی طرح عبدالرحمٰن بھی بار بار اپنا موبائل چیک کر رہا تھا۔ سگنلز کھلے تو اس نے فوراً کوئی نمبر ملا کر موبائل کان سے لگا لیا۔ اس کی کال فوراً ریسیو کی گئی۔

''ہاں چھوٹے، اپن ٹھیک ہے تو فکر نہ کر... بس اب تھوڑی دیر میں نکلتا ہے۔'' وہ ان پر نظریں رکھے ہوئے کسی سے بات کرنے لگا۔

''ابھی فون پر ہی ساری تفصیل کرے گا کیا۔ اپن کو ادھر سے نکلنے دے پھر آرام سے سب سن لینا۔'' دوسری طرف موجود شخص نے یقیناً کوئی استفسار کیا تھا جس پر اس نے جھڑکنے والے انداز میں جواب دیا پھر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

''یہ تو تو نے بہت اچھا کیا اوئے۔ بس وہیں رکا رہ۔ اپن پیدل ہی ادھر تک آجائے گا۔ اپن کی گاڑی کا حال احوال بعد میں معلوم کرنا۔ ادھر ارجن کے اڈے کے باہر ہی کھڑی تھی۔ فائرنگ میں اس کا تو حلیہ ہی بگڑ گیا ہوگا۔ کیا پتا پولیس والے ساتھ اٹھوا کر لے گئے ہوں۔'' اس کا آدمی یقیناً قرب وجوار میں ہی کہیں موجود تھا چنانچہ اس نے خود وہاں تک پہنچنے کا عندیہ دیا اور کال ختم کر کے اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''او کے یارو... اپن چلتا ہے۔ تمہاری آج کی مدد اپن کو ساری زندگی یاد رہے گی۔ اپنا ایکسپیرینس بتاتا ہے کہ سالا تم دونوں بھی مار دھاڑ کرنے والا آدمی ہے پر اپن سے نہیں بھڑا تو اچھا کیا۔ اکھا ممبئی عبدالرحمٰن کو جانتا ہے۔ اپن بھائی جی کا خاص آدمی ہے۔ اگر تم کو کبھی مدد کی ضرورت پڑے تو سیدھے اپن کے پاس آجانا۔ اپن تمہارا آج کا احسان ضرور اتارے گا۔'' اس نے شاہانہ انداز میں کہا اور ان کے ہتھیار ذرا فاصلے سے دیوار کے ساتھ ڈال کر آگے بڑھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سیدھا باہر نکل جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا اور باہر نکلنے سے قبل اس نے شہریار کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ شہریار نے خاموشی سے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ عبدالرحمٰن نے خاصی طاقت صرف کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کو جکڑ کر مصافحہ کیا۔ شہریار کی جگہ کوئی عام شخص ہوتا تو اس کی گرفت کی سختی پر تڑپ جاتا لیکن وہ نارمل رہا اور جوابی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اپنے ہاتھ کی گرفت نرم ہی رکھی۔ عبدالرحمٰن نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سلو سے مصافحہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ بھی اس نے شہریار والی حرکت ہی کی۔ جواباً سلو نے شہریار جیسے رویے کا مظاہرہ کرنے کے بجائے اتنی ہی قوت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ عبدالرحمٰن بے ساختہ ہی ہنس دیا۔

''جان دار آدمی ہو، پر اس جیسے عقلمند نہیں۔'' شہریار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا اور ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے انداز پر سلو کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

''وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بلاضرورت طاقت کا مظاہرہ کرنا عقلمندی نہیں ہوتی۔'' شہریار نے اسے سمجھایا۔

''وہ خود ایسا نہیں کر رہا تھا کیا؟'' سلو نے چڑ کر کہا۔

''نہیں، اس کا عمل بلاضرورت نہیں تھا۔ وہ ہمیں جانچ رہا تھا۔'' شہریار نے رسان سے جواب دیا اور اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس پر کوئی کال آرہی تھی۔

''تھینک گاڈ، آپ لوگ ٹھیک ہیں۔ میں بہت دیر سے کال کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن رابطہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اب بس میں وہاں پہنچ ہی رہا ہوں۔'' اس کی آواز سنتے ہی دوسری طرف سے کلام بولتا ہی چلا گیا اور کچھ سنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔

''کلام آرہا ہے، چلو ہم ٹینک سے ونود کی لاش باہر نکال لیتے ہیں۔ زیادہ دیر پانی میں پڑی رہنے سے لاش پھول جائے گی اور کلام کو اسے یہاں سے ہٹانا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔'' فون بند ہوتے ہی اس نے سلو سے کہا جو ہمیشہ کی طرح فوراً عمل کے لیے تیار ہوگیا۔ لاش کو ٹینک سے باہر نکالنا اندر ڈالنے کے مقابلے میں زیادہ مشکل کام ثابت ہوا۔ انہوں نے کپڑوں سمیت لاش کو اندر ڈالا تھا اور اب اس کے کپڑے پانی سے شرابور ہوگئے تھے۔ دونوں نے مل کر بہ مشکل اسے باہر نکال کر صحن کے فرش پر رکھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔

''میں دیکھتا ہوں، کلام ہوگا۔'' سلو ٹینک کے اندر تھا

اس لیے اس کا حال زیادہ خراب ہوگیا تھا۔ اس کے مقابلے میں شہریار کے کپڑے زیادہ نہیں بھیگے تھے چنانچہ وہ ہی دروازہ کھولنے گیا۔ حسب توقع وہاں کلام ہی موجود تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا سوٹ کیس تھام رکھا تھا۔

''سوری، آپ لوگوں کو یقیناً پریشانی اٹھانی پڑی ہوگی۔ میں خریداری کر کے واپس آرہا تھا تو پتا چلا کہ اس علاقے میں پولیس کا آپریشن جاری ہے۔ موبائل پر بھی رابطہ نہیں ہوا لیکن میرے پاس پریشان ہونے اور انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔'' وہ سوٹ کیس زمین پر رکھ کر کھولتے ہوئے وضاحت دینے لگا۔

''اٹس او کے، مجھے تمہاری پوزیشن کا اندازہ ہے۔'' شہریار نے اسے اطمینان دلایا۔

''میں نے اندازے سے آپ دونوں کے لیے کپڑے بھی خرید لیے ہیں۔ جاگنگ سوٹ کے بجائے آپ ان کپڑوں میں یہاں سے نکلیں تو بہتر رہے گا۔'' سوٹ کیس میں سے ایک شاپنگ بیگ نکال کر اس کے حوالے کرتے ہوئے وہ بولا۔ خود اس کے اپنے جسم پر بھی اب جاگنگ سوٹ کے بجائے عام پینٹ شرٹ نظر آرہی تھی۔ یقیناً اس نے کپڑے خریدنے کے بعد شاپنگ سینٹر میں ہی بدل ڈالے تھے۔ شہریار کی تیز نگاہوں نے دیکھ لیا کہ سوٹ کیس میں ایک بڑے سائز کا پولیتھین بیگ رکھا ہوا ہے۔ وہ اس کا مصرف اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

''کپڑے لا کر تم نے اچھا کیا۔ ونود کی لاش کو چھپانے کے چکر میں ہمارے کپڑے خاصے خراب ہوگئے تھے۔'' اس نے شاپنگ بیگ میں سے کپڑے نکال کر ان کا سرسری جائزہ لیا۔ وہ اس کے اور سلو کے لیے مناسب رہتے۔

''لاش کہاں چھپائی آپ لوگوں نے؟ میں تو سمجھا تھا کہ وہ پیچھے والے کمرے میں پڑا ہوگا۔'' کلام جو سوٹ کیس سے پولیتھین نکال کر کھڑا ہو رہا تھا، بری طرح چونکا۔

''تمہارے پیچھے یہاں بہت کچھ ہوا ہے۔ نہایت سنگین حالات میں اگر ہم تمہیں یہاں صحیح سلامت نظر آرہے ہیں تو اسے خوش قسمتی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔'' وہ مختصراً اسے اس عرصے میں گزرنے والے واقعات سے آگاہ کرنے لگا۔

''او مائی گاڈ، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے پیچھے آپ کا عبدل بھائی سے واسطہ پڑا ہوگا۔ آپ واقعی خوش قسمت ہیں کہ وہ یہاں سے خوش ہو کر گیا ہے اور اس نے وقت پڑنے پر آپ کے کام آنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ اب آپ زندگی میں کبھی بھی اسے اس کا یہ وعدہ یاد دلائیں گا تو وہ مکرے گا نہیں اور برے سے برے حالات میں بھی آپ کا ساتھ دے گا۔''

''لگتا ہے تمہاری بڑی اچھی جان پہچان ہے عبدل بھائی سے؟'' سلو جو کمرے میں آچکا تھا، اس کی بات سن کر طنزیہ لہجے میں بولا۔

''میں کیا، اس کے بارے میں ممبئی کے وہ لوگ بھی جانتے ہیں جنہوں نے کبھی اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بہت پھرتیلا، لڑنے بھڑنے کا ماہر اور ہتھیار شناس آدمی ہے جو اپنے دشمنوں کے لیے سفاک تو دوستوں کے لیے جان لٹا دینے والا ہے۔ بھائی جی کے سرچڑھے لوگوں میں اسے سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔'' سلو کے طنزیہ لہجے کو نوٹ کیے بغیر وہ سادگی سے دیگر تفصیلات بتانے لگا۔

''چلو ٹھیک ہے، کبھی ضرورت پڑی تو اسے آزما دیکھیں گے۔ ابھی تو ونود کی لاش کا بندوبست کرو تاکہ ہمیں یہاں سے خلاصی ملے۔'' شہریار نے درمیان میں دخل اندازی کر کے موضوع گفتگو ختم کیا تو وہ تینوں صحن میں پڑی ونود کی لاش کے پاس پہنچے اور اسے بڑی صفائی سے پولیتھین بیگ میں لپیٹ کر سوٹ کیس میں منتقل کر دیا۔

''اس مردود کی وجہ سے اب مجھے ٹینک کی صفائی بھی کرنی پڑے گی۔'' سوٹ کیس بند کرتے ہوئے کلام بڑبڑایا۔

''وہ تمہیں ویسے بھی کرنی چاہیے۔ سڑے ہوئے گٹر کے پانی جیسی بدبو آرہی ہے اس میں سے۔'' سلو نے ناک چڑھا کر کہا۔ دونوں دفعہ ٹینک میں اترنے کا فریضہ اسی نے انجام دیا تھا اس لیے وہ ایسا کہنے میں حق بجانب تھا۔

''اصل میں میرا یہاں بہت دنوں بعد آنا ہوتا ہے اس لیے یہ نوبت آجاتی ہے۔'' کلام نے کھسیائے ہوئے لہجے میں وضاحت کی جس پر مزید کوئی تبصرہ کیے بغیر وہ دونوں کپڑے تبدیل کرنے چلے گئے۔ ان کا یہاں کام ختم ہو چکا تھا۔ کلام سوٹ کیس میں بند لاش کو کس طرح ٹھکانے لگاتا، یہ ان کی دردِسری نہیں تھی۔

☆☆☆

جگو نے جھپاتی ہوئی کار عین اپنی مطلوبہ عمارت کے نیچے روکی اور کار ہی کی طرح جھپاتے نئے نکور کپڑوں میں دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ یہ وہ محلہ تھا جہاں ہر سمت سے سرسنگیت اور گھنگھروؤں کی چھن چھن سنائی دیتی تھی اور آنے

والے مہمانوں کا رات کے پُراسرار ماحول میں استقبال ہوتا تھا۔ یہاں آنے کے لیے اس نے خصوصی اہتمام کیا تھا اور گاڑی سے لے کر پیر میں موجود جوتوں تک ہر شے کا انتخاب لاجواب تھا۔ اپنے اس محتاط انتخاب کی وجہ سے وہ کسی غنڈے کے بجائے رئیس ابنِ رئیس لگ رہا تھا اور یہاں ایسا دکھنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے کا رواج تھا۔ اس کا بھی چندا بائی کے کوٹھے پر پُرجوش استقبال ہوا۔ ڈیوڑھی میں موجود بوڑھے لیکن گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ملازم نے خوشامدانہ لہجے میں اسے فرشی سلام کیا اور بڑی عزت سے سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے گیا۔ کئی جگہ سے ٹوٹ جانے والی تنگ و تاریک سیڑھیوں سے گزر کر جگو اوپر پہنچا تو وہاں آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی پھیلی تھی۔ بڑے سے ہال میں پھیلی اس روشنی میں کچھ دخل تو جھالردار فانوس اور فینسی لائٹوں کا تھا لیکن اصل کمالِ حسن کی ان دیویوں کا تھا جو برق کی طرح کوند کر جملہ حاضرین کے حواسوں پر گر رہی تھیں۔ سُر اور سنگیت کی لے پر ناچتی یہ پریاں جگو کے لیے کوئی نیا تجربہ نہیں تھا۔ وہ جس سیاست داں کے لیے خدمات انجام دیتا تھا، وہ کئی بار رات کی تاریکی میں ایسی محفلوں میں شرکت کے لیے بطور باڈی گارڈ اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اپنے آقا کے ساتھ ہونے کے باعث وہ سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود تماش بین نہیں کہلاتا تھا اور ایک طرف چوکس کھڑا خود کو ہر شے سے بے نیاز ظاہر کرتا تھا لیکن آج وہ خود تماش بین بن کر یہاں آیا تھا اور ہونے والی آؤ بھگت سے لطف اندوز ہوتا ہوا..... ان تھرکتی بجلیوں کو داد دے رہا تھا۔ اس شغل کے دوران اس نے اپنی یہاں آمد کے اصل مقصد کو فراموش نہیں کیا تھا اور نگاہیں مسلسل گوہر مقصود کی متلاشی تھیں۔ آخرکار اس کی یہ تلاش ختم ہوئی۔ وہ کوئی سترہ اٹھارہ سال کی سجی سنوری گڑیا سی لڑکی تھی جو قدرے جھجکتے ہوئے محفل میں وارد ہوئی تھی۔ جھجکتے ہوئے قدم، جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ حرکت میں آئی تو محفل کا رنگ بدل گیا۔ وہ اپنی پیش روؤں کی طرح نہ تو بازار کی جملہ اداؤں کی مالک تھی، نہ تماش بینوں کو لبھانے کے لیے تیکھے چتون سے کام لے رہی تھی۔ پھر بھی ہر ایک اس پر مرمٹنے کو تیار نظر آ رہا تھا۔ کئی نے تو یہ بھی کوشش کی کہ ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی آغوش میں لے لیں لیکن وہ چکنی مچھلی کی طرح ہر ایک کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی گئی۔ بے تاب دلوں نے اس کے قدموں میں نوٹوں کے ڈھیر لگا دیے اور وہ خود بکاؤ تھی کاغذ کے ان ٹکڑوں کو بے نیازی سے اپنے نرم و نازک تلوؤں تلے روندتی رہی۔ بالآخر محفل ختم ہوئی اور منچلے سحرزدہ سے وہاں سے رخصت ہونے لگے۔ رخصت ہونے والوں میں جگو شامل نہیں تھا۔ وہ وہیں اپنی جگہ جم کر بیٹھا تھا۔

''کیا خدمت انجام دوں سرکار کی؟'' ادھیڑ عمر نائکہ چندا بائی نے جو اسے اپنی جگہ جمے دیکھا تو کوٹھے کے آداب کے مطابق مہذبانہ دریافت کیا۔

''آں... کیا کہا تم نے؟'' جگو نے ایسی اداکاری کی جیسے کسی گہرے خیال سے واپس پلٹا ہو۔

''میں نے کہا سرکار محفل تو کب کی ختم ہو گئی اگر آپ کو مجھ سے کوئی اور خدمت درکار ہو تو ارشاد فرمائیے؟'' بائی نے بہت نرمی سے اسے ابھی تک وہاں بیٹھے رہنے کا احساس دلایا تو اس نے اپنے لبوں سے ایک گہری سرد سانس خارج کی اور کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

''محفل کب ختم ہوئی مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہوا۔ میری نظروں کے سامنے تو وہ اب بھی رقص کرتی ہر سو چاندنی بکھیر رہی ہے۔''

''یہ آپ کس کو عزت بخش رہے ہیں سرکار... کچھ اس کا حال حلیہ تو بتائیے؟'' بائی نے اس کی قیمتی پوشاک سے لے کر ہاتھوں میں پہنی نایاب پتھروں والی انگوٹھیوں تک کا ایک ہی نظر میں جائزہ لے کر خوشامدانہ لہجے میں دریافت کیا۔

''وہی جو سب سے آخر میں سفید لباس پہنے آئی تھی اور سب کچھ ٹھنڈی میٹھی چاندنی میں ڈبو دیا تھا۔'' جگو کو کہ دیہاتی پس منظر سے تعلق رکھتا تھا لیکن شہر میں قیام اور فلموں کے چسکے کی وجہ سے ان محفلوں میں گفتگو کے طریقے سے خوب واقف تھا۔

''بہت خوب سرکار! نام تو آپ نے خود بتا دیا اس کا۔ وہ واقعی چاندنی ہے۔ میرے کوٹھے کا سب سے خوب صورت اور نایاب موتی۔'' چندا بائی کوٹھے کی پیداوار تھی۔ پیر میں گھنگھرو باندھ کر ناچنے سے لے کر نائکہ کی گدی سنبھالنے تک اس نے اس کاروبار کے بہت سے اسرار و رموز سیکھے تھے چنانچہ چاندنی میں اس کی دلچسپی محسوس کر کے پہلے ہی اس کے بھاؤ بڑھانے کی تدبیر کرنے لگی۔

''میں اس موتی کو ایک رات کے لیے اپنی دسترس میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' جگو نے بے تابی سے اپنی خواہش بیان کی۔

''پہلے اپنا کچھ تعارف تو کروائیے۔ پہلی بار آپ کو اپنے کوٹھے پر دیکھا ہے۔ ذرا معلوم تو ہو کہ میری چاندنی کو مانگنے والا اس کی صحیح قدردانی بھی کر سکے گا یا نہیں۔'' وہ ایک کاروباری عورت تھی، سو یہ ممکن نہیں تھا کہ اگلے کی مالی حیثیت کا درست تخمینہ لگائے بغیر اس سے معاملات طے کر لیتی۔

''میرا نام ملک ممتاز ہے۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔ ہماری فرم ممتاز ٹریڈرز کے نام سے مختلف کاروبار کرتی ہے جن میں مسالا جات کی امپورٹ ایکسپورٹ کے علاوہ ڈرگز اور کیمیکلز وغیرہ کے کاروبار بھی شامل ہیں۔ آپ کے شہر میں بھی میں کاروبار کے سلسلے میں ہی آیا تھا۔ سُر سنگیت کا شوقین ہوں اس لیے جہاں بھی جاؤں، اپنے مطلب کی جگہ ڈھونڈ لیتا ہوں۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ چندا بائی کے کوٹھے سے بہتر محفل کہیں اور نہیں سجائی جاتی اس لیے سیدھا یہیں چلا آیا اور اب اعتراف ہے کہ بتانے والے نے ٹھیک بتایا تھا۔ آپ تو بڑے انمول موتی اپنے دامن میں جمع کیے بیٹھی ہیں اور میں ان میں سے ایک موتی کے لیے بس چند گھنٹوں کے واسطے درخواست گزار ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے جو کہ ظاہر ہے سراسر جھوٹ پر مبنی تھا، ایک بار پھر اپنی خواہش دہرائی۔

''میں کوشش کر کے دیکھتی ہوں۔ اصل میں بے بی کی طبیعت آج کچھ ناساز ہے اور وہ محفل میں حاضری دینے پر بھی مشکل سے راضی ہوئی تھی۔'' اپنے گھٹنوں پر ہاتھ جما کر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بھاؤ بڑھانے کے لیے بائی نے ایک اور کاروباری حربہ استعمال کیا۔

''میں آپ کو اسے رضامند کرنے کے لیے منہ مانگا نذرانہ دوں گا۔ بس آج کی رات کے چند گھنٹے وہ میرے نام کر دے۔ میں اتنا اصرار اس لیے کر رہا ہوں کہ میں بس آج رات ہی یہاں ہوں، کل شام تک مجھے ہر حال میں لاہور واپس جانا ہوگا ورنہ بہت بڑا مالی نقصان ہو جائے گا۔'' بائی کے حربوں کو سمجھنے کے باوجود اس نے عاجزی سے اس سے اصرار کیا۔ رقم کی اسے اس لیے پروا نہیں تھی کہ عمیر آفندی نے اسے فری ہینڈ دے دیا تھا۔ اتنا عقلمند تو وہ بھی تھا کہ سمجھ سکے کہ جب کوٹھے والیوں سے معاملات طے کرنے ہوں تو رقم سب سے پہلے تیار رکھنی پڑتی ہے۔

''آپ کے کاروبار کا معاملہ ہے تو میں ابھی بے بی کو سمجھا بجھا کر... راضی کرتی ہوں۔ آپ کا نقصان تو ہم کسی صورت گوارا نہیں کر سکتے۔'' اس ادھیڑ عمر نائکہ سے وقت نے حسن کی دولت کو یکسر چھین لیا تھا لیکن اداؤں سے کام لینا وہ اب بھی نہیں بھولی تھی۔ کھڑے ہونے کے بعد اس نے زوردار تالی بجائی اور اس کا ردِعمل سامنے آنے پر بری طرح دھاڑی۔

''شاہدے او شاہدے، کدھر مر گیا ہے تو؟'' اس کی دھاڑ پر سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا یوں سست قدموں سے اندر داخل ہوا جیسے بادلِ ناخواستہ آنا پڑا ہو۔

''صاحب کو اوپر کمرے میں پہنچا دو اور ہاں، ان سے نذرانہ لینا مت بھولنا۔'' بائی نے سخت لہجے میں لڑکے کو احکامات دیے اور خود ہال سے نکل گئی۔

''آئیے صاحب۔'' لڑکے کے الفاظ مہذبانہ لیکن لہجہ کاٹ دار تھا۔ جگو نے اس کے لہجے کی پروا نہیں کی اور دزدیدہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ دبلا پتلا، بڑی بڑی آنکھوں اور سانولی رنگت والا وہ لڑکا سولہ سترہ سال کا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کی تلاش میں اس کوٹھے تک آیا ہے۔ اسے براہِ راست لڑکے کو چھیڑنا مناسب معلوم نہیں ہوا اور اس نے فیصلہ کیا کہ اسی طریقۂ کار پر عمل کرے گا جو پہلے سے سوچ کر آیا ہے۔ تیکھے چتونوں والی، منجھی ہوئی اداؤں سے بھرپور رقاصاؤں کے مقابلے میں اس نے شب بسری کے لیے چاندنی کا انتخاب بھی اسی لیے کیا تھا کہ وہ اس ماحول میں نوآموز اور کچھ ان فٹ محسوس ہوئی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق منجھی ہوئی طوائفوں کے مقابلے میں وہ اس کم سن لڑکی سے زیادہ آسانی سے اپنی مطلوبہ معلومات حاصل کر سکتا تھا۔

''لائیے نذرانہ عطا فرمائیے۔'' اسے خواب گاہ کے انداز میں سجائے گئے ایک کمرے میں پہنچا کر لڑکے نے چبا چبا کر الفاظ ادا کرتے ہوئے مطالبہ کیا۔ جواب میں جگو نے بنا کچھ کہے اس کے ہاتھوں میں نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی تھما دی۔ یہ اچھی خاصی بھاری رقم تھی۔ چندا بائی نے اس سے چاندنی کی کوئی قیمت طے نہیں کی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ جب تک وہ اس کے مطلب کی رقم ادا نہیں کرے گا، وہ چاندنی کو اس کمرے تک ہرگز نہیں پہنچائے گی اس لیے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود ہی اتنی رقم دے دی کہ اس کے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ اس سے نوٹوں کی موٹی گڈی وصول کرنے کے بعد لڑکے نے اسے لحہ بھر کے لیے کینہ توز نظروں سے گھورا اور پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر باہر نکل گیا۔ اب جگو کمرے میں تنہا تھا اور اسے چاندنی کا انتظار کرنا تھا۔ پانچ چھ منٹ میں اس کا یہ انتظار ختم ہوا اور گھنگھروؤں کی چھن چھن کے ساتھ وہ اسی سفید لباس میں نمودار ہوئی جس میں اس نے محفل میں جلوہ دکھایا تھا۔ تھم تھم کر آگے بڑھتے اس کے قدموں نے جگو کو احساس دلایا کہ اس کے انداز میں

جو جھجک اور ہچکچاہٹ اس نے محفل میں محسوس کی تھی، وہ اب بھی برقرار ہے۔

''آداب۔'' اس کے تجزیوں سے بے خبر چاندنی نے دھیمے لہجے میں ماتھے تک ہاتھ لے جاتے ہوئے کہا۔

''تشریف لایئے۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ طبیعت کی خرابی کے باوجود آپ میری خواہش کے احترام میں یہاں تک چلی آئیں۔'' جگو نے بڑی تہذیب سے اس کا استقبال کیا۔ اس لب و لہجے اور انداز کو برقرار رکھنے کے لیے اسے بڑی محنت سے کام لینا پڑ رہا تھا کیونکہ جو زندگی وہ گزار رہا تھا، اس میں تو الگ ہی زبان میں گفتگو ہوتی تھی۔

''شکریے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی جیب میں اتنی طاقت تھی کہ میں بستر مرگ پر بھی ہوتی تو آپ کے سامنے حاضر ہو جاتی۔'' اس کی دھیمی اور سریلی آواز میں حالات کی تلخی کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

''آپ تو ناراض معلوم ہوتی ہیں لیکن اطمینان رکھیے آپ کو مجھ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔'' اس کی تلخی کو محسوس کرنے کے باوجود جگو نے نرمی سے کہا، جواب میں اس نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس سے قبل کہ جگو اسے مزید کسی قسم کی یقین دہانی کرواتا، دروازے پر دستک کی آواز ابھری۔ وہ سج سج کر چلتی دروازے تک پہنچی اور دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھولا۔ اس کے باوجود جگو باہر اس لڑکے کی جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو گیا جسے چندا بائی نے شاہدے کہہ کر پکارا تھا۔

''تو کیوں یہاں آیا ہے؟'' چاندنی نے دبی آواز میں اس سے پوچھا۔

''بائی جی نے یہ تیرے کمرے میں پہنچانے کو کہا تھا۔'' جگو کے تیز کانوں نے شاہدے کی دھیمی لیکن تلخ آواز سنی۔

''وہ کمینی جان بوجھ کر ایسا کرتی ہے۔ لا یہ مجھے دے اور خود کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ جا ورنہ وہ تجھے ایسے ہی تنگ کرتی رہے گی۔'' چاندنی نے بڑبڑاتے ہوئے غصے سے کہا اور ہاتھ بڑھا کر شاہدے کی لائی ہوئی سوغات وصول کر لی۔ جگو نے دیکھا کہ وہ امپورٹڈ شراب کی بوتل ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ چاندنی کی ایک رات کے بدلے اس نے چندا بائی کو جو موٹی رقم بھجوائی تھی اس کے بعد وہ اس خاطر مدارات کا حق دار تھا۔

''معافی چاہتی ہوں، ہمارے یہاں آئے ہوئے مہمانوں کو اس طرح ڈسٹرب کرنے کا رواج تو نہیں ہے لیکن پتا نہیں کیوں بائی جی اکثر میرے ساتھ ایسی بھول کر جاتی ہیں۔'' وہ دروازہ بند کر کے واپس پلٹی اور ایک تپائی پر جہاں پہلے ہی بلوریں جام رکھے ہوئے تھے، بوتل دھرتے ہوئے بولی۔

''کوئی بات نہیں، مجھے برا نہیں لگا لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اور بائی جی کے درمیان کچھ جھگڑا چل رہا ہے۔'' جگو نے ہوشیاری سے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی۔

''ہمارا جھگڑا تو ہمیشہ چلتا ہے۔ میں گھر سے سوچ کر نکلی تھی کہ فلمی ہیروئن بنوں گی لیکن پھنس گئی اس بائی کے چکر میں۔ اس نے عزت دار گھرانے کی لڑکی کو طوائف بنا ڈالا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اپنی بے بسی کے ساتھ اس سے نفرت بھی نہ کروں تو کیا کروں؟'' اس کی مختصر سی وضاحت میں اس کی پوری کہانی سامنے آ گئی تھی۔ وہی لڑکیوں کا اسکرین پر ناچتی تھرکتی پریوں کو دیکھ کر ان جیسا بن جانے کی خواہش میں ماں باپ کے گھر کی محفوظ و مامون چار دیواری کو چھوڑ کر آدمی نظر آنے والے درندوں کے چنگل میں پہنچ جانا اور اندھی خواہش کی تکمیل کے بجائے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھنا۔ چاندنی کی کہانی میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جو وہ اس سے تفصیلات جاننے کی خواہش کرتا۔ اگر کچھ نیا محسوس ہوا تو اس کا اور شاہدے کا تعلق۔ اس نے شاہدے کی نظروں میں اپنے لیے نفرت بھی دیکھی تھی اور کچھ دیر قبل دروازے پر ہونے والی ان دونوں کی گفتگو بھی سنی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی خاص تعلق ہے۔

''تمہاری کہانی جان کر افسوس ہوا لیکن سچ یہ ہے کہ ماں باپ کی عزت کی پروا کیے بغیر گھر کی دہلیز پار کر جانے والیوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم تو پھر بھی خوش قسمت ہو کہ یہاں اس ماحول میں تمہیں شاہدے جیسا ہمدرد ملا ہوا ہے جو تمہارے لیے کچھ نہ بھی کر سکے لیکن تمہارے ساتھ تمہارا غم تو بانٹتا ہی ہے۔'' اپنے قائم کیے ہوئے اندازے کی بنیاد پر کہی جانے والی بات کا ردعمل اس نے چاندنی پر پوری طرح محسوس کیا۔ وہ جو جام تیار کرنے کے لیے روم کے ریفریجریٹر سے ٹھنڈا پانی اور آئس کیوب نکال رہی تھی، چونک کر اس کی طرف پلٹی۔

''آپ کو کیسے معلوم کہ یہاں شاہد میرا ہمدرد ہے؟''

''یہ سمجھنے کے لیے کسی خاص محنت کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کی نظروں میں اپنے لیے نفرت دیکھی تھی اور ظاہر ہے وہ اس لیے تھی کہ میں تمہارا کسٹمر ہوں۔'' اس نے بغیر لاگ لپیٹ کے اپنا تجزیہ پیش کیا۔

''آپ نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' وہ ریفریجریٹر کے پاس سے ہٹ کر تپائی تک آ گئی اور مہارت سے جام تیار کرنے لگی۔ کوٹھے پر ملنے والی تربیت میں یقیناً اسے یہ کام بھی سکھایا گیا تھا۔

''میری طرح شاہد بھی اس کوٹھے کی پیداوار نہیں ہے۔ اسے اور اس کی بڑی بہن کو چند غنڈوں نے بچپن میں اغوا کر کے بائی جی کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ بائی نے اس کی بہن کو طوائف بنا ڈالا اور اسے کوٹھے کا خدمت گار۔ یہ طبلہ وغیرہ اچھا بجا لیتا ہے لیکن ہے تھوڑا اڑیل۔ کبھی بجانے پر راضی نہ ہو تو بائی جی بھی اس کو رام نہیں کر پاتی۔ جب سے اس کی بہن مری ہے، اس نے طبلے کو ہاتھ لگانا بالکل چھوڑ دیا ہے اور بس اوپر کے کام کر دیتا ہے۔'' اسے جام پیش کر کے وہ اپنی رو میں بولتی چلی گئی جسے سن کر جگو کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس لڑکی کا انتخاب کرتے ہوئے اس نے خود بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ اس کے لیے اس حد تک کارآمد ثابت ہو گی۔ بس ایک اندازہ تھا کہ وہ اس ماحول کی پیداوار نہیں ہے اور کہیں باہر سے لائی گئی ہے اس لیے اس سے کچھ اگلوانا آسان ثابت ہو گا۔

''اس کی بہن وہی ہے نا جو پیر آباد کے چودھری افتخار عالم شاہ کی حویلی میں مری تھی؟'' اس نے اچانک ہی سوال داغا جس پر چاندنی نے بے اختیار ہی اثبات میں سر ہلا دیا پھر گھبرا کر خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''تم کون ہو اور یہ سب کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مجھے تم ایک ہمدرد سمجھ لو۔ میں جانتا ہوں کہ چودھری کی حویلی میں شاہد کی بہن حادثاتی موت نہیں مری تھی بلکہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ قتل کرنے والا بااختیار اور دولت مند تھا اس لیے اس نے چندا بائی کا منہ نوٹوں سے بھر کر اسے خاموش کروا دیا لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا شاہد بھی اس قتل پر خاموش رہے گا؟ کیا اس کے دل میں خواہش نہیں ہے کہ اپنی بہن کے قاتل کو اس کے کیے کی سزا دلوائے؟''

''وہ اپنی بہن کی موت پر بہت دکھی ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ قاتل انجام کو پہنچے لیکن ایک طاقت ور اور بااختیار وڈیرے کے مقابلے میں اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ اس کوٹھے پر پلا بڑھا ہے اور یہاں سے باہر کی دنیا کو بہت کم جانتا ہے۔ تھانے کچہری تک اس بے چارے کی پہنچ ہی کہاں ہے جو انصاف حاصل کرنے کے لیے کچھ کر سکے .... اگر فرض کریں کہ وہ وہاں تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے لیے گواہی کون دے گا؟ یہاں سب چندا بائی سے ڈرتے ہیں اور اس کے ڈر سے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔'' چاندنی نے اسے ان حقائق سے آگاہ کیا جس سے وہ بہ خوبی واقف تھا۔

''کیا تم بھی شاہد کی خاطر گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہو گی؟ وہ تمہیں اتنا ٹوٹ کر چاہتا ہے کہ تمہارے لیے آنے والے گاہکوں سے نفرت محسوس کرتا ہے۔ جواب میں تم اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی ہو کیا؟'' جگو نے اس سے ذرا کاٹ دار لہجے میں سوال کیا۔

''میں ایسا کر کے خود کہاں جاؤں گی؟ میرے پاس بھی تو اس کوٹھے کے سوا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

''اور اگر ہم تمہیں وہ ٹھکانا فراہم کر دیں پھر؟''

''ہم... یعنی کہ آپ کے ساتھ اور لوگ بھی شامل ہیں؟'' وہ اس کی بات سن کر چونکی۔

''ہاں بلکہ سمجھو کہ اس کے پیچھے اصل لوگ کوئی اور ہیں، میں تو صرف ان کے لیے کام کر رہا ہوں۔'' جگو نے اعتراف کرنے میں حرج نہ سمجھا۔

''کیا وہ چودھری کے مخالف وڈیرے ہیں؟'' اس نے اندازہ لگایا۔

''نہیں، وہ قانون کے محافظ ہیں اور تمہیں اور شاہد کو تحفظ دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔''

''اف میرے اللہ! آپ کیا باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ قانون کب چودھری جیسے لوگوں کے خلاف کارروائی کرتا ہے؟'' وہ بے یقینی کا شکار ہوئی۔

''ہر جگہ کچھ اچھے اور ایمان دار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ میں تمہیں اور شاہد کو ایسے ہی لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔'' جگو نے اسے سمجھایا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس کیس میں تمہاری مدد حاصل کرنے کے علاوہ وہ لوگ تم دونوں کے مستقبل کے لیے بھی کوئی اچھا انتظام کر دیں گے۔ کیا تمہیں اچھا نہیں لگے گا کہ تم دونوں اس کوٹھے سے دور کسی پُرسکون گھر میں ساتھ رہو؟''

''آپ تو حسین خواب دکھا رہے ہیں۔ مجھ سے زیادہ شاہد ان باتوں کو سن کر خوش ہو گا۔ اس کی دلی تمنا ہے کہ کسی طرح یہاں سے نکل سکے۔ مینا کے مرنے کے بعد تو وہ مجھ سے مسلسل اسی خواہش کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ کہتا ہے بہن کے بعد تمہیں نہیں کھونا چاہتا لیکن یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا نا۔ ابھی تو وہ خاصا کم عمر ہے۔ آپ کو معلوم ہے، وہ عمر میں مجھ سے ایک دو سال چھوٹا ہی ہے لیکن بس یہ اندھی

محبت ہے جو اس فرق کو نہیں دیکھتی۔ یہاں کوٹھے پر سب جانتے ہیں کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اسی لیے کمبخت چندابائی اسے اذیت دینے کے لیے خاص طور پر میرے کسٹمرز کی خدمت سونپ دیتی ہے۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں اسے بتاتی چلی گئی۔

''بس تو تھوڑی سی ہمت کرو اور کل دوپہر میں تم دونوں کسی بہانے سے یہاں سے نکل کر محلے کے بعد پڑنے والے پہلے چوک تک پہنچ جاؤ۔ میں گاڑی لے کر وہاں تم دونوں کا انتظار کروں گا۔'' لوہا گرم دیکھ کر جگو نے فوراً چوٹ لگائی۔

''نہیں، چوک پر نہیں۔ وہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں محلے کا کوئی بھی فرد ہمیں آپ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ میں ایسا کروں گی کہ کل شاہد کے ساتھ خریداری کے بہانے مارکیٹ آجاؤں گی۔ آپ ٹھیک چار بجے بو چاٹ والے کے اسٹال پر ہمارا انتظار کیجیے گا۔ اور ہاں، مجھے اپنا موبائل نمبر بھی دے دیں اگر کسی وجہ سے کل ہم وہاں نہ پہنچ سکے تو میں آپ کو اطلاع دے دوں گی۔'' چاندنی نے کہا تو جگو نے ایک بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے اپنا موبائل نمبر نوٹ کروادیا۔ وہ خوش تھا کہ عمیر آفندی نے اسے جو کام سونپا تھا، اسے خوش اسلوبی سے انجام دینے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

☆☆☆

''تم نے جن لوگوں کے نام پتے مجھے لکھوائے تھے ان میں سے کوئی ایک بھی منظر پر موجود نہیں ہے۔ کوئی دوستوں کے ساتھ شکار پر گیا ہوا ہے، کوئی بیرونِ ملک طبی معائنے کے لیے اور کوئی کسی عزیز کی شادی میں شرکت کے لیے... کسی کی گاؤں میں بیٹھی ماں سخت بیمار ہوگئی ہے تو کسی کی بیوہ بہن کو بھائی کی اشد ضرورت ہے۔ کچھ کے گھر والوں نے مکمل لاعلمی ظاہر کی ہے کہ وہ نہیں جانتے ہمارا مطلوبہ شخص کہاں ہے۔ جن کے بارے میں بتایا گیا ہے، ان کا بھی کوئی سراغ نہیں ملا۔ ان حالات میں تمہاری مہیا کردہ فہرست تو بالکل بیکار ہوگئی ہے۔'' جاوید علی عالیہ کے روبرو بیٹھا اپنی جھنجلاہٹ کا اظہار کررہا تھا۔

''لیکن اس سے یہ تو تصدیق ہوجاتی ہے نا کہ میں نے تمہیں جو نام، پتے دیے تھے وہ کتنے اہم تھے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پراسرار طور پر غائب ہوجانے کی وجہ سے اُن لوگوں کو انڈرگراؤنڈ کردیا گیا ہوگا اس لیے کہ انہیں ڈر ہوگا کہ میں کسی کے ہتھے لگ چکی ہوں اور ذرا سے تشدد سے اور زور زبردستی کے نتیجے میں سب اگل سکتی ہوں۔'' عالیہ نے بڑا مدلل جواب دیا۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میں دوبارہ ان کے منظر پر آنے کا انتظار نہیں کرسکتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں فوری طور پر ان ملک دشمنوں کو نیست و نابود کردوں۔'' اسے معلوم تھا کہ کسی کے لیے بھی ساری زندگی انڈرگراؤنڈ ہو کر رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ بس دھول بیٹھنے کا انتظار کرتے ہیں اور پھر دوبارہ منظر پر آجاتے ہیں۔ عالیہ کی فراہم کردہ فہرست میں تو کئی نام ایسے تھے جن کا شمار معززین میں ہوتا تھا۔ ایسے لوگ بھلا کب تک چھپ کر بیٹھتے۔ انہیں ایک دن سامنے تو آنا ہی تھا لیکن اس کے بھڑکتے جذبات اس انتظار کے متحمل نہیں تھے۔

''اس سلسلے میں میرے پاس ایک کلیو ہے۔ معلوم نہیں کام آتا بھی ہے یا نہیں لیکن پھر بھی ایک شخص اشفاق رانا کے بارے میں مجھے اندازہ ہے کہ وہ کہاں ہوسکتا ہے۔ اس کا ٹھکانا اتفاق سے میری نظروں میں آگیا تھا۔ میری ایک دوست صبا ہے جو میری ہی طرح تنہا ایک اپارٹمنٹ میں رہتی ہے۔ وہ ایک پرائیویٹ فرم میں پرسنل سیکریٹری کی جاب کرتی ہے اور شام ڈھلے ہی وہاں سے واپس آتی ہے۔ کبھی کبھی نہیں بھی آپاتی۔ میری مصروفیت بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی اس لیے ہم کم کم ہی ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے اکٹھے ہوپاتے تھے۔ ایک دن صبا فارغ تھی تو اس نے مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں انوائٹ کرلیا اور یہ اتفاق تھا کہ میں نے اس کے سامنے والے اپارٹمنٹ سے اشفاق رانا کو ایک خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی کے ساتھ نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ صبا سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ لڑکی ایک ائرہوسٹس ہے اور وہاں تنہا رہتی ہے لیکن اشفاق رانا کا وہاں کثرت سے آنا جانا ہے۔ اکثر رات کے اوقات میں بھی وہ وہاں ٹھہرتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس نے ائرہوسٹس سے خفیہ شادی کررکھی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اگر وہ شہر سے باہر نہیں نکلا ہے تو پھر اسی ائر ہوسٹس کے اپارٹمنٹ میں ٹھہرا ہوگا کیونکہ اس کی دانست میں اس کے اس ٹھکانے سے کوئی واقف نہیں ہے۔''

''یہ تو تم نے بڑے کام کی بات بتائی ہے۔ اشفاق رانا اگر وہاں نہیں چھپا ہوا، تب بھی اس کی چہیتی کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں ہے۔ ہم اس سے اگلوالیں گے۔'' عالیہ کی فراہم کردہ معلومات پر وہ کھل اٹھا اور اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانے کے لیے اس سے سوالات کرکے مزید معلومات حاصل کرنے لگا۔ کام کی تمام باتیں معلوم کرلینے کے بعد اس نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر لائحہ عمل طے کیا اور ویژن سے اجازت طلب کرنے کے بعد وہ لوگ ضروری تیاریوں کے بعد اپنے ہدف کی طرف روانہ ہوگئے۔ ائرہوسٹس جس کا نام عالیہ نے شاہین بتایا تھا، اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچنے کے لیے انہوں نے سوئی گیس کمپنی کے نمائندوں کا بھیس اپنایا تھا۔ بلڈنگ کے چوکیدار کو انہوں نے یہی بتایا کہ فلیٹ C-30 سے ان کی کمپنی کو کمپلین موصول ہوئی ہے کہ اپارٹمنٹ میں کسی مقام سے گیس لیک ہورہی ہے اس لیے وہ کمپنی کی طرف سے چیک کرنے آئے ہیں کہ لیکیج کس جگہ سے ہورہی ہے۔ اس وضاحت کے بعد چوکیدار نے ان کے اندر جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ C-30 سیکنڈ فلور پر تھا۔ جاوید علی اور اس کا ساتھی لفٹ کے ذریعے سیکنڈ فلور پر پہنچ گئے۔ یہ اپارٹمنٹ پروجیکٹ اس طرح سے ڈیزائن کیا گیا تھا کہ ہر بلاک کے ایک فلور پر صرف دو ہی اپارٹمنٹ تھے۔ ان کے مطلوبہ اپارٹمنٹ C-30 کے مقابل موجود C-29 عالیہ کی دوست صبا کا تھا جو مبینہ طور پر اس وقت اپنی جاب پر گئی ہوئی تھی اس لیے انہیں اپنی کارروائی انجام دینے میں کسی ڈر اور جھجک کا سامنا نہیں تھا۔ C-30 کے سامنے پہنچ کر جاوید علی کے ساتھی نے ڈوربیل بجائی جس کا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا اور مجبوراً اسے دوسری دفعہ بیل بجانی پڑی۔ اس بار قدموں کی آہٹ سنائی دی پھر ایک نسوانی آواز نے غنودہ سی آواز میں دریافت کیا کہ دروازے پر کون ہے۔ وہ لوگ صبح سویرے نہیں پہنچے تھے لیکن آواز سے ظاہر تھا کہ اسے گہری نیند سے جگایا گیا ہے۔ اب یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ فلائٹ سے واپس آکر اپنی نیند پوری کررہی تھی یا پھر گزری شب کسی اور وجہ سے جاگنے کے باعث اس وقت سو رہی تھی۔

''میں نے ایسی کوئی کمپلین نہیں کروائی۔ میرے اپارٹمنٹ میں گیس کا کوئی پرابلم نہیں ہے۔'' ان کی طرف سے آمد کی وجہ بتائے جانے پر اس نے جواب دیا۔

''آپ معلوم کرلیں میڈم۔ ہوسکتا ہے گھر کے کسی اور فرد نے کمپلین لکھوائی ہو۔'' جاوید علی نے مہذبانہ لہجے میں اس سے درخواست کی۔

''یہاں میں اکیلی رہتی ہوں اس لیے کسی اور کے کمپلین کروانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ ان پیپرز پر سائن کردیں تاکہ ہمارے پاس ریکارڈ رہے کہ ہم کمپلین پر یہاں آئے تھے۔'' جاوید علی نے کسی ایسے ملازم کے لہجے میں ہی اس سے التجا کی جسے واپس جاکر اوپر والوں کو رپورٹ دینی ہو۔

''اوکے، میں کردیتی ہوں۔'' اس نے بیزار سے لہجے میں کہا اور ان کے تیز کانوں نے لاک ہٹائے جانے کی آواز سنی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ چوکنے ہوگئے۔

''عجیب ملک ہے جب کمپلین کرواؤ تو کوئی آتا نہیں اور اب بغیر کمپلین کے ہی سر پر آکھڑے ہوگئے ہیں۔'' اس نے بڑبڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھولا لیکن اگلے لمحے ہکا بکا رہ گئی جب وہ اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔ اس سے قبل کے وہ چیخنے کے لیے منہ کھولتی، جاوید علی نے اس کا منہ آہنی ہاتھ میں جکڑ کر بند کردیا۔ دوسری طرف اس کے ساتھی نے اس دوران میں دروازہ بند کردیا تھا۔ اب اگر باہر سے کوئی گزرتا بھی تو اسے سب کچھ معمول کے مطابق ہی محسوس ہوتا۔

''اندر چیک کرو۔'' جاوید علی نے اپنی جیکٹ کی جیب سے چوڑا ٹیپ نکال کر مہارت سے شاہین کے ہونٹوں پر چپکاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔ وہ تیزی سے اندر چلا گیا جبکہ جاوید علی نے اس جگہ کھڑے کھڑے بری طرح مچلتی شاہین کے دونوں ہاتھ پیچھے کرکے اس کی کلائیوں کو آپس میں ملا کر ان پر ٹیپ لپیٹ دیا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر کی طرف بڑھا۔ اچھے خاصے کشادہ لاؤنج میں کھلنے والے پہلے دروازے سے ہی اسے اپنے ساتھی کی آواز سنائی دی جسے سن کر اس کا دل اچھل پڑا۔ اس آواز کے سنائی دینے کا مطلب تھا کہ کمرے میں کوئی دوسرا شخص موجود ہے جسے وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کیے بغیر سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ شاہین سمیت اس کمرے میں داخل ہوکر جب اس نے بدن پر صرف ایک جانگیا پہنے کھڑے شخص کو دیکھا تو کھل اٹھا۔ اشفاق رانا ایک نامور وکیل تھا جو حقوقِ نسواں کے لیے کام کرنے والی ایک این جی او کے ساتھ منسلک تھا۔ جاوید علی نے ٹی وی اور اخبارات میں اس کے بیانات سنے اور پڑھے تھے۔ اس کی باتوں کو سن کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ عورتوں کی حمایت میں اس قدر بولنے والا شخص حقیقت میں کیا تھا۔ حقیقت تو وہ دیکھ رہے تھے کہ وہ عورتوں کا حمایتی ایک خوب صورت لڑکی کی خواب گاہ میں نیم برہنہ حالت میں کھڑا تھا اور یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ لڑکی اس کی خفیہ بیوی ہی تھی یا کوئی داشتہ۔ بہرحال وہ اس وقت تو اس بات پر خوش تھا کہ عالیہ کا دیا کلیو بیکار نہیں گیا تھا اور وہ لوگ اشفاق رانا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟ اگر روپیا اور زیور چاہتے ہو تو سب لے جاؤ لیکن ہم لوگوں کو کچھ مت کہنا۔'' اپنی محبوبہ کی حالت دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ ویسے گھبرا تو وہ پہلے ہی گیا تھا کہ ایک خوف

تاک پسٹل کی نال اس کی طرف اٹھی تھی اور اس نے یہی گمان کیا تھا کہ دن دہاڑے وہاں ڈاکو گھس آئے ہیں۔

"بکواس بند کرو۔ ہمیں یہاں سے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔ اپنی حرام کی دولت تم اپنی داشتاؤں کو خوش رکھنے کے لیے سنبھال کر رکھو، ہمیں اپنی خون پسینے کی کمائی کافی ہے۔" جاوید علی نے غرا کر کہا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ گھبرایا ہوا نظر آنے لگا۔ آنے والے ڈاکو ہوتے تو وہ دھن دولت دے کر بچ جاتا لیکن یہاں تو تیور بتا رہے تھے کہ یہ وہی ہیں جن سے بچ کر چھپنے کی تاکید کی گئی تھی اور اپنے تئیں وہ..... سب سے خفیہ ٹھکانے پر آگیا تھا جہاں وہ اپنی روپوشی کے ایام رنگینی سے گزار سکتا تھا لیکن معاملہ بہت جلد رنگین سے سنگین ہوگیا تھا۔

"تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو، میری سمجھ میں نہیں آرہا؟ میں ایک معزز آدمی ہوں اور اس شہر میں میری بہت عزت ہے۔"

"عزت دار آدمی اس طرح منہ چھپا کر عورتوں کی آغوش میں نہیں آبیٹھتے جیسے تو آبیٹھا ہے۔" جاوید علی نے نفرت سے کہتے ہوئے اس کے منہ پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔

"تمہیں میرے ساتھ یہ سلوک بہت مہنگا پڑے گا۔ میرا اس شہر میں بہت اثر رسوخ ہے۔ میری ایک پکار پر ساری وکیل برادری تمہارے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی۔" وہ تھپڑ کے زور سے ہل کر رہ گیا تھا۔ اس نے رخسار پر ہاتھ رکھ کر اسے دھمکی دی۔

"ہم تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نکلنے دیں گے تب نا! تمہاری وکیل برادری کو تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ جو عزت مآب اشفاق رانا صاحب ہوا کرتے تھے، انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔" وہ بھلا کہاں اس کی دھمکی سے مرعوب ہونے والا تھا۔ نہایت طنز سے جواب دیا اور آگے بڑھ کر نہایت آسانی سے ..... بڑی بڑی باتیں بنانے والے طرم خان کو قابو کر کے اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔ محترمہ شاہین تو پہلے ہی اپنی پرواز بھول کر ایک طرف سہمی کھڑی تھیں۔ جاوید کے ساتھی فیصل نے اشفاق رانا کو مناسب طریقے سے بٹھانے میں اس کی مدد کی۔ اب اشفاق رانا کے صرف منہ پر ٹیپ نہیں چپکا ہوا تھا بلکہ ہاتھ پاؤں بھی اسی ٹیپ میں لپٹ کر بے بس ہوگئے تھے۔ وہ صرف ایک عدد جانگیا میں فرش پر اکڑوں بیٹھا بڑا عجیب لگ رہا تھا۔

"ایسا کرو کہ ان خاتون کے بھی پاؤں باندھ کر انہیں دوسرے کمرے میں پہنچا دو کیونکہ اب اس کمرے میں جو کچھ ہوگا، یہ شاید اسے برداشت نہ کرسکیں۔" اس نے سرد لہجے میں فیصل کو حکم دیا جس نے فوراً ہی خوف سے پھٹ جانے والی آنکھوں کے ساتھ مہین سے شب خوابی کے لباس میں صاف دکھتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں کی تفسیر بنی شاہین کو دوسرے کمرے میں منتقل کردیا۔ اس کام کو انجام دیتے ہوئے اس نے پورا خیال رکھا تھا کہ وہ کسی طور اس قابل نہ رہے کہ باہر سے کسی کو مدد کے لیے بلا سکے۔ باہر سے کسی سُن گن لینے کا اس لیے سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کہ فلور پر موجود واحد فلیٹ میں کوئی موجود نہیں تھا اور کھڑکیوں پر دبیز پردے پڑے تھے جن کی وجہ سے کسی کے دور سے بھی کچھ دیکھ لینے کا امکان نہیں تھا۔ اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ واپس خواب گاہ میں آیا تو جاوید علی اپنی کارروائی شروع کرچکا تھا۔ اس کی جارحیت کے باعث تڑپتا، لوٹ پوٹ ہوتا اشفاق رانا بے بسی کی تصویر نظر آرہا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں لیکن منہ پر ٹیپ لگا ہونے کی وجہ سے وہ چیخ چلا نہیں سکتا تھا۔

"بتاؤ وہ کون لوگ ہیں جنہیں تم معصوم لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر پیش کرتے ہو اور وہ لڑکیاں ساری زندگی کے لیے اپنی اصل شخصیت کو کھو کر ذلت بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہوجاتی ہیں؟" اس کے قہرناک لہجے میں کیے گئے سوال کے جواب میں اشفاق رانا نے سر کو دائیں بائیں اس طرح جنبش دی جیسے خود پر لگائے جانے والی فردِ جرم سے انکار کررہا ہو۔

"تمہارے پاس جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے رانا۔ تمہیں صرف سچ بولنا ہے کیونکہ دیا مساج سینٹر میں کام کرنے والی تمہاری آلۂ کار عالیہ ہمارے قبضے میں ہے اور ہم اس سے بہت کچھ اگلوا چکے ہیں۔" اس نے اس انداز میں اشفاق رانا کو یہ حقیقت بتائی جیسے عالیہ سے حقائق معلوم کرنے کے لیے انہیں اس پر خاصا تشدد کرنا پڑا ہو۔ اپنے الفاظ کا ردِعمل اس نے اشفاق رانا کے چہرے پر دیکھا جو زرد پڑ گیا تھا۔

"اچھی طرح سوچ لو رانا۔ ہم نے عالیہ کو عورت ہونے کی رعایت نہیں دی تو تم جیسے سانڈ کو کیسے معاف کرسکتے ہیں۔" اشفاق رانا کو دباؤ میں آتا محسوس کر کے اس نے مزید سنگین لہجے میں اسے دھمکایا۔ جواب میں اس نے سر کو یوں جنبش دی جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ جاوید نے فیصل کو اشارہ کیا کہ وہ اس کے منہ پر سے ٹیپ ہٹا دے۔

"تم نے عالیہ کے ساتھ کیا کیا؟" ٹیپ ہٹتے ہی اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

"اسے پار لگا دیا۔" جاوید علی نے سفاک انداز میں جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟ جب اس نے تمہیں ساری معلومات فراہم کردی تھیں تو پھر تم نے اسے کیوں مارا؟ میرے ساتھ بھی تم ایسا ہی کرو گے؟" اس کے لہجے میں احتجاج، خوف اور عجب سب تھا۔

"اس نے بتانے میں بہت دیر لگائی تھی۔ اس دوران اس کے جسم پر اتنے زخم لگ چکے تھے کہ وہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مرگئی۔" اس نے بے نیازی سے اس کے سوال کا جواب دیا اور پھر لہجے کو مزید خوف ناک بناتے ہوئے بولا۔ "اگر تم نے بھی دیر کی تو تمہاری جان بھی اسی طرح جاسکتی ہے۔"

"نہیں پلیز، میں تمہیں بتاتا ہوں۔" اشفاق رانا کی پہلے ہی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی ہوچکی تھی۔ عالیہ کا انجام سن کر وہ مزید ڈھیلا پڑ گیا۔ اپنی کیٹیگری سے تعلق رکھنے والے دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی فطرتاً بزدل تھا اس لیے ایک حد تک ہی دباؤ برداشت کرسکا اور فرفر بولنا شروع ہوگیا۔

"مجھے اس کام کے لیے پامیلا نامی ایک عورت نے راضی کیا تھا۔ لگ بھگ پندرہ سال قبل وہ مجھے ایک پارٹی میں ملی تھی۔ اس پارٹی میں وہ کسی سرکاری افسر کے ساتھ بطور پرسنل سیکریٹری شریک ہوئی تھی۔ وہاں سب اسے مس پامیلا کہہ کر پکار رہے تھے لیکن بعد میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وہ کوئی کنواری لڑکی نہیں بلکہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ بہرحال پارٹی میں تو ہماری بس ایک خوش گوار ملاقات ہی ہوئی تھی اور ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ فون نمبرز کے تبادلے کرلیے تھے۔ کچھ دن بعد پامیلا نے خود مجھ سے رابطہ کر کے کہیں ملاقات کرنے کی فرمائش کی۔ اس ملاقات میں وہ پہلے تو ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس نے میری سماجی خدمات کو سراہا اور پھر نہایت خوب صورتی سے گفتگو کو اس ڈھب پر لے آئی کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ اسے سب معلوم تھا کہ میری این جی او کو کہاں سے فنڈز ملتے ہیں اور میں کس کے کہنے پر زیادہ تر ایسے کیسز پر کام کرتا ہوں جن کی مدد سے پاکستان کا نام بدنام کیا جاسکے۔ میں اس کام میں ماہر تھا کہ کیسے عورت کے ساتھ ہونے والی چھوٹی سی زیادتی کو بہت بڑا ایشو بنا کر دنیا کے سامنے پیش کروں۔ میرے میڈیا میں بھی گہرے روابط تھے جن کی کوشش ہی یہ ہوتی ہے کہ کہیں سے کوئی چٹ پٹی خبر مل جائے جس کی بنیاد پر وہ اپنے ناظرین کو متوجہ کرسکیں۔ پامیلا نے مجھ سے کہا کہ اپنا یہ دھندا جاری رکھوں اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ساتھ ہی اس نے ایک بڑی رقم کے عوض مجھ سے ایسی لڑکیاں فراہم کرنے کی فرمائش بھی کی جن کا آگے پیچھے کوئی پوچھنے والا نہ ہو اور وہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق چلا سکے۔ بس اس دن کے بعد سے میں اس کا بزنس پارٹنر بن گیا۔ وہ میرے اکاؤنٹ میں بڑی بڑی رقوم ٹرانسفر کرتی رہی اور میں اس کی فرمائش کے مطابق لڑکیاں فراہم کرتا رہا۔ عالیہ بھی انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔" وہ سر جھکائے ساری تفصیل سناتا چلا گیا۔

جاوید علی کا دل چاہا کہ کسی دیوار سے ٹکرا کر اس کا سر توڑ دے لیکن خود پر ضبط کر گیا کہ ابھی اسے اس سے مزید معلومات حاصل کرنی تھیں۔

"پامیلا ہمیں کہاں مل سکتی ہے؟" اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جب تک وہ جوان تھی ہم ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے لیکن پھر میرے لیے اس کی کشش ختم ہوگئی۔ اصل میں جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، تب بھی وہ کوئی ایسی جوان نہیں تھی۔ پینتیس سے تو اوپر ہی کی ہوگی لیکن اس نے خود کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا لیکن ظاہر ہے عمر کب تک چھپتی ہے۔ پتا چلنے لگا کہ وہ کوئی جوان لڑکی نہیں بلکہ ڈھلتی عمر کی عورت ہے۔ اس نے خود بھی پارٹیز میں شرکت کرنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ میرے پاس اس کا کوئی پتا ٹھکانا نہیں تھا اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی اس لیے میں تمہیں بھی نہیں بتا سکتا۔"

"جھوٹ بولتا ہے الو کی دم۔" اس کے ایک ایک لفظ کو غور سے سنتا اور پرکھتا جاوید علی آخری جملوں کو سن کر طیش میں آیا اور اس کے منہ پر زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔ تھپڑ کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ اس کا گال اندر سے پھٹ گیا اور ساتھ ہی ایک دانت بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے بے ساختہ ایک زوردار چیخ مارنی چاہی لیکن قریب ہی کھڑے فیصل نے اس کا منہ زور سے دبوچ کر اس کی چیخ کا گلا گھونٹ دیا۔

"اگر تجھے اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں ہے تو پھر تو لڑکیاں پھانسنے کے بعد انہیں سپلائی کیسے کرتا ہے؟" جاوید علی کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک تھپڑ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنا بھاری بوٹ والا پیر اس کے بندھے ہوئے پیروں کے یکجا پنجوں پر اس طرح رکھ دیا کہ پورا وزن ڈال دیا اور اس کے کھڑے پنجے بری طرح مڑ گئے اور وہ یوں تڑپ اٹھا جیسے کوئی ہڈی چٹخ گئی ہو لیکن اس بار بھی اس کی چیخ کو منہ سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں دیا گیا۔

”یاد رکھ رانا... اگر تو نے میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہیں دیا تو اسی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوگی۔“ اس نے وحشت بھرے انداز میں اس طرح دھمکی دی کہ رانا کی رہی سہی ہمت ختم ہوگئی اور وہ سر کو یوں حرکت دینے لگا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ جاوید علی نے ایک لمحے کو اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ پیلے پڑ جانے والے رخساروں کو تکلیف کی شدت سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں نے تر کر دیا تھا۔ وہ کہیں سے وہ شخص نہیں لگ رہا تھا جسے سوٹڈ بوٹڈ ٹی وی اسکرین پر بولتے دیکھ کر لوگ مسحور ہو جاتے تھے۔ اس نے فیصل کو اس کے منہ سے ہاتھ ہٹانے کا اشارہ کیا۔

”پ... پانی، مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔“ اس نے بھیک مانگنے والوں کی طرح عاجزی سے درخواست کی۔ اس کی درخواست پر جاوید علی خود آگے بڑھا اور بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیل کر اس کے قریب آیا۔ یہ صرف ایک گھونٹ پانی تھا جسے پی کر رانا کسی کتے کی طرح ہانپنے لگا اور نہایت لجاجت سے مزید پانی پلانے کی درخواست کی۔

”مزید پانی تمہیں اس وقت ملے گا جب تم مجھے پامیلا کے بارے میں معلومات فراہم کرو گے۔“ جاوید علی نے اٹل لہجے میں شرط عائد کی۔

”اس کا پتا واقعی مجھے نہیں معلوم ہے لیکن ایک فون نمبر ہے جس پر میں اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔ رابطہ ہونے پر وہ لڑکی کے بارے میں جو ہدایات دیتی ہے، میں ان پر عمل کرتا ہوں۔“

”فون نمبر بتاؤ۔“ جاوید علی نے سرد لہجے میں پوچھا۔

”وہ میرے موبائل میں پامیلا کے نام سے فیڈ ہے۔“ اس نے شرافت سے بتایا تو جاوید علی نے فیصل کو اشارہ کیا۔ رانا اور شاہین دونوں کے ہی موبائل فون اس کے قبضے میں تھے۔ فیصل نے فوراً رانا کا موبائل چیک کرنا شروع کر دیا۔

”اس میں پامیلا کے نام سے ون اور ٹو کر کے دو نمبر فیڈ ہیں۔“ فون کا ہک لاگ چیک کر کے فیصل نے فوراً ہی بتایا۔

”پامیلا ٹو والا نمبر اس کے استعمال میں ہے۔ پامیلا ون ایک پی ٹی سی ایل نمبر ہے جو کبھی اس میرج بیورو میں ہوتا تھا جس کی آڑ میں وہ اپنی لڑکیوں سے دھندا کرواتی تھی۔ بعد میں وہ میرج بیورو بند کر کے منظر سے بالکل غائب ہوگئی تھی۔“

”میرج بیورو کا پتا اور پامیلا کا حلیہ دونوں بتاؤ اور یہ بھی کہ اسے میرج بیورو بند کیے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟“ جاوید علی نے دریافت کیا۔

”میرا حلق خشک ہو رہا ہے، پہلے مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔“

”نہیں، پہلے میرے سوالوں کے جواب دو۔“ اس نے قطعی جواب دیا اور کرید کرید کر مزید تفصیلات معلوم کرنے لگا۔ رانا کو مجبوراً اس کے سوالوں کے جوابات دینے پڑے۔ جب جاوید علی کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے پاس بتانے کو کچھ نہیں رہا ہے تو اس نے سوالات کا سلسلہ روک دیا اور گلاس بھر کر پانی اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ بے تابی سے پورا پانی پی گیا۔

”امید ہے تمہاری پیاس بجھ گئی ہوگی۔ ہم اتنے بے رحم بھی نہیں کہ مرنے والے کی آخری خواہش بھی پوری نہ کریں۔“ سرد سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے کمرے کے دروازے کی طرف رخ کیا۔ رانا کے کچھ سمجھنے سے قبل فیصل نے اس کے ہونٹوں پر دوبارہ ٹیپ چپکا دیا اور اپنی جیب سے بے آواز پسٹل نکال کر اس کی کھوپڑی میں دو گولیاں اتار دیں۔ شیطانی دماغ رکھنے والا جو بہت بڑی بڑی باتیں کرتا تھا، نہایت خاموشی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ جاوید علی کو معلوم تھا کہ اس کے عقب میں کیا ہوا ہوگا اس لیے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ رانا جیسے غدار اور بدکردار لوگ اس کے لیے اتنے قابلِ نفرت تھے کہ وہ بلا ضرورت ان جیسوں کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔

”ہم تمہارے پیر کھول کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے جو کر سکتی ہو کر لینا۔“ اس کے حکم پر فیصل نے برابر والے کمرے میں بند شاہین کے پیروں کو آزاد کیا اور دروازہ بند کر کے جاوید علی کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ لفٹ میں پہنچ کر ان دونوں نے اپنے ہاتھوں میں موجود باریک دستانے اتار کر واپس جیبوں میں ٹھونسے اور گراؤنڈ فلور پر لفٹ پہنچنے پر اطمینان سے باہر نکل کر چوکیدار کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس گاڑی میں جا بیٹھے جس پر کسی کمپنی کا لوگو بڑا واضح بنا ہوا تھا۔ ان کے گاڑی میں بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی چلا دی۔ ساتھ ہی وہ تینوں اپنے حلیے میں تبدیلی لانے کے لیے استعمال کی جانے والی چیزیں ایک ایک کر کے خود سے الگ کرتے چلے گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ پیر آزاد ہونے کے باوجود شاہین کو اپنے اپارٹمنٹ سے باہر نکلنے اور کسی کو متوجہ کرنے میں اچھا خاصا وقت لگے گا۔

جب وہ اور بلڈنگ کا چوکیدار وہاں آنے والے افراد کے حلیے پولیس کو بتائیں گے تو انہیں ان حلیوں کے افراد پورے شہر میں کہیں نہیں ملیں گے۔

☆☆☆

"کیا بوریت ہے باس۔ ایسے پڑے پڑے تو ہم کو زنگ لگ جائے گا۔" سلو نے شہریار سے شکوہ کیا۔ شہر میں سیکیورٹی ہائی الرٹ ہونے کی وجہ سے کلام نے فی الحال کوئی بھی کارروائی کرنے سے منع کیا تھا اس لیے وہ تقریباً ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ کوئی مصروفیت تھی تو بس یہ کہ صبح جاگنگ کے لیے قریبی پارک تک چلے جاتے یا دن میں کسی وقت شہر کی تفریح گاہوں کا رخ کرتے کیونکہ مستقل ہوٹل کے کمرے میں ٹھہرے رہنا بھی انہیں انتظامیہ کی نظروں میں مشکوک بنا سکتا تھا۔ جاگنگ کرتے ہوئے دوبار کلام بھی ان سے آملا تھا۔ ان ملاقاتوں میں اس نے بتایا تھا کہ وہ ونود کی لاش کو کامیابی سے ٹھکانے لگانے میں کامیاب ہو گیا ہے اور بلڈنگ میں ابھی تک کسی کو اس کے غیاب پر تشویش نہیں ہے۔ اس کی وجہ اس کا طرزِ زندگی تھا۔ ایک تو وہ اکیلا رہتا تھا، دوسرے بنا کسی سے ذکر کیے اس طرح کچھ دنوں کے لیے غائب ہو جانا اس کا معمول تھا اس لیے کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا۔ دوسری طرف کلام پریم ناتھ پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے مطابق آج کل پریم ناتھ خود گھن چکر بنا ہوا تھا۔ راٹنے اس کے محکمے والوں کا جینا مشکل کیا ہوا تھا اور وہ تقریباً چوبیس گھنٹے ہی ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ اس کے گھر جانے کے اوقات مخصوص نہیں رہے تھے۔ ان حالات میں نائٹ کلبس اور ڈسکو میں جا کر تفریح کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اپنی یہ جھنجلاہٹ وہ اس طرح نکال رہا تھا کہ بے قصور شہریوں کو گرفتار کر کے تفتیش کے نام پر انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ ان بے قصور افراد کو چھوڑنے کے لیے ان کے گھر والوں سے بڑی رقوم بھی وصول کی جا رہی تھیں ۔۔۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ لوگ پولیس والوں کے سائے سے بھی بھڑکنے لگے تھے۔ کلام کی فراہم کردہ ان معلومات کی تصدیق نیوز چینلز بھی کر رہے تھے اور اب حالات اس نہج پر پہنچ گئے تھے کہ شہری پولیس کے رویے کے خلاف احتجاج کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ میڈیا ان کا ساتھ دے رہا تھا اور مبصرین صاف لفظوں میں اس اندھیر پر مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ حکام کو آڑے ہاتھوں لے رہے تھے۔ شہریار بہت غور سے اس ساری صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا اس لیے سلو کا شکوہ سن کر مسکرایا اور بولا۔

"ذرا سا صبر کرو شہزادے۔ اب جلد ہی یہ سارا بکھیڑا ختم ہو جائے گا اور ہم ہاتھ پیر چلانے کے لیے آزاد ہوں گے۔" اس کی یہ بات غلط ثابت نہیں ہوئی۔ دو دن بعد کلام نے انہیں اطلاع دی کہ حالات سازگار ہیں اور پریم ناتھ اپنے سابقہ معمول پر واپس لوٹ چکا ہے۔ انہوں نے پہلے ہی خاصا انتظار کر لیا تھا اس لیے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اسی رات کارروائی کا فیصلہ کر لیا۔ کلام کا آدمی ہنوز پریم ناتھ کی نگرانی کر رہا تھا اس لیے انہیں پلاننگ پر عمل کرنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی۔ کارروائی کے لیے انہوں نے ایک ایسی سڑک کا انتخاب کیا جہاں کلام کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق دن کے وقت بھی بہت کم گاڑیاں گزرتی تھیں اور رات میں تو مشکل سے ہی اکا دکا گاڑیوں کا گزر ہوتا تھا۔ اصل میں اس سڑک پر کچھ عرصہ قبل راہزنوں نے بڑی لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ وہ اچانک ہی اطراف کی جھاڑیوں سے نکل کر کسی گاڑی کو روک لیتے تھے اور گاڑی والوں کا سارا مال ہتھیا لیتے تھے۔ ایک آدھ بار وہ جوان عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور بعد میں ان عورتوں کی لاشیں ہی ملی تھیں۔ چنانچہ لوگوں نے ڈر کے مارے اس راستے پر سے گزرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ راہزنوں کے اس چالاک گروہ نے بھی یہ صورتِ حال دیکھ کر کہیں اور کا رخ کر لیا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں موجود خوف ہنوز باقی تھا چنانچہ رات کے وقت تو خصوصاً اس سڑک پر سفر کرنے سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ پریم ناتھ چونکہ پولیس والا تھا اور اپنے ساتھ ایک گن مین بھی رکھتا تھا اس لیے بلا خوف و خطر اس سڑک کا استعمال کرتا تھا کیونکہ اس سڑک کو چھوڑ کر متبادل راستہ اختیار کرنے کی صورت میں بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔

انہوں نے پریم ناتھ سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے اسی سڑک کا انتخاب کیا اور جب اس کے تعاقب میں آنے والے کلام نے انہیں اطلاع دی کہ وہ لوگ اس سڑک پر پہنچنے والے ہیں تو اپنا کام شروع کر دیا۔ ان دونوں کے پاس چوری کی دو عدد گاڑیاں تھیں ...... ان گاڑیوں کو انہوں نے اس انداز میں سڑک پر کھڑا کر دیا جیسے دونوں گاڑیاں کسی وجہ سے ایک دوسرے سے ٹکرا گئی ہوں۔ پھر خود آستینیں چڑھا کر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے۔ ظاہر ہے، پریم ناتھ کی گاڑی وہاں پہنچی تو اس نے دور سے ہی یہ سارا منظر دیکھ لیا۔ پولیس والا ہونے کی وجہ سے اس کے لیے اس منظر کو نظر انداز کر کے گزر جانا ممکن نہیں تھا اور بالفرض وہ گزرنا بھی چاہتا تو دونوں گاڑیاں سڑک پر اس انداز میں

کھڑی کی گئی تھیں کہ اس گاڑی کے لیے گزرنے کا راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس کی گاڑی عین ان دونوں کے سامنے آکر رک گئی۔

"اوئے، یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے تم دونوں نے؟" پریم ناتھ کا گن مین اپنی گن لہراتا ہوا گاڑی سے برآمد ہوا اور رعب سے انہیں ڈپٹتے ہوئے بولا۔ پریم ناتھ نے البتہ گاڑی سے نیچے اتر کر صورتِ حال کا جائزہ لینا اپنی افسرانہ شان کے خلاف سمجھا تھا۔

"دیکھیں، سر اس نے میری گاڑی کو سائڈ ماری ہے۔ میں اس سے نقصان بھرنے کو کہہ رہا ہوں تو یہ الٹا مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔" گن مین کی للکار سن کر پہلے تو وہ دونوں اس طرح چونک کر ایک دوسرے سے الگ ہوئے جیسے اب تک انہیں سڑک پر کسی دوسری گاڑی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوا۔ پھر شہریار نے لہجے میں مظلومیت بھرتے ہوئے اس سے شکایت کی۔

"یہ جھوٹ بولتا ہے۔ سالا نشے میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ جھونک میں میری گاڑی کو سائڈ مار بیٹھا۔ آپ قریب آکر دیکھیں، اس کے منہ سے شراب کی کتنی گندی بو آ رہی ہے۔ سالے ٹھرکی نے میری گاڑی کی ایسی تیسی کر دی۔ یہ دیکھیں کیا حشر ہو گیا ہے گاڑی کا۔" شہریار کے عاجزانہ لہجے کے مقابلے میں سلو کا لہجہ خاصا جارحانہ تھا اور وہ بہت غصے سے گن مین کو گویا اصل صورتِ حال سے آگاہ کر رہا تھا۔ دونوں کے بیانات سن کر تذبذب میں پڑ جانے والے گن مین نے خود گاڑیوں کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا اور چند قدم آگے بڑھ کر ذرا جھک کر دیکھنا چاہا کہ کون سی گاڑی کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔ سلو اور شہریار کو ایسے ہی کسی موقع کی تلاش تھی۔ سلو قیامت بن کر اس کے سر پر ٹوٹ پڑا جبکہ شہریار نے اپنی گن کا رخ گاڑی میں بیٹھے پریم ناتھ کی طرف کر دیا۔ اس سارے منظر کو کسی تماشے کی طرح دیکھتے پریم ناتھ کو اندازہ بھی نہیں تھا کہ صورتِ حال اس طرح پلٹ جائے گی۔ اس نے بے ساختہ ہی ڈیش بورڈ کا خانہ کھول کر اس میں سے اپنا ریوالور نکالنے کی کوشش کی لیکن فوراً ہی ایک گن کی نال اس کی کنپٹی سے آلگی۔ یہ کلام تھا جو اس کی گاڑی کا تعاقب کرتا رہا اور کچھ فاصلے پر گاڑی روک کر پیدل نہایت خاموشی سے یہاں تک پہنچ گیا تھا۔

"اب کوئی حرکت مت کرنا ورنہ بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔" اس نے غرا کر پریم ناتھ کو دھمکایا۔

"کون ہو تم لوگ؟" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"جلد جان جاؤ گے۔ ابھی تو گاڑی سے نیچے اترو۔" کلام نے سابقہ لہجے میں اسے جواب دیا جس پر وہ کسی مزاحمت کے بغیر گاڑی سے اتر آیا۔ مزاحمت کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اسے سامنے ہی اپنا گن مین سڑک پر چت لیٹا نظر آ رہا تھا اور وہ خود خالی ہاتھ تین مسلح افراد کے نرغے میں تھا۔

"اگر تم کوئی لٹیرے ہو تو تمہیں اپنی یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی۔ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور مجھے نقصان پہنچا کر تم بہت بڑی غلطی کرو گے۔" شاید اسے اچانک ہی وہ راہزن یاد آگئے تھے جن کی اس سڑک پر لوٹ مار کرنے کی کہانیاں عام تھیں اس لیے ذرا سا سنبھالا لے کر انہیں دھمکانے کی کوشش کی۔

"اپنا منہ بند رکھو۔ ہم نے تمہارا سب آگا پیچھا معلوم کر کے ہی تم پر ہاتھ ڈالا ہے۔" شہریار جو اس دوران ان کے نزدیک آچکا تھا، سخت لہجے میں بولا اور اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ دے مارا۔ پریم ناتھ کے لیے یہ صورتِ حال بڑی گمبھیر تھی۔ اسے بالکل سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح اسے گھیر لینے والے لوگ کون ہو سکتے ہیں۔ وہ کوئی اچھا ریکارڈ رکھنے والے پولیس افسر نہیں تھا۔ جہاں بھی رہا تھا، لوگوں پر ظلم و ستم ہی ڈھائے تھے جس کی حالیہ مثال بے گناہوں کو گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنانا اور ان کی رہائی کے بدلے ان کے اعزا سے خطیر رقوم وصول کرنا تھا۔

"آگے بڑھو۔" اسے گم صم کھڑا دیکھ کر شہریار نے گن سے ٹہوکا دیا۔ ان کا رخ کچھ فاصلے پر کھڑی کلام کی گاڑی کی طرف تھا۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر شہریار نے اپنی جیب سے کلوروفام میں ڈوبا رومال نکالا اور پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر پریم ناتھ کی ناک پر رکھ دیا۔ اس اچانک حملے پر وہ ذرا سا مچلا لیکن پھر ہاتھ پیر چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ زمین پر گرنے سے پہلے ہی شہریار نے اسے سنبھال لیا۔ اس دوران میں کلام تیزی سے آگے بڑھ کر گاڑی کی ڈکی کھول چکا تھا۔ ڈکی میں ویسا ہی ایک سوٹ کیس رکھا تھا جو چند دن قبل اس نے ونود کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ڈکی میں رکھے رکھے ہی اس نے سوٹ کیس کو کھولا اور تینوں نے مل کر پریم ناتھ کے بے ہوش وجود کو اس میں منتقل کر دیا۔ سوٹ کیس بند کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ مناسب مقدار میں آکسیجن اندر جاتی رہے۔ ڈکی بند کرنے کے بعد ان تینوں نے گاڑی میں اپنی اپنی جگہ سنبھال

لی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر کلام بیٹھا تھا جس نے گاڑی ریورس کر کے سڑک پر واپس موڑ لی۔ آگے ان کی دو گاڑیوں اور پریم ناتھ کی گاڑی نے مل کر سڑک بلاک کر دی تھی اس لیے اس سڑک پر آگے سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ گاڑیاں چوری کی ہونے کی وجہ سے انہیں ان کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ساری کارروائی کے دوران انہوں نے اپنے ہاتھوں پر ربر کے پتلے دستانے پہن رکھے تھے اس لیے یہ پریشانی بھی نہیں تھی کہ پولیس کو ان کے فنگر پرنٹس مل جائیں گے۔ وہ اپنا کوئی نشان چھوڑے بغیر بہت کامیابی سے پریم ناتھ کو اپنے ساتھ لے کر جا رہے تھے۔ ان کی منزل کلام کا وہ فلیٹ تھا جو اس نے اسی قسم کی کارروائی کے لیے ایک نئے پروجیکٹ میں لے رکھا تھا۔ پروجیکٹ نیا ہونے کی وجہ سے ابھی وہاں بہت کم فلیٹ آباد ہوئے تھے اور کلام کا فلیٹ تو تھا بھی ٹاپ فلور پر جہاں اس کے سوا ابھی تک کوئی دوسری فیملی نہیں آئی تھی۔ وہ خود بھی وہاں کبھی کبھی ہی جاتا تھا اور بلڈنگ کے چوکیدار کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص وہاں اس کا چہرہ شناس تھا۔ اب بھی وہ گاڑی لے کر وہاں پہنچا تو چوکیدار نے اسے پہچان کر گاڑی کو کھلے دروازے سے گزرنے کی اجازت دے دی۔ کلام نے گاڑی پارکنگ میں لے جا کر روکی اور پھر اس نے اور سلو نے مل کر سوٹ کیس ڈکی سے باہر نکالا۔ سوٹ کیس پریم ناتھ کے بے ہوش وجود کی وجہ سے بہت بھاری ہو رہا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اس میں وہیل لگے ہوئے تھے اس لیے اسے ڈکی سے نکالنے کے بعد انہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آئی اور اکیلا سلو ہی اسے دھکیلتا ہوا کلام کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ شہریار بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہاں اوپر جانے کے لیے لفٹ موجود تھی۔ وہ تینوں سوٹ کیس سمیت لفٹ میں سوار ہوئے اور ایک بٹن دباتے ہی لفٹ نے انہیں چند لمحوں میں ٹاپ فلور پر پہنچا دیا۔ یوں پریم ناتھ بغیر کسی ہنگامے اور شور شرابے کے کلام کے فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔

یہ لگژری فلیٹ تھا جو بناوٹ کے اعتبار سے تقریباً ساؤنڈ پروف تھا اور انہیں مزید سہولت یہ حاصل تھی کہ آس پڑوس میں کوئی آباد بھی نہیں تھا اس لیے وہ اپنی ساری کارروائی اطمینان سے انجام دے سکتے تھے۔ فلیٹ میں پہنچ کر انہوں نے سب سے پہلے سوٹ کیس... کھولا۔ اندر پریم ناتھ پسینے میں شرابور پڑا اکھڑے اکھڑے سانس لے رہا تھا۔ سوٹ کیس کو ڈکی سے نکال کر اوپر لانے کے لیے انہیں اس کا ڈھکن صحیح طور پر بند کرنا پڑا تھا اس لیے اس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ سوٹ کیس کھلنے کے نتیجے میں اسے وافر آکسیجن ملی تو وہ گہرے گہرے سانس لے کر کمی پوری کرنے لگا۔

''اسے ہوش آنے والا ہے۔ بہتر ہے کہ اسے باہر نکال کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔'' اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے شہریار نے اپنا خیال ظاہر کیا تو کلام اور سلو فوراً ہی حرکت میں آ گئے۔ دونوں کے کام مکمل کرنے تک پریم ناتھ کو ہوش آ چکا تھا لیکن وہ غائب دماغی کی کیفیت میں ایک سمت تکے جا رہا تھا۔ شہریار کمرے کے ساتھ منسلک باتھ روم سے ایک مگ میں پانی بھر لایا اور اس کے منہ پر انڈیل دیا۔ چہرے پر پانی پڑنے پر اس نے جھرجھری سی لی اور پھر اس کی آنکھوں کا رنگ بدلتا نظر آیا جس کا مطلب تھا کہ وہ غائب دماغی کی کیفیت سے باہر نکل رہا ہے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' اس کے منہ سے نکلنے والے سوال نے ثابت کر دیا کہ وہ حواسوں میں لوٹ چکا ہے۔

''ہم حرام کے اس مال میں اپنا حصہ چاہتے ہیں جو تم نے بے گناہ شہریوں کو گرفتار کر کے ان کی رہائی کے بدلے میں رشوت کے طور پر وصول کیا ہے۔'' شہریار نے نہایت سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''تو تم نے مجھے تاوان کے لیے اغوا کیا ہے؟'' پریم ناتھ کے چہرے پر ذرا سا اطمینان اترا۔

''ہاں، تاوان تو تمہیں ادا کرنا ہوگا۔'' اسے یہ جواب دیتے ہوئے شہریار کی نظروں میں ڈاکٹر فرحان جمیل کی خوب صورت تصویر تھی۔ ایسے شاندار شخص کو پھنسانے میں سب سے کلیدی کردار ادا کرنے والے شخص کو وہ بچ بچ بھاری تاوان کی ادائیگی کے بغیر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ تاوان کے طور پر اسے شاید اپنی جان ہی گنوانی پڑتی۔

''دیکھو، میں تمہیں جھٹلاؤں گا نہیں۔ رشوت میں نے بچ بچ لی ہے لیکن میرا وشواس کرو کہ وہ سارے روپے اکیلے میری جیب میں نہیں گئے۔ اوپر نیچے والوں کو حصہ دینے کے بعد میرے حصے میں بہت تھوڑی رقم آتی ہے۔ تم اسی حساب سے مجھ سے مانگو گے تو میں تمہیں دے دوں گا لیکن میری حیثیت سے بڑھ کر ڈیمانڈ کرو گے تو کچھ نہیں کر سکوں گا۔'' ان کی طرف سے کوئی مطالبہ سامنے آنے سے پہلے ہی اس نے بارگیننگ شروع کر دی۔

''حیثیت تو تمہاری بڑی اونچی ہے پریم ناتھ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک چھوٹے سے گاؤں سے اٹھ کر ممبئی جیسے شہر میں نہ آ گئے ہوتے۔ بتاؤ کیا قیمت لی تھی تم نے ڈاکٹر فرحان جمیل کو را کے ہاتھوں پہنچانے کی؟ تمہیں تو دو طرف سے حصہ ملا ہوگا۔ ایک طرف سے فرحان جمیل کے دشمن خاندان والوں نے نوازا ہوگا تو دوسری طرف سے را نے اتنا اہم شخص پکڑوانے پر تم پر نوازشات کی بارش کر دی ہوگی۔ تمہارے ٹھاٹ باٹ ایسے ہی تو نہیں ہیں۔ سیدھے طریقے سے کام کرتے تو تم مرتے دم تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے جس کے مزے آج کل لوٹ رہے ہو۔'' اس کے ہر لفظ کے ساتھ پریم ناتھ کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا اور اب وہ کسی اور نظر سے اپنے سامنے موجود افراد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے پولیس کی نوکری میں ایک عرصہ گزارا تھا اس لیے یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا تھا کہ را کی گرفت میں موجود ایک پاکستانی سائنس داں کی تلاش میں اس طرح پہنچنے والوں کا تعلق بھارت کی سرزمین سے تو ہو نہیں سکتا۔ وہ یقیناً ڈاکٹر فرحان کے ہم وطن تھے جو اپنے ملک کے ایک قیمتی سرمائے کو واپس لینے یہاں تک آ پہنچے تھے۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا را سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک چھوٹا افسر ہوں اور را والے مجھ جیسوں کو منہ نہیں لگاتے ہیں۔'' آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ ان کے ساتھ تعاون نہیں کرنا ہے۔

''را سے تیرا تعلق ہے یا نہیں، یہ تو ہم بعد میں پوچھیں گے۔ پہلے تو یہ قبول کر کہ تو نے اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لیے پاکستان سے آئے ہوئے ڈاکٹر فرحان جمیل کو گرفتار کیا تھا یا نہیں؟''

''میں نے اپنی سروس کے دوران درجنوں افراد کو گرفتار کیا ہے، اب مجھے ان سب کے نام تو یاد ہونے سے رہے۔'' اس نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا جس پر شہریار کا پارا چڑھ گیا اور اس نے بے دریغ اسے لاتوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ مارتے ہوئے اس نے اس بات کا بھی لحاظ نہیں کیا تھا کہ اس کے پیر پریم ناتھ کے جسم کے کس حصے پر پڑ رہے ہیں۔ دو تین لاتیں تو اس نے اس کے منہ پر بھی دے ماریں جس کے نتیجے میں اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا اور دائیں جبڑے کو بھی نقصان پہنچا۔ یہ چوٹیں کھا کر وہ بری طرح چیخنے لگا جس پر کلام نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی آوازوں کا گلا گھونٹ ڈالا۔

''تم تو بڑے بودے نکلے پریم ناتھ... صرف ٹریلر پر ہی تمہارا یہ حال ہو گیا۔ ابھی تو ہم تمہارے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کریں گے۔ تمہیں تو اچھا خاصا تجربہ ہوگا کہ کیسے تشدد پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تم تو اپنے علاقے میں بڑے سفاک پولیس والے مشہور تھے۔ سنا ہے تم نے ڈاکٹر فرحان پر بھی بے تحاشا تشدد کیا تھا اور ان پر الزام لگایا تھا کہ وہ پاکستانی جاسوس ہیں۔ ہم تمہارے سامنے اعتراف کرتے ہیں کہ ہم پاکستانی جاسوس ہیں۔ اب بتا کہ تو ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔'' اس نے فرش پر پڑے پریم ناتھ پر جھک کر اس کے چہرے کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا کہ پریم ناتھ کو اس کی انگلیاں اندر گڑتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اذیت اور نفرت سے اس کے چہرے کے خدوخال بگڑ گئے لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے وہ چیخ چلا کر اظہار نہ کر سکا۔

''پلاس سے اس کے سارے ناخن ایک ایک کر کے اکھاڑ ڈالو اور خبردار... اس وقت تک اپنا ہاتھ مت روکنا جب تک یہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے لیے رضامندی نہ ظاہر کر دے۔'' حکم جاری کر کے وہ خود ایک کرسی پر جا بیٹھا اور سلو حکم کی تعمیل کے لیے کمربستہ ہو گیا۔

''میں چائے بنا کر لاتا ہوں۔'' سلو نے ابھی پریم ناتھ کی پہلی انگلی کو ہی اپنی گرفت میں لیا تھا کہ کلام کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے نکلتے ہی پریم ناتھ کی چھوٹی انگلی کا ناخن اکھڑ کر پلاس کی گرفت میں نظر آنے لگا۔ ناخن اکھیڑے جانے کی اذیت سے پریم ناتھ کا جسم بری طرح سے پھڑکا اور بننے والے زخم سے تیزی سے خون بہنے لگا۔ سلو نے اس کی ہدایت کے مطابق اپنا ہاتھ روکا نہیں اور پریم ناتھ کی شدید مزاحمت کے باوجود اس کی دوسری انگلی کا ناخن بھی اکھاڑ ڈالا۔ اس بار وہ اذیت برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔

''جانے دو، تھوڑی دیر کے لیے چائے کا وقفہ کر لیتے ہیں پھر اس سے نمٹیں گے۔'' پریم ناتھ کے بے ہوش ہونے پر سلو نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے بے نیازی سے کہا۔ اسی وقت کلام ٹرے میں چائے کے کپ رکھے واپس آ گیا۔ ٹرے میں چائے کے کپ کے علاوہ ایک چھوٹی پلیٹ میں چاکلیٹ کوکیز بھی رکھے ہوئے تھے۔

''یہاں میرا کبھی کبھار ہی آنا ہوتا ہے اس لیے خورونوش کی اشیا میں چائے، کافی کے علاوہ بس بسکٹ ہی مل سکتے ہیں کیونکہ یہ بغیر فریج کے بھی لمبے عرصے تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔'' اس نے کسی ایسے میزبان کی طرح، جو آنے والے مہمانوں کی خاطر خواہ مدارت نہ کر پا رہا ہو، شرمندہ سے لہجے میں وضاحت دی۔

''یہ بھی بہت ہے، ہم یہاں دعوت میں نہیں آئے ہیں جو خاطریں کرواتے پھریں۔'' شہریار نے سنجیدگی سے جواب دیا اور ٹرے میں سے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ سلو نے بھی اس کی پیروی کی۔ اس میں یہ عادت بہت اچھی تھی کہ

اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور بلاضرورت کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔

"اس کی کھال مجھے کافی موٹی لگتی ہے۔ یہ اتنی آسانی سے اپنی زبان نہیں کھولے گا۔" چائے پیتے ہوئے فرش پر بے ہوش پڑے پریم ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کلام نے تبصرہ کیا۔

"مجھے ہر حال میں اس سے سچ اگلوانا ہے۔ چاہے اس کے لیے مجھے اس کا پورا جسم ہی کیوں نہ چھیدنا پڑ جائے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ذرا سے لالچ کے پیچھے بہت بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے۔ وہ بے چارے نہ جانے اتنے عرصے سے کتنی مصیبتوں سے گزر رہے ہیں اور کس حال میں ہیں؟ اس شخص کے لیے میرے پاس معافی کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔" یہ وہی شہریار تھا جو اپر کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود نچلے طبقے کے مظلوم و مجبور افراد کی پریشانیاں بہت ہمدردی سے سنتا تھا لیکن ایک ملک دشمن کے لیے اس کے لہجے میں ایسی سفاکی تھی کہ کلام بھی اندر سے لرز اٹھا۔ سلو البتہ نارمل تھا۔ جس نہج پر اس کی تربیت ہوئی تھی اس میں کسی پر تشدد کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ دوسرے اتنے دنوں کے ساتھ میں اس نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ملک دشمنوں کے حق میں شہریار کتنا سخت اور بے لچک آدمی ہے۔

"تم شاید اپنا موبائل کچن میں چھوڑ آئے ہو، وہاں سے اس کی ٹون سنائی دے رہی ہے۔" کچن کی طرف سے آتی بہت دھیمی سی آواز پر شہریار کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے کلام کو آگاہ کیا۔

"اوہ۔" کلام تیزی سے کچن کی طرف گیا اور جب فون کان سے لگائے واپس آیا تو چہرے کے تاثرات لمحہ بہ لمحہ رنگ بدل رہے تھے۔

"ہمیں یہاں سے فوری طور پر روانہ ہونا ہوگا۔ میرے ایک آدمی کی کال آئی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس وقت میں کہاں ہوں۔ اسے اطلاع ملی ہے کہ جس بلڈنگ میں ہم موجود ہیں، اس پر ریڈ کرنے کے لیے ایک پولیس پارٹی روانہ ہوچکی ہے۔ ابتدائی معلومات کے مطابق پولیس کو یہاں کچھ جرائم پیشہ افراد کی موجودگی کی خبر ملی ہے اس لیے ہم یہاں سے جتنی جلدی نکل جائیں، اتنا ہی اچھا ہوگا۔" جلدی جلدی انہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا کلام افراتفری کا شکار نظر آرہا تھا۔ ظاہر ہے، وہ اس وقت پولیس کے ایک مغوی افسر کے ساتھ یہاں موجود تھے اور پکڑے جانے کی صورت میں بہت بُرے انجام سے دوچار ہوسکتے تھے۔ اس لیے ان کے لیے حالات سخت مخدوش تھے۔

"ٹھیک ہے، پہلے اسے دوبارہ سوٹ کیس [illegible] کرو پھر نکلتے ہیں۔" چائے کا کپ ہاتھ سے رکھ کر [illegible] فیصلہ سنایا اور فوری طور پر حرکت میں آگیا۔ کلام سے [illegible] ایسا لگا کہ وہ اس کام میں وقت ضائع نہیں کرنا [illegible] فوری طور پر نکلنے کا خواہش مند ہے لیکن شہریار کا [illegible] دیکھتے ہوئے اسے کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی اور خود [illegible] دونوں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اب ایک بار پھر بے ہوش [illegible] سوٹ کیس میں منتقل ہوچکا تھا اور وہ لوگ لفٹ کے [illegible] اسے نیچے لے جارہے تھے۔ سوٹ کیس کو ڈکی میں [illegible] خود گاڑی میں بیٹھنے تک انہیں کوئی مشکل پیش [illegible] آئی۔ اپارٹمنٹ بلڈنگ کا یہ پروجیکٹ نیا ہونے کی [illegible] زیادہ آباد نہیں تھا اور یہ ماحول ان جیسے افراد کے علاوہ [illegible] پیشہ لوگوں کے لیے بھی سازگار تھا کیونکہ یہاں ان کی حرکات و سکنات کسی کی نظر میں آنے کا امکان نہیں ہوتا تھا۔ کلام [illegible] گاڑی گیٹ سے باہر نکالی ہی تھی کہ انہیں پولیس کی ایک [illegible] دکھائی دی۔ خلافِ معمول پولیس والے ہوٹرز بجاتے [illegible] آنے کے بجائے خاموشی سے وہاں آئے تھے۔ ان کی [illegible] کو گیٹ سے نکلتے دیکھ کر انہیں دور سے ہی رکنے کا اشارہ [illegible] گیا لیکن ظاہر ہے ان کے لیے رکنا ممکن نہیں تھا۔ کلام [illegible] ایکسلریٹر پر دباؤ کچھ اور بھی بڑھا دیا اور اس کی گاڑی [illegible] رفتاری سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ لازمی ردِعمل کے [illegible] پولیس کی گاڑی بھی ان کے پیچھے آئی۔ اب صورتِ حال [illegible] کہ کلام کی کوشش تھی کہ کسی طرح اپنے تعاقب میں آنے [illegible] پولیس جیپ سے پیچھا چھڑالے لیکن پولیس والے بھی ان [illegible] جان چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

"گاڑی کی اسپیڈ تھوڑی کم کرو۔ میں انہیں روکنے [illegible] بندوبست کرتا ہوں۔" سلو نے کلام سے کہا اور خود اپنی [illegible] سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کلام نے آہستہ [illegible] رفتار کم کرنا شروع کردی۔ ان کی گاڑی کی رفتار کم [illegible] دیکھ کر پولیس جیپ کا ڈرائیور جوش میں آگیا اور جیپ کی [illegible] مزید بڑھادی۔ اس کی اس حرکت نے گاڑی اور جیپ [illegible] درمیانی فاصلہ مزید کم کردیا اور سلو کے لیے جیپ کے [illegible] ٹائر کو نشانہ بنانا اور بھی آسان ہوگیا۔ اگلے ٹائر میں گولی [illegible] ہی فضا میں زوردار آواز گونجی اور تیز رفتار پولیس جیپ بری طرح لہرائی کے ڈرائیور کے لیے اس پر قابو پانا [illegible] ہوگیا۔ کلام نے فوراً ہی گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ اس [illegible] وہ ایک ایسی سڑک سے گزر رہے تھے جس کے [illegible]

اطراف درختوں کے گھنے جھنڈ موجود تھے۔ عرصے سے ممبئی میں رہنے والا کلام یہاں کے راستوں اور جغرافیے سے اچھی طرح واقف تھا لیکن یہ واقفیت کسی ناگہانی کو تو نہیں ٹال سکتی تھی۔ جلد ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ ان کے تعاقب میں وہی واحد جیپ نہیں آرہی تھی جس کے ٹائر کو نشانہ بنا کر سلو نے اسے ناکارہ کردیا تھا۔ وہاں کچھ اور بھی ہیڈ لائٹس تھیں جو تیزی سے دوڑتی چلی آرہی تھیں۔

"ہمارے سامنے سے بھی کچھ گاڑیاں آرہی ہیں۔ لگتا ہے انہوں نے وائرلیس پر رابطہ کرکے اپنی مدد کے لیے اپنے ساتھیوں کو بلالیا ہے۔" اچانک ہی کلام نے متوحش لہجے میں انہیں مطلع کیا۔ یہ ون وے روڈ تھا جس پر سامنے سے گاڑیاں آنے کا مطلب تھا کہ انہیں دونوں جانب سے گھیرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

"بچاؤ کا کیا راستہ ہے؟" شہریار نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"ہمیں گاڑی چھوڑ کر درختوں کے جھنڈ میں گھسنا ہوگا۔"

یہ جواب سن کر شہریار نے ہونٹ بھینچ لیے۔ گاڑی چھوڑنے کا مطلب تھا کہ انہیں پریم ناتھ کو بھی چھوڑنا پڑتا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اگر وہ پریم ناتھ سمیت پکڑے جاتے تو خلاصی کی کوئی صورت نہیں نکلتی البتہ بچ نکلنے کی صورت میں دوبارہ پریم ناتھ پر ہاتھ ڈالا جاسکتا تھا۔

"اوکے۔"

"ہم رائٹ سائڈ پر جائیں گے۔" اس کی ایک لفظی رضامندی سن کر کلام نے بتایا۔ اس صورتِ حال میں سب سے زیادہ اسے ہی نقصان پہنچنے والا تھا۔ اس کی گاڑی سے پریم ناتھ سمیت ملنے کا مطلب تھا کہ وہ پوری طرح ایکسپوز ہوجائے گا اور اسے اپنا برسوں کا بنابنایا سیٹ اپ ختم کرکے نئے سرے سے قدم جمانے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ دوسری صورت یہ بھی ہوسکتی تھی کہ اسے یہاں سے باہر نکل جانا پڑتا کیونکہ ایک سرا ہاتھ میں آنے کے بعد یہاں کی ایجنسیاں اسے چھوڑنے والی نہیں تھیں۔ وہ تو کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتی پھرتیں۔

فکروں اور پریشانیوں کے باوجود اس نے بہت مہارت سے گاڑی روکی اور وہ تینوں پھرتی سے باہر نکل کر دائیں طرف کے جھنڈ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ عین ممکن تھا کہ پولیس والوں نے بھی انہیں جھنڈ میں گھستے ہوئے دیکھ لیا ہو اور خود بھی ان کے تعاقب میں وہاں چلے آئیں۔ پولیس والوں کی عددی برتری اس صورت میں ان کے لیے مسئلہ بن سکتی تھی لیکن اس کے سوا فی الحال ان کے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

"ہمیں یہاں سے شمال کی طرف بھاگنا ہے۔ وہاں سے ایک ریلوے لائن گزرتی ہے۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم وہاں سے گزرنے والی کسی گاڑی میں سوار ہونے میں کامیاب ہوجائیں گے۔" بھاگتے بھاگتے کلام نے انہیں آگاہ کیا تو انہیں سمجھ آیا کہ اس نے خصوصیت سے دائیں طرف کے جھنڈ میں گھسنے کا مشورہ کیوں دیا تھا۔ وہ جان بچا کر بھاگ رہے تھے اس لیے سارے حواس کسی وحشی جانور کی طرح ہی چوکنے تھے۔ ان چوکنے حواسوں کے ساتھ انہوں نے پہلے گاڑیوں کے بریک لگنے کی آوازیں سنیں اور پھر ان آوازوں پر ٹرین کی تیز وسل حاوی ہوتی چلی گئی۔

"جلدی کریں، کوئی گاڑی جنکشن کو چھوڑ کر اس طرف آنے والی ہے۔ اس وقت اس کی رفتار تیز نہیں ہوگی اس لیے ہم اس پر چڑھنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔" کلام نے چیخ کر انہیں آگاہ کیا اور اپنی رفتار کو کچھ اور بڑھا دیا۔ ان دونوں نے بھی یہی کیا اور عین اس وقت تک ریلوے لائن تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے جبکہ گاڑی دھیمی رفتار میں وہاں سے گزر رہی تھی۔ ان کے اندازوں کے برعکس وہ کوئی مسافر ریل گاڑی نہیں تھی بلکہ مال گاڑی تھی۔ یہاں وہ ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کرسکتے تھے اور اپنی اپنی مہارت اور پھرتی سے کام لے کر اپنے طور پر اس مال گاڑی میں چڑھنا تھا۔ تینوں نے اللہ کا نام لیا اور چھلانگ لگادی۔ تینوں ہی تربیت یافتہ تھے اس لیے ذرا سی مشکل سے ہی سہی، اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔ مال گاڑی پر چڑھنے کے لیے انہوں نے دو ڈبوں کے درمیان چھوڑی جانے والی وسیع جگہ کا انتخاب کیا تھا اس لیے فوراً ہی فرش سے چپک کر لیٹ گئے۔ بیٹھنے یا کھڑے رہنے کی صورت میں دور سے انہیں دیکھ لیے جانے کا امکان تھا۔ ان تینوں کے اضافے سے بے نیاز مال گاڑی اپنے سفر پر گامزن رہی۔ اپنی جگہ لیٹے لیٹے بھی وہ دیکھ سکتے تھے کہ جھنڈ میں کئی ٹارچوں کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہی ہیں لیکن یہ جگنو اب انہیں تلاش نہیں کرسکتے تھے۔ وہ تو لمحہ بہ لمحہ رفتار پکڑتی مال گاڑی کے ساتھ ان کی پہنچ سے دور ہوتے جارہے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ پناہ گاہ عارضی ہے اور اب نہ جانے انہیں کب تک اور کتنا بھاگنا ہے۔

☆☆☆

"میں نے تمہاری فراہم کردہ معلومات کے متعلق

اچھی طرح چھان بین کروائی ہے۔ اشفاق رانا نے تمہیں پامیلا نامی جس عورت کے بارے میں بتایا تھا، کچھ حوالوں کے باعث ہم اس کی اصلیت تک بھی پہنچ گئے ہیں۔ سب سے اہم حوالہ میرج بیورو کا تھا۔ کچھ عرصے قبل شہر میں ہونے والے بم دھماکوں کا سراغ لگاتے ہوئے پولیس اس میرج بیورو تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن انہیں وہاں تک پہنچنے میں تھوڑی سی تاخیر ہوگئی اور یہ عورت وہاں سے اپنا سیٹ اپ ختم کر کے فرار ہونے میں کامیاب رہی تھی۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ کچھ عرصہ شہریار عادل کی بیوی بن کر رہنے والی ڈاکٹر ماریا نے اپنے آخری بیان میں اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ اور اس کی ماں را اور موساد کی ڈبل ایجنٹ ہیں اور پامیلا بن کر امرا کے طبقے میں گردش کرنے والی عورت دراصل ڈاکٹر ماریا کی ماں سنتھیا جوزف ہی تھی۔ بیٹی کی موت کے بعد وہ مسلسل منظر سے غائب ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنی اکلوتی بیٹی کی لاش وصول کرنے کے لیے بھی کسی قسم کی کوئی کوشش نہیں کی۔ کچھ اس قسم کے ثبوت بھی ملے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنتھیا کے ریاض انور سے بھی تعلقات تھے لیکن ظاہر ہے اب ریاض انور مر چکا ہے اس لیے ہم اس سے کچھ بھی نہیں معلوم کر سکتے۔'' ذیشان نے اپنی طرف آس بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جاوید علی کو سنجیدگی سے ان تفصیلات سے آگاہ کیا جو اس نے اشفاق رانا سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں جمع کی تھیں۔

''میں نے آپ کو رانا سے حاصل ہونے والا ایک نمبر بھی تو دیا تھا، اس سے کوئی سراغ نہیں ملا؟'' جاوید علی کے پاس ابھی ایک امید باقی تھی۔

''تم نے شاید اس نمبر پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ بڑا عجیب نمبر ہے اور ہمارے ملک میں استعمال ہونے والی کسی بھی موبائل سروس سے تعلق نہیں رکھتا۔ میں نے اس نمبر پر کال کر کے دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن بیل جانے کے باوجود کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔'' اس نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

''آپ رانا کے موبائل سے کال کر کے دیکھتے۔ ہوسکتا ہے وہ اجنبی نمبر سے آنے والی کال ریسیو نہ کرتی ہو۔'' اس نے تیزی سے مشورہ دیا۔

''پہلے میں نے رانا کا نمبر استعمال کیا تھا لیکن اس کے باوجود کال ریسیو نہیں کی گئی اور اب تو اس کی موت کی خبر منظر عام پر آگئی ہے۔ اس ائر ہوسٹس شاہین نے پولیس اور میڈیا والوں کو سب بتا دیا ہے کہ کس طرح دو افراد نے زبردستی اس کے فلیٹ میں گھس کر اسے اور رانا کو بے بس کیا اور پھر اسے علیحدہ کمرے میں بند کر کے رانا سے تنہائی میں پوچھ گچھ کرتے رہے۔ ان حالات میں اب ہمارے لیے کس طور رانا کا استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہمارا دشمن جتنی جدید ٹیکنالوجی سے لیس ہے، کچھ بعید نہیں کہ اسے ٹریس کرنے کے چکر میں ہم پھنس جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ سنتھیا کے موبائل پر یہ سہولت موجود ہو کہ وہ کال کرنے والے کی لوکیشن سے آگاہ ہو سکے۔'' اس نے جاوید علی کو صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کی۔

''اشفاق رانا کا موبائل ریکارڈ... اس سے بھی کچھ معلوم نہیں ہوا کیا؟''

''نہیں۔'' ذیشان نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''وہ جس موبائل کمپنی کی سروسز استعمال کر رہا تھا، اس نے ہمیں اس کا پورا ڈیٹا فراہم کر دیا ہے لیکن اس مخصوص نمبر سے آنے یا اس پر کی جانے والی کالز کے متعلق ان کے پاس کسی قسم کا ریکارڈ نہیں ہے۔''

''یعنی ہم ایک بار پھر اندھیرے میں کھڑے ہیں۔'' پُرجوش سے جاوید علی کو مایوسی نے آ گھیرا۔

''بی بریو جوان۔ ہمارے پروفیشن میں بہت بار ایسا مقام آتا ہے کہ لگتا ہے کہ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے لیکن ہم اپنی ہمت ٹوٹنے نہیں دیتے اور اس اندھیرے میں بھی اپنے لیے روشنی کی کوئی کرن ڈھونڈ نکالتے ہیں۔'' ذیشان نے اسے تسلی دی جسے اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ قبول کر لیا اور اس سے اجازت لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سب کچھ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی فی الحال تو اسے بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری محنت اکارت چلی گئی ہو۔ اس گم صم سی کیفیت میں وہ اس کمرے میں جا پہنچا جہاں آج کل عالیہ کا قیام تھا۔ ابتدا میں عالیہ کے بارے میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ اسے وہ لوگ اس طرح استعمال کریں جیسے دوسرے ملکوں کی سیکرٹ سروسز عورتوں کو استعمال کرتی ہیں۔ عورت نامی نرم و نازک ہتھیار کے ذریعے وہ بڑے بڑے سورماؤں کو زیر کر لینے کے ہنر سے واقف تھے۔ عالیہ جیسی تجربہ کار عورت یہ کام بہت خوبی سے انجام دے سکتی تھی لیکن ذیشان سمیت کسی نے بھی اس تجویز کو قبول نہیں کیا۔ ایک تو وہ عورت کے اس استعمال سے ہی متفق نہیں تھے، دوسرے مجبوری میں گناہوں کے دلدل میں پھنس جانے والی عالیہ کو اگر وہ بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کرنے لگتے تو یہ اس کے ساتھ سخت زیادتی ہوتی۔ چنانچہ اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ ہونے تک فی الحال اسے یہیں رکھا گیا تھا۔ ویسے بھی ابھی اس کا باہر نکلنا اس کے لیے خطرناک ہوسکتا تھا۔

''کیا بات ہے، بڑے اُداس لگ رہے ہو؟'' اسے اپنے سامنے پا کر عالیہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں دریافت کیا۔

''ناکامی اداسی ہی لاتی ہے۔ تم سے ملنے والا اشفاق رانا کا کلیو بھی ہمارے کسی کام نہیں آسکا۔ اس سے سب کچھ اگلوانے کے باوجود ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں پہلے تھے۔'' اس نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا اور اسے خود بخود ہی ساری تفصیلات سے آگاہ کرتا چلا گیا۔ چند روز قبل قابلِ نفرت ٹھہرنے والی عالیہ سے اس عرصے میں اسے کچھ انسیت ہو چلی تھی اور اب وہ پہلے جتنی بری نہیں لگتی تھی بلکہ وہ اس کی مجبوریوں کو سمجھنے لگا تھا... بنیادی طور پر وہ بری لڑکی نہیں تھی، بس حالات نے اسے برا بنا دیا تھا اور اب موقع ملا تھا تو واقعی شریف زادیوں کی طرح وقت گزار رہی تھی۔ ورنہ ہونے کو تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ یہاں اتنی بڑی تعداد میں موجود مردوں میں سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتی لیکن اب تک ایسی کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔

''ہوں... تو یہ بات ہے۔ غلطی تم میں سے کسی کی نہیں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں میں ہر کام کا ایک طریقہ مقرر ہے۔ ہوسکتا ہے رانا سے تمہیں جو نمبر ملا ہے۔ اس پر رابطے کے لیے بھی کوئی طریقۂ کار مقرر ہوتا کہ کوئی غیر متعلق شخص مداخلت نہ کر سکے۔ یہ طریقہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ کال سے پہلے کوئی مخصوص کوڈ ایس ایم ایس کرنا یا مقررہ تعداد میں مس کال دینا وغیرہ۔ اور ظاہر ہے یہ بات وہی شخص جانتا ہوگا جسے یہ نمبر فراہم کیا گیا ہے۔''

''تمہارے پاس بھی تو ایمرجنسی میں رابطے کے لیے کوئی صورت ہوگی۔'' جاوید علی کے دل میں امید کی کرن جاگی۔

''میرے پاس صرف ایک صورت ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اگر کبھی مجھے روپوش ہونے کی ضرورت پیش آئے تو میں انگریزی کے اخبارات کے کلاسیفائڈ پیج پر ایک مخصوص اشتہار مسلسل تین دن تک چھپواؤں اور اس اشتہار کے ساتھ اپنا رابطہ نمبر بھی دوں۔ اس طرح وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہے اور وہ خود مجھ تک پہنچ کر میری مدد کی کوشش کریں گے۔'' اس کے سوال پر عالیہ نے اسے آگاہ کیا۔

''یہ تو بہت عجیب طریقۂ کار ہے۔ اس طریقے سے تو کبھی تمہاری فوری مدد نہیں ہوسکتی۔'' اس کی بات سن کر جاوید علی نے اعتراض کیا۔

''یہ بات میں بھی سمجھتی ہوں لیکن ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ میں اور مجھ جیسی دوسری لڑکیاں ان کے لیے اتنی اہمیت نہیں رکھتیں کہ وہ ہماری حفاظت کے لیے فکر مند ہوں۔ میں اگر اپنی جان سے بھی چلی جاؤں گی تو کیا ہوگا؟ وہ میری جگہ کوئی دوسری لے آئیں گے۔'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ تلخ حقیقت بیان کی۔

''یعنی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارے اشتہار کے جواب میں ان کی طرف سے کوئی رسپانس نہ آئے۔'' جاوید علی پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''ہو تو سکتا ہے لیکن میرے خیال میں ہوگا نہیں۔ انہیں تجسس ہوگا کہ میرے اتنے دن کے غیاب کے بارے میں جان سکیں۔ اگر وہ یہ سمجھ بھی گئے کہ میں نے یہ اشتہار ان کے مخالفین کی مدد کے لیے دیا ہے تو بھی وہ میرے ذریعے آپ لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ میری حیثیت تو دونوں طرف کے لوگوں کے لیے چارے کی سی ہے جس کے ذریعے اپنا اپنا شکار کھیلنے کی کوشش کی جائے گی۔'' وہ یکدم ہی اداس ہوگئی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو عالیہ۔ کم از کم ہم لوگ اتنے خود غرض نہیں ہیں کہ تمہارے تحفظ کا خیال رکھے بغیر تمہیں استعمال کریں۔ اشتہار دینے یا نہ دینے کے.... سلسلے میں تم مکمل آزاد ہو۔ ہم میں سے کوئی تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرے گا۔ البتہ میں تمہیں یہ بتادوں کہ اشتہار میں تمہارا جو رابطہ نمبر دیا جائے گا، وہ کسی ایسی جگہ کا ہوگا جہاں تم موجود نہیں ہوگی۔ تم یہیں بیٹھے بیٹھے اس نمبر پر آنے والی کالز ریسیو کروگی اور اتنی سمجھ دار تو تم ہو کہ یہ سمجھ سکو کہ ہم اپنے اتنے اہم ٹھکانے کا پتا کسی دشمن کی نظر میں نہیں آنے دے سکتے۔'' جاوید علی کو اس کی بات نے صدمہ پہنچایا تھا اس لیے وہ ذرا جذباتی لہجے میں اسے وضاحت دینے لگا۔

''سوری جاوید! میں نے تمہارا دل دکھایا لیکن تم بھی میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب تک کی زندگی میں میرا جن لوگوں سے واسطہ پڑتا رہا ہے، وہ سب ایسے تھے جنہوں نے کسی نہ کسی طور پر مجھے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے میرا انسانوں کے خلوص پر سے اعتماد ختم ہوگیا ہے۔ اس اعتماد کو بحال ہونے میں... ابھی کچھ وقت لگے گا۔'' عالیہ زمانہ شناس لڑکی تھی اس لیے اس کی کیفیت کو فوراً بھانپ گئی۔

''ہمارے ساتھ رہوگی تو انشاء اللہ جلد یہ اعتماد بحال ہوجائے گا۔'' جاوید علی نے مسکراتے ہوئے اسے یقین دلایا تو عالیہ اس کے سادہ سے چہرے پر پھیلی شفاف مسکراہٹ کو دیکھتی رہ گئی۔ اتنا تجربہ تو وہ رکھتی تھی کہ جان سکے کہ ایسی شفاف مسکراہٹ انہی چہروں پر بکھرتی ہے جو بے ریا دل

رکھتے ہیں۔

☆☆☆

"آپ کمال کے میزبان ہیں اشوک صاحب! آپ نے تو دو راتوں میں ہی میرا دل خوش کردیا ہے۔ آپ کی یہ میزبانی مجھے ساری عمر یاد رہے گی۔ میری طرف سے آپ کو دعوت ہے کہ آپ بھی پاکستان آئیں۔ ہم نے بھی آپ کی میزبانی کا حق نہ ادا کردیا تو بولیے گا۔" چودھری کی پچھلی رات بالی وڈ کی ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ گزری تھی اس لیے وہ بہت ہی ترنگ میں تھا۔ بھارت کا یہ دورہ اس کے لیے ہر اعتبار سے خوش کن ثابت ہوا تھا۔

پہلی خوشی تو اسے اس وقت حاصل ہوئی تھی جب لنڈا نے اسے اطلاع دی تھی کہ تنظیم اسے اہم میٹنگ کے سلسلے میں بھارت کے دورے پر بھیج رہی ہے۔ اس اطلاع نے اس کی کچلی ہوئی عزتِ نفس کو بحال کردیا تھا اور وہ سمجھنے لگا تھا کہ تنظیم نے بالآخر اس کی اہمیت کو تسلیم کرلیا ہے۔ بھارت پہنچنے پر اشوک کی طرف سے اس کا پُرجوش استقبال ہوا تھا اور ان دو دنوں میں اس نے دل کھول کر اس کی خاطر مدارات کی تھی۔ اس وقت بھی وہ لوازمات سے بھری ناشتے کی ٹیبل پر ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے اور خوشی چودھری کے بشرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"دھنیواد چودھری صاحب! کبھی یہاں کے دھندوں سے مہلت ملی تو آپ کے نیوتے کو ضرور یاد رکھوں گا۔ ابھی تو آپ ہماری میزبانی کا مزہ لیجیے اور جو من چاہے بس اس چیز کی طرف اشارہ کردیجیے۔ بالی وڈ کی کوئی ہیروئن ایسی نہیں جسے ہماری طرف سے سندیش ملے اور وہ آنے سے انکار کردے۔ ہمارے حکم پر تو سالی کسبیاں شوٹنگ چھوڑ کر بھی آنے پر مجبور ہیں۔" اشوک نے شاہانہ انداز میں اسے پیشکش کی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ چودھری کو اپنے مقابلے میں کچھ نہیں سمجھتا تھا لیکن جن لوگوں کی طرف سے اسے بھیجا گیا تھا، ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور تھا۔ چودھری کی بڑھ چڑھ کر کی جانے والی مہمان نوازی میں بھی جہاں ایک طرف اوپر والوں کو خوش رکھنے کا جذبہ کارفرما تھا، وہیں وہ چودھری کو خود سے متاثر کرکے مرعوب کرنا چاہتا تھا اور چودھری کی حالت بتارہی تھی کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہے۔ اس کی شخصیت بھی اپنی جگہ بارعب اور متاثر کن تھی۔

وہ لگ بھگ پینتالیس سال کا مضبوط جسم رکھنے والا مرد تھا جو ہمیشہ قیمتی ٹو پیس سوٹ زیب تن کرتا تھا۔ اس کے گلے میں کافی بھاری سونے کی زنجیر رہتی تھی اور بائیں ہاتھ کی کلائی میں ننھے ننھے ہیرے جڑا موٹا سا سونے کا کڑا موجود تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں موجود انگوٹھیوں میں قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے جو کہ ایک اسٹائل سے پائپ پیتے ہوئے اور بھی نمایاں ہوجاتے تھے۔ وہ پائپ میں جو تمباکو استعمال کرتا تھا، اس کی مہک خود اس کے امپورٹڈ ہونے کا اعلان کرتی تھی۔ وہ شہر کے کئی ہوٹلوں اور سپر مارکیٹس کا مالک تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کا بزنس دبئی تک پھیلا ہوا ہے اور فلم انڈسٹری میں بھی اس کا کثیر سرمایا لگا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ٹاپ ہیرو ہیروئن سے لے کر پروڈیوسرز، ڈائریکٹرز اور ڈسٹری بیوٹرز تک سب جھک کر اسے نمسکار کہتے تھے اور وہ مزے سے سب پر اپنا حکم چلاتا تھا۔ اس کے اصل دھندوں کو بھی سب جانتے تھے لیکن کوئی نہیں تھا جو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کرسکے۔ پولیس اہلکاروں سے لے کر بڑے بڑے عہدے داروں اور وزرا سے اس کے گہرے مراسم تھے۔ وہ سب کو خوش رکھتا تھا اور سب اس سے صرفِ نظر کرتے تھے۔

"کاروباری معاملات تو ہمارے درمیان تقریباً طے ہی ہوگئے ہیں۔ اب آپ حکم فرمائیے کہ آج کے دن آپ نے میرے لیے کیا پروگرام طے کیا ہے؟" جوس کا گلاس اٹھا کر ایک بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے چودھری نے خوش گوار موڈ میں بے تکلفی سے دریافت کیا۔

"دوپہر کے بعد میں آپ کو اس جگہ لے چلوں گا جہاں آپ کا مال پیکنگ کے لیے تیار ہے۔ آپ مال کو ایک نظر دیکھ کر اپنا اطمینان کرلیجیے گا پھر میں اس کی پیکنگ شروع کروادوں گا۔ دوپہر تک آپ فارغ ہوں گے۔ چاہیں تو یہیں ٹھہر کر آرام کریں یا اگر کچھ اور خواہش ہو تو اس آدمی کو بتادیں جسے میں نے آپ کی خدمت کے لیے مخصوص کیا ہوا ہے۔ میں البتہ اس دوران یہاں موجود نہیں رہوں گا۔ مجھے اپنے ایک دو ضروری کام نمٹانے ہیں، اس کے علاوہ ایک پولیس آفیسر کو دیکھنے اسپتال بھی جانا ہے۔ کل رات اس بے چارے کو اغوا کرکے تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی نکلی کہ اتفاقاً ایک پولیس پارٹی کے ہاتھ لگ گیا۔ سنا ہے سالا خاصا زخمی ہوا ہے اس لیے اسے دیکھنے جانا ضروری ہے۔" اشوک نے اس کے سامنے اپنا پورا پروگرام رکھ دیا۔

"ایسا کرتا ہوں کہ میں بھی آپ کے ساتھ اسپتال چلتا ہوں۔ اس کے بعد وہیں سے کہیں گھومنے پھرنے نکل جاؤں گا۔ آپ آگے اپنے کام نمٹا لیجیے گا۔ دوپہر کے کھانے پر ہم دوبارہ یہاں اکٹھے ہوجائیں گے۔" چودھری نے اپنا پروگرام بتایا جس سے اشوک نے اتفاق کیا۔ دس منٹ بعد وہ

اشوک کے محل نما مکان سے روانہ ہوئے تو جس بڑی سی گاڑی میں وہ دونوں سوار تھے، اس کے علاوہ بھی دو گاڑیاں ان کے آگے پیچھے چل رہی تھیں۔ ان میں سے ایک گاڑی میں اشوک کے ذاتی محافظ سوار تھے جبکہ دوسری گاڑی باوردی ڈرائیور اور گارڈ سمیت چودھری کے لیے مخصوص تھی تاکہ وہ اسپتال سے جہاں جانا چاہے جاسکے۔

اسپتال میں انہیں جس کمرے میں جانا تھا، اس کے دروازے پر باوردی پولیس اہلکار تعینات تھے لیکن انہوں نے اشوک سے کوئی تعرض نہیں کیا اور اسے ادب سے نمسکار کرنے کے ساتھ ہی پھرتی سے اس کے لیے دروازہ بھی کھول دیا۔ اشوک اپنے محافظوں کو باہر ہی رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے چودھری سمیت کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے میں ایک خوب صورت سی نرس ڈیوٹی پر موجود تھی جو اشوک کو دیکھ کر یوں اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"باہر جاؤ بے بی، جب تک ہم ادھر ہیں تمہاری چھٹی ہے۔" اشوک نے اس کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے کہا تو وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"نمسکار اشوک صاحب! آپ نے مجھے بڑا مان دیا کہ میری خاطر یہاں تک چلے آئے۔" بستر پر دراز مریض بھی اس دوران اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے... عاجزی سے کہنے لگا۔

"ہم اپنے دوستوں کا پورا خیال رکھتے ہیں پریم ناتھ۔ تم ہماری اتنی سیوا کرتے ہو، ہم کیسے تمہیں دیکھنے یہاں نہ آتے۔" اشوک نے باوقار لہجے میں جواب دیا۔ جواب دینے سے قبل وہ چودھری کو لے کر اس نرم و گداز صوفے پر بیٹھ چکا تھا جو اسپتال کے اس وی آئی پی روم میں آنے والے خاص مہمانوں کے لیے ہی رکھا گیا تھا۔

"یہ تو آپ کا بڑا پن ہے۔" پریم ناتھ نے اس خوشامدی کتے کی طرح کہا جو ہڈیوں اور چھچھڑوں کے لیے اپنے مالک کے تلوے چاٹتا ہے۔

"یہ بتاؤ کہ تمہارا یہ حال کیا کس نے؟ کہیں یہ بھائی جی کے غنڈے تو نہیں تھے جنہوں نے ہمارے ایک وفادار پر ہاتھ ڈال کر ہمیں چھیڑنے کی کوشش کی ہو؟" اشوک نے گمبھیر لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

"نہیں اشوک صاحب! یہ دوسرا قصہ ہے۔" پریم ناتھ نے اس کے اندازے کی تردید کرتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اس کے ساتھ بیٹھے چودھری کی طرف دیکھا۔

"اوہ... ہم ان سے تمہارا تعارف تو کروانا بھول ہی گئے۔ یہ ہمارے ایک پاکستانی دوست چودھری افتخار عالم شاہ ہیں۔ انہیں پتا چلا کہ ہم اپنے ایک زخمی دوست کو دیکھنے اسپتال جارہے ہیں تو یہ بھی ہمارے ساتھ ہی آگئے۔" اشوک نے اس کی نظروں کا زاویہ دیکھتے ہوئے چودھری کا تعارف کروایا تو اس نے پہلے دونوں ہاتھ جوڑ کر چودھری کو نمستے کہا اور پھر عاجزی سے بولا۔

"بہت بہت دھنیواد چودھری صاحب کہ آپ نے میری اتنی پروا کی۔"

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اشوک صاحب کے دوست ہیں تو پھر میرے بھی دوست ہی ہوئے۔" چودھری نے بڑے تدبر سے اسے جواب دیا۔

"ہاں تو پریم ناتھ! تم نے بتایا نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا اور کس نے تمہاری یہ حالت بنائی؟" اشوک نے گفتگو کا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اس بار پریم ناتھ نے ذرا تذبذب کے عالم میں چودھری کی طرف دیکھا۔

"ان سے کوئی پردے داری نہیں ہے پریم ناتھ... یہ ہمارے دوست ہیں۔" اشوک نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے تسلی دی تو اسے چاروناچار زبان کھولنی پڑی کیونکہ اشوک کی حکم عدولی کرنا بھی اس کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھا۔

"یہ قصہ میرے ممبئی آنے سے پہلے شروع ہوا تھا۔ میں نے ایک زمیندار کے کہنے پر اس کے پاکستان سے آئے ہوئے بھانجے کو ایک کیس میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اتفاق یہ ہوا کہ مارپیٹ کے دوران اس نے یہ اگل دیا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے جو حیاتیاتی ہتھیاروں پر ریسرچ کررہا ہے۔ مجھے وہ کام کا بندہ لگا اور میں نے فوراً را والوں سے سودے بازی کرکے اسے ان کے حوالے کردیا۔ انہوں نے اس کا کیا کیا، اس کی تو مجھے جانکاری نہیں لیکن مجھے یہاں ممبئی میں میری مرضی کی پوسٹنگ مل گئی۔ کل رات جب میں اپنے گھر سے نکل کر کلب جارہا تھا تو راستے میں کچھ لوگوں نے میری گاڑی کو گھیر کر میرے گارڈ کو زخمی کردیا اور مجھے اغوا کرکے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں انہوں نے مجھے یہ بتایا کہ وہ پاکستانی ایجنٹ ہیں اور ڈاکٹر فرحان جمیل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مجھے تشدد کا نشانہ بھی بنایا لیکن اتفاق سے اسی وقت اس اپارٹمنٹ بلڈنگ پر پولیس نے بھائی جی کے چند ساتھیوں کی موجودگی کی اطلاع پا کر ریڈ کردیا۔ وہ لوگ مجھ سمیت افراتفری میں بھاگے لیکن پولیس ان کے پیچھے لگ گئی۔ انہوں نے دیکھا کہ گاڑی میں فرار مشکل ہے تو ایک جگہ گاڑی روک کر درختوں کے جھنڈ میں

گھس گئے اور وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔ پولیس نے ان کی چھوڑی ہوئی گاڑی کی تلاشی لی تو ڈکی میں سے ایک سوٹ کیس میں، میں بند زخمی حالت میں مل گیا اور انہوں نے مجھے اسپتال پہنچا دیا۔ اسی لیے میں اس سے آپ کے سامنے زندہ بیٹھا ہوں ورنہ یا تو دم گھٹنے سے مر جاتا یا ابھی تک ان کا ٹارچر سہہ رہا ہوتا۔'' پریم ناتھ نے اختصار کے ساتھ پوری کہانی سنا ڈالی۔

''ہوں تو یہ چکر تھا، ورنہ کل رات تو بھائی جی کا وہ پٹھا عبدل پکڑا ہی جاتا۔ میرے آدمیوں نے ہی پولیس کو خبر دی تھی کہ عبدل اس بلڈنگ میں موجود ہے اور ایک پارٹی کے ساتھ اسلحے کی بڑی ڈیلنگ کر رہا ہے۔'' اس کی کہانی سن کر اشوک نے گویا کوئی گتھی سلجھائی۔

''چکر تو یہی ہے اشوک صاحب لیکن میں بڑے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ وہ تینوں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور دوبارہ کبھی بھی مجھ پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔'' پریم ناتھ کچھ خوف زدہ نظر آتا تھا۔

''فکر نہ کرو، میں تمہاری حفاظت کے لیے اپنے کچھ بندے بھیج دوں گا پھر تمہارا پولیس ڈپارٹمنٹ بھی تو ہے نا۔ انہوں نے اتنی دیر میں کڈنیپرز کا اتا پتا معلوم کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا کیا؟''

''پولیس اپنا کام کر رہی ہے۔ جس گاڑی سے مجھے نکالا گیا تھا، اس کے مالک کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ اس کا نام کلام ہے اور وہ ایک فلیٹ میں اکیلا کرائے پر رہتا ہے۔ مجھے جہاں لے جایا گیا تھا وہ اپارٹمنٹ بھی اسی کی ملکیت ہے لیکن وہ کل سے غائب ہے۔ میرے محکمے کے لوگ اس کے بارے میں مزید انفارمیشن اکٹھی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیونکہ ہمیں اس بات کا وشواس ہو گیا ہے کہ وہ کوئی پاکستانی جاسوس تھا جو یہاں رہ رہا تھا۔'' اس نے اشوک کی بات کا جواب دیا۔

''اوکے، یہ تم لوگوں کا پرابلم ہے کہ ان مجرموں کی گرفتاری کے لیے تمہارا ڈپارٹمنٹ کیا کرتا ہے۔ مجھے تو بس اسی بات کا دکھ ہے کہ بھائی جی کی ناک کا بال عبدل پھر بچ نکلا۔ لگانے کو تو میرے آدمی بھی اسے ٹھکانے لگا دیں لیکن پولیس کے ہاتھ لگ کر اس کی جو رسوائی ہوگی، اس کا مزہ ہی الگ ہے۔ خیر۔۔۔ ابھی نہیں تو پھر کبھی وہ سالا چھری تلے آئے گا تو ضرور پھر ہم گن گن کر اپنے بدلے لیں گے۔'' وہ یکدم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تو چودھری نے بھی اس کی پیروی کی۔ پریم ناتھ بھی اپنے زخموں کو بھول کر بستر سے نیچے اتر آیا۔

''ہم جا رہے ہیں، تم آرام کرو۔'' اشوک نے پریم ناتھ سے کہا اور شاہانہ انداز میں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ چودھری بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ اشوک کے ان ٹھاٹ باٹ نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کے اپنے سامنے بھی جھکنے والوں کی تعداد کم نہیں تھی لیکن اشوک کی بات ہی الگ تھی۔ نہ اس کی دولت بے شمار تھا اور نہ اختیارات کی حد۔ وہ یہاں رہ کر اشوک کی ایک ایک حرکت اور انداز کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ طے کرتا جا رہا تھا کہ واپس جا کر خود اسے کیا کیا اقدامات اٹھانے ہوں گے جن سے اس کا اسٹیٹس اور بھی بلند ہو سکے۔

☆☆☆

حسبِ پروگرام جگو بازار میں بو چاٹ والے کے اسٹال پر چاندنی اور شاہد سے ملا اور انہیں اپنی کار میں بٹھا کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس موقع پر چاندنی کچھ سہمی ہوئی تھی جبکہ شاہد بے یقینی کا شکار نظر آتا تھا۔ اس نے راستے میں جگو سے کئی ایسے سوال کیے جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جگو کے بارے میں شکوک و شبہات کا شکار ہے۔ جواب میں جگو نے صرف اتنا کہا کہ وہ انہیں جہاں لے جا رہا ہے، وہاں پہنچ کر ان پر اس کی سچائی ثابت ہو جائے گی۔ اس کے بعد وہ دونوں گاڑی کی پچھلی نشست پر یوں چپ چاپ بیٹھ گئے جیسے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا ہو۔ جگو نے راستے میں عمیر کو اپنی آمد کے بارے میں آگاہ کیا اور اس کی ہدایت پر انہیں دفتر کے بجائے اس کے بنگلے پر لے گیا۔ یہ بنگلا اب بھی اسی طرح سجا ہوا تھا جیسے شہریار کے دور میں تھا۔ اگرچہ شہریار نے اپنے ذاتی خرچے پر بنگلے کو آراستہ کیا تھا لیکن لیاقت رانا نے وہاں سے کسی بھی شے کو ہٹانا پسند نہیں کیا تھا۔ عمیر یہاں آیا تو اسے نفاست اور سادگی سے کی ہوئی یہ سیٹنگ بہت پسند آئی۔ لہٰذا اس نے یہاں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ عمیر نے بنگلے کے لاؤنج میں ان تینوں کا استقبال کیا۔

''آپ لوگوں کو سفر میں کوئی پریشانی تو پیش نہیں آئی؟'' شاہد سے مصافحہ کرتے ہوئے اس سے بااخلاق لہجے میں دریافت کیا۔

''یس سر! ہم بہت آرام سے یہاں پہنچے ہیں۔'' شاہد نے مرعوبیت سے جواب دیا۔ اتنا پڑھا لکھا تو وہ بہرحال تھا کہ بنگلے کے باہر لگی تختی پڑھ کر یہ جان سکے کہ لانے والے نے ان کے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا ہے۔

''گڈ، اب آپ لوگ چاہیں تو فریش ہو جائیں۔ بیس منٹ بعد کھانا لگ جائے گا۔ کھانے کے بعد ہم آپس میں بات چیت کریں گے۔'' نرمی سے نپے تلے لہجے میں بولتا ہوا

وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

دوبارہ ان کی ملاقات کھانے کی میز پر ہوئی تو عمیر نے دیکھا کہ اگرچہ انہوں نے منہ ہاتھ دھو کر بال سنوار لیے تھے لیکن جسم پر کپڑے وہی تھے جو پہن کر وہ یہاں آئے تھے۔ یکدم ہی اسے اپنی غفلت کا احساس ہوا۔ وہ دونوں یہاں خالی ہاتھ آئے تھے۔ انہیں جس انداز میں فرار ہو کر یہاں آنا پڑا تھا اس میں کپڑے ساتھ لانے کی گنجائش کہاں تھی۔ ہاں، یہ ممکن تھا کہ لڑکی اپنے پرس میں تھوڑی بہت نقدی یا زیورات لے آئی ہو۔ بہرحال اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔

''اس وقت تو یہاں کا بازار بند ہو چکا ہوگا، کل ڈرائیور کے ساتھ جا کر تم دونوں اپنے کپڑوں اور دوسری ضرورت کی چیزوں کی خریداری کر لینا۔'' کھانے کے دوران اس نے ان سے یہ مختصر بات کی جس میں آپ جناب کا تکلف ختم کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں اس سے اتنے چھوٹے تھے کہ اس تکلف کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

''ہم اپنا سامان اس لیے ساتھ نہیں لائے کہ پھر بائی جی کو ہم پر شک ہو جائے گا لیکن رقم ہے ہمارے پاس۔ ہم اپنی ضرورت کا سامان خود خرید لیں گے۔'' چاندنی نے اپنی بے سروسامانی کی وضاحت پیش کرتے ہوئے خودداری کا علم بلند رکھنا چاہا۔

''اپنے پاس موجود رقم تم سنبھال کر رکھو، بعد میں کام آئے گی۔ تم دونوں مجھ سے چھوٹے ہو اس لیے تمہیں میری بات ماننا ہوگی اور یہ طے ہے کہ جب تک تم دونوں یہاں ہو تمہارے اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔'' عمیر نے نہایت رسان سے لیکن فیصلہ کن لہجے میں اپنا حکم سنایا جس کے بعد ان دونوں کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی اور وہ سر جھکائے خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد عمیر انہیں اپنے ساتھ اسٹڈی میں لے گیا۔ کسی اہم گفتگو کے لیے وہ جگہ خاصی مناسب تھی۔ جگو ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اسے لاہور واپس جانے کی جلدی تھی اس لیے اس نے کھانے میں شرکت سے معذرت ظاہر کر کے اجازت لے لی تھی چنانچہ اس وقت اسٹڈی میں بس وہ تین افراد ہی تھے۔

''چودھری افتخار عالم شاہ خاصا بارسوخ آدمی ہے اور دوسرے بارسوخ افراد کی طرح قانون شکنی کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ ہم کافی عرصے سے کوشش کر رہے ہیں کہ اس کے گرد دائرہ تنگ کر سکیں لیکن ہر بار ہی وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلتا ہے۔ مینا کا کیس سامنے آنے کے بعد ہم نے اس کے ورثا کو اسی لیے تلاش کیا ہے کہ ان کی مدعیت میں چودھری کے خلاف کیس درج کیا جا سکے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں شاہد کی صورت میں ایک وارث کے علاوہ گواہ کی حیثیت سے تم بھی مل گئی ہو اور یہ امکان پیدا ہو چکا ہے کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا لیکن یہ جان لو کہ یہ کیس اتنا آسان نہیں ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر ذرا سا رکا اور ان دونوں کے چہروں کا بغور جائزہ لینے کے بعد دوبارہ بولنا شروع ہوا۔

''تم دونوں بس آج رات ہی میرے مہمان رہو گے۔ کل صبح تھانے میں رپورٹ درج کروانے کے بعد تم دونوں کو ایک دوسری جگہ شفٹ کر دیا جائے گا کیونکہ بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہارے اور میرے درمیان کسی قسم کا تعلق ظاہر نہ ہو۔ آج کے بعد تم دونوں سے بس ایک وکیل ہی رابطہ رکھے گا۔ اس وکیل کی فیس وغیرہ میرے ذمے ہوگی اور تم لوگوں کے ضروری اخراجات بھی۔ کسی انتہائی ضرورت کے تحت ہی تم دونوں میں سے کوئی مجھ سے رابطہ کرنے کا حق دار ہوگا، ورنہ بہتر یہی ہے کہ مجھ سے براہ راست رابطہ نہ کرنا اور نہ ہی کسی کے سامنے میرا ذکر کرنا۔'' عمیر نے بولتے بولتے پہلو بدلا اور ذرا سا توقف کے بعد گفتگو کا سلسلہ دوبارہ جوڑا۔

''میرا جو آدمی تم دونوں کو لے کر یہاں آیا ہے، اس نے مجھے تمہارے بارے میں پہلے ہی سے معلومات فراہم کر دی ہیں۔ تم دونوں نے کوٹھے پر پرورش ضرور پائی ہے لیکن ابھی بہت کم عمر اور نہ تجربے کار ہو اس لیے میں تمہیں اس کیس کی بعض نزاکتیں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ تمہیں دو طرح کے دشمنوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک چندا بائی کے کوٹھے سے بھاگ کر تم نے اسے ویسے ہی نقصان سے دوچار کیا ہے، اوپر سے جب یہ کیس کھلے گا تو اس پر بھی لالچ کے باعث قتل کو چھپانے کا الزام عائد ہوگا۔ دوسری طرف چودھری کی بھی کوشش ہوگی کہ مدعی اور گواہ دونوں پر دباؤ ڈال سکے۔ اس مقصد کے لیے وہ دھمکیوں سے لے کر قاتلانہ حملے تک کوئی بھی کارروائی کر سکتا ہے۔ دشمنوں کی طرف سے ایک اوچھا ہتھکنڈا یہ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے کہ وہ الٹا تم دونوں کو حدود کے کیس میں پھنسانے کی کوشش کرے۔ اس وار سے بچنے کا سیدھا سادہ اور پیشگی حل یہ ہے کہ فوری طور پر تم دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ جاؤ۔ رضامند نہ ہونے کی صورت میں، میں تم دونوں کے لیے الگ الگ قیام گاہوں کے بندوبست کی کوشش کروں گا۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ تمہارا ایک دوسرے کے ساتھ رہنا زیادہ بہتر ہے تاکہ مل جل کر ایک

دوسرے کی حفاظت کرسکو۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے؟'' اس بار اس کا روئے سخن شاہد کی طرف تھا۔

''میں آپ کی ساری باتوں سے متفق ہوں سر... اگر چاندنی کو اعتراض نہ ہو تو میں پہلی فرصت میں اس سے نکاح کے لیے راضی ہوں۔'' شاہد نے پہلی بار اس کے سامنے لب کشائی کی۔

''میں راضی ہوں سر۔'' چاندنی کی طرف سے دھیمی آواز میں فوراً جواب آیا۔ عمر میں شاہد سے ایک ڈیڑھ سال بڑی ہونے کے باوجود اس وقت وہ کسی عام گھریلو لڑکی کی طرح شرمائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، یہ کام تو کل تمہارے پولیس اسٹیشن جانے سے پہلے انجام پا جائے گا لیکن مجھے یہ بتاؤ کہ کہیں کسی دباؤ سے گھبرا کر تم لوگ اس کیس سے بھاگ تو نہیں جاؤ گے؟'' عمیر نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا سر۔ کئی دن کانٹوں پر گزارنے کے بعد مجھے یہ موقع ملا ہے کہ میں اپنی بہن کے قاتل کو انجام تک پہنچانے کے لیے کچھ کرسکوں۔ اس لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ میں خود کو اس کیس سے علیحدہ کرسکوں۔'' شاہد نے بڑے عزم سے جواب دیا۔

''مجھے ہر قدم پر آپ شاہد کے ساتھ ہی کھڑا پائیں گے۔'' عمیر کی سوالیہ نظریں اپنے چہرے پر محسوس کرکے چاندنی نے بھی یقین دہانی کروائی۔

''گڈ... یہی اسپرٹ باقی رہی تو چودھری اپنے انجام تک ضرور پہنچے گا لیکن فی الحال مسئلہ یہ ہے کہ چودھری پاکستان میں موجود نہیں ہے اور سیر و سیاحت کے ویزے پر بھارت گیا ہوا ہے۔ ہم کارروائی تو کل ہی سے شروع کردیں گے لیکن ظاہر ہے اصل میں اس کیس میں گرماگرمی اس وقت آئے گی جب چودھری واپس پاکستان پہنچے گا۔ میری کوشش ہوگی کہ یہ بات لیک آؤٹ نہ ہونے پائے کہ یہاں اس پر مینا کے قتل کا کیس چلانے کی تیاری ہو چکی ہے۔ میرے کچھ روابط ایسے ہیں جن کے ذریعے ہمیں چودھری کی بھارت سے روانگی کی خبر مل سکتی ہے۔ خبر مل گئی تو ہم اسے ائرپورٹ پر ہی گرفتار کروادیں گے۔ پھر انشاء اللہ چودھری کو قید خانے کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر اس کیس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ چودھری کی واپسی تک تم لوگ تقریباً فارغ ہی رہو گے، سو اس عرصے میں اطمینان سے ایک دوسرے کا ساتھ انجوائے کرنا۔'' اس نے جان بوجھ کر آخر میں ایک شوخ جملہ بول کر ماحول پر چھائے تناؤ کو کم کرنے کی کوشش کی اور ان دونوں کے ہونٹوں پر نمودار ہونے والی شرمیلی سی مسکراہٹ نے بتایا کہ وہ اپنی [illegible] میں ناکام نہیں رہا ہے۔ دل ہی دل میں ان کی [illegible] کے قائم رہنے کی دعا کرتے ہوئے وہ محفل برخاست [illegible] اعلان کرکے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

''مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ تم [illegible] اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس جاؤ لیکن مجبوری [illegible] میرا اسٹور پر رہنا ضروری ہے۔ مصطفی بھائی آج [illegible] پر ہیں ورنہ وہ ہوتے تو مجھے چھٹی کرنے میں کوئی پریشانی [illegible] ہوتی۔'' ناشتا کرتے ہوئے اسلم نے کوئی دسویں [illegible] پریشانی اور مجبوری کا اظہار کیا تو ماہ بانو اس کی [illegible] مسکرا دی۔ اپنے لیے اس کی محبت میں اسے [illegible] شبہ نہیں رہا تھا لیکن آج کل تو وہ اس کا اتنا خیال رکھ رہا [illegible] اسے خود پر کانچ کی گڑیا کا گمان ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی [illegible] وہ دنیا کی چند خوش قسمت عورتوں میں سے ہے جس کا [illegible] حالت میں اس کا اتنا خیال رکھ رہا ہے ورنہ وہ جس ماحول [illegible] پروان چڑھی تھی، وہاں اس بات کو اتنی خاص اہمیت [illegible] جاتی تھی اور مرد کہتے تھے کہ اگر کوئی عورت بچہ پیدا [illegible] ہے تو یہ کوئی ایسا کارنامہ نہیں ہے۔ دنیا کی ساری عورتیں [illegible] کام کرتی ہیں۔ گویا ان کے نزدیک عورت بچے پیدا [illegible] والی مشین تھی جسے ہر حال میں اپنا کام کرنا تھا۔

''آپ اتنی فکر کیوں کررہے ہیں؟ مجھے [illegible] چیک اپ کے لیے ہی تو جانا ہے اس کے لیے میں [illegible] بلقیس باجی کے ساتھ چلی جاؤں گی بلکہ اگر آپ کہیں [illegible] کلینک سے اسٹور آجاتی ہوں، آپ کا ہاتھ بٹا دوں گی۔'' ماہ بانو نے اسے تسلی دیتے ہوئے پیشکش کی۔

''بالکل نہیں، آج تمہاری چھٹی ہے اور کلینک سے فارغ ہونے کے بعد تم گھر آکر مکمل آرام کرو گی۔'' [illegible] فوراً انکار کردیا۔

''تو ٹھیک ہے، میں آپ کی بات مان لیتی [illegible] آپ بھی میری بات مانیں اور بالکل پریشان نہ ہوں [illegible] کوئی پریشانی کی بات ہے ہی نہیں۔'' اس کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے ماہ بانو نے شرط عائد کی۔

''یہ میرے بس میں نہیں ہے۔'' وہ [illegible] بولا تو وہ ہنس پڑی پھر ذرا چھیڑنے کے لیے بولی۔

''یہ اتنی فکرمندی میرے لیے ہے یا [illegible] والے بچے کے لیے؟''

''دونوں کے لیے۔ تم مجھے عزیز ہو اور [illegible] ہیں پرورش پانے کی وجہ سے وہ بھی مجھے پیارا ہے۔ میں [illegible] دونوں میں سے کسی کا نقصان برداشت نہیں کرسکتا۔ خاص طور پر تم مجھے ہر حال میں زندہ سلامت اور صحت مند چاہیے ہو۔''

اس نے جذباتی ہوکر ماہ بانو کا ہاتھ تھام لیا۔

''میں جانتی ہوں، بس ایسے ہی آپ کو چھیڑ رہی تھی۔'' وہ بھی سنجیدہ ہوگئی۔

''میرے جذبات کی گہرائی کو جانتے ہوئے تمہیں یہ باتیں نہیں کرنی چاہیے۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ تمہاری ذات میں میرے لیے دنیا کے سارے رشتے سمٹ کر آگئے ہیں۔ میرا پیار کہیں بٹا ہوا نہیں ہے۔ میرے لیے بس تم، تم اور تم ہی ہو۔ تم سے جدائی کا تصور بھی کروں تو میری سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں۔'' وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔

''اچھا بابا، معاف کردیں۔ میں اپنے کان پکڑتی ہوں میری توبہ جو آئندہ ایسی گستاخی کی ہو۔'' اس نے سچ مچ اپنے دونوں کان پکڑ لیے تو اسلم ہنس پڑا پھر جلدی جلدی ناشتا ختم کرکے اسٹور جانے کے لیے تیار ہونے لگا۔ کام کی وجہ سے آج وہ معمول سے کچھ پہلے ہی وہاں جا رہا تھا۔

''پتا نہیں کیوں آج تمہیں چھوڑ کر جانے کا دل نہیں چاہ رہا۔'' دروازے سے نکلتے نکلتے بھی وہ اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

''وہ تو جناب کا کبھی بھی نہیں چاہتا لیکن بس اب جائیے، آپ کو دیر ہو جائے گی اور میرے کام بھی نہیں سمٹ سکیں گے۔'' ماہ بانو نے اسے باہر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی تو اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اسے اپنے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

''کیا کرتے ہیں، کوئی دیکھ لے گا۔'' وہ محجوب ہوئی۔

''یہاں دیکھنے کے لیے اڑتے پرندوں اور پھول پودوں کے سوا ہے ہی کون۔'' اس نے بولتے ہوئے ایک اور گستاخی کی اور اس سے قبل کہ وہ اسے دھکا دے دیتی، اپنی گرفت سے آزاد کرکے ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد ماہ بانو اندر آگئی اور گھر کے مختلف کام نمٹانے لگی۔ ان کاموں کو نمٹانے کے ساتھ ساتھ وہ کھانا بنانے کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ ابھی اس کے پاس اسپتال کے لیے روانہ ہونے میں تھوڑا وقت باقی تھا اس لیے زیادہ سے زیادہ کام نمٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ آج کے کھانے میں وہ اسپیشلی اسلم کی پسندیدہ ڈش بریانی بنانا چاہتی تھی۔ روزانہ تو وہ خود بھی اسلم کے ساتھ اسٹور جاتی تھی اس لیے اتنی فرصت سے کچھ پکانے کا موقع نہیں ملتا تھا اور وہ سادہ سا کھانا کھانے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ چھٹی والے دن بھی اسلم اسے زیادہ دیر کچن میں کھڑا رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس لیے آج وہ اس کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔

اس کا ارادہ یہ تھا کہ بریانی کے لیے یخنی تیار کرکے رکھ دے گی اور شام میں اسلم کے واپس آنے کے وقت چاول ابال کر دم لگا دے گی۔ ایک چولہے پر بریانی کے لیے یخنی تیار کرتے ہوئے اس نے دوسرے پر کسٹرڈ بھی بنانا شروع کردیا۔ جلدی سے تیار ہونے والی اس سوئٹ ڈش کو ٹھنڈا ہونے کے لیے فریج میں رکھنے کے بعد وہ اس کی سجاوٹ بعد میں کرسکتی تھی۔ تیزی سے ان کاموں کو نمٹاتے ہوئے اس نے اپنی جانے کی تیاری بھی کر ڈالی۔ چنانچہ جب مصطفی خان کی بیوی بلقیس اپنی چلبلی سی بیٹی طوبٰی کا ہاتھ تھامے وہاں آئی تو وہ پوری طرح تیار تھی۔

''اوہو، بڑی خوشبوئیں آرہی ہیں۔ صبح صبح کیا پکا ڈالا؟'' بلقیس نے ناک سکیڑ کر خوشبو کو اندر اتارتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں استفسار کیا۔

''شام میں بریانی پکانے کا ارادہ ہے۔ اسی کے لیے یخنی تیار کی ہے۔'' اس نے پرس اٹھا کر شانے سے لٹکاتے ہوئے بتایا تو طوبٰی مچل گئی۔

''آنٹی، میں بھی بریانی کھاؤں گی۔''

''کیوں نہیں بیٹا، آپ کی اور آپ کی ممی کی بھی بریانی کی دعوت ہے۔'' اس نے طوبٰی کے رخسار کو تھپتھپایا۔

''بری بات ہے طوبٰی... ایسے زبردستی کسی سے دعوت نہیں لیتے۔'' بلقیس نے بیٹی کو گھرکا۔

''زبردستی کیسی، طوبٰی نہ بھی کہتی تو میں خود آپ کو انوائٹ کرتی۔ مصطفی بھائی تو ویسے بھی آج نہیں آئیں گے اس لیے بہتر ہے کہ آپ اکیلے ڈنر کرنے کے بجائے ہمیں جوائن کرلیں۔'' ماہ بانو نے لگاوٹ سے کہا تو بلقیس کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

''ٹھیک ہے بھئی، جیسی تمہاری مرضی لیکن بس اب فوراً نکل پڑو۔ تمہیں کلینک پر چھوڑ کر ہم ماں بیٹی شاپنگ کے لیے چلے جائیں گے اور واپسی میں دوبارہ پک کرلیں گے۔'' بلقیس نے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا تو وہ سر ہلاتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔

''تم آرام سے اندر جا کر چیک اپ کرواؤ۔ ہم آدھ پون گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔'' کلینک کے سامنے اسے اتار کر بلقیس نے محبت سے کہا اور خود اپنی چھوٹی سی کار دوڑاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوگئی۔ اسے جس شاپنگ سینٹر سے

خریداری کرنی تھی، وہ یہاں سے دس بارہ منٹ کی ڈرائیو پر ہی تھا۔ پھر بھی وہ راستے میں ماہ بانو کو ہدایت دے چکی تھی کہ اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو اسے کال کر کے جلدی بھی بلاسکتی ہے۔ پارکنگ ایریا میں پہنچ کر اس نے اپنی گاڑی پارک کی اور طوبیٰ کا ہاتھ پکڑ کے اندر لے گئی۔ اندر جا کر اس نے اپنی ضرورت کی اشیا اٹھا اٹھا کر ٹرالی میں رکھنا شروع کردیں۔ ان اشیا کو وہ لسٹ دے کر اسلم سے بھی منگوا سکتی تھی لیکن خواتین کے ازلی شاپنگ کے شوق سے مجبور ہو کر خود ہی یہاں چلی آئی تھی۔ اپنی اس مصروفیت میں وہ اتنی مگن تھی کہ چالیس منٹ کا وقت گزرنے پر بھی کوئی احساس نہیں ہوا۔ چونکی تو اس وقت جب اس کے پیچھے پیچھے چلتی طوبیٰ نے شاید اپنی شمولیت کے لیے ایک ریک میں ایک دوسرے کے اوپر رکھے گئے خشک دودھ کے ڈبوں میں سے ایک نکال کر ٹرالی میں ڈالنا چاہا لیکن نتیجے میں سارے ڈبے نیچے آگرے۔ ان ڈبوں میں سے ایک اس کے سر سے ٹکرایا جبکہ دوسرا پیر کے انگوٹھے پر آگرا۔ انگوٹھے پر گرنے والے ڈبے نے زیادہ کام دکھایا اور وہاں سے خون بہہ نکلا۔ طوبیٰ نے دہشت زدہ چیخیں ماریں اور بلقیس سمیت کئی افراد اس کی طرف بھاگے۔ بلقیس کے کئی منٹ انتظامیہ سے معذرت کرنے اور طوبیٰ کی مرہم پٹی کروانے میں گزر گئے۔ ان لوگوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا اس لیے فراخ دلی سے نہ صرف معذرت قبول کرلی بلکہ بچی کی مرہم پٹی بھی خود کروائی۔ اپنی کی ہوئی شاپنگ کا بل ادا کرنے کے بعد بلقیس، طوبیٰ سمیت پارکنگ میں پہنچی تو اسے گھڑی دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ کافی لیٹ ہو چکی ہے۔ دل میں شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنا موبائل نکالا تاکہ ماہ بانو کو اپنے دیر سے آنے کی اطلاع دے سکے۔ اس کا نمبر ٹرائی کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کا موبائل آف ہے۔ بلقیس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اب وہ کلینک پہنچ کر ہی ماہ بانو کو اپنی تاخیر کا سبب بتا سکتی تھی۔ دس منٹ میں کلینک تک کا سفر طے کر کے گاڑی باہر روکنے کے بعد وہ اندر پہنچی تو اسے ماہ بانو انتظار گاہ میں دکھائی نہ دی۔ اس نے آگے بڑھ کر ریسپشنسٹ سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

''وہ تو تقریباً بیس منٹ پہلے یہاں سے جا چکی ہیں۔'' اس نے بتایا تو بلقیس کچھ اور شرمندہ ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی تاخیر سے گھبرا کر ماہ بانو خود ہی گھر واپس چلی گئی ہے اس نے فوراً گھر کا رخ کیا۔ گھر پہنچ کر اس نے پہلے اپنی خریدی ہوئی اشیا اور طوبیٰ کو اندر پہنچایا۔

''آرام سے اپنے بیڈ پر لیٹی رہو۔ یہاں سے ہلیں میں سخت خفا ہو جاؤں گی۔'' طوبیٰ کو اس کے کمرے میں کر اس نے سختی سے ہدایت کی اور خود سیدھی انیکسی کی چلی گئی۔ وہاں کا دروازہ بند تھا اور اندر کسی کی موجودگی کا نہیں ہو رہا تھا پھر بھی اس نے دستک دے کر دیکھا ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں سی ابھر آ ماہ بانو کو اس سے پہلے ہی یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن موجود نہیں تھی۔ اس نے چند منٹ اور انتظار کا فیصلہ وہیں انیکسی کے سامنے ٹہلتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگی اس دوران اس نے ایک دو بار پھر اس سے موبائل پر کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا نمبر ہنوز بند جا رہا تھا۔ دل میں کچھ گھبراہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک موہوم امید کے سہارے اسلم کا نمبر ملایا۔

''جی باجی کہیے، کیا کوئی مسئلہ ہے؟'' اسلم نے فوراً کال ریسیو کی اور قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ اس کے انداز نے بلقیس کو بتا دیا کہ اس کا یہ اندازہ بھی غلط نکلا ہے۔ ماہ بانو وہاں بھی نہیں پہنچی ہے۔

''ہیلو بلقیس باجی! کیا ہوا آپ کو... کچھ بول نہیں رہیں؟'' ادھر سے اسلم پریشان سا پوچھ رہا تھا۔

''میں نے یہ پوچھنے کے لیے تمہیں فون کیا تھا کہ بانو وہاں تو نہیں آئی ہے؟'' بلقیس نے تھوک نگل کر حلق تر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''یہاں...'' اسلم کو حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''وہ تو آپ کے ساتھ کلینک گئی تھی اور وہاں سے اسے آپ کے ساتھ ہی گھر واپس جانا تھا۔'' اس کے لہجے میں دنیا بھر کی پریشانی تھی۔

''ہاں لیکن وہ مجھے کلینک پر نہیں ملی۔ میں قریبی شاپنگ سینٹر سے خریداری کر کے کلینک پہنچی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہی وہاں سے نکل چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ گھر آ گئی ہوگی لیکن وہ یہاں بھی نہیں ہے۔'' بلقیس نے گھٹے گھٹے لہجے میں اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس کی نظروں کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے اور اپنے وجود پر کھڑا رہنا دشوار لگنے لگا۔ اسے اس کا سب سے قیمتی اثاثہ گم ہونے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔ ایسے میں وہ ہوش و حواس قائم رکھتا بھی تو کیسے...؟

یہ پر پیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آیندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

ڈاکٹر اللہ بخش کو چکر آ رہے تھے۔ اس کے پیٹ میں رہ رہ کر درد کے گولے اٹھ رہے تھے۔ کبھی کبھی یہ گولے ٹانگوں میں چلے جاتے اور کبھی سینے میں چکرانے لگتے۔ سر میں جیسے دماغ کی جگہ سیسے کا ڈلا تھا جو ذرا سی حرکت سے پگھل کر مائع درد میں تبدیل ہو جاتا۔ آنکھیں کھولنا دشوار اور کھولنا بیکار تھا کیونکہ دن میں بھی دنیا اس کے آگے اندھیر تھی۔ بعض اوقات اسے شبہ ہوتا کہ اب تب میں اس کی جان نکلنے والی ہے۔ اس نے ابھی کوئی دوا نہیں کھائی تھی اور نہ اسے ایسا

درست علاج

مریم کے خان

حکمت ہو... یا ڈاکٹر اس کے پاس ہر مرض کا علاج ہوتا ہے... مگر بعض ایسے موذی مرض لاحق ہو جاتے ہیں... جن کا کہیں کوئی علاج ممکن نہیں... خصوصاً وہ آزار جو روح کی گہرائیوں میں سرایت کر چکے ہوں... ہمارے ہی قرب و جوار میں پھیلی کہانیوں میں سے ایک کہانی... جرم کے پُرخار راستوں کے مسافر جو بھٹکتے ہوئے جان بچانے والے مسیحا تک جا پہنچے تھے...

جاسوسی کے صفحات پر ایک دلچسپ... لمحہ بہ لمحہ پیرہن بدلتی طبع زاد تحریر...

کوئی مرض لاحق ہوا تھا جس میں مریض کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ اس حالت کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ گزشتہ دو دن سے پولیس کی تحویل میں تھا۔ دن تو تقریباً بے ہوشی میں گزرتا تھا البتہ رات کو نیند تو کیا بعض اوقات چاہنے کے باوجود موت بھی نہیں آتی تھی۔

دو دن پہلے وہ سکھر شہر میں گھنٹا گھر سے ذرا دور ایک محلے میں واقع اپنے کلینک سے اٹھا تھا کہ پولیس نے اسے اٹھا لیا۔ دو سپاہیوں نے پیشہ ورانہ مہارت سے اسے اٹھا کر پولیس موبائل کے کٹے پھٹے فرش پر پھینکا۔ ڈاکٹر اللہ بخش کی عینک وہیں جواب دے گئی۔ عینک کے بغیر اسے اتنا ہی نظر آتا تھا جتنا ایک نابینا کو عینک لگا کر نظر آسکتا ہے۔ جب تک وہ اپنے ممکنہ جرم کے بارے میں استفسار کرتا، موبائل اسے پولیس اسٹیشن لے آئی تھی اور یہاں لاتے ہی اسے مشہور زمانہ ڈرائنگ روم لے جایا گیا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر اللہ بخش نے اس خوفناک جگہ کے بس قصے ہی سنے تھے۔ مگر صبح تک وہ اس کے بارے میں اتنا جان چکا تھا کہ اگر چاہتا تو ایک مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی دوسری ڈگری لے سکتا تھا۔ پہلی ڈگری ایم بی بی ایس کی تھی اور اس نے ایک ایسے میڈیکل کالج سے حاصل کی تھی جو سہولتوں کے لحاظ سے سرکاری اسکول سے بھی گیا گزرا تھا اور اس کی واحد خوبی یہ تھی کہ یہاں سے پڑھنے والے اور نہ پڑھنے والے ایک ہی جیسے گریڈ سے پاس ہوتے تھے۔ کسی زمانے میں پرچہ دینے والے نقل کے دوسرے لوازمات کو جائز قرار دینے کے لیے میز پر ٹی ٹی یا ماؤزر رکھ کر پرچہ حل کرتے تھے۔ اب اس تکلف کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اب نقل، تعلیم اور ڈگری کے لیے ضروریات میں شامل ہو گئی ہے۔

ایم بی بی ایس کرنے اور چار سال سرکاری اسپتالوں میں کام کرنے کے بعد ڈاکٹر اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنا کلینک کھول سکے۔ تعلیم تو اس نے بس ایسے ہی حاصل کی تھی۔ کلینک میں وہی تجربہ کام آیا جو وہ سرکاری اسپتالوں میں حاصل کر چکا تھا۔ چھ سال میں اس کی پریکٹس اتنی جم گئی تھی کہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور سکھر میں اپنا مکان بھی بنا لیا۔ ویسے وہ گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کی پہلی شادی اس وقت ہوئی تھی جب وہ صرف بارہ برس کا تھا مگر شادی کے مفہوم سے کسی قدر آشنا ضرور تھا لیکن عملی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کی بیوی جو اس کی چچا زاد تھی، عمر میں اس سے دس سال بڑی تھی۔ اسے بس تین سال ہی شوہر کا ساتھ ملا۔ ان تین سالوں میں بھی زیادہ وقت تو اللہ بخش کو بڑا ہونے میں لگا۔ پھر وہ کالج میں داخلے کے لیے شہر آ گیا۔ اس کے بعد وہ صرف سالانہ چھٹیوں میں گاؤں جاتا تھا۔ ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اس نے گاؤں کا رخ کرنا چھوڑ دیا۔ بیوی سے اسے پہلے بھی دلچسپی نہیں تھی اور بچے نہ ہونے سے رہی سہی دلچسپی بھی ختم ہو گئی۔ مگر وہ اسے طلاق نہیں دے سکتا تھا۔ یہ ان کی خاندانی روایت میں شامل نہیں تھا۔ اگر وہ بیوی کو قتل کر دیتا تو اس کے چچا زادوں کو کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن اگر وہ اسے طلاق دیتا تو چچا زاد اسے ضرور قتل کر دیتے۔

ساری رات پولیس والے اس سے ایک ہی سوال کرتے تھے کہ اس نے ڈاکو مہر داد کے ساتھ کیا کیا تھا اور وہ انہیں یقین دلاتا رہا کہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ پولیس والے یقین کرنے پر آمادہ نہیں تھے اس لیے انہوں نے زبان کے علاوہ بھی بہت کچھ استعمال کیا۔ جب وہ بے ہوش ہو جاتا تو وہ اسے دوبارہ ہوش میں لاتے تھے۔ صبح اس کی اس دھمکی کے ساتھ جاں بخشی ہوئی کہ رات اسے پھر یہیں آنا ہو گا اور اسے حوالات میں پھینک دیا گیا۔ وہ ایسا بے خبر سویا کہ جب آنکھ کھلی تو رات ہو چکی تھی۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ بس کچھ دیر میں اس کی شامت آنے والی ہے۔ اب تک اسے اس کا جرم نہیں بتایا گیا تھا۔ ایف آئی آر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس تفتیش کے نتیجے میں وہ جان سے گزرا تو پولیس والے اس کی لاش کسی جنگل میں پھینک دیں گے۔

اسے نصف رات سے ذرا پہلے لے جایا گیا اور صبح فجر کی اذان سن کر اس کی گلو خلاصی ہوئی۔ اس روز اسے بہت ندامت ہوئی تھی کہ اس نے بہت کم فجر کی نماز پڑھی تھی۔ اکثر تو اسے اذان سننے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ وہ دو شفٹوں میں کلینک میں بیٹھتا تھا۔ پہلے صبح دس سے دوپہر دو بجے تک۔ اس میں وہ صرف عورتوں اور بچوں کو دیکھتا تھا۔ شام کو چھ سے رات اس وقت تک بیٹھتا تھا جب تک مریض آتے رہتے تھے۔ اس میں جنرل چیک اپ ہوتا تھا، کوئی بھی آسکتا تھا۔ اکثر اسے کلینک بند کرتے اٹھتے اٹھتے ایک بج جاتا تھا اور سوتے سوتے دو بج جاتے تھے۔ اس کی دوسری بیوی شازیہ شہر کی تھی اور اس سے اللہ بخش کے چار بچے تھے۔ دوسری رات سے جانبر ہونے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ مر گیا تو شازیہ چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو اکیلے نہیں پال سکے گی۔ وہ صرف میٹرک پاس تھی لیکن خوب صورت بہت تھی۔ خود اللہ بخش اس کی صورت شکل دیکھ کر لٹو ہوا تھا۔ اسے دوسرا شوہر مل جاتا لیکن اس کے بچوں کو دوسرا باپ نہیں ملتا۔

اب تک کسی نے پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی۔ چھ سالوں میں اس نے شہر میں اچھی خاصی جان پہچان بنا لی تھی اگر شازیہ کو پتا ہوتا کہ وہ پولیس کی تحویل میں ہے تو وہ کوشش کر سکتی تھی۔ کئی وکیل اللہ بخش کے مستقل مریض تھے۔ وہ ان کی مدد لے سکتی تھی لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ پولیس نے اس کے بارے میں بھاپ بھی نہیں نکالی تھی۔ شازیہ اور بچے اس کے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے کہ ان کا شوہر اور باپ اچانک کہاں غائب ہو گیا۔ دو راتوں میں اللہ بخش کا جو حال ہوا تھا، وہ تو تھا ہی اب اسے فکر تیسری رات کی لگ گئی تھی۔ دوسری رات بھی پرچہ امتحان وہی تھا اور اس میں ایک ہی سوال تھا جس کا اللہ بخش کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ اس لیے امتحان ابھی مکمل نہیں ہوا تھا اور آنے والی رات کے خوف سے اسے رہ رہ کر لرز اٹھتا تھا۔ حوالات میں اس کا چرسی ساتھی بار بار اسے مشورہ دیتا تھا۔

”چریا اتنی تکلیف کیوں اٹھاتا ہے بابا.... پولیس سے پوچھ کیا کہنا ہے اور بول دے۔“

اللہ بخش نے آج رات اس مشورے پر عمل کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ ٹھیک بارہ بجنے میں دس منٹ پر حوالات کا دروازہ کھلا اور اسی داروغہ حوالات نے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا جو گزشتہ دو راتوں سے اسے عقوبت خانے لے جانے اور وہاں سے نیم مردہ حالت میں واپس لانے پر مامور تھا۔ اللہ بخش لرزیدہ قدموں سے اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ آج تو اس کی فریاد کرنے کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ مگر خلافِ توقع ڈرائنگ روم کے بجائے اس نے ایک کمرے کی چق اٹھا کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اللہ بخش نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”سائیں، ادھر جانا ہے؟“

”تو کیا تیری ....“ داروغہ کی باقی بات ناقابلِ اشاعت لیکن پولیس نصاب کے عین مطابق تھی۔ اللہ بخش نے اس گالی کا برا نہیں منایا کیونکہ گزشتہ دو راتوں میں وہ اس سے کہیں زیادہ ناقابلِ اشاعت گالیاں سن چکا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا تو سامنے میز کے دوسری طرف اسے ایک ایس پی رینک کا آفیسر دکھائی دیا۔ جبکہ کمرے کے باہر ڈی ایس پی کی تختی لگی تھی۔ اللہ بخش نے اسے سلام کیا اور یوں کھڑا ہو گیا جیسے ابھی اسے سزا سنائی جائے گی۔ جلاد باہر عمل درآمد کے لیے پہلے سے موجود تھا، وہ اندر نہیں آیا تھا۔ مگر یہاں بھی خلافِ توقع سلوک ہوا۔ ایس پی نے نرمی سے پوچھا۔ ”تم ڈاکٹر اللہ بخش ہو؟“

”جی سائیں، میں ہی وہ بدنصیب ہوں۔“ اس نے رقت سے کہا۔

”بیٹھو، میں صرف تمہاری خاطر یہاں آیا ہوں۔“

”مہربانی سائیں، مہربانی۔“ وہ ایک خاص پوز میں کرسی پر بیٹھ گیا کیونکہ نارمل پوز میں بیٹھنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اس کے ذاتی کپڑے تو تھانے آتے ہی اتار لیے گئے تھے اور اسے کسی پرانے قیدی کا پھٹا پرانا کرتہ شلوار دے دیا گیا تھا۔

”تم سے کچھ سوالات کروں گا، تمہاری رہائی کا انحصار ان کے درست جوابات پر ہے۔“

اس نے عاجزی سے کہا۔ ”سائیں، پچھلے دو دن سے مجھ سے ایک ہی سوال کیا جا رہا ہے کہ میں نے مہر داد کے ساتھ کیا کیا۔ میرے پاس ایک ہی جواب ہے، میں نے کچھ نہیں کیا۔ اگر آپ کوئی دوسرا جواب چاہتے ہو تو مجھے بتا دو، میں وہی جواب دے دوں گا۔“

”یہ لوگ جاہل ہیں۔“ ایس پی نے سگریٹ سلگاتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ایس پی نے کلف لگی وردی پہن رکھی تھی اور اس کے سیاہ بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے۔ سانولا رنگ فیشل سے چمک رہا تھا۔ وہ یقیناً اوپر سے آیا ہوا پولیس افسر تھا۔ ”انہیں کسی سے کچھ معلوم کرنے کا ایک ہی طریقہ آتا ہے۔“

”سائیں، میں آپ کے ہر سوال کا جواب دوں گا۔ بس میری یہاں سے جان چھڑا دیں۔ میرے بیوی بچے ہیں، وہ رو رہے ہوں گے میری جان کو۔“

ایس پی نے مبہم انداز میں سر ہلایا اور اپنے سامنے رکھی ایک چھوٹی سی فائل کھولی۔ ”ایک ہفتہ پہلے بارہ مارچ بدھ کی رات تم جعفر آباد سے واپس آ رہے تھے۔“

”جی سائیں، درست ہے۔“ اللہ بخش نے سر ہلایا۔ ”میں اپنے ایک واقف کار کی شادی سے واپس آ رہا تھا۔“

ایس پی نے فائل بند کی اور ذرا آگے جھکا۔ ”واپسی کے اس سفر میں کیا ہوا تھا؟“

☆☆☆

اللہ بخش کے پاس کار تھی۔ یہ چھیاسی ماڈل کی کرولا تھی جو اسے ایک مریض نے بہت سستی دلا دی تھی۔ کار بہترین حالت میں تھی اور ورکشاپ سے نکل کر بالکل نئی لگنے لگی تھی۔ اللہ بخش اس کا نئی نویلی دلہن کی طرح خیال رکھتا تھا۔ وہ چاہتا تو کار میں بھی جا سکتا تھا لیکن اس نے سنا تھا کہ جعفر آباد میں کار چھیننے کی وارداتیں زیادہ ہو رہی ہیں اور وہاں چھینی کار واپس بھی نہیں ملتی۔ اس لیے اللہ بخش نے بس سے جانے کا

فیصلہ کیا۔ اس کا واقف کار زمیندار خاندان سے تھا۔ پیسے والے لوگ تھے اس لیے شادی بڑے پیمانے پر کر رہے تھے۔ انتظامات شاندار تھے اور صبح شام بکرے ذبح ہو رہے تھے اور دیگیں بن رہی تھیں۔ اللہ بخش کے اس واقف کار نے اس سے کچھ دوائیں بھی منگوائی تھیں۔ وہ ساتھ لے گیا تھا۔ یہ مخصوص دوائیں تھیں جو عام دستیاب نہیں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ خاص ادویات تھیں۔

واپسی میں وہ جس بس میں سوار ہوا، وہ خراب بھی تھی اور راستے میں دو بار اس کا ٹائر بھی پنکچر ہوا۔ چھ گھنٹے بعد وہ سندھ کی حدود میں داخل ہوئے۔ جیکب آباد سے آگے نکلتے نکلتے ہی رات ہو گئی تھی۔ یہ سارا علاقہ ڈاکوؤں کی شکارگاہ کے طور پر مشہور تھا اور سیانے لوگ رات کے وقت اس علاقے میں سفر سے گریز کرتے تھے۔ سنسان سڑک پر ان کی اکیلی بس چلی جا رہی تھی کہ اس کا ٹائر تیسری بار پنکچر ہو گیا۔ مسافروں کا غم و غصے سے برا حال ہو گیا لیکن وہ کیا کر سکتے تھے، سوائے صبر کے۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر مل کر ٹائر بدل رہے تھے اور مسافر آس پاس ٹہل کر وقت گزار رہے تھے۔ یہاں جنگل تھا اور جنگل سے جانوروں کی آوازوں کے ساتھ حشرات الارض کا راگ بھی جاری تھا۔ اچانک جھاڑیوں سے ایک بوڑھا آدمی نکلا اور مسافروں کی طرف آیا۔ وہ خستہ حال اور مسکین لگ رہا تھا اس لیے کسی نے خوف نہیں کھایا۔ اس نے عاجزی سے مسافروں سے پوچھا۔

”تم لوگوں میں کوئی ڈاکٹر ہے، میری جوان بیٹی بیمار ہے۔“

اللہ بخش کا اعتراف کرنے کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ ڈاکٹر ہے لیکن یہاں اس کی حسن پرست فطرت آڑے آئی اور جوان بیٹی کا سن کر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ آگے آیا.... ”ہاں بابا میں ڈاکٹر ہوں، کہاں ہے تمہاری بیٹی؟“

مگر اس کے ڈاکٹر ہونے کا اعتراف سنتے ہی بوڑھے کی ساری عاجزی اور کمزوری غائب ہو گئی۔ وہ تن کر کھڑا ہو گیا اور اس نے کڑک کر کہا۔ ”آجاؤ دلیر جوانو.... ڈاکٹر مل گیا ہے۔“

جھاڑیوں سے کوئی درجن بھر دلیر جوان نکلے جنہوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں جدید ترین اسلحہ تھا۔ بے شک وہ کلاشنکوف اور اسی قسم کی جدید رائفلوں سے مسلح تھے جن میں گولیوں کا میگزین لگتا ہے لیکن ڈاکوؤں کا ٹریڈ مارک یعنی کارتوس کی پیٹیاں بھی سینے پر کراس کی شکل میں باندھ رکھی تھیں۔ اللہ بخش سمیت تمام مسافروں کی گھگی بندھ چکی تھی۔ ڈاکوؤں نے کسی سے کچھ نہیں کیا بس اللہ بخش کو گھیر لیا۔ اس نے اپنا اعتراف واپس لینا چاہا مگر ڈاکو اسے ڈاکٹر مان چکے تھے۔ کڑک دار بوڑھے نے اسے ساتھ لے کر چلنے کا حکم دیا۔ اللہ بخش منت سماجت کرتا رہا اور اس وقت کو کوستا رہ گیا جب اس نے ڈاکٹر ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ باقی مسافروں کو فوراً سے پیشتر وہاں سے روانہ ہو جانے کا حکم دے کر ڈاکو اللہ بخش کو اس کے میڈیکل بیگ سمیت جھاڑیوں میں چھپی بڑی سی جیپ تک لائے۔ اسے درمیان میں بٹھا کر وہ سب اس کے چاروں طرف بیٹھ گئے اور جیپ روانہ ہو گئی۔ اس وقت اللہ بخش کی وہی حالت ہو رہی تھی جو درجن بھر خونخوار بلیوں میں گھر جانے والے اکیلے چوہے کی ہوتی ہے۔

روانگی کے دس منٹ بعد اللہ بخش کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی اس لیے وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کس طرف گئے تھے اور کہاں کہاں سے گزرے تھے۔ بس ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بدترین قسم کے کچے راستوں پر سفر کر رہے ہیں۔ ڈھائی گھنٹے کے اس سفر میں اس کا حشر ہو گیا تھا۔ خوف سے پہلے ہی برا حال تھا۔ اب جسمانی حالت بھی ٹھیک نہیں رہی تھی۔ جیپ سے اترنے کے بعد اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کنکریٹ مکسر میں ڈال کر گھمایا جاتا رہا ہو۔ سر چکرا رہا تھا جیسے میٹرک کے دنوں میں پہلی بار سگریٹ پینے سے حال ہوا تھا۔ حواس بحال ہونے اور آنکھوں سے پٹی اترنے کے بعد اس نے ڈاکوؤں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ نہایت غریب قسم کا ڈاکٹر ہے اور انہیں اس کے تاوان میں ہزار روپے بھی نہیں ملیں گے۔

”ہمیں ہزار روپے نہیں چاہئیں۔“ کڑک دار بوڑھے نے جھڑک کر کہا۔

”میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“

”بابا، تم سے کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”یہاں تم کو ایک آدمی کا علاج کرنا ہے۔“

یہ کچا اور بڑا سا احاطہ تھا جس میں بلند اور گھنے درخت تھے۔ الگ الگ جگہوں پر کچی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں اور ان کو بھی بیلوں اور جھاڑیوں کی مدد سے کیموفلاج کیا گیا تھا۔ بوڑھا اللہ بخش کو ایک بڑی سی کچی کوٹھری میں لایا۔ وہاں جنریٹر چل رہا تھا اور احاطے میں بجلی سے روشنی کی گئی تھی۔ کوٹھری میں ایک بڑی سی مسہری پر ایک لمبا چوڑا شخص بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کا کرتہ پیٹ اور سینے سے خون آلود ہو رہا تھا۔ اللہ بخش اسے دیکھتے ہی پہچان گیا۔

☆☆☆

ایس پی جواب تک لاتعلقی سے اللہ بخش کی بات سن رہا تھا بلکہ اسے شبہ تھا کہ وہ سن بھی رہا ہے یا نہیں کیونکہ بہ ظاہر اس کی توجہ اس سے زیادہ سگریٹ کی طرف تھی۔ وہ وقفے وقفے سے اور نہایت انہماک سے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اللہ بخش کو اس کا دھواں اچھا لگ رہا تھا وہ خود بھی عادی سگریٹ نوش تھا اور دو دن سے اس نے ایک سگریٹ بھی نہیں پی تھی بہرحال اسے نکوٹین کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس کے پاس محسوس کرنے کے لیے دیگر تکالیف کی کوئی کمی نہیں تھی پھر جیسے ہی اس نے بے ہوش ڈاکو کا ذکر کیا، ایس پی چونک کر سیدھا ہوا اور اس کی طرف جھکا۔

”تم اسے پہچان گئے تھے؟“

”ہاں سائیں۔“ اللہ بخش نے تھوک نگل کر کہا۔ ”میں اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔“

”کون تھا وہ؟“ ایس پی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔

اس نے دوسری بار تھوک نگلا اور بولا۔ ”سائیں وہ مشہور ڈاکو مہرداد تھا۔“

مہرداد کا تعلق سندھ بلوچستان سرحد پر واقع ایک علاقے قبیلے سے تھا۔ لیکن وہ سندھ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ زرداد دشمنی کی وجہ سے بھاگ کر یہاں چلا آیا تھا۔ اس نے ایک مقامی عورت سے شادی کی اور یہیں بس گیا۔ جس وقت مہرداد صرف بارہ برس کا تھا، اس کے باپ کے دشمن اس گاؤں تک آ پہنچے جہاں زرداد آباد تھا۔ اس نے اور گاؤں والوں نے مزاحمت کی لیکن آنے والے جدید اسلحے سے لیس تھے۔ انہوں نے زرداد کو سب کے سامنے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ وہ تو مہرداد اور اس کی ماں کو بھی مارنا چاہتے تھے لیکن گاؤں والے آڑے آ گئے۔ انہوں نے حملہ آوروں سے کہا۔

”تم نے اپنا دشمن مار دیا۔ وہ تمہارا آدمی بھی تھا اس لیے ہم میں سے کوئی انتقام کے لیے نہیں آئے گا لیکن یہ عورت ہمارے قبیلے سے ہے اور یہ بچہ بھی ہمارے رشتے کا ہے۔ اگر ان کو مارا تو ان کا انتقام ہم پر فرض ہو جائے گا۔“

بات حملہ آوروں کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ مہرداد اور اس کی ماں کو چھوڑ گئے۔ دیکھا جائے تو گاؤں والوں نے مہرداد پر احسان کیا تھا لیکن اس نے اس احسان کے بجائے یہ یاد رکھا کہ گاؤں والوں نے اس کے باپ کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا اور اسے طاقتور دشمنوں کے سامنے اکیلا چھوڑ دیا۔ وہ بچہ تھا اس لیے خاموش رہا لیکن جب وہ جوان ہو گیا اور ڈاکو بن گیا تو اس نے گاؤں والوں کو اپنے جذبات کا اصلی روپ دکھایا۔ سترہ برس کی عمر میں وہ ڈاکوؤں کے ایک چھوٹے گروہ میں شامل ہو گیا۔ عملی تربیت کے بعد صرف بیس برس کی عمر میں وہ پختہ کار ڈاکو بن گیا تھا۔ اس کا نام اس وقت سامنے آیا جب اس نے ایک وڈیرے غلام رسول کی حویلی پر دھاوا بولا اور وہاں آنے والی اس کی بیٹی کی پوری برات کو لوٹ لیا۔ ڈاکوؤں کو کوئی من کے قریب سونا اور لاکھوں روپے ملے تھے۔ یہ بہت بڑا نقصان تھا جو غلام رسول نے بڑی مشکل سے پانچ سال میں ہاریوں پر ٹیکس لگا کر پورا کیا۔

پچیس سال کی عمر میں مہرداد سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے سرحدی علاقوں کا ایک جانا پہچانا اور دہشت ناک نام بن گیا۔ اس نے چن چن کر اپنے باپ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا صرف ان کو نہیں بلکہ جہاں موقع ملا، ان کے خاندان کو بھی ختم کر دیا تھا حالانکہ ان لوگوں نے اسے اور اس کی ماں کو بخش دیا تھا مگر اس کے سینے میں بھڑکتی انتقام کی آگ نے کسی کو نہیں بخشا تھا۔ اس نے تو اپنے ننھیال والوں کو بھی معاف نہیں کیا تھا۔ گاؤں کا رخ کرنے سے پہلے اس نے باپ کے قاتلوں کو ٹھکانے لگایا۔ پھر وہ گاؤں آیا اور اس نے تمام گاؤں والوں پر جرمانہ لگایا۔ اس کی ماں زندہ تھی، جب وہ سفارش کے لیے بیٹے کے پاس آئی تو مہرداد نے اپنے

حق

قمر لبے اپنی بیوہ ماں کی خواہش پر شادی کر ہی بیٹھے۔ کشادہ مکان میں وہ صرف تین نفوس تھے۔ شادی کے پہلے ہفتے میں ہی انہیں احساس ہو گیا کہ شادی نہ کر کے وہ زندگی کی کیسی کیسی نعمتوں سے محروم تھے۔

ہفتہ عشرہ گزرنے کے بعد وہ بیگم سے راز و نیاز کرتے کرتے، ایک دم بولے۔ ”مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کبھی الگ گھر کا مطالبہ نہیں کرو گی۔“

”خدا نہ کرے!“ بیگم نے جھٹ جواب دیا۔ ”اماں نے آپ کو پالا پوسا ہے... آپ پر پہلا حق ان کا ہے... اُن کو کوئی چھوٹا سا فلیٹ دلا دیں... بڑا گھر ہوا تو وہ بے چاری اس کی صحیح طرح دیکھ بھال نہیں کر سکیں گی! میں کون ہوتی ہوں ان سے پہلے گھر لینے والی!“

(اسلام آباد سے عائشہ خرم کی معصومیت)

ساتھیوں سے کہا۔ ''اس عورت کو میں بھول گیا تھا جرمانے میں اس کا نام بھی شامل کرو۔ بے شک یہ میری ماں ہے لیکن ہے تو اس قبیلے سے جس نے میرے باپ کو پناہ دی اور پھر دشمنوں کے سامنے بے یارومددگار چھوڑ دیا۔''

تو یہ تھا مہرداد جس نے اپنی ماں کو بھی نہیں بخشا۔ اس نے پورے گاؤں سے لاکھوں روپے جرمانہ وصول کیا مگر اس پر بھی تسلی نہیں ہوئی تو اس نے گاؤں کے نمبردار کو اپنے ہاتھ سے گولی ماری۔ وہ پندرہ سال سے اس علاقے میں خوف و دہشت کی علامت بنا ہوا تھا۔ علاقے کے لوگ اس سے تنگ تھے مگر کسی میں جرات نہیں تھی کہ اس کے خلاف کھل کر کچھ کہتا۔ وہ چلتی بسوں کو لوٹتا تھا۔ فصل کے دنوں میں زمینداروں سے بھتّا وصول کرتا تھا۔ انکار کرنے والے کی تیار فصل کو آگ لگا دیتا تھا۔ موٹی اسامیوں کو تاوان کے لیے اغوا کرتا تھا۔ پولیس نے دباؤ کی بنا پر کئی بار اس کے خلاف نام نہاد آپریشن کیے۔ نام نہاد یوں کہ جب آپریشن کرنا پڑتا تو پہلے ہی اسے خبردار کر دیا جاتا اور وہ محفوظ علاقے کی طرف نکل جاتا تھا۔ جب تک آپریشن جاری رہتا، وہ وہیں چین کی بانسری بجاتا اور جب آپریشن ختم ہو جاتا تو ان لوگوں کو بجانے آ جاتا جن کی وجہ سے یہ آپریشن ہوتا تھا۔

جیسے جیسے اس کی شہرت و دہشت بڑھ رہی تھی، ویسے ویسے اس کے سر کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ اس بڑھتی قیمت نے کئی بار پولیس والوں کو مجبور کیا اور انہوں نے مہرداد کو مارنے کا دعویٰ کرتے ہوئے حکومت سے یہ قیمت بھی وصول کر لی لیکن دونوں بار مہرداد بالآخر زندہ ثابت ہوا۔ البتہ قیمت وصول کرنے والے پولیس اہلکاروں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ مہرداد نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ بقائے پُرامن باہمی کی پالیسی پر یقین رکھتا تھا۔ نہ پولیس والوں کو چھیڑتا تھا اور نہ ان کا حصہ مارتا تھا۔ مہرداد کے نام کی دہشت تھی لیکن اسے دیکھنے والے بہت کم تھے اور جنہوں نے دیکھا تھا، ان میں سے بہت کم زندہ تھے۔ عام لوگ تو کیا پولیس والوں نے بھی اسے کم دیکھا تھا۔ ریکارڈ میں اس کی چند تصاویر تھیں مگر وہ دھندلی اور غیر واضح تھیں۔ ایس پی کے ذہن میں غالباً یہی سوال تھا کہ جب پولیس والے مہرداد کو نہیں پہچانتے تھے تو ایک عام ڈاکٹر نے اسے کیسے پہچان لیا۔

''تم نے مہرداد کو کیسے پہچانا؟''

''میں نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔'' اللہ بخش نے مبہم انداز میں جواب دیا۔

''کب.....؟ کہاں.....؟''

''مجھے یاد نہیں ہے لیکن میرے کلینک پر آنے والے کسی شخص نے مجھے ایک تصویر دکھائی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ یہ مہرداد ہے۔''

''تم نے پولیس کو اطلاع نہیں دی؟''

''پولیس کو۔'' اللہ بخش بدکا۔ ''سائیں میں ایک فرد کے کہنے میں آ کر پولیس کے پاس دوڑا جاتا تو پہلے خود مارا جاتا۔''

ایس پی سوچ میں پڑ گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا؟''

''جی سائیں۔''

''تم نے ظاہر کیا تھا کہ تم اسے پہچان گئے تھے؟''

''نہیں سائیں، ایسا کر کے میں اپنی موت کو دعوت دیتا۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

☆☆☆

اللہ بخش مہرداد کو دیکھ کر بدحواس ہو گیا تھا اور خیریت گزری کہ اس نے مہرداد کو شناخت کرنے کا اعلان نہیں کیا۔ البتہ اس نے احمقانہ انداز میں کڑک بوڑھے سے پوچھا۔ ''کیا اسے گولی لگی ہے؟''

''ادھر ڈاکوؤں کے ڈیرے میں تمہیں اپنڈکس کا مریض ملے گا؟'' اس نے خفگی سے کہا۔

''مم..... مجھے کیا کرنا ہے؟'' اس نے دوسرا احمقانہ سوال کیا۔ بوڑھا مزید خفا ہو گیا۔

''تو ڈاکٹر ہے یا گھسیارا۔ اس کا علاج کرو اور اسے بچاؤ، اگر یہ نہ بچا تو.....''

''تو.....؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''تو تجھے اس کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کر دیں گے۔''

کسی کے ساتھ قبر میں دفن ہونا اتنا خوفناک نہیں تھا لیکن مہرداد کے ساتھ دفن ہونے کے تصور سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ایک تو دفن کرنے سے پہلے یہ ڈاکو اسے فوت کرتے اور دوسرے ایک ہی قبر میں جب فرشتے حساب کتاب کے لیے آتے تو عین ممکن تھا مہرداد کے ساتھ وہ بھی لپیٹ میں آ جاتا۔ اللہ بخش نے جلدی سے اپنا بیگ کھولا اور بوڑھے سے کہا۔

''مجھے گرم پانی اور ایک صاف بڑے تولیے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چاہئیں۔''

وہاں گرم پانی موجود تھا۔ اسے فوری فراہم کر دیا گیا۔ کچھ دیر میں تولیے کے ٹکڑے بھی آ گئے۔ مہرداد لمبا چوڑا

بھاری بھرکم آدمی تھا۔ اس کے چہرے پر روایتی ڈاکو مارکہ داڑھی مونچھیں موجود تھیں۔ اللہ بخش نے بوڑھے ڈاکو سے کہا۔ ''مجھے ایک مددگار کی ضرورت ہے، اس کے کپڑے اتارنے ہیں۔''

بوڑھے کے کڑکنے پر ایک نوجوان دوڑا آیا۔ صحت میں وہ بھی مہرداد سے کم نہیں تھا۔ اس کی مدد سے اللہ بخش نے مہرداد کی قمیص اتاری۔ اس کے پیٹ اور سینے میں دو گولیوں کے نشان تھے۔ سینے والی گولی تو مسئلہ نہیں تھی کیونکہ وہ ایک پسلی توڑ کر رک گئی تھی لیکن پیٹ میں لگنے والی گولی مسئلہ تھی۔ وہ اندر کہیں گہرائی میں اتر گئی تھی۔ مہرداد کی بے ہوشی کی وجہ یہی گولی تھی اور اس نے شاید جگر کو نقصان پہنچایا تھا۔ اللہ بخش چھوٹی موٹی سرجری کا تجربہ رکھتا تھا جیسا کہ ہر ڈاکٹر کر لیتا ہے لیکن یہ تو باقاعدہ سرجری کا کیس تھا اس کے پاس ڈھنگ کے اوزار بھی نہیں تھے کیونکہ وہ ڈاکٹر تھا سرجن نہیں۔ گرم پانی آیا تو اس نے سب سے پہلے اس میں جراثیم کش دوا ملا کر زخم صاف کیے اور پہلے پیٹ والی گولی کی پوزیشن کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ اس کی فرمائش پر مسہری کے عین اوپر ایک تیز روشنی والے بلب کا بندوبست کر دیا گیا تھا۔

ڈاکوؤں کے پاس سب کچھ تھا۔ دو منٹ میں ایک ڈاکو نے لمبے تار کے سرے پر ہولڈر میں لگا بلب چھت کو سہارا دینے والی لکڑی کی بلی میں لگا دیا۔ دو سو واٹ کا بلب روشن ہوا تو اللہ بخش کو سب صاف نظر آنے لگا۔ اس سب میں وہاں موجود بے پناہ اسلحہ جس سے ایک چھوٹی موٹی فوج کو مسلح کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ تھیلوں میں لوٹ کا مال بھی موجود تھا۔ پہلے نیم تاریکی میں اللہ بخش جتوئی کی کمزور نظر یہ سب دیکھنے سے قاصر تھی اور دیکھنے کے بعد پھیل گئی تھیں۔ کڑک بوڑھے نے اس کی نظریں محسوس کرتے ہوئے پستول نکال لیا۔ اللہ بخش نے اپنی توجہ فوری مہرداد پر مرکوز کر دی۔ بوڑھے نے پستول لہراتے ہوئے کہا۔

''تم نے اپنا کام شروع نہیں کیا بابا۔''

وہ خود باباؤں کا بھی بابا تھا اور اسے بابا کہہ رہا تھا لیکن اللہ بخش اعتراض کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اس نے اپنے پاس موجود اوزار گرم پانی اور جراثیم کش دوا سے صاف کیے اور مہرداد کی سرجری میں لگ گیا۔ وہ گولی کی تلاش میں اندازے سے کام لے رہا تھا کیونکہ اسے آج تک کسی زخم سے گولی نکالنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور گولی بھی خاصی گہرائی میں تھی اس لیے وہ سرجری کے بجائے چیر پھاڑ سے کام لے رہا تھا۔ یعنی زخم مزید بڑا کر رہا تھا۔ اگر مہرداد ذرا بھی ہوش میں ہوتا تو اس حرکت پر اسے کبھی معاف نہ کرتا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ مکمل بے ہوش تھا۔ جیسے جیسے وہ زخم بڑا کر رہا تھا، خون بہنے کی رفتار بڑھ رہی تھی اور وہ تولیے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بار بار خون صاف کر رہا تھا۔ ایک موقع پر اسے خدشہ محسوس ہونے لگا کہ مہرداد گولی کے زخم سے نہیں بلکہ اس کی سرجری سے انتقال کر جائے گا اور اس کے بعد یہ ڈاکو اس کے ساتھ وہی کریں گے جس کا کڑک بوڑھا اعلان کر چکا تھا۔

خدا خدا کر کے وہ گولی تک پہنچنے میں کامیاب رہا اور غیر متوقع طور پر گولی جگر کے پاس گوشت میں پھنسی پائی گئی۔ اس نے جگر کو نقصان نہیں کیا تھا بلکہ حیرت انگیز طور پر کسی بھی اہم عضو کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ گولی نکال کر اس نے اپنی زندگی کا سب سے طویل سکون کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے زخم کی ڈریسنگ شروع کر دی۔ دوسری گولی بہ آسانی نکل آئی۔ وہ سامنے ہی رکی تھی۔ گولی نکال کر اس نے ٹوٹی پسلیوں کو اپنی جگہ سیٹ کر دیا۔ آخر میں اس نے مہرداد کو تین انجکشن دیے۔ ایک اینٹی بایوٹک تھا ایک پین کلر اور ایک اینٹی ٹیٹنس تھا۔ موسم ہلکا سا سرد تھا لیکن اللہ بخش یوں پسینے پسینے ہو رہا تھا جیسے جون کی گرمی میں آپریشن کیا ہو۔ کڑک بوڑھا غور سے سب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اعتراض کیا۔ ''سردار کا خون بہہ رہا ہے۔''

''کچھ خون بہے گا۔'' اللہ بخش نے اپنا پسینا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد رک جائے گا۔ یہ ہوش میں آئے تو اسے دودھ میں دیسی گھی ملا کر دینا۔ اس سے طاقت ملے گی۔''

''ٹھیک ہے بابا ابھی تو یہیں ہے، دیکھ لے گا۔'' کڑک بوڑھے نے اطمینان سے کہا تو وہ گھبرا گیا۔

''مجھے کیوں روکتے ہو سائیں، میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔''

''پر یہ ابھی ہوش میں کہاں آیا ہے۔ جب یہ ہوش میں آئے گا اور ٹھیک لگے گا، تب تجھے جانے کی اجازت ملے گی۔''

یہ سن کر اللہ بخش کو دوبارہ پسینے آنے لگے۔ یہ سوچ کر کہ مہرداد ہوش میں آئے گا اور پھر اسے دیکھے گا اور اس کے بعد اسے کبھی واپس جانے کا موقع نہیں ملے گا۔

☆☆☆

ایس پی کی آواز پر وہ گڑبڑایا۔ ''جی سائیں..... معافی سائیں، میں سن نہیں سکا۔''

ایس پی کے چہرے کے خطوط بگڑے تھے مگر اس نے "اعلیٰ ظرفی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بات دہرائی۔
"مہر داد کا آپریشن کامیاب رہا تھا؟"
"جی سائیں، اسے آپریشن تو نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ میں ڈاکٹر ہوں سرجن نہیں ہوں۔ پر اللہ نے مہربانی کی اور میں نے گولی نکال دی۔ اس کے کسی اہم عضو کو نقصان نہیں ہوا تھا۔"
"خون بہت زیادہ نکلا تھا؟"
"نہیں سائیں، وہ جتنا ہٹا کٹا تھا، اتنا خون نہیں نکلا تھا۔ اتنا خون تو عام آدمی کا نکل آئے تو اسے بھی کوئی خطرہ نہیں ہوتا ہے۔"
ایس پی سوچ میں پڑ گیا۔ اللہ بخش اسے دیکھ رہا تھا اسے اب تک اندازہ نہیں تھا کہ پولیس نے اسے کیوں اٹھایا ہے اور کیوں اس سے دوراتوں تک ایک ہی سوال کرتی رہی اور اب یہ ایس پی اس سے سوالات کر رہا تھا۔ ان کا مقصد کیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"سائیں، ایک سوال کرسکتا ہوں؟"
"کیسا سوال؟"
"سائیں، مجھے کیوں اٹھایا گیا ہے اور مجھ سے مہر داد کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟ اس رات کے بعد میں نے اسے دیکھا بھی نہیں۔"
ایس پی نے جواب میں دوسری سگریٹ سلگائی اور دھواں خارج کرتے ہوئے الٹا اس سے پوچھا۔ "جب تم نے مہر داد کے جسم میں موجود گولی نکال دی تو پھر کیا ہوا تھا؟"

☆☆☆

مددگار ڈاکو بوڑھے کے اشارے پر اسے ایک اور کوٹھری میں لے گیا۔ "ابھی یہاں آرام سے بیٹھو۔"
وہاں فرش پر سوائے خاک کے کچھ نہیں تھا۔ لیکن ڈاکوؤں کے ڈیرے پر اگر آپ صحیح سلامت اور زندہ تھے تو یقیناً آرام سے تھے۔ وہاں تکلیف کیا ہوتی ہے، اللہ بخش نے کچھ دیر بعد اس کا نمونہ بھی دیکھ لیا۔ اسے بیٹھے ابھی نصف گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ باہر شور اور کسی کی فریادیں بلند ہوئیں۔ اس نے اٹھ کر باہر جھانکا۔ چار پانچ ڈاکوؤں نے ایک آدمی کو گھیر رکھا تھا اور اسے بے دریغ رائفل کے بٹوں اور ٹھڈوں سے مار رہے تھے۔ وہ بچنے کی کوشش کرتے ہوئے زمین پر لوٹ رہا تھا اور فریاد کر رہا تھا۔ اس کی چیخیں اندر تک صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس کی آواز میں ایسا درد اور خوف تھا کہ اللہ بخش کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

"سائیں میں نے کچھ نہیں کیا..... میرے کو [illegible] دو..... میں نے کچھ نہیں کیا..... میرے چھوٹے چھو[illegible] بچے ہیں۔"
"ان کو بھی یہاں لائیں گے اور تیرے سامنے [illegible] ڈالیں گے۔" ایک ڈاکو نے کہتے ہوئے اس کے سر [illegible] تو وہ جھول کر گرا لیکن نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی [illegible] فریادیں جاری تھیں۔ وہ معافی کی درخواست کر رہا تھا۔ [illegible] میں بوڑھا اندر سے نکل آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مہر داد کے گروہ میں اس کی حیثیت نائب کی سی ہے۔ اس وقت [illegible] اس کے احکامات پر عمل کر رہے تھے۔ صحن میں پھیلی تیز [illegible] میں سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھے نے زمین [illegible] پڑے آدمی کو دیکھا جس کا منہ ناک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ خون اور مٹی نے اس کے پورے سر کو ایک رنگ کر دیا تھا۔ بوڑھے نے سفاک مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
"بابا، یہ پکڑا گیا نا۔"
"بچ کر کہاں جاتا۔" ایک ڈاکو نے فخر سے کہا۔ "چوہے کی طرح پکڑ کر لے آئے۔"
"کام بھی اس نے چوہے والا کیا تھا۔ ایک مخبر [illegible] پکڑوانے کی کوشش کی۔ مہر داد کو کچھ نہیں ہوگا لیکن اب اس کے بیوی بچے ساری عمر اسے روئیں گے۔ اسے ہوش میں لاؤ۔"
ایک ڈاکو نے بالٹی میں بھرا پانی اس پر ڈالا تو وہ ہوش میں آ گیا۔ کڑک بوڑھے کو دیکھ کر وہ اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ "سائیں مجھے معاف کر دو..... مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ دیکھو اللہ سائیں بھی معاف کر دیتا ہے۔"
"وہ اللہ سائیں ہے لیکن ہم بہت گناہ گار بندے ہیں۔" بوڑھے نے کہتے ہوئے اپنا پستول نکالا۔ "ہم سے رحم نہ مانگ آسان موت مانگ مگر تجھے وہ بھی نہیں ملے گی۔"
بوڑھے نے کہتے ہوئے آدمی کے ایک پاؤں میں گولی ماری۔ اس کی چیخ ڈاکوؤں کے بلند و بالا اور وحشیانہ قہقہوں میں دب گئی تھی۔ اللہ بخش کانپ اٹھا اسے لگا جیسے کوئی فلم دیکھ رہا ہو۔ مگر یہ فلم نہیں تھی، اصل منظر تھا۔ اب [illegible] زخمی کے اردگرد رقص کر رہے تھے اور وہ اپنا پاؤں تھامے رونے کے انداز میں کراہ رہا تھا اور پھر زمین پر دراز ہو گیا۔ کوئی دس منٹ بعد بوڑھے نے اس کے دوسرے پاؤں میں گولی ماری۔ اس بار بھی ڈاکوؤں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اسی طرح دس دس منٹ کے وقفے سے وہ اسے گولیاں [illegible] رہا۔ اللہ بخش سے یہ سب دیکھا نہیں جا رہا تھا لیکن

دروازے کے پاس سے ہٹ بھی نہیں سکا۔ اس میں سکت نہیں رہی تھی۔ اس کا رواں رواں لرز رہا تھا۔ چاروں ہاتھوں پاؤں میں گولیاں کھانے کے بعد اس میں بالکل سکت نہیں رہی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ بوڑھے نے آخری گولی اس کے سر میں اتار دی۔ وہ بے ہوشی میں تڑپا اور مر گیا۔
"اس کتے کی لاش جنگل میں پھینک دو۔ جانوروں کو بھی کچھ گوشت ملے گا۔" کڑک بوڑھے نے حکم دیا اور مہر داد والے کمرے میں چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے کسی انسان کو نہیں، کیڑے کو مارا تھا۔ دو ڈاکو مرنے والے کی لاش ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے لے گئے۔ اب صحن خالی تھا اور اللہ بخش کو لگ رہا تھا اس نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔ وہ پیچھے ہٹا تو اس کے پاؤں کانپ رہے تھے۔ یہ منظر دیکھنے کے بعد اسے اپنی عافیت مزید خطرے میں دکھائی دے رہی تھی۔ ان ڈاکوؤں میں اتنا ہی رحم تھا جتنا ملک کے حکمرانوں میں حب الوطنی اور ایمان داری پائی جاتی ہے۔ اپنی متوقع وفات کے تصور سے اس کا دل بھر آیا اور وہ کوٹھری کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ وہ سخت مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اگر مہر داد ہوش میں نہ آتا تب بھی اس کی کم بختی تھی اور ہوش میں آجاتا تو زیادہ کم بختی ہوتی۔
وہ دل ہی دل میں اپنی زندگی کی دعا کر رہا تھا اور اس وقت وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ مہر داد ہوش میں آجائے لیکن اس کے حواس بحال نہ ہوں اور وہ اسے پہچان نہ پائے۔ ایک یہی صورت تھی کہ اس کے بچنے کا کچھ امکان ہوتا۔ اگرچہ اب اسے یہ خدشہ بھی ہو چلا تھا کہ مہر داد اسے پہچانے یا نہ پہچانے وہ اسے چھوڑے گا نہیں۔ وہ اس کے اڈے تک آ گیا تھا۔ اسے بالکل علم نہیں تھا کہ یہ اڈا کہاں ہے مگر ڈاکو شک کرسکتے تھے کہ وہ ان کے اڈے کے محل وقوع سے واقف ہو گیا ہے اور اس کے بعد وہ اسے کہاں جانے دیتے۔ خطرہ مول لے کر اسے چھوڑنے سے زیادہ آسان کام یہ تھا کہ اسے گولی مار کر جنگل کے جانوروں کے لیے کچھ گوشت اور مہیا کر دیا جاتا۔ یہ سوچ کر اس کی حالت غیر ہو گئی اور وہ سسک سسک کر رونے لگا۔
اس کے بعد اس کی بیوی اور بچے کیا کرتے؟ اسے زیادہ خیال اپنے بچوں کا تھا۔ خاص طور سے چھوٹی بیٹی میں اس کی جان تھی۔ اکثر اسے کلینک میں دیر ہو جاتی تھی لیکن ماریا اس کا انتظار کرتی تھی اور اسے دیکھ کر ہی سوتی تھی۔ اسے پتا نہیں چلا کہ وہ کب کچی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے سو گیا۔ اچانک دروازہ دھماکے سے کھلا اور اس کی آنکھ بھی کھل

گئی۔ دروازے پر مددگار ڈاکو کو دیکھ کر اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اسے پہلا خیال یہی آیا کہ مہر داد گزر گیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہوا ہے اور اب اس کی شامت قریب ہے۔ مددگار ڈاکو نے اسے باہر آنے کا حکم دیا۔ وہ اٹھ کر لرزاں قدموں سے باہر آیا۔ "جی سائیں؟"
"چل تیرے کو سردار نے بلایا ہے۔"
یہ سن کر اس کا خون پھر خشک ہو گیا تھا کہ اسے سردار نے بلایا ہے۔ یعنی مہر داد کو ہوش آ گیا تھا اور وہ اپنے حواسوں میں تھا تبھی تو اس نے اللہ بخش کو طلب کیا تھا۔ وہ مرے قدموں سے مددگار ڈاکو کے ساتھ مہر داد والی کوٹھری کی طرف بڑھا۔ اندر کڑک بوڑھا موجود تھا اور مہر داد ہوش میں آ گیا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ تیز روشنی والا بلب بجھا دیا گیا تھا اور اب وہاں ہلکی روشنی کا بلب روشن تھا۔ کوٹھری پہلے کی طرح نیم تاریک ہو گئی تھی۔ مہر داد سر کے نیچے ایک بڑا تکیہ لگائے پیتل کے جہازی سائز گلاس میں دودھ میں دیسی گھی ملا کر پی رہا تھا اور اس کی حالت خاصی بہتر لگ رہی تھی۔ چہرے سے وہ پوری طرح حواس میں لگ رہا تھا۔ اس نے اندر تک اتر جانے والی نظر سے اللہ بخش کو دیکھا اور غراتی آواز میں پوچھا۔
"تو ڈاکٹر ہے؟"
"جی سائیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کا چہرہ زیادہ نمایاں نہ ہو۔
"کہاں کا رہنے والا ہے؟"
"شکارپور کا سائیں۔" اس نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اگر وہ سکھر کہہ دیتا تو اس کا امکان تھا کہ مہر داد کو یاد آ جاتا۔ مگر شکارپور کے نام پر اس نے ردعمل ظاہر نہیں کیا... اور نہ ہی ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے اللہ بخش کو پہچانا ہے۔ ابھی تک کسی نے اس کا نام نہیں پوچھا تھا اور وہ نام غلط بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے پاس شناختی کارڈ تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ اس پر پتا گاؤں کا لکھا ہوا تھا۔
"کہاں سے آ رہا تھا؟"
"سائیں ادھر بلوچستان میں ایک واقف کار کے گھر شادی میں گیا تھا، وہاں سے آ رہا تھا۔"
"میں نے جوان بیٹی کی بیماری کا کہا تو فوراً میرے ساتھ آنے پر راضی ہو گیا۔" کڑک بوڑھا ہنسا۔
اب تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے کہ مہر داد نے اسے پہچان لیا ہے اس لیے اللہ بخش کا خوف کم ہوا اور اس نے گھگیائی ہوئی آواز میں التجا کی۔ "سائیں اب آپ بالکل

ٹھیک ہیں۔ تین چار دن آرام کرو گے اور سفر سے گریز کرو گے تو بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"تو نہیں جاسکتا۔" کڑک بوڑھے نے اس بار کڑک کر کہا۔

"کیوں سائیں؟" اللہ بخش نے فریاد کی۔ اس کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔

"جب تک سردار ٹھیک نہیں ہو جاتا تو یہاں سے نہیں جاسکتا۔"

"سائیں بالکل ٹھیک ہے، بس آرام کرے گا اور دوائی کھائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"دوائی کہاں ہے؟"

اس کے پاس بیگ میں اینٹی بایوٹک کیپسول اور پین کلر موجود تھی۔ وہ اس نے کڑک بوڑھے کو دکھائیں۔ "یہ دوا ایک ایک کیپسول اور دو گولی دن میں تین بار لینی ہے۔ بس تین دن میں سائیں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تو اتنا گبرو جوان ہے۔" اللہ بخش کا لہجہ خوشامدانہ ہو گیا۔ "اس کے لیے تو معمولی زخم ہے۔"

خوشامد نے کام کیا اور مہر داد نے کڑک بوڑھے سے کہا۔ "اسے واپس بھیج دو۔"

"پر سائیں ...."

"جو کہا ہے وہ کرو۔" مہر داد غرایا۔ "اسے ابھی بھیج دو اور بندے حفاظت سے کسی بس پر سوار کرا کے آئیں۔"

اللہ بخش کو اپنے کانوں اور اپنی خوش بختی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ مہر داد کے حکم سے پہلے بھی اس کے خیال میں اس کے بچنے کا امکان آدھا آدھا تھا۔ کڑک بوڑھے کو مہر داد سے اتفاق نہیں تھا مگر سردار وہ تھا اور اس کا حکم ماننا لازم تھا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے اللہ بخش کو دیکھا۔ غالباً وہ دل میں اس کے لیے کوئی انجام سوچ چکا تھا لیکن مہر داد نے معافی اور واپسی کا اعلان کر کے اس کا منصوبہ خراب کر دیا تھا۔ وہ بیگ اٹھا کر جانے لگا۔ وہ دروازے پر پہنچا تھا کہ مہر داد نے عقب سے آواز دی۔ "ڈاکٹر رک جا۔"

اللہ بخش کی امیدوں کا باغ کھل کھلا کر سرسبز بھی ہو چکا تھا مگر مہر داد کے ایک جملے سے اچانک ہی وہ مرجھا گیا۔ اس نے مڑ کر مرے ہوئے انداز میں پوچھا۔ "جی سائیں؟"

"تو کیسا ڈاکٹر ہے، اپنی فیس چھوڑے جا رہا ہے۔ ہم ڈاکو بھی بعض اوقات بندے کو چھوڑ دیتے ہیں پر تم ڈاکٹر لوگ تو آدمی کی کھال بھی اتروا لیتے ہو۔"

"سائیں آپ سے فیس کیسی؟"

"ہم کسی سے مفت کام نہیں لیتے۔" مہر داد نے کہا اور نوٹوں کی ایک گڈی اس کی طرف اچھال دی۔ اللہ بخش کا منہ کھل گیا۔ یہ ہزار کے نوٹ والی گڈی تھی۔ اسے ایک لاکھ روپے فیس دی جا رہی تھی۔ اس کی قسمت واقعی عروج پر تھی۔

"شکریہ سائیں، بہت شکریہ۔" اس نے جلدی سے کہا اور جھک کر ہاتھ جوڑتا ہوا کوٹھری سے نکل گیا۔

کڑک بوڑھا اس کے ساتھ باہر آیا تھا اور اس نے اللہ بخش سے کہا۔ "سن ڈاکٹر، یہاں جو دیکھا اور کیا ہے اسے بھول جانا۔"

"سائیں، میں آج کی رات ہی اپنی زندگی سے نکال دوں گا۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"اس میں تیری بہتری ہے۔ شکار پور یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ شکار پور کیا تو اس پورے ملک میں کہیں ہم سے نہیں بچ سکتا اور پولیس کے پاس جانے کی غلطی مت کرنا، وہ خود سردار کی نمک خوار ہے۔"

اللہ بخش اسی دھرتی کا رہنے والا تھا اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس کس کی وفادار ہوتی ہے۔ کڑک بوڑھے نے اسی مددگار ڈاکو کو حکم دیا کہ وہ ایک اور بندے کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو نزدیکی سڑک پر کسی بس پر بٹھا دے۔ اسے سر پر تھیلا چڑھا کر جیپ میں بٹھایا گیا اس تھیلے کی وجہ سے کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ یہ جگہ یا راستہ دیکھ سکے۔ جیپ دو گھنٹے تک اونچے نیچے راستوں سے گزرتی رہی اور صبح کے قریب وہ سڑک کے ساتھ تھے۔ روشنی کے ساتھ ہی پہلی بس نمودار ہوئی اور ڈاکوؤں نے اسے بس میں سوار کرا دیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ شکار پور میں تھا۔ وہاں سے اس نے سکھر جانے والی بس پکڑی تھی۔

☆☆☆

اللہ بخش نے ایس پی کو بہت سی باتیں نکال کر کہانی سنائی تھی۔ خاص طور سے رقم والی بات اور یہ کہ مہر داد اسے شناخت کر سکتا تھا، گول کر گیا تھا۔ اگر وہ یہ بتا دیتا تو اس سے کچھ نئے سوالات سامنے آتے اور اس کے پاس ان سوالوں کے جواب تو تھے لیکن وہ دے نہیں سکتا تھا۔ ایس پی خاموشی سے سن رہا تھا۔ درمیان میں اس نے ایک بار بھی مداخلت نہیں کی تھی۔ جب اللہ بخش خاموش ہو گیا تو ایس پی نے تیسری سگریٹ سلگائی اور سر ہلا کر بولا۔ "اچھی کہانی ہے۔ تم نے اپنی بچت کے سارے پہلو مدنظر رکھے ہیں۔"

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں سائیں، میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے۔"

"بکومت۔" ایس پی کا موڈ خراب ہوگیا۔ "تم نے جھوٹ نہیں بولا ہے لیکن پورا سچ بھی نہیں بولا ہے۔"

"سائیں، میں قسم کھاتا ہوں۔"

"قسم مت کھاؤ کیونکہ ہم پولیس والے قسم پر اعتبار نہیں کرتے۔" ایس پی نے راکھ جھاڑ کر درشت لہجے میں کہا۔ "تم جانتے ہو دو دن پہلے مہرداد مرگیا تھا اور اس کے ساتھیوں نے اسے خاموشی سے دفنا دیا ہے۔"

اللہ بخش کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ اس نے تھوک نگل کر کہا۔ "مہرداد مرگیا۔"

ایس پی نے سر ہلایا۔ "اس کی موت چھپائی گئی تھی۔ لیکن پولیس نے اس کی لاش نکلوالی ہے اور اس کا پوسٹ مارٹم بھی ہوا ہے۔ کل اخبارات میں اس کی موت کا اعلان بھی کر دیا گیا ہے۔"

"تب سائیں یہ تو پولیس کی کامیابی ہے۔" اللہ بخش نے جلدی سے کہا۔ "اس پر انعام بھی تو ہے۔"

مہرداد پر جتنا انعام تھا، اس سے زیادہ تو ہر مہینے اس کی طرف سے پولیس والوں کو ملتا تھا۔ بھلا روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو کون ذبح کرسکتا ہے۔ ایس پی نے اس بات پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے کہا۔ "تمہارا کہنا ہے کہ تم نے گولی نکال دی تھی اور اس کا زخم ٹھیک تھا مگر وہ مرگیا۔"

"سائیں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مہرداد کی قضا آئی ہو گی۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "ہوسکتا ہے اس نے کوئی بداحتیاطی کی ہو اور زخم خراب ہوگیا ہو۔"

ایس پی نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس نے کوئی بداحتیاطی نہیں کی تھی۔ جب تم نے آپریشن کیا تو اس کے بارہ گھنٹے بعد اس کی طبیعت بگڑنا شروع ہوگئی تھی۔ چوبیس گھنٹے بعد وہ بے ہوش ہوگیا اور اڑتالیس گھنٹے میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس کے ساتھیوں نے ڈاکٹر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہے۔ وہ اسے کسی اسپتال بھی نہیں لے جاسکتے تھے اس لیے بے بسی سے اسے مرتا دیکھتے رہے۔"

"سائیں، اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بھی بے بسی سے مرے تھے۔" اللہ بخش نے آہستہ سے کہا تو ایس پی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"تم جانتے ہو مہرداد کی موت کیسے واقع ہوئی ہے؟"

"نہیں سائیں۔" اس نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔

"پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اس کے جگر پر ایک بہت تیز اثر کیمیکل جما ہوا پایا گیا اور اسی کیمیکل کے اثر سے اس کی موت واقع ہوئی۔ عام طور سے یہ کیمیکل کیڑے مارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے یہ کیمیکل اس نے غلطی سے کھالیا ہو۔"

"ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ کیمیکل کھانے کی صورت میں وہ خالص حالت میں جگر تک نہیں پہنچ سکتا ہے بلکہ جگر اسے تبدیل کر کے اپنے اندر ذخیرہ کرتا ہے۔ مہرداد کے جگر پر موجود کیمیکل خالص حالت میں تھا اور اسی وجہ سے وہ اڑتالیس گھنٹے میں جگر کی خرابی سے مرگیا۔" ایس پی نے تفصیل سے بتایا۔ اب تک کی گفتگو میں یہ اس کا سب سے طویل جملہ تھا۔ "سوال یہ ہے کہ زہر اس کے جگر تک کیسے پہنچا؟"

اس اچانک جملے پر اللہ بخش گڑبڑا گیا۔ "سائیں میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

ایس پی کچھ دیر اسے تیز نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے فائل کھول کر اس میں رکھا ہوا ایک اخباری تراشہ دیکھا۔ تراشہ ایک مقامی سندھی زبان کے اخبار کا تھا۔ اس نے کہا۔ "آج سے چھ مہینے پہلے سکھر شہر میں ایک کلینک آنے والی ایک نوجوان لڑکی کو کچھ افراد اغوا کر کے لے گئے تھے۔ لیکن اس واقعے کی کہیں رپورٹ نہیں کی گئی اور نہ ہی لڑکی کے اغوا کی رپورٹ کرائی گئی۔ البتہ اس واقعے کے بعد شہر سے باہر جنگل کے کنارے ایک لڑکی کی لاش ملی تھی۔ جانوروں نے لاش کو تقریباً کھالیا تھا اور صرف ہڈیاں باقی بچی تھیں۔ پوسٹ مارٹم سے صرف اتنا پتا چلا کہ وہ کسی نوجوان لڑکی کی لاش تھی۔ کوئی وارث سامنے نہیں آیا اس لیے سکھر کے ایک ڈاکٹر نے رضاکارانہ اس کی تدفین کی ذمے داری قبول کرلی اور وہ ڈاکٹر تم تھے۔"

"یہ...... یہ کام میں نے صرف انسانی ہمدردی میں کیا تھا۔" اللہ بخش نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "میں اس سے پہلے بھی کئی لاوارث ملنے والی لاشوں کی تدفین کرا چکا ہوں۔"

ایس پی نے سر ہلایا اور فائل بند کردی۔ "ڈاکٹر اب ہم کچھ ان آفیشل بات کریں گے۔ میرا اس کیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں حیدرآباد سے صرف تمہاری خاطر یہاں آیا ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پولیس نے تمہیں مہرداد کی وجہ سے اٹھالیا ہے۔" وہ کہتے ہوئے جھکا۔ "میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ چھ مہینے پہلے تمہارے کلینک پر کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

☆☆☆

بشریٰ کریم ایک غریب اور معمولی سی لڑکی تھی۔ اس کا واحد اثاثہ اس کی خوب صورتی تھی لیکن اس کا یہ اثاثہ اس کے کسی کام آنے کے بجائے الٹا اس کے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ وہ دو سال کی تھی کہ اس کا باپ جو ریلوے میں ملازم تھا، ایک دن غلطی سے پٹری پر گر گیا اور آنے والی ٹرین کے نیچے آکر اس کے ٹکڑے ہوگئے۔ اس کے بعد اس کی ماں محنت کر کے اس کا اور اپنا پیٹ بھرنے لگی۔ وہ ایک چھوٹی سی گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ اسے سلائی نہیں آتی تھی، اس کا کام تیار ملبوسات کے اضافی کونے کھدرے کاٹنا تھا۔ کام معمولی تھا اس لیے معاوضہ بھی معمولی ملتا تھا۔ بس گھر اپنا تھا اس لیے بھوکے رہ کر بھی گزارہ ہوجاتا تھا۔ بشریٰ بڑی ہوئی تو ماں کو اس کی فکر لگ گئی۔ وہ بچپن سے بہت پیاری اور معصوم صورت لڑکی تھی۔ وہ اس کی حفاظت پہلے بھی کرتی آئی تھی لیکن اب اس کی دن رات کی نیند و چین حرام ہوگیا تھا۔ انہی فکروں کی وجہ سے وہ بیمار پڑ گئی اور جب روز روز چھٹی کرنے لگی تو اسے ملازمت سے جواب مل گیا۔ وہ صحت کے ہاتھوں مجبور ہوگئی تھی، مجبوراً اس کی جگہ بشریٰ کام کرنے لگی۔

بشریٰ گھر سے نکلی تو ہر ایرے غیرے کی نظر اس پر پڑنے لگی۔ مگر یہ عام لوگ تھے جو بس دیکھ سکتے تھے، بہت ہوا تو آتے جاتے کوئی جملہ کس دیا۔ اس سے زیادہ کی ان میں ہمت نہیں تھی بشریٰ جانتی تھی اس لیے زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔ ان دنوں صغریٰ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ اسے اللہ بخش کے کلینک لائی اور اس نے پہلی بار بشریٰ کو دیکھا۔ اللہ بخش حسن پرست تھا۔ وہ اس سے متاثر ہوا لیکن یہ تاثر ایسا نہیں تھا کہ وہ سب بھول کر اس کے پیچھے لگ جاتا۔ وہ پہلے ہی دو بار کا شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ پھر اس کی اور بشریٰ کی عمر میں دگنا فرق تھا۔ وہ اٹھارہ برس کی تھی اور اللہ بخش پینتیس برس کا تھا۔ اس لیے بھی اس نے دل پر جبر کیا اور اپنی پسند کو بس اپنی حد تک رکھا۔

وہ صغریٰ کا علاج بہت توجہ سے اور بغیر فیس کے کرنے لگا تھا۔ اس پر دونوں ماں بیٹی اس کی احسان مند ہوگئیں پھر وہ ان سے خوش اخلاقی سے اور اچھی طرح پیش آتا تھا۔ سب سے بڑھ کر اس نے بشریٰ کو ہوس کی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا اس لیے وہ ماں بیٹی اس پر اعتماد کرنے لگی تھیں۔ بشریٰ اس سے ہنسی مذاق بھی کرلیتی تھی بلکہ ایک دو بار اس نے محسوس کیا کہ وہ اسے پسند بھی کرتی ہے لیکن اس نے ہمیشہ اسے اپنا وہم سمجھا۔ وہ خوش شکل اور ہینڈسم تھا۔ بس رنگ سانولا تھا مگر بشریٰ تو بہت زیادہ حسین تھی۔ بالکل گلاب کا کھلا ہوا نو دمیدہ پھول سا۔ ویسی رنگت اور ویسی ہی خوشبو تھی۔ وہ اللہ بخش پر اعتماد کرتی تھی۔ اگر صغریٰ کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی تو وہ اس کی دوا لینے کلینک پر اکیلے بھی آجاتی تھی۔ اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک دن اللہ بخش نے شام کے وقت کلینک کھولا تھا کہ گھبرائی ہوئی بشریٰ وہاں آگئی۔ وہ چونکا۔ "کیا ہوا بشریٰ خیر تو ہے؟"

"ڈاکٹر صاحب میں فیکٹری سے گھر جارہی تھی کہ یہاں سے کچھ دور ایک کالی جیپ میں بیٹھے ایک آدمی نے مجھے آواز دی۔ وہ مجھے ساتھ چلنے کو کہہ رہا تھا۔ میں ڈر کر بھاگی اور ادھر آگئی۔"

"کون تھا وہ؟" اللہ بخش کو غصہ آگیا۔ اس نے باہر نکل کر دیکھا لیکن کالی جیپ جاچکی تھی۔ اس نے اندر آکر بشریٰ کو تسلی دی۔ "فکر نہ کرو، کوئی ایسے ہی بدمعاش ہوگا...... بھاگ گیا ہے۔"

مگر بشریٰ اتنی ڈری ہوئی تھی کہ اس نے اکیلے گھر جانے سے انکار کردیا اور وہ اسے چھوڑ کر آیا۔ اللہ بخش کو یہ سب اچھا لگا تھا۔ وہ خود کو ایسا ہیرو محسوس کررہا تھا جس نے حسین ہیروئن کو غنڈوں سے بچالیا تھا۔ بشریٰ نے جس طرح شرماتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا تھا، یہ ادا بھی اس کے دل میں اتر گئی اور اسے پہلی بار اپنی دوسری شادی پر افسوس ہوا۔ اگر اس نے دوسری بار شادی نہ کررکھی ہوتی تو فوراً بشریٰ کی ماں سے اس کا ہاتھ مانگ لیتا۔ اسے یقین تھا کہ وہ کبھی انکار نہ کرتی۔ وہ جوان اور اچھی حیثیت کا آدمی تھا۔ ان ماں بیٹی کو اور کیا چاہیے تھا؟ مگر اب وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ شازیہ کو بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا اور بچوں کو تو بالکل نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ شازیہ اس کی حسن پرستی سے واقف تھی اس لیے بارہا اسے وارننگ دے چکی تھی کہ اگر اس نے تیسری شادی کا سوچا بھی تو وہ مٹی کا تیل چھڑک کر خود کو اور بچوں کو آگ لگادے گی۔ اللہ بخش جانتا تھا وہ ایسا ہی کرتی۔ وہ بہت ضدی اور نخرے والی عورت تھی۔

یہ سب جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی اس کا بشریٰ کی طرف میلان بڑھتا جارہا تھا۔ اس نے اس سے کہا تھا کہ وہ کوئی خطرہ محسوس کرے تو فوراً اسے بتائے یا اس کے پاس آجائے۔ یہ کالی جیپ نظر آنے کے کوئی ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ اس روز شدید بارش ہوئی تھی اور سڑکوں گلیوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ بیمار بھی گھروں میں دبکے ہوئے تھے اور کلینک پر سناٹا تھا اور وہ دس بجے کلینک بند کررہا تھا کہ بشریٰ آگئی۔ اسے پریشان دیکھ کر وہ بولا۔ "خیریت پھر کوئی پیچھے آیا ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب، اماں کی طبیعت خراب ہے۔

بہت کھانسی ہو رہی ہے۔"

"تم بیٹھو، میں دوائیں رکھ لوں۔" اس نے کہا اور کلینک کے فارمیسی والے حصے میں آیا۔ بہت ساری عام دوائیں وہ کلینک میں رکھتا تھا۔ اسے سستی یا مفت میں مل جاتی تھیں اور فیس کے علاوہ اس سے بھی کماتا تھا۔ وہ ممکنہ دوائیں بیگ میں رکھ رہا تھا کہ اچانک باہر سے بشریٰ کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ وہ تڑپ کر باہر آیا کہ کسی نے اس کے سر پر کچھ مارا، وہ نیچے گرا۔ اس نے دیکھا کہ بشریٰ کو ایک تنومند بڑھی ہوئی داڑھی مونچھوں والے آدمی نے گرفت میں لے رکھا تھا اور اس کا منہ آدمی کے چوڑے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ اللہ بخش پر وار کرنے والا کوئی اور شخص تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ پھر اس نے بشریٰ کو پکڑنے والے شخص کو قریب آتے دیکھا۔ اس نے جھک کر غراتی آواز میں کہا۔

"میرا نام مہرداد ہے۔ میں اس لڑکی کو لے جا رہا ہوں۔ اگر اس بارے میں کسی سے کچھ کہا یا پولیس میں گیا تو اگلی بار تیرے گھر آ جاؤں گا۔"

سر پر وار نے اس کی ہمت ختم کر دی تھی اور جب تک وہ اٹھنے کے قابل ہوتا، مہرداد بشریٰ کو لے کر جا چکا تھا۔ پھر کئی دن بعد اس کی لاش ملی تھی۔ اللہ بخش نے کلائی پر زخم کے نشان سے لاش شناخت کی لیکن اس نے کسی کو بتایا نہیں کہ وہ لاش کس کی تھی۔ اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔ صغریٰ تو بشریٰ کے اغوا کا سن کر صدمے سے مر گئی تھی۔ اس کی تدفین بھی اللہ بخش نے کی تھی۔

☆☆☆

اللہ بخش خاموش تھا اور ایس پی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "او کے، تم نہیں بتانا چاہتے لیکن میں جانتا ہوں۔ اس رات تمہارے کلینک میں کیا ہوا تھا۔ ایک عینی گواہ نے لڑکی کا اغوا دیکھا تھا اور اس نے پولیس کو تو نہیں لیکن ایک صحافی کو یہ بات بتا دی تھی اور اس نے اسے کہانی کی صورت میں اخبار میں شائع کر دیا تھا۔"

"یہ غلط ہے سائیں، ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔" اللہ بخش کا لہجہ سپاٹ تھا۔ "اگر آپ کو کسی نے بتایا ہے تو غلط بتایا ہے۔"

اچانک ایس پی آگے جھکا اور اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ڈرو مت، میں تمہارا ہمدرد ہوں اور اسی وجہ سے یہاں آیا ہوں۔ پولیس کے پیچھے اصل میں مہرداد کے ساتھی ہیں اور ان کو شبہ ہے کہ مہرداد کی موت میں تمہارا ہاتھ ہے۔"

اللہ بخش دہل کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ ان ڈاکوؤں کے لیے شک ہی کافی ہوگا مگر اس نے اقرار نہیں کیا۔ "ان ... غلط ہے سائیں۔ میں نہیں جانتا کہ مہرداد کی موت کیسے ہوئی؟"

"تمہاری اسی ثابت قدمی نے تمہیں بچا لیا ورنہ ... وقت تمہاری لاش کسی ویرانے میں پڑی سڑ رہی ہوتی ... یہاں سے تمہیں نکال دوں گا لیکن خطرہ ہوگا تمہارے لیے ... بہتر ہے کہ فوراً بیوی بچوں کو لے کر نکل جاؤ ... مکان اور کلینک فروخت کر دو اور دوبارہ یہاں کا رخ مت کرنا۔" ایس پی بات مکمل کرتے ہی کھڑا ہو گیا۔

وہ دروازے کی طرف بڑھا تھا کہ اللہ بخش نے کہا۔ "سائیں، اجازت ہو تو ایک سوال کر سکتا ہوں؟"

ایس پی رک گیا مگر مڑا نہیں۔ "پوچھو؟"

"آپ کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے اور آپ کیوں آئے مجھے بچانے کے لیے؟"

"بشریٰ میری دور کی رشتے دار لگتی تھی۔ میں رشتہ ... بتا سکتا۔ لیکن تم نے میرا ہی کام کیا ہے اسی لیے میں تمہیں بچانے آیا ہوں لیکن اگر تم کبھی پکڑے گئے تو میرا نام ... لو گے اور لیا بھی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ جو کیا ہے ... تم نے کیا ہے۔"

ایس پی کمرے سے چلا گیا۔ ایک منٹ بعد حوالات کے داروغہ نے اندر جھانکا اور ایک بنڈل اس کی طرف اچھال دیا۔ یہ اس کے کپڑے تھے۔ اس نے غرا کر کہا۔ "... پہنو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

اس نے عجلت میں کپڑے بدلے۔ اس کا پرس اور تمام کاغذات تھے لیکن رقم غائب تھی۔ اس نے خدا کا شکر کیا کہ رقم غائب ہوئی ہے، وہ ہمیشہ کے لیے غائب نہیں ہو گیا۔ وہ باہر آیا تو کسی نے اسے نہیں روکا اور وہ آرام سے تھانے سے باہر آ گیا۔ اپنے گھر کی طرف پیدل مارچ کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ ایس پی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ جو کیا تھا اس نے کیا تھا۔ جس وقت اس نے مہرداد کے پیٹ سے گولی ... تو اسی وقت اس نے اس کے پیٹ میں کٹے مار زہر کا کیپسول رکھ دیا تھا۔ یہ کیپسول وہ اپنے واقف کار کی فرمائش پر ... تھا۔ اتفاق سے ایک کیپسول اس کے بیگ میں رہ گیا تھا۔ ... ڈاکٹر تھا اور اس کا کام بیماروں کا علاج کرنا تھا۔ اس کے ... میں اس نے مہرداد کا بالکل درست علاج کیا تھا۔ اس ... فیصلہ کیا کہ وہ ایس پی کے مشورے پر عمل کرے گا اور ... بیوی بچوں کو لے کر یہاں سے کہیں دور چلا جائے گا۔

چوتھا سال

مختار آزاد

عموماً دیکھا گیا ہے کہ عورتوں کی چھٹی حس وقت سے پہلے آنے والے خطرے کو بھانپ لیتی ہے... مگر زیرِ نظر کہانی میں ایک مرد کی چھٹی حس نے قبل از وقت ایک عورت کی سنگینی اور خطرے کی بو سے آگاہ کر دیا۔

آیندہ درپیش خطرات کے تدارک کے لیے ایک باپ کی کی جانے والی پیش بندی

یہ 1978ء کی بات ہے۔ ویت نام جنگ ختم ہونے کے بعد جب فوج سے فارغ کر دیا گیا تو میں نے سراغ رسانی کا دفتر کھول لیا۔ کام ٹھیک ٹھاک چل پڑا۔ اُس وقت بھی میں بیولمنٹ ایوینیو پر واقع اپنے دفتر میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ویسے بھی ان دنوں، میں زیادہ تر وقت اخبار پڑھنے میں گزار رہا تھا۔

پچھلے تین سال میری زندگی میں نہایت اہم ثابت ہوئے تھے۔ اسی عرصے میں، مَیں نے یہ دفتر قائم کیا تھا۔ اُسی دوران میں شادی کی تھی اور اب اپنی ڈیڑھ سالہ بیٹی جینی اور بیوی ایلن کے ساتھ مطمئن زندگی گزار رہا تھا۔ کام تسلی بخش چل رہا تھا، آمدنی مناسب تھی لیکن چوتھے برس کا آغاز کچھ اچھا نہیں ہوا۔ کاروبار مندی میں چلا گیا۔ آمدنی نہ ہونے کے برابر تھی جس کی وجہ سے ایلن بھی ذہنی دباؤ میں دن گزار رہی تھی۔

اُس دن بھی میں فارغ بیٹھے رہنے کے بجائے اخبار میں جرائم کی خبریں پڑھنے میں مصروف تھا۔ اچانک میں چونکا۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ”ہیلو۔“ میں نے فون اٹھایا۔

”کیئر انویسٹی گیشن اینڈ سیکیوریٹی؟“ دوسری طرف سے ایک سنجیدہ مردانہ آواز سنائی دی۔

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں ایک کیس کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں، کیا آپ کے پاس کچھ وقت ہے؟“ فون کرنے والے نے کہا۔

”بالکل... آپ کھل کر بات کیجیے۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”میرا نام سڈنی کوک ہے اور میں پیشے کے لحاظ سے وکیل ہوں۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”میرا دفتر 140 میڈیسن روڈ پر واقع ہے۔ اصل میں میرے ایک جاننے والے کو آپ کی مدد چاہیے۔“

”کیا یہ قانونی معاملہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی نہیں... اس کا میرے شعبے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے جلدی سے کہا۔ ”دراصل میں اس وقت جس شخص کے بارے میں بات کر رہا ہوں، وہ میرے ذاتی دوست ہیں اس لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو وہ میرے حوالے سے بات کرلیں گے۔“ اس نے کہا۔

”بالکل بات کرسکتے ہیں لیکن مسٹر سڈنی! اس کام کے لیے آپ نے صرف مجھ سے ہی کیوں رابطہ کیا ہے؟“ میں نے اس سے وہ سوال کیا جو عموماً ہر کلائنٹ سے کرتا ہوں۔

”آپ کی نیک نامی اور شہرت کے باعث۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ”مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے یہ کیس لیا تو خود چھان بین کریں گے، کسی ماتحت کے حوالے نہیں کریں گے۔“

سڈنی سے گفتگو کے دوران میں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ٹیلی فون ڈائریکٹری کھول لی تھی۔ اس میں سڈنی کوک کا بتایا ہوا پتا اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ ”آپ کا نمبر 444۔“ میں نے ڈائریکٹری میں لکھا ہوا نمبر دُہرایا۔

”جی ہاں، یہی نمبر ہے مگر میں اس وقت اپنے دفتر سے نہیں بلکہ عدالت سے بات کر رہا ہوں۔“ فون نمبر سننے کے بعد اس نے جلدی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ آپ کو مجھے فون کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ویسے بھی میں جس کے لیے فون کر رہا ہوں، وہ آپ سے خود رابطہ کرے گا۔ آپ دونوں باہمی طور پر تمام معاملات دیکھ لیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے یہ سن کر کہا۔ ”میری روزانہ کی فیس تین سو ڈالر جبکہ اخراجات علیحدہ ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔ ”وہ آپ سے بات کرے گا تو اس سے یہ معاملہ طے کرلیجیے گا۔ ویسے بھی فیس کی ادائیگی اس کا مسئلہ ہے، بہتر ہے کہ یہ بات آپ اسے ہی بتائیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ اُن سے کہہ دیں کہ مجھ سے بات کرلیں۔“

”میں آپ کو اُن کا فون نمبر اور پتا لکھوا دیتا ہوں، بہتر ہوگا کہ میرے حوالے سے آپ ہی ان سے بات کرلیں۔ وہ بہت سست آدمی ہے اور ان دنوں شدید بیمار بھی ہے۔ اس کے لیے آپ کے دفتر پہنچنا مشکل ہو۔“ اس نے ... ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں خود ان سے فون پر بات کرلیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے کلائنٹ کا فون نمبر اور پتا لکھا اور فون رکھ کے ایک بار پھر جرائم کی خبریں پڑھنے لگا۔ ویسے بھی فراغت کے اُن دنوں یہ میرا سب سے دلچسپ مشغلہ تھا جو میں دفتر میں سرانجام دیتا تھا۔

لنچ کے بعد مجھے خیال آیا۔ میں نے سڈنی کوک کے دیے ہوئے نمبر پر فون کیا۔ ”کیا مسٹر ہمفرے سے بات ہوسکتی ہے؟“

”آپ کون بول رہے ہیں؟“ اس نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کیا۔

”میرا نام کیرے جان ہے اور میں سراغ رساں ہوں۔ مجھے مسٹر سڈنی کوک نے آپ سے رابطہ کرنے کی درخواست کی تھی۔“

”اوہ...“ اس نے یہ سن کر کہا۔ ”میں ہمفرے ہی بات کر رہا ہوں۔“ اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ شاید وہ بیمار ہے۔ ”آپ آج شام سات بجے میرے گھر پہنچ سکتے ہیں؟ بات یہ ہے کہ میں ان دنوں سخت بیمار ہوں اور میرے لیے چلنا پھرنا دوبھر ہوچکا ہے۔“ اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں...“

”تو پھر ٹھیک ہے، میں شام سات بجے آپ کا انتظار کروں گا۔“

”بہتر۔“ یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

شام کے سات بج رہے تھے۔ میں ہمفرے میکلین سے ملاقات کے لیے اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

”جی فرمایئے۔“ کافی دیر بعد ایک نحیف و نزار شخص نے دروازہ کھولا۔ اس وقت وہ گاؤن پہنے ہوئے تھا۔

”معاف کیجیے گا، آپ کو زحمت دی۔“ میں نے اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام کیرے جان ہے...“

”اچھا... میں آپ کا ہی منتظر تھا۔“ نام سنتے ہی اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے داہنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

اس وقت وہ نہا کر نکلا تھا۔ اس نے گیلے بدن پر گاؤن پہنا ہوا تھا۔ میں نے اس کے سراپا پر بھرپور تنقیدی نظر ڈالی۔ سڈنی نے جو کچھ بتایا تھا، وہ پہلی نظر میں ویسی ہی شخصیت نظر آرہا تھا۔ یہ کبھی دراز قد، مضبوط جسم اور سنہرے بالوں والا خوبصورت شخص رہا ہوگا مگر اب اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ بال کھچڑی ہوچکے تھے۔ چہرے اور گردن پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں اور جسم لاغر نظر آرہا تھا۔

”بہت شکریہ آپ کی آمد کا۔“ اندر لاتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ ”معاف کیجیے گا۔ میں ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا کہ گھنٹی بج اٹھی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے حلیے کی وضاحت پیش کی۔

ہمفرے کا فلیٹ جس علاقے میں واقع تھا، وہ شہر کا مہنگا علاقہ تھا اور یہاں فلیٹ وہی لوگ خرید سکتے تھے جن کے پاس پیسا وافر ہو۔ فلیٹ اندر سے بھی خاصا پُرتعیش تھا۔ وہ مجھے لے کر سیدھا لیونگ روم میں پہنچا اور صوفے پر بٹھا کر ایک بار پھر معذرت چاہی اور اجازت لے کر لباس بدلنے کے لیے بیڈ روم میں چلا گیا۔ یہ خاصا خوب صورت اور کشادہ لیونگ روم تھا۔ ابھی مجھے بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ صاف ستھرے اور معقول لباس میں واپس آگیا۔

”برا مت منایئے گا میں نے آپ کو یہاں آنے کے لیے کہا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں کافی عرصے سے بیمار ہوں۔ مجھ سے زیادہ چلا پھرا نہیں جاتا۔“ اس نے میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر وہی بات دُہرائی جو فون پر کرچکا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے رسماً کہا۔

”بات یہ ہے کہ میں اپنی بیٹی کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔“ اُس نے کام کی بات شروع کی۔ ”جب میری فون پر بات ہوئی تھی تو آپ نے پوچھا تھا کہ کام کی نوعیت کیا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ رُکا اور چند گہری سانسیں لیں پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”اصل میں معاملہ میرے اور میری بیٹی کی ماں کے درمیان طلاق کا ہے لیکن فی الحال اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ میری بیٹی کا ہے۔ اسی کام کے لیے میں نے آپ کی خدمات حاصل کی ہیں۔ کئی سال پہلے کی بات ہے...“ وہ کہتے کہتے رکا اور ایک بار پھر چند گہری سانسیں لیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ جو کچھ کہنا چاہ رہا ہے اور اس کے لیے خود کو تیار کر رہا ہے۔ ”میں آپ کو شروع سے بات بتاتا ہوں تاکہ آپ مسئلے کی نوعیت کو سمجھ سکیں۔“

”جیسا آپ بہتر سمجھیں۔ بات جتنی وضاحت سے ہوگی، معاملہ اتنی ہی جلد سلجھ جائے گا۔“

”میں نے زندگی میں صرف ایک ہی شادی کی اور... اولاد میں صرف ایک ہی بیٹی ہے۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔ ”کم و بیش اڑتیس، چالیس برس پہلے میں نے شادی کی تھی اور لوریٹا شادی کے کئی سال بعد پیدا ہوئی تھی۔“ یہ کہہ کر وہ رکا۔ اس کی سانس پھول چکی تھی۔ وہ اپنی اکھڑی سانسوں کو درست کرنے لگا۔ ”معاف کیجیے گا، مجھے دمے کی بھی شکایت ہے اور آج کل میں بُری طرح اس بیماری کی زد میں آیا ہوا ہوں۔“ چند منٹ بعد جب ذرا طبیعت بہتر ہوئی تو اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بات یہ ہے کہ میری اپنی بیوی سے شادی کے دس بارہ سال کے بعد اَن بن شروع ہوگئی۔ میں چاہتا تو اسے کب کا طلاق دے چکا ہوتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ لوریٹا اس وقت کم عمر تھی اور طلاق سے اس کی شخصیت پر بُرا اثر پڑتا اس لیے میں نے اس فیصلے پر عمل نہیں کیا۔ میں اپنی بیٹی سے بہت زیادہ محبت کرتا ہوں۔ یہ بات اس کی ماں بھی جانتی ہے۔ اسی لیے اس نے مجھے زک پہنچانے کے لیے یہ سب کچھ کیا۔“ اس کی پلکیں نم ہوگئیں۔ سانس بھی پھولنے لگا تھا۔ وہ رک گیا اور اپنی اکھڑی سانسوں کو بحال کرنے لگا۔

”آپ کی بیوی نے ایسا کیا کیا ہے؟“ جب اس کی حالت سنبھلی تو میں نے سوال کیا۔

”وہ لوریٹا کو لے کر گھر چھوڑ کر چلی گئی۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ میں اپنی بچی کو اچھے ماحول

میں تعلیم و تربیت دے کر ایک مستحکم شخصیت بنانا چاہتا تھا لیکن کم بخت نے مجھ سے نفرت کا بدلہ میری بیٹی کو زِک پہنچا کر لیا۔'' بیوی کے ذکر پر اس کے لہجے میں نفرت دَر آئی تھی۔

''آپ کی بیوی سے اختلافات کی وجہ کیا تھی؟'' میں نے قطع کلامی کی۔

''وہ میری جائداد، کاروبار اور ہر طرح کی املاک میں قانونی طور پر نصف حصے کی مالک بننا چاہتی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ عیش و عشرت کی دلدادہ تھی۔ اسے کسی کا دستِ نگر ہونا پسند نہیں تھا۔ وہ اپنی پسند سے.... دولت کو خرچ کرنا چاہتی تھی۔ میں معتدل مزاج شخص ہوں۔ یہ بات مجھے پسند نہیں تھی اسی لیے میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ممکن نہیں۔''

''تو پھر وہ بچی کو ساتھ لے کر چلی گئی آپ کو چھوڑ کر۔'' میں نے کہا۔

''ایسا ہی ہے۔''

''اس نے طلاق کیوں نہیں لی؟ اس طرح بھی وہ آپ کی دولت کا کافی بڑا حصہ حاصل کر سکتی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ طلاق کے بعد اسے جو کچھ ملے گا، وہ بہت ہی تھوڑا ہوگا... اتنا کہ وہ سال چھ ماہ کے اندر اندر ہی قلاش ہو جاتی۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''وہ کیسے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اس لیے کہ میرے کاروبار کا بہت بڑا حصہ آف شور یا بے نام تھا اور جو قانونی دولت تھی، وہ بہت ہی کم۔''

اچھا...'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ بات مجھے چونکا گئی۔ اس بات سے صاف ظاہر تھا کہ یا تو وہ مافیا سے منسلک رہا ہے یا ایسے چکر کا حصہ تھا جس میں دولت ہمیشہ غیر قانونی طریقوں سے گردش کرتی ہے۔ میں نے سر کو جھٹکا۔ مجھے کیا، یہ میرا دردِ سر نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں...'' اس نے سرد آہ بھری۔ ''اسی لیے وہ جاتے ہوئے میری بچی کو بھی ساتھ لے گئی کہ اسے جتنے گھٹیا ماحول میں پروان چڑھائے گی، اسے جتنا زیادہ گھٹیا بنا سکے گی، مجھے اس سے اتنی ہی زیادہ تکلیف پہنچے گی۔'' اس نے چبا چبا کر الفاظ ادا کیے۔ ''ویسے بھی طلاق کے باعث تو اسے اتنی رقم ملتی نہیں البتہ طلاق نہ لینے کا فائدہ یہ ہوا کہ اُسے اب تک ہر ماہ معقول رقم مل رہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ''اس کے جذبۂ انتقام نے میری بچی کو تباہ کر دیا ہے۔'' اس کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔

''آپ کی بچی... میرا مطلب ہے کہ لوریٹا اب کتنی بڑی ہے؟'' میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اب چونتیس پینتیس سال کی ہوگی۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اور آپ کی عمر کیا ہوگی؟'' میں نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

''اُنھتر برس۔'' ہمفرے نے آہستہ سے جواب دیا۔ ''میں نے کافی دیر سے شادی کی تھی۔ فرصت ہی نہیں ملی اُن دنوں۔'' اس نے خلا میں گھورتے ہوئے ایسے کہا جیسے بیتے ہوئے دن یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ''شادی کے وقت جینی مجھ سے عمر میں تقریباً آدھی تھی۔ ویسے بھی اب اگر ہم دونوں کے بیچ طلاق ہوئی ہے تو مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ البتہ میری خواہش ہے کہ میری دولت پر میری بیٹی عیش کرے۔ ویسے بھی اب وہ اس قابل تو رہی نہیں ہے کہ خود ہاتھ پاؤں چلا کر اپنی زندگی کو بہتر گزارنے کے لیے کچھ کر سکے۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوا اور چھت کو گھورنے لگا۔ اس کے لہجے میں پوشیدہ افسردگی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

''آپ کو اس وقت لوریٹا کے حوالے سے ایسی کیا فکر لاحق ہے کہ جس کے لیے آپ میری خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں؟''

''لوریٹا نشے کی عادی ہو گئی ہے۔ وہ نشہ آور گولیاں استعمال کرتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ لا اُبالی لڑکی کے ہاتھوں اپنی جان ہی نہ گنوا دے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''مجھے اس کی زندگی عزیز ہے۔''

''وہ کب سے نشہ کر رہی ہے؟'' ہمفرے کی بات ختم ہونے پر میں نے سوال کیا۔ ویسے بھی وہ اصل موضوع پر اب آیا تھا۔

''میری اطلاعات کے مطابق تو شاید وہ پانچ چھ سال سے نشہ کر رہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''وہ جانتی ہے کہ آپ کے علم میں یہ بات ہے؟''

''ہاں...'' ہمفرے نے آہستہ سے کہا۔ ''اس نے کئی بار مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نشہ کرنا چھوڑ دے گی لیکن وعدے کا پاس نہ رکھ سکی۔''

''اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس قسم کا نشہ کرتی ہے اور وہ اسے کہاں سے خریدتی ہے یا اس کا ایسا کون دوست ہے جو اسے یہ لا کر دیتا ہے۔ بس میں یہی جاننا چاہتا ہوں۔ باقی سارا معاملہ میں خود دیکھ لوں گا۔'' یہ کہتے ہوئے ہمفرے کا لہجہ سخت ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی عجیب سی چمک اتر آئی تھی۔

''اوہ...'' مجھے یہ کام خاصا بے مزہ لگا۔ ''وہ کرتی کیا ہے؟'' میں نے بے دلی سے پوچھا۔

''پراپرٹی کے کاروبار سے منسلک ہے۔'' اس نے کراہت بھرے لہجے میں کہا۔ ہمفرے ایک بار پھر دکھی ہو گیا۔ ''وہ ایک ناکام لڑکی ہے۔ اسے کسی کام میں کامیابی نہیں ملی۔ اس نے چند سال پہلے شادی کی تھی لیکن وہ بھی نہ چل سکی۔ البتہ اس نے شوہر کا نام اب تک اپنے ساتھ چپکا یا ہوا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ہمفرے کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

''اس کے دوستوں کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟'' اس کی حالت سنبھلی تو میں نے سوال کیا۔

''کیوں نہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کچھ نام گنوائے، جنہیں میں نے نوٹ بک میں لکھ لیا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ آپ کے ساتھ تو نہیں رہتی؟'' میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''وہ ایک علیحدہ فلیٹ میں رہتی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور آپ کی مسز...''

''وہ بھی اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔''

''آپ مجھے اس کا پتا لکھوا دیجیے۔'' اس نے پتا لکھوانا شروع کیا۔ ''کیا مجھے اس کی تصویر مل سکتی ہے؟ بہتر ہے کہ تازہ ترین تصویر ہو۔'' میں نے پتا لکھنے کے بعد کہا۔

یہ سن کر بوڑھا بدقت تمام صوفے سے اٹھا اور لیونگ روم کے دوسرے کنارے پر واقع کارنس پر رکھی فریم کی ہوئی ایک تصویر اٹھا کر مجھے تھما دی۔ میں غور سے اسے دیکھنے لگا۔ میرے خیال میں یہ تصویر شاید ایک سال یا اس سے بھی پرانی ہو سکتی تھی۔ فریم میں اس کی تین تصویریں مختلف انداز میں لگی ہوئی تھیں۔ یہ تصویریں کسی شوقیہ فوٹوگرافر کی کھینچی ہوئی لگتی تھیں۔ تینوں تصویروں میں اس نے چیک کا بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے نقوش تیکھے، بال سنہری اور قد عام لوگوں سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جارحیت نظر آتی تھی۔ چہرے سے وہ مشکل پسند عورت لگتی تھی۔

''مجھے یہ تصویریں چاہئیں۔''

''آپ لے سکتے ہیں۔'' اس نے فوراً اجازت دے دی۔ ''ہاں ایک منٹ... فیس کیا ایڈوانس میں لیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

عام طور پر میں کلائنٹ سے فیس کام ہونے کے بعد وصول کرتا ہوں مگر یہاں معاملہ دوسرا تھا۔ بوڑھا کافی بیمار لگ رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ کل دوپہر وہ لنچ کرے گا یا اُس وقت اس کی تدفین کی تیاری ہو رہی ہوگی۔ اس لیے میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ ''بہتر ہے کہ ساڑھے چھ سو ڈالر پیشگی ادا کر دیں۔ باقی کام ختم ہونے کے بعد دیکھ لیں گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور لیونگ روم سے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا لوٹا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ دبا ہوا تھا۔ لفافہ اس نے مجھے تھمایا اور میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

''لوریٹا کی اپنے شوہر کے ساتھ اگر کوئی تصویر ہو تو وہ بھی مجھے دکھا دیں، مجھے اس سے بھی ملنا پڑ سکتا ہے۔''

''مل جائے گی۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک بار پھر لیونگ روم سے نکل گیا۔ کچھ دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی تصویر تھی۔ ''یہ لیجیے۔'' اس نے تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

لوریٹا اپنے شوہر پیٹر وارڈ کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ پیٹر کا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل تھا۔ دونوں بے فکرے انداز میں ہنس رہے تھے۔ لوریٹا نے بڑے گلے کا بلاؤز اور تنگ جینز پہن رکھی تھی۔ پیٹر کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ بڑے بڑے بال بے ہنگم انداز میں بکھرے ہوئے تھے۔ بازوؤں سے ڈھلکتا ہوا کوٹ شکن آلود تھا۔ شرٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس کا حلیہ ستر کی دہائی کے راک اسٹار جیسا تھا۔ ویسے بھی اس طرح کا حلیہ اُس دور کے لڑکوں کا مقبول فیشن تھا۔

''یہ کیا کرتا ہے؟'' میں نے تصویر پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے سے پوچھا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ مقامی راک گلوکاروں اور موسیقاروں کے گروپ کے لیے بطور پروموٹر کام کرتا ہے۔'' اس نے شہادت کی انگلی سے کنپٹی پر دباؤ ڈال کر سوچتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے بوڑھے سے اس کے بارے میں چند دیگر ضروری تفصیلات بھی حاصل کیں اور انہیں اپنی نوٹ بک میں درج کرتا رہا۔ ''یہ تصویر بھی مجھے درکار ہے۔'' میں نے بوڑھے کی نظروں کے سامنے اسے لہراتے ہوئے کہا۔

''رکھ لیں۔'' اس نے سرِ اقرار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

میں نے ہینڈ بیگ کھول کر اس میں تصویریں اور نوٹ بک رکھ لی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں پرسوں آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھا۔ بوڑھا مجھے دروازے تک چھوڑنے کے لیے آیا۔ دروازے پر اس نے مجھ سے مصافحہ

کیا۔ اس کے ہاتھوں کی نرمی اس کی جسمانی کمزوری کو عیاں کر رہی تھی۔

ویسے یہ کافی بور کام تھا۔ اس طرح کے کام مجھے پسند نہیں تھے۔ اگر حالات بہتر ہوتے تو شاید میں انکار کر دیتا لیکن مسئلہ پیسوں کا تھا۔ کئی مہینوں سے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ اب تک جو کچھ جمع جتھا تھا، اسی سے گھر چل رہا تھا۔ اس لیے انکار کرنے کی گنجائش بالکل بھی نہیں تھی۔ اُن دنوں مجھے رقم کی سخت ضرورت تھی۔ کام تو کل شروع ہونا تھا لیکن پیسے آچکے تھے۔ اس لیے میں نے فوراً سپر مارکیٹ کا رُخ کیا۔ میں گھر جانے سے پہلے کھانے پینے اور گھریلو استعمال کا کچھ ضروری سامان خریدنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

ڈنر کے بعد میں اٹھ کر لیونگ روم میں آگیا اور ہمفرے سے ملاقات کے دوران میں ہونے والی ساری گفتگو کو اپنے ذہن میں دُہرانے لگا۔

میں کافی دیر تک ہمفرے کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ مجھے رہ رہ کر اس کی تین باتیں چونکا رہی تھیں۔ ہمفرے نے کہا تھا کہ اس کی جائداد کا بڑا حصہ بے نام تھا، طلاق لینے کی صورت میں اس کی بیوی کو وہ کچھ نہیں ملتا جس کی اسے توقع تھی۔ اسی لیے اُس عورت نے اب تک طلاق نہیں لی تھی۔ دوسرا یہ کہ جب اس کی بیوی گھر چھوڑ کر گئی تو وہ اُس وقت بوجوہ اسے طلاق نہیں دینا چاہتا تھا۔ تیسری بات یہ کہ اس کا کہنا تھا کہ میں صرف یہ پتا چلاؤں کہ لوریٹا کس قسم کا نشہ کرتی ہے اور اسے یہ نشہ آور اشیا کون فراہم کرتا ہے۔ باقی معاملہ خود دیکھ لوں گا۔

ان تینوں باتوں سے ایک چیز صاف ظاہر تھی کہ اس نے ساری دولت نہ صرف غیر قانونی طریقوں سے حاصل کی تھی بلکہ کسی وقت وہ مافیا میں کسی ایسے مقام پر فائز تھا جہاں گھریلو زندگی کے حوالے سے معمولی سے معمولی اسکینڈل سے بھی بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ اگرچہ اس کی عمر اور صحت، دونوں سے ایک بات عیاں تھی کہ اب وہ مافیا کا رکن نہیں رہا ہوگا لیکن جس طرح سخت لہجے میں لوریٹا کو نشہ پہنچانے والے کے بارے میں پتا لگانے کا کہا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اب بیٹی کو روکنے کے بجائے اس شخص کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر چکا تھا، جو اسے نشہ فراہم کرتا ہے۔ اس وقت مجھے اس کا لہجہ اور آنکھوں کی چمک یاد آگئی۔ شیر بوڑھا ہو گیا تھا، اس کے دانت گر گئے تھے، وہ شکار نہیں پکڑ سکتا تھا لیکن مافیا کے اس بڈھے شیر کی ہیبت تو جرم کے جنگل میں اب بھی ضرور ہوگی۔

میرے لیے یہ پریشان کن بات تھی۔ اگر کوئی شخص مجرم ہے تو اس کو سزا دینا عدالت اور قانون کی ذمے داری ہے۔ ہمفرے کی مدد کر کے میں بلواسطہ طور پر قانون شکنی کا مرتکب ہو جاتا۔ میں اُس وقت عجیب کشمکش سے دوچار تھا۔ ایک طرف میری مالی ضرورت اور دوسری طرف قانون پسندی تھی۔ میں ریٹائرڈ فوجی تھا اور قانون کی خلاف ورزی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

تمام تر سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سب سے پہلے لوریٹا اور اس کے سابق شوہر سے تعارف حاصل کیا جائے۔ ساتھ ہی ان دونوں کی مصروفیات اور ملنے جلنے والوں کا جائزہ لیا جائے۔ ان دونوں سے تعارف کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ میں لوریٹا کے فلیٹ پر دھاوا بولنا چاہتا تھا۔ یہ کام اس وقت کرنا تھا جب مجھے یقین ہوتا کہ اُس کی ماں فلیٹ پر موجود ہے۔ میں لوریٹا سے ملنے کے بہانے وہاں پہنچ کر اس بات کا جائزہ لے سکتا تھا کہ وہ ماں بیٹی کس انداز میں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اس سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ نشہ صرف لوریٹا کرتی ہے یا اس کی ماں بھی اس لت کی شکار ہے۔ اگر اتفاق سے لوریٹا یا پیٹر میں سے کوئی وہاں پہنچ جاتا تو بات بگڑتی نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ پہلے دن کی محنت سے ہی کیس کا نتیجہ نکل جاتا۔ آخر میں نے اگلے دن کی ساری مصروفیات ترتیب وار اپنی نوٹ بک پر لکھیں اور پھر سونے کے لیے چل دیا۔ میری بیوی میرا انتظار کرتے کرتے نیند کی آغوش میں جا چکی تھی۔ میں نے بھی خاموشی سے کمبل اوڑھا اور آنکھیں موند لیں۔ کل کا دن ممکنہ طور پر بہت مصروف گزرنا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ آج رات نیند بہت اچھی آئے۔

☆☆☆

صبح دفتر پہنچنے کے بعد میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری سے پیٹر وارڈ کا ٹیلی فون نمبر حاصل کر کے فون کیا۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس وقت دفتر آتا جاتا ہے۔ ”کیا مسٹر وارڈ دوپہر کو دفتر میں مل سکیں گے؟“

”شاید... لیکن اس بات کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔“ میں نے فون کیا تو جواب میں ایک بھاری نسوانی آواز میں جواب ملا۔

”آفس کب تک کھلا رہتا ہے؟“

”شام کے ساڑھے پانچ بجے تک۔“ اس نے جواب دیا اور فوراً ہی فون بند کر دیا۔

روک اِٹ ایکسپریس پروموشن کا دفتر شہر کے مضافاتی علاقے میں واقع تھا۔ یہ دفتر ایک بند کارخانے کی عمارت میں قائم کیا گیا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ پیٹر کی

آمدنی بہت زیادہ نہیں ہوگی۔ جب میں وہاں پہنچا تو سہ پہر کے تین بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ میں نے کارخانے کے سامنے اس طرح کار پارک کی کہ داخلی دروازہ نظروں کے سامنے رہے۔ میں کار میں بیٹھا اس کے آنے کا منتظر تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جیسے ہی پیٹر وارڈ یہاں پہنچے، میں اپنی گاڑی سے نکل جاؤں اور اچانک اس سے یوں ٹکراؤں، جیسے اتفاقی طور پر بے دھیانی میں ٹکرا گیا ہوں۔ یوں معذرت کے بہانے اس سے تعارف حاصل کر سکوں۔

میری نظریں داخلی گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ میں جب سے یہاں موجود تھا، تب سے نہ تو کوئی اندر گیا اور نہ ہی باہر آیا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ میرا انتظار کارآمد ہوگا یا رائگاں جائے گا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے پانچ بج کے سینتیس منٹ ہونے والے تھے۔ مجھے انتظار کرتے ہوئے تقریباً دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ دوپہر جب میں نے فون کیا تھا تو اُس عورت نے کہا تھا کہ دفتر ساڑھے پانچ بجے بند ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے دفتر بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا۔ یہ بات ذہن میں آتے ہی میں نے فوراً سر اوپر اٹھایا۔ گیٹ سے ایک عورت باہر نکل رہی تھی۔ اس نے جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا وہ چالیس سال کی تو ہوگی۔ وہ عورت تھوڑا سا آگے آ کر ایک کار کے پاس کھڑی ہوگئی۔ یہ ایک پرانی سیڈان تھی۔ میں نے نظریں دوبارہ گیٹ پر مرکوز کر دیں۔ کچھ ہی دیر گزری ہوگی کہ ایک مرد بھی باہر نکلا۔ وہ گیٹ بند کر کے تالا لگا رہا تھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے فوراً اپنی جیبی دوربین نکالی اور اس کو فوکس کر کے مرد کا جائزہ لینے لگا۔ اسی دوران وہ پلٹا۔ اس پر پہلی نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔ یہ پیٹر وارڈ تھا، لوریٹا کا سابق شوہر۔ ہمفرے نے اس کی جو تصویر مجھے دی تھی، اس میں پیٹر اسمارٹ اور کم عمر نظر آ رہا تھا۔ اس کے سر کے بال بھی سیاہ تھے مگر جو شخص اب میری نظروں کے سامنے تھا، وہ ڈھلکے کاندھوں، کھچڑی بال اور موٹے جسم والا بھدا سا شخص تھا جو عمر کے لحاظ سے کم و بیش پچاس سال کا تو ہوگا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی تصویر اٹھائی۔ ایک نظر تصویر پر اور دوسری پیٹر پر ڈالی... یقیناً وہ پیٹر ہی تھا۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور کار کے قریب پہنچ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف سے وہ عورت بھی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اُسے دیکھ کر کم از کم میں یہ تو سمجھ چکا تھا کہ یہ ہمفرے کی بیٹی نہیں ہو سکتی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ اس کی وہی اسسٹنٹ ہے جس نے دوپہر کو میرا فون اٹینڈ کیا تھا۔ اُن دونوں کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور آگے بڑھ گئی۔

ان کے جاتے ہی میں نے بھی گاڑی اسٹارٹ کی اور سڑک پر آگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کس طرف گئے ہوں گے۔ یہ رش کا وقت تھا۔ اس وقت عام طور پر سڑکوں پر بہت زیادہ ٹریفک ہوتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے ان کی کار نظر آگئی۔ میں فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ ویسے بھی اس وقت ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ انہیں شک بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں ان کا پیچھا کر رہا ہوں۔

تقریباً بیس پچیس منٹ میں وہ ایش لینڈ سپر مارکیٹ پہنچے۔ میں نے بھی گاڑی پارک کی۔ پارکنگ میں بھی کافی رش تھا۔ گاڑی پارک کرنے میں ہی مجھے پانچ منٹ لگ گئے۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا مارکیٹ کے اندر پہنچا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ کسی میوزک اسٹور میں ہی ہوگا۔ تین چار اسٹور دیکھ لینے کے بعد آخر وہ مجھے ایک میوزک اسٹور میں کھڑا نظر آ گیا۔ میں اس طرح دُکان کے اندر داخل ہوا جیسے کیسٹیں خریدنے کے لیے آیا ہوں۔

میں نے کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھا، وہ اور اس کے ساتھ آنے والی عورت کاؤنٹر پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں اپنی پسند کی کیسٹ تلاش کرنے کے بہانے ان کے قریب پہنچ گیا۔ میں اُن کی باتیں سننا چاہتا تھا۔

”ہاں گروپ تو نیا ہے لیکن میں نے اُن کے کئی شو منعقد کروائے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر تم اُن کی کیسٹ جاری کرو گے تو وہ خاصی پسند کی جائے گی۔“ پیٹر اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیٹر کے ساتھ آنے والی عورت خاموش کھڑی اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن نئے گروپ کو لانچ کرنے میں کاروباری لحاظ سے خاصا رِسک ہوتا ہے۔“ کاؤنٹر پر موجود شخص نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”ارے نہیں جونی... ایسی بات نہیں ہے۔“ یہ سُن کر پیٹر زور سے ہنسا۔ ”میں اُن کی لانچنگ کا ایسا اہتمام کروں گا کہ تمام اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی میں اُن کی دھوم مچ جائے گی۔ ساتھ ہی تمہاری ایڈورٹائزمنٹ مفت میں ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ اس طرح تمہارے لیے یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہوگا۔“

”مگر پھر بھی سوچنا تو پڑتا ہے، نیا گروپ ہے...“ وہ ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔

”زیادہ مت سوچو۔“ پیٹر نے قطع کلامی کی۔ ”تم ٹائم دو۔ انہیں اسٹوڈیو میں بلواؤ۔ ایک دو گانے ریکارڈ کر کے سُن

لو۔ مجھے یقین ہے کہ تم خود جان جاؤ گے کہ یہ منافع کا سودا ہے، گھاٹے کا نہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ ''پچھلے دس برسوں میں تم نے میرے منتخب کیے ہوئے جتنے بھی میوزک گروپ لانچ کیے، ان میں کبھی نقصان ہوا؟''

''یہ بات تو تمہاری سچ ہے۔'' وہ شخص بہت کائیاں لگ رہا تھا لیکن آخر اس نے ہار مان لی۔ ''ٹھیک ہے، پرسوں شام چھ بجے انہیں اسٹوڈیو بلوا لو۔''

''یہ ہوئی نا بات۔'' پیٹر نے خوشی سے کہا۔ ''میں مون لائٹ بار جا رہا ہوں۔ آج شام وہ وہاں پرفارم کرنے والے ہیں۔ انہیں بتا دیتا ہوں۔ پرسوں شام وہ اسٹوڈیو پہنچ جائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی ساتھی عورت کی طرف مڑا۔ ''ڈیبرا! تم ان کو ساتھ لے کر آؤ گی۔''

یہ سنتے ہی میں نے جلدی سے پاپ میوزک کی ایک کیسٹ اٹھائی اور کاؤنٹر پر پہنچ کر اسے بل بنانے کا کہا۔

''یہ دیکھو... اسے بھی تم نے میری سفارش پر ہی متعارف کروایا تھا نا۔'' پیٹر نے کیسٹ اپنے ہاتھ میں اٹھا کر جونی کو دکھاتے ہوئے کہا۔ مقبولیت تو دیکھو، انہیں ہم جیسے بوڑھے بھی پسند کرتے ہیں۔'' اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''انہیں آپ نے لانچ کروایا تھا؟'' میں نے حیرت زدہ انداز اختیار کرتے ہوئے اس سے بے ساختہ لہجے میں کہا۔ اس نے سر ہلایا تو میں نے فوراً مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' اس نے بھی گرم جوشی سے جواب دیا۔ ''خاصے زندہ دل لگتے ہو۔'' رسمی کلمات کے بعد اس نے کیسٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے راک میوزک پسند ہے گو کہ یہ پسند کرنے کی میری عمر نہیں ہے۔'' میں نے شرمانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے یہ میوزک تو دلوں میں جوش پیدا کر دیتا ہے۔ رگوں میں لہو آگ بن جاتا ہے۔'' میرا انداز شاعرانہ تھا۔

''خاصے دلچسپ آدمی ہیں آپ۔'' اس نے اپنا بزنس کارڈ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بہت شکریہ۔'' میں نے کارڈ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کبھی آپ سے ملنے کے لیے آؤں گا۔''

''میں انتظار کروں گا۔'' اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر وہ جونی سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے بل ادا کیا اور کیسٹ لے کر باہر چلا آیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ایک تو مجھے اس کے اگلے پڑاؤ کا پتا چل گیا تھا 'مون لائٹ بار'۔ دوسرا یہ کہ بہت اچھا تعارف ہو گیا تھا۔ اس سے مل کر لگا کہ وہ بے ضرر آدمی ہے۔ اس سے شادی کرنے میں پہل بھی لوریٹا نے کی ہوگی اور علیحدگی کا پہلا قدم بھی اسی نے اٹھایا ہوگا۔ میں نے اسے اُن مشکوک افراد کی فہرست سے خارج کر دیا جو ممکنہ طور پر لوریٹا کو نشہ آور شے فراہم کر سکتے تھے۔

میں نہایت آرام سے پارکنگ میں پہنچا۔ گاڑی میں بیٹھ کر برابر میں نظر دوڑائی تو اس کار میں ایک پریمی جوڑا ایک دوسرے میں مدغم تھا۔ یہ دیکھ کر میں مسکرا دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور ابھی ریورس گیئر لگانے ہی والا تھا کہ سامنے نظر پڑی۔ ایک تیس پینتیس سال کی عورت دعوتِ نظارہ دیتے ہوئے پُرکشش لباس میں سامنے سے آ رہی تھی۔ یہ لوریٹا تھی۔ اس کے سر کے بال سنہرے تھے۔ چہرے پر میک اپ تھپا ہوا تھا۔ اس نے گہرے سرخ رنگ کا شارٹ اسکرٹ، بڑے گلے کا نیلا ٹائٹ بلاؤز اور اونچی ہیل کی سینڈل پہن رکھی تھی۔ کندھے پر بڑا سا پرس جھول رہا تھا۔ وہ لہراتی، بل کھاتی ہوئی میرے برابر والی گاڑی کی طرف بڑھی۔ اس نے شاہانہ بے نیازی سے کار کا دروازہ کھولا تو وہ پریمی جوڑا چونک گیا اور جلدی سے ہنستے مسکراتے ہوئے انہوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ اس دوران میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھے جوڑے کو غور سے دیکھا۔ دونوں چہرے مہرے سے لاأبالی لگ رہے تھے۔ لوریٹا کے بیٹھتے ہی اس مرد نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اگلے ہی لمحے کار پارکنگ سے نکل رہی تھی۔

وہ کار مونٹروز کی طرف جانے والے راستے پر مڑی تھی۔ میں نے بھی اپنی کار اسٹارٹ کی اور نہایت سکون سے باہر سڑک پر آ گیا۔ میں جان بوجھ کر کچھ دیر کی تاخیر کر رہا تھا تاکہ انہیں کسی قسم کا شک نہ گزرے۔ اتفاق سے راستہ کچھ صاف مل گیا۔ اب وہ گاڑی میری نظروں کے سامنے تھی۔ اس وقت سڑک پر بہت زیادہ رش نہیں تھا۔ رش نہ ہونے کی وجہ سے میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں وہ لوگ یہ نہ جان جائیں کہ اُن کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اسی لیے اُن سے خاصا فاصلہ رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

مونٹروز سے کچھ پہلے گاڑی بلاک 21 کے قریب پہنچی تو انہوں نے مجھے سائڈ میں ہو کر آگے نکلنے کا اشارہ دیا۔ میں سائڈ مرر میں دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے دوسری طرف دیکھا۔ سامنے مون لائٹ بار تھا۔ اندھیرا ہو چکا تھا لیکن بار کا روشنیوں والا سائن بورڈ جگمگا رہا تھا۔ میں نے رفتار نہایت کم کر دی۔ میری نظر سائڈ مرر پر مرکوز تھی۔ میرے آگے

بڑھتے ہی وہ کار بھی رک گئی۔ لوریٹا اور وہ دوسری عورت، دونوں اتر گئیں۔ یہ دوسری بھی لوریٹا کی ہم عمر ہی لگ رہی تھی۔ اُن کے اترتے ہی وہ گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں نے کار پارک کی اور باہر نکل آیا۔ وہ دونوں عورتیں بھی بار کی طرف جا رہی تھیں۔

اندر کافی رش تھا۔ میں نے بھی گلاس تھاما اور بڑے سکون سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ لوریٹا اور اس کی ساتھی عورت کاؤنٹر کے سامنے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں گلاس تھے اور وہ آہستہ آہستہ گھونٹ بھر رہی تھیں۔ میری نظریں اُن دونوں پر تھیں۔

اسی دوران میں پیٹر بھی اندر داخل ہو گیا۔ وہ تنہا تھا۔ میں دروازے کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کئی نوجوان اس کی طرف بڑھے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ لوریٹا بھی اُسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک پیٹر کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ ''ایک شام میں، مختصر وقفے سے دوسری بار ملاقات۔'' اس نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ ''ویسے... تم یہاں کیسے؟''

''اخبار میں پڑھا تھا کہ ایک ابھرتا ہوا راک بینڈ آج یہاں پرفارم کرے گا، بس اسی لیے یہاں آیا ہوں۔''

''اوہ... تمہیں پتا ہے، وہ بینڈ میری ہی دریافت ہے۔''

''بہت خوب!'' میں نے خوشی کا تاثر دیتے ہوئے جواب دیا۔ اسی دوران میں کوئی شخص آ گیا اور پیٹر اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے پھر کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کی نظریں اسی طرف ٹکی ہوئی تھیں۔

''پھر ملتے ہیں۔'' پیٹر نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

''یقیناً۔'' میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا۔ وہ دوسری طرف چلا گیا۔

ایک بار پھر میری نظریں اُنہی دونوں عورتوں پر مرکوز ہو چکی تھیں۔ لوریٹا وقفے وقفے سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے بے چینی ظاہر تھی۔ تھوڑی دیر میں ایک سیاہ فام، پستہ قد ویٹر اس کے پاس پہنچا۔ لوریٹا نے کچھ کہے بغیر پرس کھولا اور ایک لفافہ نکال کر اسے اس طرح تھمایا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ اس نے وہ لفافہ پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ لوٹا اور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا پیکٹ نکالا اور نہایت رازداری سے اسے لوریٹا کو تھما دیا جو اس نے جلدی سے اپنے پرس میں ڈال لیا۔

''ارے نامی!'' اسی دوران کسی نے اونچی آواز میں پکارا۔

''یس باس۔'' یہ سن کر وہ ویٹر فوراً مڑا اور چلاتے ہوئے کہا۔

''تو اس کا نام نامی ہے اور یہی ہے لوریٹا کے مرض کی زہر آلود دوا کو اُس تک پہنچانے والا۔'' میں نے دل میں سوچا۔ یہاں پر میرا کام مکمل ہو چکا تھا۔ میں نے بڑا سا گھونٹ لیا اور خالی گلاس برابر سے گزرنے والے ویٹر کی ٹرے پر رکھ کر باہر نکلنے لگا۔ اس دوران میں نے کاؤنٹر پر نظر ڈالی۔ گلاس لوریٹا کے منہ سے لگا ہوا تھا۔

''ایکسکیوزمی!'' میں گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا تو اچانک مجھے اپنے عقب سے نسوانی آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ لوریٹا میرے قریب کھڑی تھی۔

''آپ...'' اس نے استفساریہ انداز میں دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''آپ پیٹر وارڈ کے دوست ہیں نا؟''

''جی ہاں... اُن سے میری شناسائی ہے مگر آپ یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہی ہیں؟ آپ کون ہیں؟''

''وہ میرے شوہر ہیں۔''

''اوہ... کہیے، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''دراصل میرے پاس گاڑی نہیں ہے اور مجھے فوری طور پر اپنے دفتر پہنچنا ہے۔ ایمرجنسی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''بہت دیر ہو رہی ہے۔ کیا آپ مجھے وہاں تک پہنچا دیں گے؟''

''کوئی بات نہیں، آپ بیٹھیے۔ کہاں جائیں گی آپ؟'' وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔ اس نے جو پتا بتایا، یہ وہی تھا جہاں سے ہوتا ہوا میں یہاں پہنچا تھا۔

''میں بھی اُسی طرف جا رہا تھا۔'' پتا سن کر میں نے کہا۔

''اچھا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ پرس اس کی جھولی میں تھا اور نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں۔

''تو آپ پیٹر کو اکیلا چھوڑ آئی ہیں۔'' کچھ دیر تک خاموشی رہی تو میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''نہیں...'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور پھر کچھ دیر تک اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے چباتی رہی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''دراصل ہمارے درمیان کئی سال پہلے علیحدگی ہو گئی تھی۔''

''اوہ...'' یہ سن کر میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ ''معافی چاہتا ہوں۔ میری بات سے آپ کی دل آزاری

ہوئی ہوگی۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ایسی بات کوئی نہیں ہے۔“ اس نے فوراً کہا۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“

”لوریٹا۔۔۔لوریٹا وارڈ۔“

”تو آپ نے دوسری شادی کرلی ہے؟“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ پیٹر سے علیحدگی کے بعد میں اب تک تنہا ہوں۔“ میرے سوال کے جواب میں وہ کہنے لگی۔ ”مجھے پیٹر وارڈ سے بہت محبت تھی اور اب بھی ہے۔ اسی لیے اس کا نام اب تک میرے نام سے جڑا ہوا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ جذباتی ہوگئی۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“

”ایڈم تھامسن۔“ میں نے نقلی نام بتایا۔ ”میں ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر ہوں۔“ میں نے اپنی طرف سے اس کی تسلی کرتے ہوئے کہا۔ ”یونہی گھوم پھر کر اپنا فارغ وقت گزارتا ہوں۔“

”اوکے!“

اچانک اس کی نظر اپنی گود میں رکھے پرس پر پڑی۔ اس کی زِپ کھلی ہوئی تھی۔ میں نے بھی کن انکھوں سے جھانک لیا۔ پرس میں رکھے ایک خاکی لفافے کے نیچے سے پستول کی نال جھانک رہی تھی۔ اس نے زِپ بند کی اور پرس کار کی پچھلی نشست پر اچھال دیا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سر سیٹ سے ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ لگ رہا تھا کہ وہ اپنی منزل تک پہنچنے سے پہلے اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ اس وقت میں نے اس کی جسمانی حالت کا مشاہدہ شروع کردیا۔ وہ بار بار ٹانگ بدل رہی تھی۔ کبھی سیدھی ٹانگ اُلٹی پر رکھتی اور کبھی اُلٹی ٹانگ سیدھی پر۔ میں سمجھ گیا کہ اس وقت اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ میں یہ بات بھی جان گیا کہ اسے دفتر پہنچ کر کام نہیں کرنا بلکہ نشہ کرنا ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ گھر میں نشے سے پرہیز کی کوشش کرتی ہوگی۔

”کس کمپنی میں کام کرتی ہو؟“ جب ہم پہنچنے والے تھے تو وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر میں نے پوچھا۔

”بی اینڈ بی رئیل اسٹیٹ میں۔“ اس نے ایسے کہا کہ جیسے اس کا حلق سوکھ رہا ہو۔ ”وہ دراصل ایک کلائنٹ کو آنا تھا۔ میں اِدھر چلی آئی۔ بس یہاں دیر ہوگئی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ”بار میں آپ کو پیٹر کے ساتھ دیکھا تھا اسی لیے آپ سے لفٹ مانگ لی۔“

”لیجیے۔۔۔ہم پہنچ گئے۔“

”بہت شکریہ۔“ میں نے گاڑی روکی تو وہ تیزی سے اتر کر روڈ کراس کرنے لگی۔ سامنے ایک منزلہ عمارت پر لگے بڑے سے بورڈ پر پڑنے والی روشنی میں لکھا ہوا نام صاف پڑھا جاسکتا تھا: بی اینڈ بی رئیل اسٹیٹ۔

لوریٹا کے اترتے ہی میں نے تیزی سے گاڑی آگے بڑھادی اور تقریباً آدھا کلومیٹر دور پہنچنے کے بعد بریک لگایا اور ہاتھ بڑھا کر پچھلی سیٹ سے لوریٹا کا پرس اٹھایا۔ میں اس وقت ہی چونک گیا تھا جب وہ پرس لیے بغیر جلدی میں گاڑی سے اتری تھی۔ میں پرس لیے بغیر اترتا دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ اس کی یہ بھول دراصل یہ میرے لیے قسمت کا تحفہ تھا۔ اس پرس میں وہ پیکٹ تھا جو اس نے بار کے پیسٹر ویٹر سے لیا تھا۔

میں نے پرس کی زِپ کھولی۔ لفافہ نکالا تو اس کے اندر سفید پلاسٹک کا ایک چھوٹا سا پیکٹ رکھا تھا۔ نہایت احتیاط سے لفافہ کھولا اور اس میں رکھا ہوا پوڈر ذرا سا نکال کر زبان کی نوک پر رکھا۔ اگلے ہی لمحے میں سمجھ گیا کہ یہ کوکین ہے۔ میں نے دستانے پہن کر پستول نکالا۔ یہ ایک چھوٹا پستول تھا۔ عموماً رات کو دیر گئے تک باہر رہنے والی عورتیں اس طرح کے پستول اپنے پرس میں رکھ کر خود کو محفوظ ہونے کا یقین دلاتی ہیں۔ لوریٹا بھی انہی عورتوں میں سے ایک تھی جو رات گئے تک باہر رہتی ہیں اور خود کو غیر محفوظ بھی سمجھتی ہیں۔

”ہمفرے ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔“ پرس کی زِپ بند کرکے اسے واپس پچھلی نشست پر رکھتے ہوئے میں نے خود کلامی کی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑا آگے جا کر دائیں طرف یوٹرن لیا۔ میں لوریٹا کو پرس واپس کرنے کے لیے بی اینڈ بی رئیل اسٹیٹ کے دفتر جارہا تھا۔

میں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ وہ دفتر کے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے اس کے سامنے پہنچ کر بریک لگائے اور جیسے ہی سر کھڑکی سے باہر نکالا، وہ لپک کر میرے قریب آگئی۔

”اوہ۔۔۔ بہت بہت شکریہ۔ میں کافی پریشان ہوگئی تھی۔“ اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

”مجھے بھی آگے جا کر یاد آیا کہ تم پرس کے بغیر اتر گئی ہو۔ مڑ کر دیکھا تو واقعی پرس رکھا ہوا تھا۔“ میں نے ہاتھ بڑھا کر پچھلی سیٹ پر سے پرس اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جلدی میں بھول گئی تھی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ بس۔۔۔ اب تو وہ گیا۔“ اس نے پرس تھامتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”بہت بہت شکریہ آپ کا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ میں نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

”لگتا ہے اس میں کافی اہم چیزیں ہیں۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

”جی ہاں، بہت ہی اہم۔“

”میں چلتا ہوں۔“ میں نے گیئر لگاتے ہوئے کہا تو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے دفتر کی طرف بڑھ گئی۔

میں اب گھر جارہا تھا۔ ڈنر کے بعد میں لیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا اور دن بھر کی رُوداد کے نوٹس بنانے لگا۔ میری عادت ہے کہ کام کی تکمیل پر کلائنٹ کو سادہ کاغذ پر ٹائپ شدہ رپورٹ دیتا ہوں لیکن اپنے دستخط اور کمپنی کی مہر کے بغیر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی طرح کے قانونی معاملے میں میرا یا میری کمپنی کا نام خوامخواہ بیچ میں آئے۔ اس لیے ہر دن کی کارروائی کے نوٹس تیار کرنا میری پیشہ ورانہ عادت تھی۔

میں نے ہمفرے سے کام دو دن میں ختم کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ آج پہلا دن تھا اور میرا کام تقریباً مکمل ہوچکا تھا۔ اس نے جو کام میرے ذمّے لگایا تھا، اس کے دو نکات تھے۔ اول یہ کہ لوریٹا نشہ کرتی ہے مگر کس چیز کا؟ دوسرا یہ کہ اسے نشہ کون فراہم کرتا ہے یا وہ کہاں سے اسے خریدتی ہے؟

مجھے ان دونوں سوالات کے جوابات مل گئے تھے۔ وہ پہلے کون سا نشہ کرتی تھی، اس کا تو مجھے پتا نہیں لیکن اس وقت وہ کوکین استعمال کررہی تھی اور یہ اسے مون لائٹ بار کے ٹامی نام کے ویٹر کے ذریعے ملا کرتی تھی۔ میری نظر میں ٹامی منشیات فروشوں کا چھوٹا موٹا کارندہ تھا جو ویٹر کے روپ میں گاہکوں کو کوکین فراہم کرتا تھا۔ جس رازداری سے لوریٹا نے کوکین لی تھی، اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ ٹامی کس کا کارندہ تھا، یہ پتا کرنا میرا مقصد نہیں تھا اور نہ ہی ہمفرے نے یہ بات جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس طرح اب میری ایک ذمّے داری باقی تھی اور وہ یہ کہ ٹامی کے گھر کا پتا چلانا اور اس سے مل کر یہ تصدیق کرلینا کہ کیا وہ واقعی کوکین فراہم کرتا ہے۔ بس! اس کے بعد میری رپورٹ مکمل تھی۔ یہ بہت معمولی کام تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ کل دوپہر کو یہ کام کرکے رپورٹ مکمل کروں گا اور شام کو گھر لوٹتے ہوئے اسے ہمفرے کے حوالے کردوں گا۔ ویسے بھی یہ کام اس لیے آسان تھا کہ میری جیب میں اس سے لیے ہوئے وہ پچاس ڈالرز اب تک موجود تھے جو اخراجات کی مد میں ملے تھے۔ انہیں بھی تو خرچ کرنا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کو خرچ کرنے سے میرا کام بہت ہی آسان ہوجائے گا۔

☆☆☆

دوسرے دن میں دفتر پہنچا اور ہمفرے کو دینے کے لیے رپورٹ لکھنے لگا۔ یہ ایک صفحے پر مشتمل رپورٹ تھی۔ میں نے رپورٹ تیار کی اور ٹامی کا نام لکھ کر اس کے پتے والی جگہ کو خالی چھوڑ دیا۔ اس کے بعد میں نے مون لائٹ بار فون کیا۔ معلوم ہوا کہ بار دن کے تین بجے کھل جاتا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ سہ پہر تک میں فارغ تھا۔ بیٹھے بیٹھے میرے دماغ میں خیال آیا کہ کیوں نا مسز ہمفرے کے فلیٹ پر پہنچا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ کس طرح کی زندگی بسر کررہی ہے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے نوٹ بک نکال کر اس کا پتا ایک کاغذ پر لکھا۔ کچھ دیر بعد میری کار گرے ہیمر اپارٹمنٹس کی طرف بڑھ رہی تھی یہ متوسط طبقے کا علاقہ تھا۔

ہمفرے نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بیوی کا نام جنیفر ہے۔ پتا میرے پاس تھا۔ مجھے اپارٹمنٹ ڈھونڈنے میں کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ جنیفر ہمفرے کا فلیٹ ساتویں منزل پر تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچا۔ میں دروازوں پر لکھے نمبروں پر نظر ڈالتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک میرے دائیں طرف واقع ایک فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ اُس وقت میں اس فلیٹ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ یہ دیکھ کر میں بھی ٹھٹک گیا۔ ایک ادھیڑ عمر مرد ہنستا ہوا فلیٹ سے باہر نکلا۔ اس نے سرمئی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ ہاتھ میں سیاہ چمڑے کا آفس بیگ تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک عورت نکلی۔ وہ بھی عمر کے لحاظ سے پچاس پچپن سے اوپر کی لگ رہی تھی۔ اس کی صحت خاصی بہتر تھی۔ میں ایک ہی نظر میں بھانپ گیا کہ وہ خود کو پُرکشش رکھنے کے لیے بڑی محنت کرتی ہوگی۔

”ٹھیک ہے، تو پھر ہم کام ہونے کے بعد ملیں گے۔“ اس نے کھنکتی ہوئی آواز میں لگاوٹ سے کہا۔

”اور اگر پہلے ملنے کا دل کرے تو۔۔۔“ مرد نے بھی نہایت پیار کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ کر اسے اپنی بانہوں میں تھام لیا۔

”تو آجانا لیکن خیال رہے کہ لوریٹا گھر پر نہ ہو۔“ عورت کا لہجہ تنبیہہ آمیز تھا۔

”اوکے جینی ڈارلنگ!“ یہ کہہ کر مرد نے اسے خود سے جدا کیا۔

”بائے ڈیئر سڈنی۔“ اس نے بھی اونچی آواز میں کہا

اور دروازہ بند کرلیا۔ مرد لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اُن دونوں کو دیکھتے ہوئے میں لمبے کوریڈور میں نہایت آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں ان کی باتیں سُن چکا تھا۔ تھوڑا آگے جا کر پلٹا تو وہ مرد مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں پلٹا اور اس دروازے پر نظر ڈالی جس سے وہ باہر نکلا تھا۔ دروازے پر نمبر 712 نمبر لکھا ہوا تھا۔

یہ وہی فلیٹ تھا جس کا پتا مجھے ہمفرے نے دیا تھا۔ اس عورت کے منہ سے میں سڈنی اور لوریٹا کا نام سُن چکا تھا۔ اب اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ عورت یقیناً جنیفر ہمفرے ہی تھی۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ یہ مرد کون ہے جسے وہ سڈنی کہہ کر مخاطب کررہی تھی۔ کہیں یہ وہ سڈنی تو نہیں جس نے ہمفرے سے ملاقات کے لیے مجھے فون کیا تھا۔ اگرچہ یہ میرا کیس نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ہمفرے اب بھی میرا کلائنٹ تھا اس لیے اس معاملے میں میری دلچسپی بجا تھی۔ میں واپس دفتر لوٹ آیا۔ راستے بھر میں یہی سوچتا رہا کہ سڈنی کون ہے؟ میں اس شخص کا چہرہ اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ وہ چہرہ میرے سوال کے ساتھ ساتھ بار بار ذہن میں اُبھر رہا تھا۔

دفتر پہنچ کر بھی میں صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ آخر مجھے یقین آگیا کہ خود کو ہمفرے کا دوست ظاہر کرنے والا سڈنی کوک وکیل ہے لیکن وہ ہمفرے کا دوست نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہ مسز ہمفرے کے ساتھ مل کر کچھ گڑبڑ ضرور کررہا ہے۔ عورت کا یہ کہنا کہ اس وقت آنا جب لوریٹا گھر پر نہ ہو، اس کا مطلب تھا کہ اس کھیل میں ہمفرے کی بیٹی شامل نہیں۔ مجھے لگا کہ مسٹر ہمفرے کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہونے والی ہے۔

کافی دیر سوچنے کے بعد آخر میں نے پبلک لائبریری جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے سڈنی سے صرف ایک بار بات کی تھی اور وہ بھی فون پر، اس کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن مسز ہمفرے کے فلیٹ کے باہر جس شخص کو میں نے دیکھا تھا، اس کا چہرہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔

کچھ دیر بعد میں لائبریری میں بیٹھا ہوا نیویارک میں کام کرنے والے وکیلوں کی ڈائریکٹری دیکھ رہا تھا۔ یہ ڈائریکٹری محکمۂ قانون وانصاف نے شائع کی تھی جس کا مقصد لوگوں کو قانونی پیچیدگیوں سے نمٹنے کے لیے وکیلوں کے انتخاب میں معاونت فراہم کرنا تھا۔ اچانک میں چونک گیا۔ مسٹر سڈنی کوک... ساتھ ہی اس کی ایک تصویر بھی تھی۔ "یہ تو وہی ہے۔" میں نے خود کلامی کی اور جلدی سے بیگ کھول کر نوٹ بک نکالی اور ڈائریکٹری میں لکھے ہوئے پتے اور نمبر کو چیک کرنے لگا۔ پتا اور فون نمبر وہی تھا جو سڈنی نے مجھے لکھوایا تھا۔ اس سے ایک بات صاف ہوگئی کہ ہمفرے کے فلیٹ کے سامنے جس شخص کو میں نے دیکھا تھا وہی ہے جس کی معرفت میں ہمفرے سے ملا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ میں نے ڈائریکٹری بک شیلف میں رکھی اور دفتر لوٹ آیا۔

سہ پہر کے بعد میں دفتر سے مون لائٹ بار جانے کے لیے نکلا۔ یہ وقت میں نے سوچ سمجھ کر منتخب کیا تھا۔ میں تنہائی میں ٹامی سے ملنا چاہتا تھا۔ جب میں بار میں داخل ہوا تو اس وقت شام کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ بار تقریباً خالی تھا۔ میں نے کاؤنٹر سے گلاس لیا اور ایک خالی کونے میں رکھے ہوئے اسٹول پر بیٹھ کر گھونٹ لینے لگا۔ میں اچٹتی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھے جارہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹامی بھی نظر آگیا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی، میں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

"یس سر۔" وہ فوراً میرے قریب پہنچا۔

"مجھے لوری نے بھیجا ہے، میرا مطلب ہے کہ لورینا۔" میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔

"اوہ... کہیے، کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" اس کے انداز سے لگا کہ وہ لوری کو نہ صرف پہچانتا ہے بلکہ بہت اچھی طرح جانتا بھی ہے۔

"سفید دوا چاہیے۔"

"مل جائے گی۔"

"مگر یہاں نہیں، تم مجھے اپنے گھر کا پتا بتادو۔ جس وقت کہو گے گھر پہنچ کر لے لوں گا۔" میں نے مطلب کی بات کی اور ساتھ ہی پچاس ڈالر کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ ہمارے نئے تعلق کے قیام پر تمہارا انعام۔"

"یہاں کیا مسئلہ ہوسکتا ہے؟" اس نے فوراً نوٹ اچک لی اور جیب میں ٹھونستے ہوئے سوال کیا۔ نوٹ دیکھ کر اس کی بتیسی نکل گئی تھی۔

"میں بوڑھا آدمی ہوں۔ یہاں آنا کچھ معیوب لگتا ہے۔" میں نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ آپ میرا پتا لکھ لیں۔ میں رات دو بجے سے دوپہر تک گھر پر ہی ہوتا ہوں۔ پہلے فون پر بتادینا پھر دوا لے لینا۔"

"یہ بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کا پتا اور فون نمبر لکھنے لگا۔

میرا کام ہو چکا تھا۔ میں نے گلاس خالی کیا اور بار سے نکل آیا۔

دفتر پہنچ کر میں نے رپورٹ مرتب کی اور اسے لفافے میں بند کرکے سکون کا سانس لیا۔ میری فیس حلال ہو چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج شام یہ رپورٹ ہمفرے کے حوالے کرکے سیدھا گھر پہنچوں اور بیوی بچی کو لے کر کہیں باہر ڈنر کروں۔ میں نے فوراً فون اٹھایا اور بیوی کو یہ خوش خبری سنائی۔ جینی نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ آج ہم کئی مہینوں کے بعد باہر ڈنر کرنے والے تھے۔

بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ اخلاقی طور پر سڈنی کوک کو بھی اطلاع کردوں کہ اس نے جو کلائنٹ دیا تھا، اُس کا کام ہوگیا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے ڈائری نکالی اور سڈنی کے دفتر کا نمبر ملانے لگا۔ پہلی گھنٹی بجتے پر ہی مجھے ریکارڈ شدہ پیغام سنائی دیا۔

"مسٹر سڈنی منگل سے ہفتے تک، شہر سے باہر ہیں۔ اگر کوئی خاص بات ہے تو آپ بیپ سننے کے بعد اپنا پیغام ریکارڈ کروادیں یا پھر اُن کی واپسی کا انتظار کریں۔"

پیغام سن کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ پیر کو اس نے مجھے فون کیا تھا۔ منگل کو میں نے اسے مسز ہمفرے کے فلیٹ پر دیکھا تھا۔ آخر ایسی کیا ضرورت پیش آئی کہ اسے شہر سے باہر جانا پڑا ہے حالانکہ اُس وقت تو جنیفر اور وہ ملنے کی باتیں کررہے تھے۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد میں نے اپنے ایک دوست کو فون کیا۔ میں سڈنی کوک کا کچا چٹھا جاننا چاہتا تھا۔ میرا دوست ریٹائرڈ پولیس آفیسر تھا اور خالص قانونی معاملات میں لوگوں کو مشورے فراہم کرنے والی ایک کمپنی چلارہا تھا۔ "ہائے۔"

"ہائے..." اس نے میری آواز پہچانتے ہی گرم جوشی سے کہا۔ "کہیے، کیا حال ہیں؟"

"تم سے ایک کام آپڑا ہے؟"

"بتاؤ۔"

"مجھے سڈنی کوک وکیل کے بارے میں معلومات چاہئیں۔"

"سنو..." یہ کہتے ہی وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرح آن ہوگیا۔ "عمر اٹھاون برس۔ پچھلے پچیس برسوں سے وکالت کررہا ہے۔ شعبہ جرائم، کردار کے لحاظ سے مشکوک۔ اس کے بارے میں اطلاعات ہیں کہ وہ مافیا کی قانونی مدد کرتا ہے اور بدلے میں ٹھیک ٹھاک مال بناتا ہے۔ ان دنوں وہ مافیا کے ایک سابق رکن ہمفرے میکلین کی بیوی کے چکر میں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ہمفرے کا قانونی مشیر بھی

دل بدست آور...

ایک صاحب قدرے برہمی کے عالم میں ایک رسالے کے دفتر میں تشریف لائے اور مدیر کے بارے میں استفسار کیا۔ وہاں پہنچے تو اپنا تعارف ایک مصنف کے طور پر کرایا۔ مدیر کے لیے وہ نام اجنبی تھا۔ دونوں کے درمیان کچھ یوں گفتگو ہوئی۔

"آپ ہی اس رسالے کے ایڈیٹر ہیں؟" انہوں نے الزام تراشی کے انداز میں پوچھا۔

"جی، خادم کی یہی ذمے داری ہے!"

"میں آپ کے لیے سترہ کہانیاں، آٹھ غزلیں، پانچ طویل نظمیں بھیج چکا ہوں۔ ان میں سے ایک بھی نہیں چھاپی گئی۔ یہ زیادتی کیوں ہورہی ہے؟"

تعداد کے حوالے سے مدیر کو ان کا نام یاد آگیا۔ "دراصل آپ کی بیشتر بلند پایہ تخلیقات کسی اچھے ادبی رسالے کے لیے موزوں ہیں۔ ہم تفریحی کہانیاں وغیرہ چھاپتے ہیں۔ کوئی ادبی نمبر نکالنے کی صورت پیدا ہوئی تو ہم ضرور آپ کی کسی تجریدی کہانی کا انتخاب کریں گے۔" جواب مہذب اور معذرت خواہانہ تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" موصوف نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آج کل پڑھنے والوں کا ذوق بگڑ گیا ہے، لوگ ادب سے الرجک ہیں۔ آپ کی بھی مجبوری ہے، ایک کمرشل ادارہ وہی کچھ چھاپے گا جو قارئین پڑھنا چاہتے ہیں۔ میں پندرہ سال سے لکھ رہا ہوں لیکن قارئین کی بدذوقی کے باعث آج تک میری ایک سطر بھی زیورِ طباعت سے آراستہ نہیں ہوسکی۔" وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئے پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "خیر، میں ان رکاوٹوں سے دل برداشتہ ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میرا پچھلا مواد تلف کردیں۔ گھر جا کر میں آپ کو پانچ نئی کہانیاں بھیجوں گا اور مزید بھی بھیجتا رہوں گا۔ میری کوشش ہوگی کہ اپنا معیار کچھ نیچے لاسکوں تاکہ آپ کے قارئین میری انوکھی اور اچھوتی کہانیوں سے فیض یاب ہوسکیں۔"

"جگہ کی قلت کے باعث ہم آپ کے پچھلے مواد کے بارے میں آپ کے مشورے پر عمل کرچکے ہیں اور آئندہ بھی اسے پیشِ نظر رکھیں گے۔"

موصوف نے مدیر کی بات کاٹ دی۔ "آج کل کاغذ بہت مہنگا ہوگیا ہے۔ آپ نے کاغذ کے ایک طرف لکھنے کی جو پابندی عائد کی ہوئی ہے، وہ ناروا ہے۔ اس مد میں میرے دگنے اخراجات ہوتے ہیں۔ کیا آپ میرے لیے یہ شرط نہیں ہٹا سکتے؟"

مدیر کے ذہن میں موصوف کا تلفی والا مشورہ گھوم رہا تھا۔ "آپ دونوں طرف لکھیں، درمیان میں سطر بھی نہ چھوڑیں۔ میں سب سنبھال لوں گا۔"

وہ صاحب مسرور وشاداں واپس چلے گئے۔

"بہت مشکلات ہوں گی۔" ان کے چلے جانے کے بعد معاون نے گہرا سانس لے کر مدیر سے کہا۔ "کاغذ کے دونوں طرف... ریڈنگ اور کمپوزنگ میں بہت مسائل ہوں گے؟"

"وہ مرحلے ہی نہیں آئیں گے۔" مدیر نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "میں اگر ان سے یہ کہتا کہ وہ کاغذ کے ایک طرف بھی نہ لکھا کریں تو وہ ناراض ہوجاتے اور ہم اپنا ایک قاری کھودیتے... اب ان کے مسودے آئیں گے اور چلے جائیں گے۔" ان کا آخری اشارہ ردی کی پیک زدہ ٹوکری کی طرف تھا۔

(شہناز شہرت، حیدرآباد)

ہے۔"

"بس بس..." اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور بولتا میں نے اسے بریک لگا دیے۔ "میرے لیے اتنی ہی معلومات کافی ہیں۔"

"آخری جملہ... خاصا مکار، عیار اور مجرمانہ خصلت کا حامل شخص ہے۔" یہ کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔

"بنا فیس کے معلومات کی فراہمی پر شکریہ۔"

"مجھے تم سے اسی بات کی توقع تھی۔" اس کا لہجہ پُرمزاح تھا۔

فون رکھنے کے بعد میں نے کافی بنائی۔ شام کے چھ بج چکے تھے۔ میں نے کافی پینے کے دوران میں ہمفرے کو فون کیا۔ وہ خاصا متجسس تھا۔ میں نے اس کے استفسار پر اسے ساری رُوداد سنائی اور یہ بتایا کہ میں اسے رپورٹ پیش کرنے کے لیے اس کے پاس آنا چاہتا ہوں۔

"کوئی بات نہیں، تم اسے ڈاک سے بھیج دو۔"

"جیسا آپ کہیں۔"

"مجھے چند روز میں آپ کی دوبارہ مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" اس نے میری بات سُن کر کہا۔

"آپ مجھے فون کر سکتے ہیں، میں حاضر ہوں۔"

"آپ کی مدد کا شکریہ... بائے۔" یہ کہہ کر اُس نے فون رکھ دیا۔

☆☆☆

ہمفرے کا کیس حل کیے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ میں حسبِ سابق دفتر پہنچا اور اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ 'سٹی نیوز' کے پہلے صفحے پر چونکا دینے والی خبر نمایاں انداز میں شائع کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک بڑی سی تصویر بھی چھپی تھی۔ "مافیا کے مبینہ سابق رکن اور ماضی کی اہم کاروباری شخصیت ہمفرے انتقال کر گئے۔" سرخی پڑھنے کے بعد پوری خبر پڑھے بغیر میرا چین سے بیٹھنا مشکل تھا۔ میں نے فوراً خبر پڑھنی شروع کی۔

خبر کے مطابق اٹھہتر سالہ ممتاز کاروباری شخصیت ہمفرے نیند کی حالت میں انتقال کر گئے۔ ان کی لاش پولیس نے تحویل میں لے لی ہے۔ ابتدائی تفتیش کے مطابق یہ طبعی موت کا واقعہ ہے تاہم مزید تفتیش جاری ہے۔

ہمفرے گزشتہ تین دہائیوں سے ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے بارے میں عام تاثر پایا جاتا تھا کہ وہ مافیا سے وابستہ تھے اور غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے۔ مزید یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ بہت بڑے کاروبار کے بھی مالک تھے۔ ان کی جائداد کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر بے نام کھاتوں پر مشتمل ہے۔ گزشتہ بیس پچیس سال سے وہ کاروباری سرگرمیوں سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ ان کی بیوی سے علیحدگی ہو چکی تھی اور وہ کئی برسوں سے تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ وہ کافی عرصے سے سانس کے عارضے میں مبتلا تھے۔ کل صبح ان کے معالج نے انہیں فون کیا لیکن فون اٹینڈ نہ ہونے پر انہوں پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس جب تالا توڑ کر ان کے گھر میں داخل ہوئی تو وہ اپنے بیڈروم میں بستر پر مردہ حالت میں تھے۔ ان کی لاش جس حالت میں ملی ہے، پولیس کے مطابق اسے دیکھتے ہوئے یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی موت سوتے میں سانس رک جانے کے باعث ہوئی ہے۔ مزید تفتیش کے لیے لاش کا پوسٹ مارٹم آج صبح متوقع ہے۔

نہ جانے کیوں یہ خبر پڑھنے کے بعد مجھے لگا کہ یہ اتنا سیدھا سادہ واقعہ ہرگز نہیں، جتنا کہ خبر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس شبے کی ایک وجہ ہمفرے کا یہ بھی کہنا بھی تھا کہ وہ ایک اور معاملے میں میری مدد لینا چاہتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسے کچھ خطرہ تھا۔ وہ خطرہ کیا تھا؟ میں اس بارے میں سوچنے لگا۔ آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس دن اس نے بیوی سے طلاق اور بیٹی کے معاملے پر بات کی تھی۔ بیٹی کا معاملہ وہ جان چکا تھا۔ رہی بیوی کو طلاق دینے کی بات تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس معاملے میں میری مدد چاہتا ہو۔ ممکن ہے کہ وہ یہ جان چکا ہو کہ جنیفر اور سڈنی کے مابین چکر چل رہا ہے جسے جواز بنا کر وہ نہ صرف بیوی کو طلاق دے سکتا تھا بلکہ اس طرح وہ بیوی کو کچھ دینے سے بھی بچ جاتا۔ یوں اس کے بعد اس کی تمام دولت کی جائز امیدوار اس کی بیٹی ہی ہوتی۔ ویسے بھی اُس دن اس نے میرے سامنے بیٹی کو ہی اپنی تمام تر جائداد کا وارث بنانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

مجھے سڈنی کو جنیفر کے فلیٹ پر دیکھ کر جو شک ہوا تھا، اب وہ یقین میں بدل رہا تھا۔ میں نے پولیس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر بعد میں پولیس سراغ رساں ایڈمنڈ کو فون ملا رہا تھا۔ یہ میرا پرانا دوست تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کے ذریعے میں پولیس کو اس کیس میں ایک فرض شناس شہری کی حیثیت سے مدد دے سکتا ہوں۔

"کیسے ہو تم؟" فون اٹھاتے ہی جب میں نے ہیلو کہا تو وہ میری آواز پہچان کر گرم جوشی سے بولا۔ "بڑے دن ہو گئے تم سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی۔" اس نے چھوٹتے ہی شکوہ بھی کر دیا۔

"سب شکایتیں بجا لیکن فی الحال میں نے یہ جاننے کے لیے فون کیا ہے کہ ہمفرے میکلین کیس کی تفتیش کس کے پاس ہے؟" میں نے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

"خیریت تو ہے؟" اس کی آواز سے تشویش جھلک رہی تھی۔

"شاید نہیں..." میرا لہجہ بدستور سنجیدہ تھا۔ "اخبار کے مطابق یہ طبعی موت تھی جبکہ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" اس کی آواز سے پریشانی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میرے خیال میں یہ قتل کیس ہے اور شاید میں حقیقت تک پہنچنے میں پولیس کی مدد کر سکتا ہوں۔"

"تم بڑی اہم بات کر رہے ہو۔" اس نے سنتے ہی کہا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ کیس میرے پاس ہے۔ میں کچھ ہی دیر میں تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔ دفتر میں ہی ہو نا؟"

"تفتیش تمہارے پاس ہے تو یہ بہت ہی اچھا ہوا۔ تم فوراً پہنچو۔" یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

فون کرنے سے پہلے میں یہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے تفتیش کس کے پاس ہو، وہ مزاج کا کیسا ہو لیکن اب میں مطمئن تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایڈمنڈ پرانا دوست ہونے کے ناتے نہ صرف میری بات پر پورا یقین کرے گا بلکہ قاتلوں کو پکڑنے کی بھی ہر ممکن کوشش کرے گا۔

آدھ گھنٹے بعد ایڈمنڈ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میں اسے ساری کہانی سنا چکا تھا۔

"تمہارے خیال میں سڈنی کوک اور مسز ہمفرے، دونوں اس کیس میں ملوث ہو سکتے ہیں؟"

"ایسا ہی ہے۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "فی الحال پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا ہے؟"

"وہ تو آج ہونا ہے۔" میری بات سن کر وہ کہنے لگا۔ "تم سے ملنے سے پہلے میرا خیال تھا کہ شاید پوسٹ مارٹم کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ سچ پوچھو تو میرا خیال تھا کہ پوسٹ مارٹم کیا ہی نہ جائے مگر اب میں چاہتا ہوں کہ پوسٹ مارٹم نہایت باریک بینی سے ہو۔"

"بالکل ٹھیک سوچ رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ اگر یہ بات پوسٹ مارٹم سے ثابت ہو جائے تو فوراً مسز ہمفرے کو اور سڈنی کو شبے کے الزام میں حراست میں لے لو۔" میں نے مشورہ دیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"تمہاری بات میں وزن ہے۔ وہ کئی سالوں سے اپنے شوہر سے علیحدہ رہ رہی تھی۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ایڈمنڈ نے کہنا شروع کیا۔ "ویسے بھی ہمفرے کی طبعی یا غیر طبعی موت کی صورت میں اس کی جائداد کا بڑا حصہ اسے ہی ملنا تھا۔ اب اگر ہمفرے کی غیر طبعی موت ثابت ہو جاتی ہے تو سب سے بڑی مشکوک تو وہی ٹھہرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے تمہاری مدد کی اب ہر قدم پر ضرورت پڑے گی اس لیے بہتر ہوگا کہ یا تو دفتر میں رہنا یا گھر پر تاکہ رابطے میں آسانی ہو۔"

"جس وقت ضرورت پڑے یہیں مل جاؤں گا۔" میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

شام کے چار بج رہے تھے۔ میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔ "ہیلو۔" میں نے فوراً فون اٹھایا۔

"تم دفتر میں ٹھہرو، میں اسپتال میں ہوں۔ یہاں سے نکل کر سیدھا تمہارے پاس پہنچتا ہوں۔" اس نے رسمی تکلفات میں پڑے بغیر مطلب کی بات کی۔

قرض کی میعاد

ایک صاحب نے کسی سے پانچ سو روپے ادھار مانگے اور وعدہ کیا کہ "کراچی سے آتے ہی میں سارے پیسے لوٹا دوں گا۔"

قرض دینے والے صاحب نے پوچھا۔ "آپ کس دن کراچی سے واپس آئیں گے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "جا کون رہا ہے؟"

(منور خان، کوہاٹ)

ٹپ

سان فرانسسکو کے ایک مشہور ریسٹورنٹ کا ویٹر اپنے بیٹے کو چڑیا گھر دکھانے لے گیا۔ جب جانوروں کے کھانے کا وقت آیا تو انہوں نے دیکھا کہ ایک ملازم آیا اور گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا شیر کے پنجرے میں پھینک کر چلا گیا۔ لڑکا یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا اور اپنے باپ سے پوچھنے لگا کہ "یہ لوگ ڈھنگ سے کھانا پیش کرنے کے بجائے جیسا کہ ہوٹلوں میں ہوتا ہے، اس طرح پھینک کر کیوں چلے جاتے ہیں؟"

ویٹر لڑکے کی طرف جھک کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ "یہ جانور ٹپ وغیرہ دینے کے بالکل قائل نہیں۔"

(عمران اللہ، لیہ)

''ٹھیک ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔
ایڈمنڈ کا لہجہ پریشان کن تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بات وہ نہیں جو اخبار میں چھپی تھی۔ ضرور یہ قتل کا ہی کیس ہے تبھی تو اس کی آواز ہیجان خیز تھی۔ تقریباً بیس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وہ پہنچ گیا۔
''یہ لو۔'' اس نے آتے ہی جیب سے ایک کاغذ کی فوٹو کاپی نکال کر مجھے تھمائی۔ ''اسے ذرا غور سے پڑھو۔''
''اوہ میرے خدا... میرا اندازہ درست تھا۔'' تحریر پڑھنے کے بعد میں نے بے ساختہ کہا۔
ایڈمنڈ نے جس دستاویز کی فوٹو کاپی مجھے تھمائی تھی، وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ تھی، جس میں صاف طور پر لکھا تھا کہ ہمفرے کی موت رات دس سے گیارہ بجے کے درمیان سانس رک جانے کے باعث ہوئی۔ ساتھ ہی اس کے چہرے اور گردن پر ایسے نشانات بھی پائے گئے ہیں جس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اسے منہ پر تکیہ رکھ کر ہلاک کیا گیا ہے۔ ڈاکٹرز نے موت کو مکمل طور پر غیر طبعی قرار ... دیا تھا۔
''اب تم کیا کرو گے؟ اگر تم سرکاری گواہ بن جاؤ تو میں فوری طور پر سڈنی اور مسز جنیفر ہمفرے کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کروالیتا ہوں۔''
''قانون کی مدد کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔
''ٹھیک ہے تو پھر اپنا تفصیلی تحریری بیان مجھے دے دو۔ اس کی بنیاد پر میں وارنٹ جاری کروا کر ان دونوں کو شام تک گرفتار لوں گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے بیان لکھتے ہوئے کہا۔
کچھ دیر بعد میں نے بیان لکھ لیا تو تجزیاتی نظروں سے اسے دوبارہ پڑھا اور پھر اپنے دستخط کر کے ایڈمنڈ کے سامنے رکھ دیا۔ ''یہ لو۔''
ایڈمنڈ نے فوراً کاغذ اُچک لیا اور اسے جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ ''یہ تو کمال ہوگیا۔'' بیان پڑھنے کے بعد اس نے گہری سانس لی اور غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس بیان کے بعد وارنٹ جاری کروانا بہت آسان ہوگیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں تمہارا بہت ہی شکر گزار ہوں ورنہ یقین کرو میں تو اس کیس کو خاطر میں ہی نہیں لا رہا تھا۔ اس کی تو عمر ہی اتنی تھی کہ کوئی بھی بہ آسانی یقین کر لیتا کہ وہ بڈھا خود ہی لڑھک گیا ہوگا۔''
''ضروری نہیں کہ ہر خیال درست ہو۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔
''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خیر... اب یہ بچ نہیں سکتے۔'' اس کا لہجہ پُرجوش تھا۔
رات کے نو بج رہے تھے جب میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف ایڈمنڈ تھا۔ ''کام ہوگیا۔ وہ دونوں پکڑے گئے۔'' اس کا لہجہ پُرجوش تھا۔
''کچھ بتایا انہوں نے؟'' میں نے جواباً کہا۔
''ابھی تک تو نہیں لیکن کب تک چپ رہیں گے۔ انہوں نے جرم کیا ہے اور انہیں قبول کرنا ہی پڑے گا۔''
''ٹھیک ہے، جب وہ اعتراف کرلیں تو مجھے بھی بتا دینا۔''
''تمہیں تو پہلی فرصت میں بتاؤں گا۔''

☆☆☆

سڈنی اور جنیفر کی گرفتاری کو تین روز گزر چکے تھے، تاہم وہ بدستور اعترافِ جرم سے انکار کر رہے تھے۔ اس صورت حال سے ایڈمنڈ اور میں بہت پریشان تھے۔ چوتھے دن صبح سویرے مجھے ایڈمنڈ نے فون کیا۔ اس کی آواز خوشی سے بھرائی ہوئی تھی۔ ''دونوں نے جرم قبول کرلیا۔''
''ارے واہ۔'' میں خوشی سے تقریباً چلا اٹھا۔
''ان دونوں کو آج مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں۔ فارغ ہو کر دفتر پہنچتا ہوں، پھر بتاتا ہوں اصل کہانی کیا تھی۔''
''میں انتظار کروں گا۔''
''بائے!'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون رکھ دیا۔
دن کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے جب ایڈمنڈ میرے دفتر پہنچا۔ میں بھی پچھلے کئی گھنٹوں سے اس کی آمد کا شدت سے منتظر تھا۔ ''یہ دونوں تو چھپے رستم نکلے۔'' اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔ خوشی کے مارے اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ''ویسے ان مکاروں کی گرفتاری کا اصل سہرا تمہارے سر سجتا ہے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔
''کس کے سر سجتا ہے، یہ چھوڑو۔ یہ بتاؤ اصل ماجرا کیا تھا؟'' اس کے بیٹھتے ہی میں نے بے قراری سے کہا۔
''یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ جنیفر نے تقریباً بیس بائیس سال پہلے ہی ہمفرے کو چھوڑ دیا تھا لیکن وہ قانونی طور پر اب بھی اُس کی ہی بیوی تھی... تو جب اس کو پتا چلا کہ ہمفرے اسے اپنی جائداد سے دودھ میں گری مکھی کی طرح باہر نکال رہا ہے تو وہ سٹپٹا گئی۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا، انجام تمہارے سامنے ہے۔''
''کھل کر پوری کہانی سناؤ۔'' میں نے اسے ٹوکا۔
''ٹھیک ہے تو پھر سنو۔'' اس نے ہمفرے کے قتل کی اصل کہانی سنانا شروع کی۔
ایڈمنڈ کے مطابق ہمفرے ماضی میں مافیا کا رکن رہا ہے اور اس کی تمام تر جائداد غیر قانونی تھی۔ سڈنی کوک پچھلے پچیس سال سے اس کی تمام تر غیر قانونی جائداد اور دولت کو قانونی رنگ دے کر جائز بنا رہا تھا۔ اب تک ہمفرے کی تمام دولت قانونی طور پر جائز ہو چکی تھی۔ جب یہ کام ہوگیا تو ہمفرے نے ایک وصیت تیار کروائی، جس کی رُو سے اس کی طبعی یا غیر طبعی موت کے بعد ساری جائداد کی وارث اس کی اکلوتی بیٹی لوریٹا ہوتی۔ دوسری طرف اس نے سڈنی کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اس کی بیوی سے عشق لڑائے۔ یوں وہ اس عشق کو جواز بنا کر بیوی کو طلاق دے دیتا۔ اس طرح ہمفرے کو اپنی لالچی بیوی کو جائداد سے ایک پائی بھی ادا نہیں کرنا پڑتی۔ اس نے سڈنی کو بھاری معاوضہ دے کر اس کام پر لگا دیا۔
چالاک سڈنی نے دوسرا کھیل شروع کر دیا۔ اس نے جنیفر کو اس کے شوہر کا پورا منصوبہ بتا دیا اور کہا کہ اگر وہ اپنے شوہر سے ترکے میں ملنے والی دولت کا نصف حصہ اسے دے تو وہ نہ صرف ہمفرے کی اصل وصیت تبدیل کر دے گا بلکہ جعلی وصیت کی رُو سے جنیفر کو ہی تمام جائداد کا مالک بنا دے گا۔ جنیفر تو پہلے سے ہی ہمفرے کی دولت پر نظریں لگائے بیٹھی تھی۔ اس نے سڈنی کے اس منصوبے سے پہلے بھی بڑی کوشش کی کہ کسی طرح پیٹر وارڈ کو راضی کر کے ہمفرے کو قتل کروا دے لیکن جب وہ نہ مانا تو اس نے بیٹی کو ورغلایا اور اسے پیٹر سے علیحدہ کروا دیا۔ پھر اسے اپنی ہی بیٹی راہ کا کانٹا لگنے لگی۔ اس نے سازش کی اور پھر اسے رفتہ رفتہ نشے کا عادی بنا کر ناکارہ کر دیا۔ اب جب سڈنی نے اس کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا تو اسے یہ منافع کا سودا لگا۔ اس نے فوراً ہاں کر دی۔ یہ کھیل ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ آخر منصوبے پر عمل کرنے کے لیے سازگار وقت آگیا۔
منصوبے پر عمل سے چند روز پہلے سڈنی نے شہر سے باہر چلے جانے کا ناٹک رچایا۔ اس نے لاس اینجلس میں اپنے نام سے ہوٹل کا ایک کمرا بُک کروایا اور خود سے مشابہ ایک شخص کو اپنے نام پر بنوائے گئے ٹکٹ پر جہاز سے لاس اینجلس بھجوا دیا اور خود یہیں روپوش رہا۔ جس صبح مسٹر ہمفرے کی لاش ملی، اُس شب کو وہ چھپتا چھپاتا ہمفرے کے اپارٹمنٹ پر پہنچا اور لیونگ روم میں صوفے کے کشن سے اس

نحیف شخص کی سانس روک کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی واردات کامیاب رہتی لیکن اتفاق سے جب وہ اپارٹمنٹ سے نکل کر زینے کے راستے گراؤنڈ فلور پر پہنچا تو وہاں اندھیرے گوشے میں سیوریج پائپ کی مرمت کرنے والے ایک پلمبر نے اسے دیکھ لیا۔ وہ پلمبر اس بلڈنگ کے تمام فلیٹوں میں پلمبرنگ کی خدمات سرانجام دیتا تھا۔ وہ کئی بار پہلے بھی اسے یہاں آتا جاتا دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ البتہ جب میرے بیان کے بعد ایڈمنڈ نے تفتیش شروع کی تو اس پلمبر سے بھی ملا۔ پلمبر بھی ہمفرے کے قتل سے آگاہ تھا۔ اس رات اس نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ سچ سچ بتا دیا۔ البتہ سڈنی کے بیان کے مطابق وہ لاس اینجلس سے اسی دن واپس آیا تھا جس روز ہمفرے کی لاش دریافت ہوئی تھی۔ جب پلمبر نے اسے پولیس کے سامنے شناخت کر کے وہی بات دُہرائی تو وہ ٹوٹ گیا اور اس نے اعتراف کر لیا لیکن اس کے باوجود جرم کا سارا ملبا جنیفر پر ڈالنے کی کوشش کی۔ سڈنی کے اعتراف کے بعد جنیفر نے بھی اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ یوں دونوں نہ صرف قتل بلکہ جعل سازی کے بھی مرتکب ہوئے۔

”دولت بہت بُری چیز ہے۔“ ایڈمنڈ جب پورا قصہ سنا چکا تو میں نے گہری سانس لی اور افسوس بھرے لہجے میں کہا۔ ”دولت کی خاطر ایک ماں نے اپنی ہی بیٹی کو نشے کی لت لگا دی۔ افسوس صد افسوس...“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میری بات سُن کر وہ بھی افسردہ ہو گیا۔

ہمفرے قتل کیس بہت سیدھا سادہ تھا۔ ایک ماہ مقدمہ چلا اور پھر سڈنی کو سزائے موت جبکہ جنیفر کو عمر قید کی سزا ہو گئی۔ مقدمے کی سماعت کے دوران میں ایک بار مجھے بھی بیان دینے کے لیے عدالت میں طلب کیا گیا۔ پیٹر وارڈ اور لوریٹا بھی عدالت میں موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر ان دونوں کو کافی حیرت ہوئی۔ وہ دونوں حقیقت سے باخبر ہو چکے تھے۔ دونوں بار بار میرا شکریہ ادا کر رہے تھے۔ لوریٹا بیک وقت اُداس بھی تھی کہ ایک طرف تو اس کا باپ چلا گیا، دوسری طرف اس کی ماں اپنے لالچ کے باعث اس انجام کو پہنچی۔

☆☆☆

ہمفرے قتل کیس کے مجرموں کو اپنے انجام تک پہنچے ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے لیکن میری بے روزگاری بدستور موجود تھی۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ کاروبار کا چوتھا سال مجھے راس نہیں آیا ہے۔ ہمفرے کا دیا ہوا کیس اب تک کا آخری کیس تھا۔

اُس دن بھی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک پیٹر وارڈ اور لوریٹا کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی۔ وہ دونوں بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر تک رسمی باتوں کے بعد لوریٹا نے اپنے پرس بیگ سے ایک بھاری بھرکم لفافہ نکالا۔ ”یہ آپ کے لیے۔“ اس نے لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی فیس... دو لاکھ ڈالرز نقد۔“

”مگر...“

”یہ میرے پاپا کے قاتلوں کو انجام تک پہنچانے اور میری زندگی بچانے کے لیے کی گئی کوششوں کی فیس ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہاں... اب میں نے کوکین سے بھی نجات حاصل کر لی ہے۔“

”یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔“

”سوچ کیا رہے ہیں؟ یہ لفافہ اٹھا لیں۔“ رقم اب تک میز پر میرے سامنے رکھی تھی لیکن میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے لفافہ اپنی طرف کھسکا لیا۔

”اب ایک درخواست ہے آپ سے۔“ پیٹر نے مجھ سے کہا۔

”وہ کیا؟“

”ہم دونوں مل کر ایک بہت بڑی میوزک ریکارڈنگ کمپنی بنا رہے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ بطور جنرل منیجر ہماری کمپنی جوائن کر لیں۔ تنخواہ اور مراعات... جو آپ کہیں گے، وہی ہوں گی۔“ پیٹر کی بات سُن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا سوچ رہے ہیں مسٹر ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر۔“ مجھے خاموش دیکھ کر لوریٹا نے کہا۔ ”ویسے ہم انکار نہیں سنیں گے۔“ اس نے ضدی بچی کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہا تو میں ہنس پڑا۔

”یہ سوچ رہا تھا کہ تنخواہ اور مراعات کے بارے میں کمپنی کے دفتر میں بیٹھ کر بات کریں گے، وہ بھی کل صبح۔“

”واہ!“ میری بات سن کر دونوں نے بے اختیار کہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کاروبار کا چوتھا سال ہی سب سے بہتر سال گزرا ورنہ پچھلے تین سال تو صرف مندی ہی مندی تھی۔

کھیل

جمال دستی

شوق اور ذوق کا کوئی مول نہیں... اسے بھی پرانی عمارتوں اور کھنڈرات کو کھنگالنے کا خبط تھا... اور اس کی خاطر وہ میلوں میلوں پیدل گھومتا رہتا... اسی آوارہ گردی میں وہ اس عمارت تک جا پہنچا جہاں ایک نہیں دو لاشیں اس کی منتظر تھیں۔

پُراسرار در و دیوار میں مقیدرہ جانے والی روحوں کا ماجرا

جوزف کیلی ٹہلنے کے انداز میں بیلی ہل کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا لینڈل برج تک پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے یہ سب سے مختصر راستہ تھا۔ ہل کے وسط میں کھڑے ہو کر اس نے پلیٹ فارم پر نظر ڈالی اور گہری سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔ ہل سے اترنے کے بعد وہ دائیں جانب مڑ گیا۔ اب اس کا رخ اسٹیشن کی جانب تھا جس کے سامنے والی سڑک سے اسے اپنی مطلوبہ بس میں سوار ہونا تھا۔ وہ ایک درمیانی عمر کا شخص تھا جس کی آنکھوں میں کھوج نظر آتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے گرم موسم میں قمیص پتلون اور جیکٹ پہن رکھی تھی اور کسی مختلف دور کا انسان لگ رہا تھا۔ اس کے ایک کندھے پر کیمرا اور دوسرے پر کینوس کا تھیلا لٹک رہا تھا جس میں اس کا لنچ اور کافی کا تھرماس رکھا ہوا تھا۔ اگر اس کی شخصیت میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو وہ اس کے بوسیدہ ہیٹ نے پوری کر دی جو اس نے بڑی شان سے اپنے سر پر چڑھا رکھا تھا۔

جوزف نے تمام عمر چھوٹے موٹے معمولی نوعیت کے کام کیے تھے۔ وہ کبھی بھی کسی ایک جگہ ٹک کر ملازمت نہیں

کرتا تھا۔ کبھی کسی بس میں ڈرائیوری کرلی تو کبھی کنڈیکٹر بن گیا۔ اس نے کچھ عرصہ ٹیکسی بھی چلائی لیکن بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ یہ کتنا خطرناک کام ہے۔ اس دوران میں اسے شہر کے چند ایسے علاقوں میں جانے کا بھی اتفاق ہوا جہاں کا نام سنتے ہی دوسرے ٹیکسی ڈرائیور کانوں کو ہاتھ لگا دیتے تھے۔ ان جگہوں پر چوری وڈکیتی کی وارداتیں عام تھیں اور ایک بار اس کی ٹیکسی پر بھی حملہ ہوا لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بحفاظت وہاں سے واپس آگیا۔ اس واقعے کے بعد اس نے ٹیکسی چلانے سے توبہ کرلی۔

اسے نہ جانے کب اور کیسے تباہ شدہ عمارتیں دیکھنے کا شوق ہوگیا تھا جو بڑھتے بڑھتے جنون کی شکل اختیار کرگیا اور اب یہ شوق اس کی زندگی پر حاوی ہو چکا تھا۔ بچپن سے ہی اسے خستہ حال، برباد شدہ عمارتیں دیکھنے اور ان میں تاک جھانک کرنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ اسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب لڑکپن میں اس نے اپنی پہلی مہم سر کی تھی۔ وہ گھر سے مچھلیاں پکڑنے کے لیے نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مچھلیاں پکڑنے کی ڈوری اور کانٹا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنی آنکھوں پر چھجا بنائے دور کہیں نظریں جمائے ہوئے تھا۔ وہ ایک زنگ آلود گیٹ کے پاس پہنچا جس پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ ”داخلہ ممنوع ہے۔“

جوزف کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ اس گیٹ کے پیچھے ضرور پانی کا کوئی ایسا ذخیرہ ہوگا جہاں سے اسے مچھلیاں مل سکتی ہیں اور اس کا خیال درست نکلا جونہی وہ گیٹ کو ہلکا سا دھکیل کر اندر داخل ہوا تو تھوڑا دور ہی جانے پر... وہ ایک بہت بڑے تالاب کے پاس کھڑا ہوا تھا جس کی لمبائی چوڑائی کسی چھوٹی سی جھیل سے تھوڑی ہی کم ہوگی۔ اس جھیل نما تالاب میں اسے مچھلیوں کی مختلف اقسام مثلاً روچ، ٹراؤٹ اور پیرچ وغیرہ خاصی تعداد میں نظر آئیں۔ وہ جس جگہ بیٹھا ہوا تھا، اس کے چاروں طرف پتوں کا ڈھیر تھا۔ جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک مصنوعی جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا ہے جو کہ ایک وسیع و عریض باغ کے وسط میں ہے جو غالباً اٹھارویں صدی میں تعمیر ہوا ہوگا۔ اس کے ساتھ یقیناً کوئی قدیم مکان بھی ہوگا۔ اس نے تالاب سے پکڑی ہوئی مچھلی وہیں چھوڑی اور عمارت کی تلاش میں نکل گیا۔ اس وقت اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ مہم جوئی اس کی زندگی بدل دے گی اور وہ تمام عمر اسی راستے پر چلتا رہے گا۔ جوزف کو اپنی زندگی میں پہلی بار ایک ویران عمارت دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

وہ ایک چھوٹا مگر عالی شان مکان تھا اور آثار بتا رہے تھے کہ یہ عمارت آگسٹس کے دور میں تعمیر ہوئی ہوگی۔ اس کے بلند و بالا ستون، کشادہ بالکونیاں اور قیمتی پتھروں سے مزین آتش دان اس عمارت کی عظمت کی گواہی دے رہے تھے۔ گوکہ سب کچھ تباہ و برباد ہو چکا تھا لیکن عمارت کے کچھ حصے کسی حد تک محفوظ تھے۔ وہ مکان میں داخل ہوگیا۔ شاید برسوں بعد وہ اس طرف آنے والا پہلا شخص تھا۔ سیڑھیوں کی حالت کافی خستہ تھی لیکن وہ آہستہ آہستہ چڑھتا ہوا مکان کے عقبی حصے کی جانب اتر گیا جہاں نوکروں کے کمرے تھے۔ ان میں بیشتر کے دروازے غائب تھے اور کہیں کہیں سے دیوار بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہ عمارت ویڈن ہال کے نام سے پہچانی جاتی تھی جسے مسمار کرنے کے بعد اس جگہ ایک نئی رہائش گاہ تعمیر کی جاتی۔ ہر شکستہ اور مخدوش عمارت کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد جوزف کے ذہن میں اچھوتا خیال آیا۔ اس سے پہلے کہ یہ مکان مسمار کردیا جائے اور اس کا نام ونشان بھی مٹ جائے کیوں نا وہ اس تاریخی عمارت کو تصویر کی شکل میں محفوظ کرلے، پورے انگلستان بلکہ یورپ میں ایسی لاتعداد قدیم عمارتیں ہوں گی جو ایک ایک کرکے اپنا وجود کھوتی جارہی ہیں۔

اس نے یارک شائر واپس آکر ایک کیمرا اور بلیک اینڈ وائٹ فلم کا رول خریدا۔ دوسرے دن وہ دوبارہ ویڈن ہال گیا اور اس کے اندرونی و بیرونی حصے کی متعدد تصویریں اتاریں۔ وہ اپنے اس کارنامے پر بہت خوش تھا۔ اس نے تاریخی سرمائے کو تصویروں میں محفوظ کرلیا تھا۔ اس کے بعد یہ اس کا معمول بن گیا۔ وہ گھوم پھر کر قدیم متروکہ اور مخدوش عمارتیں تلاش کرتا اور اپنے کیمرے کی مدد سے ان کی تصاویر اتار کر اس تاریخی ورثے کو محفوظ کرلیتا۔ ہر سال موسم گرما میں وہ انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، ویلس اور آئرلینڈ کی خاک چھانتا لیکن اسے زیادہ تر کامیابی انگلستان میں ملی جہاں قدیم تاریخی عمارتیں بڑی تیزی سے مسمار ہورہی تھیں۔ ان عمارتوں کی تصاویر لینے کے دوران اسے کئی قیمتی اشیا ملیں جو متروک حالت میں پڑی ہوئی تھیں اور ان کا کوئی وارث نہیں تھا۔ مثلاً سونے چاندی کے سکوں سے بھری ہوئی ٹرے، دیواروں پر آویزاں نادر و نایاب آئل پینٹنگز، چھتوں میں لٹکے ہوئے فانوس اور کتابیں وغیرہ لیکن اس نے کبھی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا البتہ ان کی تصویریں ضرور اتاریں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب اشیا اس کے لیے بیکار ہیں کیونکہ اگر وہ انہیں بیچنے گیا تو فوراً پکڑا جائے گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے چور سمجھے۔ ویسے بھی یہ مشغلہ اختیار کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو

بہت اہم سمجھنے لگا تھا۔ جب بھی اس کی کھینچی ہوئی تصویریں دھل کر آتیں تو اس کا سینہ فخر سے چوڑا ہوجاتا اور وہ سوچتا کہ پورے انگلستان میں کسی کے پاس یہ نادر و نایاب تصاویر نہیں ہوں گی۔ اسے یقین تھا کہ ان تصویروں کی فروخت سے اسے اچھی خاصی رقم مل سکتی ہے۔

وہ اپریل کی ایک گرم صبح تھی جب وہ ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑی بس میں سوار ہوا جو اسے گریٹ کیلڈ نامی گاؤں تک لے جاتی جہاں سے پیدل آدھ گھنٹے کی مسافت پر تھا اور یہ فاصلہ اسے پیدل طے کرنا تھا۔ اس عمارت کے بارے میں اس نے یارک شائر پوسٹ میں ایک مضمون پڑھا تھا جس کے بعد اس کے دل میں اس عمارت کو دیکھنے کی خواہش انگڑائی لینے لگی اور وہ اپنی تاک جھانک کی عادت سے مجبور ہوکر اس جانب چل دیا۔

بس کا سفر بے حد آرام دہ تھا۔ وہ کھڑکی کے برابر والی نشست پر بیٹھا باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ بس نے اسے گریٹ کیلڈ کے مرکزی چوک پر اتار دیا جس کے ساتھ ہی 1918ء کی جنگ میں مارے جانے والوں کی یادگار تھی۔ وہاں ایک بڑی سی سنگی تختی نصب تھی جس کے چاروں اطراف جنگ میں مارے جانے والوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نظر اس تختی پر ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔ سڑک کے دونوں اطراف قدیم طرز کی عمارتوں کی قطار تھی جو اس کے اندازے کے مطابق 1920ء یا 1930ء میں تعمیر کی گئی تھیں۔ وہ سڑک کے کنارے بنی ہوئی فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں عمارتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا تھا۔ یہاں رک کر اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا پھر سڑک چھوڑ کر ایک پگڈنڈی پر ہولیا۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا جب اپنی منزل تک پہنچا تو وہاں کی تنہائی اور سناٹا دیکھ کر اسے خوف سے جھرجھری آگئی۔ لیکن اس نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا۔ یہ ماحول اس کے لیے نیا نہیں تھا بلکہ اس سے پہلے بھی وہ کئی مرتبہ اس طرح کی صورتِ حال کا سامنا کرچکا تھا۔

جوزف بڑے اطمینان سے آگے بڑھا۔ اسے یقین تھا کہ اس عمارت کی تصویریں اس کے اثاثے میں اچھا اضافہ ثابت ہوں گی۔ وہ جونہی بڑے ہال میں داخل ہوا تو اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔ اس کے سامنے ایک لاش چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں باریک نائلون کی ڈوری کا پھندا تھا اور اس ڈوری کا دوسرا سرا چھت میں نصب فانوس کے کنڈے سے گزرتا ہوا دیوار گیر آتش دان سے منسلک تھا۔ فرش پر ہی ایک چھوٹی سیڑھی نما اسٹول رکھا ہوا تھا جس پر چڑھ کر رسی کو چھت کے ہک سے گزارا گیا ہوگا۔ لٹکی ہوئی لاش کے قدموں کے نیچے ایک کرسی الٹی پڑی تھی اور اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والی نے اس کرسی پر چڑھ کر گلے میں پھندا ڈالا اور کرسی کو ٹھوکر ماردی۔ اگر یہ قتل تھا تو اس صورت میں کسی نے اس عورت کو کرسی پر کھڑا کیا اور پھندا ڈالنے کے بعد اس کے قدموں کے نیچے سے کرسی کھینچ لی۔ جوزف کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس عورت کو پھانسی دی گئی یا اس نے خودکشی کی تھی۔ یہ فیصلہ پولیس ہی کرسکتی تھی۔ لاش کے نیچے فرش پر مکھیوں کی بہتات سے پتا چلتا تھا کہ یہ گزرے کل کی بات نہیں بلکہ اسے وہاں لٹکے ہوئے کئی روز گزر چکے تھے۔

جوزف چند لمحے بے حس وحرکت کھڑا لاش کو دیکھتا رہا پھر اس نے اپنا کیمرا نکالا اور اس کی تصویریں لینا شروع کردیں۔

سب سے پہلے مقتولہ کی عمر کا تعین کرنا ضروری تھا جو خاصا مشکل لگ رہا تھا کیونکہ جسم کے کچھ حصوں کا گوشت گل سڑ جانے کی وجہ سے وہ جزوی طور پر ڈھانچے میں تبدیل ہو چکی تھی تاہم اندازے کے مطابق وہ بیس اور تیس کے درمیان تھی۔ اس نے سستی سی جینز پہن رکھی تھی جو اب چیتھڑوں میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ نیچے کی جانب جھول رہے تھے جبکہ اس کے پیر فرش سے چھ انچ اوپر اٹھے ہوئے تھے جس کا مطلب تھا کہ کرسی ہٹ جانے کے بعد اس کا جسم جھٹکے سے نیچے آیا ہوگا۔

جوزف ہال سے باہر آگیا اور طویل راہداری سے گزرتا ہوا بقیہ عمارت کا جائزہ لینے لگا۔ وہ مکان کے عقبی حصے میں واقع ایک کمرے میں داخل ہوا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہاں اسے ایک پرانی فورڈ اسکارٹ وین کھڑی نظر آئی۔ اس کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور ٹائروں میں ہوا کم لگتی تھی جس کا مطلب تھا کہ وہ وین وہاں کافی عرصے سے کھڑی ہوئی تھی۔ اس گاڑی کو دیکھ کر وہ چکرا گیا۔ کیا وہ عورت خودکشی کرنے کے لیے اس وین میں سوار ہوکر یہاں تک آئی تھی؟ لیکن اسے مکان میں جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اردگرد پھیلے ہوئے جنگل میں کئی ایسے درخت تھے جن کی مضبوط شاخوں سے لٹک کر وہ خودکشی کرسکتی تھی۔ یقیناً یہ کوئی اور ہی کہانی تھی۔

وہ واپس راہداری میں آیا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی منزل پر پہنچ گیا۔ اس کی راہداری نچلی منزل کے مقابلے میں تنگ تھی۔ اس نے پرانے طرز کے مکانوں میں ایسا ہی دیکھا تھا۔ تمام کمرے پرندوں اور چمگادڑوں سے بھرے ہوئے

تھے کیونکہ ٹوٹے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی وجہ سے ان کی وہاں تک رسائی آسان ہوگئی تھی۔ وہ باری باری سب کمروں میں جھانکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے والے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے ایک اور ڈھانچا نما لاش نظر آرہی تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا۔ لاش کی پوزیشن کچھ یوں تھی جیسے وہ شخص کھڑکی کے نیچے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا ہو۔ اس نے مردانہ لباس پہنا ہوا تھا جبکہ پیروں میں بھاری جوتے اور کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے برابر میں ہی ایک چاقو پڑا ہوا تھا جس کے پھل پر خون جم کر سیاہ ہوچکا تھا۔ جوزف نے لاش کے ساتھ ساتھ اس چاقو کی بھی تصویریں بنالیں۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد جوزف نے پورے گھر کا چکر لگایا اور اپنی عادت کے مطابق ہر کمرے میں الماریاں اور درازیں کھول کر ان کی تلاشی لیتا رہا۔ یہاں بھی اسے چاندی کے برتن، قدیم مجسمے اور اٹھارویں صدی کے ملبوسات ملے لیکن پورے گھر کو اچھی طرح چھان لینے کے بعد بھی اسے کوئی اور لاش نظر نہیں آئی۔ وہ عقبی دروازے سے نکل کر مکان کے پچھلے حصے میں گیا اور باہر کھڑی ہوئی فورڈ وین کا معائنہ کرنے لگا۔ اسے گاڑی کے عقبی حصے میں ویسی ہی ڈوری کا گچھا نظر آیا جو اس عورت کی پھانسی یا خودکشی کے لیے استعمال کی گئی تھی۔ گاڑی کے اگنیشن میں چابیاں لگی ہوئی تھیں جس کا مطلب تھا کہ اس گاڑی میں آنے والا جلدی میں تھا اور اسے فوراً ہی واپس جانا تھا اس لیے اس نے گاڑی میں سے چابیاں نہیں نکالیں۔ جوزف نے اپنا کیمرا کندھے پر ڈالا اور گاؤں جانے والی سڑک پر چل دیا۔ مرکزی چوک پر پہنچ کر اس نے پبلک بوتھ سے پولیس کو فون پر لاشوں کی موجودگی کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”بہت زیادہ جلدی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دونوں لاشیں کم از کم بارہ مہینے پرانی ہیں۔“

☆☆☆

دو کانسٹیبل اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچے تو وہ ایک شراب خانے کے باہر بینچ پر بیٹھا کسی مشروب کے گھونٹ لے رہا تھا۔ پولیس کو فون کرتے ہوئے اسے اسی جگہ کا بورڈ نظر آیا اور اس نے دور سے ہی بورڈ پر لکھا ہوا نام پڑھ لیا۔ ”میں گرین مین کے باہر بیٹھا ہوا ملوں گا۔“ پولیس کو وہاں تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے پولیس کار کو آتا دیکھ کر بقیہ مشروب حلق میں انڈیلا اور کانسٹیبل کے اشارہ کرنے پر گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیور کو پیٹلے ہال جانے کا راستہ بتایا اور ایک مناسب جگہ پر وہ لوگ پگڈنڈی پر پیدل ہی مکان کی طرف چل پڑے۔ جائے وقوعہ پر پہنچ کر وہ باہر ہی رک گیا اور دونوں کانسٹیبل اندر چلے گئے۔ چند لمحوں بعد ہی وہ واپس آگئے اور ان میں سے ایک بولا۔

”کیا تم نے کبھی مجرمانہ مداخلتِ بے جا کے بارے میں سنا ہے؟“

اس کا دوسرا ساتھی وائرلیس کے ذریعے پولیس اسٹیشن کو بتا رہا تھا کہ فون کرنے والے شخص کی اطلاع درست ہے۔ اس ویران اور اجاڑ مکان میں واقعی دو لاشیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک کو قتل کیا گیا ہے جبکہ دوسرا خودکشی کا کیس ہے۔

”ہاں۔“ جوزف نے جواب دیا اور ایک بار پھر اس کی نظریں اس قدیم عمارت پر جم گئیں۔

”اور تمہیں یہ ڈر نہیں کہ اس جرم پر تمہارے خلاف مقدمہ بھی قائم ہوسکتا ہے؟“ دوسرے کانسٹیبل نے کہا۔

”نہیں۔“ جوزف مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اپنا ہوم ورک کر رکھا ہے۔ کسی تباہ شدہ لاوارث عمارت کے اطراف چکر لگانا اور کوئی نقصان نہ پہنچانا کسی طرح بھی مداخلتِ بے جا کے زمرے میں نہیں آتا۔ میری ساری عمر انہی عمارتوں کو دریافت کرنے میں گزر گئی۔ مجھے ایک دو مرتبہ یہ ضرور کہا گیا کہ میں اس جگہ سے چلا جاؤں لیکن کبھی مداخلتِ بے جا کے الزام میں مقدمہ چلانے کی دھمکی نہیں دی گئی کیونکہ میں کسی عمارت کو نقصان پہنچاتا ہوں اور نہ ہی وہاں سے کوئی چیز چوری کرتا ہوں۔“

☆☆☆

پولیس آفیسر مارک فلپ اپنی ساتھی لنڈا اجین کے ہمراہ جائے واردات پر پہنچا تو وہاں کھڑی ہوئی لینڈ روور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اس گاڑی کو اچھی طرح پہچانتا تھا جو بل بیچ کی ملکیت تھی اور ایک پولیس کار کے عقب میں کھڑی ہوئی تھی۔ مارک فلپ نے بھی اپنی کار اس کے پیچھے لگا دی۔ وہاں ایک پولیس کانسٹیبل ان کی راہنمائی کے لیے پہلے سے موجود تھا۔

بل بیچ مکان کے باہر ہی کھڑا ہوا تھا۔ وہ ان کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”دونوں کو مرے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔“

”میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔“ فلپ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ویسے تو میں سو گز کے فاصلے سے بھی تم جیسے پیتھالوجسٹ کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر سمجھ جاتا

ہوں کہ تم کیا کہو گے۔“

”فی الحال یہ نہیں بتا سکتا کہ ان دونوں کی موت کیسے واقع ہوئی البتہ مجھے حیرت ہوگی اگر ابتدائی تاثر غلط نکلا۔ اوپر والے کمرے میں مرد کے سینے پر گہرا زخم آیا ہے جبکہ ہال میں موجود عورت کی لاش کی گردن میں پھندا پڑا ہوا تھا لیکن ابھی یہ تصدیق ہونا باقی ہے کہ ان کی موت کس طرح واقع ہوئی۔“

بل بیچ نے اپنی پلکیں صاف کیں اور ماتھے کا پسینا پونچھتے ہوئے بولا۔ ”وہ دونوں جوان تھے اور ان کی عمریں بیس اور پچیس سال کے درمیان ہوں گی۔ میرے اندازے کے مطابق انہیں مرے ہوئے کم از کم بارہ مہینے ہوچکے ہیں۔ مرد کا قد پانچ فٹ دس انچ جبکہ عورت پورے پانچ فٹ کی تھی۔ پولیس والے اپنا کام ختم کرلیں تو میں ان لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے یارک شائر لے جاؤں گا۔ کیا ان لاشوں کو لے جانے کے لیے ایمبولینس آچکی ہے؟“

”ابھی تک تو نہیں آئی۔“ فلپ نے جواب دیا۔ ”ہم نے سڑک کے کنارے صرف تمہاری گاڑی اور ایک پولیس کار کھڑی ہوئی دیکھی ہے۔“

”اگر تم چاہو تو اندر جا کر لاشوں کو دیکھ سکتے ہو۔ پوسٹ مارٹم کے دوران پولیس کی نمائندگی کون کرے گا؟“

فلپ نے لنڈا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم وہاں جانا پسند کرو گی؟“

”اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ لنڈا بولی۔

”ٹھیک ہے، تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ میں ایک چکر یہاں کا لگا لوں۔“

”یہ پوسٹ مارٹم کے مقابلے میں زیادہ دلچسپ ہوگا۔“ بل بیچ نے قدیم عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

فلپ کھلے ہوئے دروازے سے مکان میں داخل ہوا اور طویل راہداری عبور کرتا ہوا عقبی حصے میں پہنچ گیا جہاں فورڈ وین کھڑی ہوئی تھی اور ایک پولیس آفیسر اس کا باریک بینی سے معائنہ کر رہا تھا۔ فلپ اس کے قریب جا کر بولا۔

”کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟“

”اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد کچھ معلوم ہونے کی امید بہت کم ہے۔“ پولیس آفیسر وین سے باہر آتے ہوئے بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ یہ گاڑی کب سے یہاں کھڑی ہے لیکن لگتا یہی ہے کہ کافی وقت گزر گیا ہے اور گرد کی تہ نے سب کچھ دھندلا دیا ہے لیکن میں اپنی کوشش جاری رکھوں گا۔ گاڑی کے پچھلے حصے میں ویسی ہی ریشمی ڈوری رکھی ہوئی ہے جیسی کہ لڑکی کی خودکشی یا پھانسی میں استعمال کی گئی تھی۔ میں نے اس پر ٹیگ لگا دیا ہے اور میں اسے تجزیے کے لیے لیبارٹری لے جاؤں گا۔“

”بہت خوب۔“ فلپ ستائشی انداز میں بولا۔ ”اگر میں اس کا بونٹ اٹھا کر دیکھوں تو اس سے تمہارے کام میں کوئی خلل تو نہیں پڑے گا؟“

”بالکل نہیں۔ میں بونٹ کا بٹن دبا دیتا ہوں۔“

فلپ نے بونٹ اوپر اٹھایا اور گاڑی کا چیسز نمبر اپنی ڈائری میں لکھ لیا۔ دفتر واپس آنے کے بعد اس نے وہ نمبر کمپیوٹر میں ڈالا اور ابھی اس نے کافی کا دوسرا مگ بھی ختم نہیں کیا تھا کہ اسے فیکس کے ذریعے جواب موصول ہوگیا۔ وہ سیاہ رنگ کی فورڈ وین تیئس سالہ میکس فار کے نام پر رجسٹرڈ تھی جو نیو کاسل کا رہائشی تھا۔

فلپ نے متعلقہ پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا اور میکس فار کا نام پتا بتانے کے بعد بولا۔ ”کیا مجھے اس شخص کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں؟“

”میں ابھی دیکھتا ہوں۔“ دوسری جانب بیٹھا ہوا آفیسر مستعدی سے بولا۔

فلپ نے کمپیوٹر کے کی بورڈ کی آواز سنی اور چند لمحوں بعد آفیسر کا جواب آگیا۔ ”ہم اس شخص کو جانتے ہیں بلکہ تم بھی جانتے ہوگے۔ کیا تمہارے پاس مقامی طور پر نگرانی کا کوئی انتظام نہیں ہے؟ یہ ایک لاپتا شخص ہے۔“

فلپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا کہ اپنا ریکارڈ دیکھے بغیر دوسرے پولیس اسٹیشن کو فون کر دیا۔ ریکارڈ کے مطابق وہ یارک شائر یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور تقریباً بیس ماہ پہلے موسم گرما میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹی کی ایک اور طالبہ ٹریسی ایلس بھی غائب ہوگئی تھی جس کے بارے میں پتا چلا کہ وہ اس کی گرل فرینڈ تھی۔

”کیا تمہیں ان کی لاشیں اتفاقیہ طور پر مل گئیں؟“ پولیس آفیسر نے پوچھا۔

”یونہی سمجھ لو۔“ فلپ نے اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ وہ اس معاملے میں جوزف کا نام نہیں لینا چاہ رہا تھا۔

”مسٹر اور مسز فار کے لیے یہ ایک اندوہناک خبر ہوگی لیکن اسے سننے کے بعد ان کا لاحاصل انتظار ختم ہوجائے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد وہ ذہنی طور

پر بُری سے بُری خبر سننے کے لیے تیار ہوں گے۔ میکس فار کا نام ہم نے پہلی بار اس وقت سنا جب اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی گئی تھی۔ اس سے پہلے اس کا کوئی پولیس ریکارڈ نہیں تھا۔ وہ ایک شریف طالب علم تھا اور سارا وقت کتابوں میں سر دیے رہتا۔ کیا اس سلسلے میں ہم تمہاری کوئی مدد کرسکتے ہیں؟''

''یقیناً ہمیں تمہارے تعاون کی ضرورت ہوگی۔'' فلپ نے کہا۔ ''فی الحال تمہیں یہ بُری خبر مسٹر فار اور ان کی بیگم تک پہنچانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم یہ کام بخوبی کرسکو گے۔''

فون بند کرنے کے بعد اس نے انٹر کام کا بٹن دبایا اور اپنے ایک ماتحت سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''مجھے میکس فار اور ٹریسی ایلس کی فائلیں درکار ہیں۔ یہ دونوں بیس ماہ قبل لاپتا ہوگئے تھے۔ جتنی جلدی ہوسکے، یہ دونوں فائلیں میری میز پر پہنچادو۔''

یہ کہہ کر اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی صرف شام کے پانچ بجے تھے جبکہ صبح سے اب تک بہت سے واقعات پیش آچکے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ماتحت وہ فائلیں لے کر آگیا۔ وہ دونوں فائلیں بہت پتلی تھیں اور ان میں صرف ایک ایک کاغذ لگا ہوا تھا جس میں ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج تھی۔ لاپتا افراد کے معاملے میں پولیس اس سے زیادہ کیا کارروائی کرسکتی تھی۔ رپورٹ کے مطابق وہ دونوں ڈون کیسٹر روڈ پر رہائش پذیر تھے۔

فلپ نے ٹھنڈی سانس لے کر دونوں فائلیں ایک طرف رکھ دیں۔ ان سے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوئی۔ اب اسے خود ہی سب کچھ پتا لگانا تھا۔ سب سے پہلے اس نے میکس فار اور ٹریسی کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ ممکن تھا کہ اسے وہاں سے کوئی سراغ مل جاتا۔ وہ ایک پرانے طرز کا مکان تھا جہاں ایک ناگوار قسم کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ فلپ نے اس کی سیلن زدہ دیواروں کو دیکھتے ہی اندازہ لگالیا کہ سردیوں کے موسم میں اس گھر کو گرم رکھنا کتنا دشوار ہوتا ہوگا۔ وہاں اس کی ملاقات ایک نوجوان عورت سے ہوئی جو آنکھوں پر چشمہ لگائے مسلسل پلکیں جھپکا رہی تھی۔ فلپ کے استفسار پر وہ بولی۔ ''ہم تو سمجھ رہے تھے کہ وہ دونوں کہیں بھاگ گئے۔''

وہ ایک پستہ قد عورت تھی لیکن غالباً اسے اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا شوق تھا۔ وہ فلپ کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔ ''وہ سامنے والے کمرے میں رہتے تھے اور اس کا کرایہ مل کر ادا کرتے تھے۔ دونوں میں بڑی محبت تھی۔ میکس لمبا چوڑا شخص تھا جبکہ ٹریسی اس کے مقابلے میں چھوٹے قد کی تھی۔''

''کیا واقعی وہ چھوٹے قد کی عورت تھی؟'' فلپ نے تصدیق کرنا چاہی۔

''ہاں اور اسے اس کا شدت سے احساس تھا۔ وہ بہت سستے کپڑے پہنتی تھی کیونکہ اس کے لیے بچوں کے ملبوسات ہی کافی تھے جن پر کوئی ٹیکس نہیں ہوتا اور وہ بہت کم قیمت میں مل جاتے ہیں لیکن اسے قد بڑھانے کا بہت شوق تھا اور وہ اس کے لیے جتن کرتی رہتی تھی۔ جب پولیس نے ان کے کمرے کی تلاشی لی تو ہمیں احساس ہوا کہ وہ کہیں بھاگے نہیں تھے بلکہ لاپتا ہیں کیونکہ کمرا بالکل معمول کے مطابق تھا اور تمام چیزیں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔ ان کے کپڑے، جوتے، کتابیں اور تمام ذاتی اشیا ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ کافی نقد رقم بھی دراز میں رکھی ہوئی تھی۔''

''اندازاً کتنی رقم ہوگی؟'' فلپ نے پوچھا۔

''پچاس پاؤنڈ۔ ان کے لیے یہی بہت بڑی رقم تھی۔ اگر وہ اپنے پروگرام کے تحت کہیں جاتے تو اپنا سامان اور رقم بھی ساتھ ہی لے جاتے۔ وہ کسی امیر گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ میکس کا باپ بینک میں کلرک ہے جبکہ ٹریسی کا باپ کوئلے کی کان میں کام کرتا ہے۔ ان کے امتحانات ختم ہو چکے تھے لیکن وہ کچھ مزید کورسز کر رہے تھے۔ وہ جس حال میں کمرا چھوڑ کر گئے تھے، اسے دیکھ کر کسی کو بھی شک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اب واپس نہیں آئیں گے۔''

''کیا ان کا کمرا دوبارہ کرائے پر دے دیا گیا؟'' فلپ نے پوچھا۔

''ہاں، اب وہاں ایک اور جوڑا رہتا ہے اور سامان ان کے والدین لے گئے۔ ان کو گئے ہوئے چند ہفتے ہو چکے تھے جب یہ کارروائی عمل میں آئی... تب معلوم ہوا کہ وہ دونوں لاپتا ہیں۔''

''اوہ۔'' فلپ نے اظہارِ افسوس کیا۔

''اسی زمانے میں کیرن نامی ایک لڑکی بھی اغوا ہوئی تھی۔ تمہیں اس کے بارے میں یقیناً معلوم ہوا ہوگا؟''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔'' فلپ نے تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ بھی میکس، ٹریسی اور میرے ساتھ ایک ہی کلاس میں تھی کیونکہ اس کورس میں طالب علموں کی تعداد کم تھی اس لیے ہم سب ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ کیرن کا ہم لوگوں سے زیادہ تعلق نہیں تھا۔ وہ الگ تھلگ رہنے کی عادی تھی لیکن ایک ہی کلاس میں ہونے کی وجہ سے اس کا

واسطہ ہم سے رہتا تھا۔ ہم ایک ساتھ ہی لیکچر اور سیمینار میں شرکت کرتے۔ وہ عین امتحان سے کچھ پہلے اغوا ہوگئی اور امتحان کے فوراً بعد میکس اور ٹریسی بھی غائب ہوگئے۔ پھر کیرن بحفاظت واپس لوٹ آئی اور اس نے اپنے بارے میں الٹی سیدھی باتیں بتائیں۔ میں اس وقت گھر جانے کے خیال سے خوش تھی اس لیے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ مجھے ساؤتھمپٹن شائر کبھی اتنا اچھا نہیں لگا۔''

''کیا وہ تمہارا آبائی شہر ہے؟''

''ہاں، ہمارا خاندان پشتوں سے وہاں آباد ہے۔''

''اوہ، آئی سی۔'' فلپ نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولا۔ ''کیرن... ان دونوں، میرا مطلب ہے کہ میکس اور ٹریسی کو جانتی تھی؟''

''ہاں، میں نے بتایا نا کہ اس کورس میں طالب علموں کی تعداد کم تھی اس لیے سب ہی ایک دوسرے سے واقف تھے۔ البتہ کیرن اور بقیہ لوگوں کے درمیان طبقاتی فرق تھا۔ ہم سب متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے جبکہ کیرن امیر کبیر والدین کی اولاد تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ لوگ شاہی خاندان سے بس ایک ہی درجہ کم ہوں گے تو غلط نہ ہوگا۔ اس فرق کے باوجود وہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔''

''ایک چھوٹی سی کلاس میں سب طالب علم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے اس لیے تمہیں میکس اور ٹریسی کے غائب ہوجانے سے پریشانی تو ہوئی ہوگی؟''

''ہاں، ہم لوگ یہی سوچتے تھے کہ کوئی اس طرح اچانک غائب نہیں ہوجاتا پھر وہ دونوں کہاں چلے گئے لیکن کیرن بالکل بھی پریشان نہیں لگ رہی تھی۔ لیکن وہ جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، وہاں بچوں کو شروع سے ہی اپنے جذبات کو چھپانا اور کنٹرول کرنا سکھایا جاتا ہے۔''

''یہ تو واقعی بڑی دلچسپ بات ہے۔'' فلپ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں ہوسکتا تھا لہٰذا وہ فریزر گیٹ پولیس اسٹیشن لوٹ آیا۔ اس نے فون کرکے معلوم کیا کہ لنڈا جین یارک سٹی اسپتال سے واپس آگئی ہے یا نہیں۔ وہ اپنی میز پر بیٹھی لیمپ کی روشنی میں کچھ کاغذات دیکھ رہی تھی۔

''پوسٹ مارٹم ہوگیا؟'' فلپ نے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی جناب!'' وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں بل بیچ کی فراہم کردہ معلومات ہی لکھ رہی تھی۔ وہ بھی اپنی رپورٹ جلد از جلد فیکس کردے گا۔''

''کیا تم مجھے اس کا خلاصہ بتا سکتی ہو؟''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرد کے سینے میں عین دل کے مقام پر چاقو گھونپا گیا ہے۔''

''اتنی پرانی لاش سے یہ اندازہ کیسے لگایا جاسکتا ہے جبکہ اس کا بیشتر حصہ گل سڑ کر ڈھانچے میں تبدیل ہوچکا ہے؟''

''بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے لیکن دل کے عضلات ابھی بھی قابلِ شناخت ہیں... کیونکہ چاقو سے وار کیا گیا تھا، اس لیے قمیص پر بھی خون کے دھبے نظر آرہے ہیں۔ لگتا ہے کہ دل پر زخم آنے کی وجہ سے اس کی موت فوراً ہی واقع ہوگئی اور وہ دیوار کی جانب لڑھک گیا۔''

''اس کی لاش اسی حالت میں ملی تھی؟''

''جی جناب!''

''اس سے ہم کیا نتیجہ اخذ کریں؟ ان میں سے ایک قتل اور دوسرا خودکشی کا کیس معلوم ہوتا ہے۔ اس لڑکی نے پہلے مرد کو قتل کیا پھر گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرلی۔ قاتل کوئی اجنبی نہیں تھا۔''

باتیں کرتے کرتے اس کی نظر ایک تصویر پر چلی گئی جو ایک سیاہ فام عورت کی تھی۔ وہ ساحل پر سبز رنگ کا تیراکی کا لباس پہنے کھڑی ہوئی تھی اور پس منظر میں بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان نظر آرہا تھا۔

''یہ کون ہے... تمہاری بہن؟''

''نہیں، یہ میری ماں ہے اور یہ تصویر اس وقت لی گئی تھی جب میں بہت چھوٹی تھی۔''

''اچھا۔'' فلپ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا؟''

''ہم اتنی جلدی کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے کیونکہ عورت کے سر پر بھی چوٹوں کے نشان پائے گئے ہیں۔ اس کی کھوپڑی میں فریکچر ہوگیا ہے۔ ممکن ہے کہ موت کی وجہ یہ نہ ہو لیکن اس سے وہ بے ہوش یا کم از کم نیم بے ہوش ضرور ہوگئی ہوگی۔''

''ایسی صورت میں وہ اپنے گلے میں پھندا کیسے ڈال سکتی ہے؟''

''بالکل ٹھیک۔ بل بیچ کی بھی یہی رائے ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس پورے قصے میں کسی تیسرے فرد کا ہاتھ ہے۔''

☆☆☆

اپنے کمرے میں واپس آکر اس نے کیرن کی فائل منگوائی اور کچھ دیر اس کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر اس نے انٹر کام کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے لنڈا بول رہی تھی۔

"تم مصروف تو نہیں ہو؟" فلپ نے پوچھا۔

"نہیں کوئی خاص نہیں۔" لنڈا نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ ہم لیڈز جا رہے ہیں۔"

لنڈا نے بُرا سا منہ بنایا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد وہ بہت زیادہ تھک چکی تھی اور اب گھر جا کر آرام کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی لیکن پولیس والوں کی قسمت میں آرام کہاں۔ لہٰذا اسے بادلِ ناخواستہ کہنا پڑا۔

"ٹھیک ہے جناب۔"

☆☆☆

"کیرن ہمیشہ سے ہی فضول خرچ تھی۔" قیمتی کپڑوں میں ملبوس عورت مشروب کا گھونٹ لیتے ہوئے بولی۔ اس کے پیر نرم قالین میں دھنسے ہوئے تھے۔ لکڑی کی دیواروں پر جابجا آئل پینٹنگز آویزاں تھیں اور کمرے کی ہر شے سے امارت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"وہ ہمیشہ سے فضول خرچ تھی۔" کرسی پر بیٹھے ہوئے مرد نے اس کی نقل اتاری پھر اپنی ایرانی بلی کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "لیکن تمہاری طرح نہیں میری جان۔"

"کیا کہا؟ میں فضول خرچ ہوں؟" عورت آنکھیں نکالتے ہوئے بولی۔

"میں اپنی بلی سے کہہ رہا تھا۔"

"جب میں اسے لے کر گھر سے باہر نکلتی تو کوئی مرد میری طرف نہیں دیکھتا تھا۔" وہ عورت فلپ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ اس نے لنڈا کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ "اس کے بعد ہمارے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی اور مجھے بھی مزید بچوں کی خواہش نہیں تھی۔"

"اس کے بجائے ہم نے بلیاں پالنا شروع کر دیں۔" مرد بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"وہ جیسے ہی سات برس کی ہوئی، میں نے اسے اسکول بھیجنا شروع کر دیا پھر اٹھارہ سال کی عمر میں وہ یونیورسٹی چلی گئی۔"

"اسکول سے یونیورسٹی؟" فلپ نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہمیں اس کی تعلیم کا سارا خرچ برداشت کرنا پڑا کیونکہ ہم جیسے لوگوں کو کوئی مدد نہیں ملتی کیونکہ ہم پیسے والے ہیں۔"

"پیسے والے۔" مرد نے ایک بار پھر اس کی نقل اتاری۔

"پھر وہ اغوا ہو گئی اور ہمیں اس کی رہائی کے عوض تاوان ادا کرنا پڑا۔ گو کہ پولیس اس کے خلاف تھی لیکن ہمیں ہر حال میں ادائیگی کرنا تھی۔ دس لاکھ پاؤنڈز کی خاطر ہم اپنی بیٹی سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتے تھے۔"

"اس کے بعد وہ گھر واپس آگئی۔" مرد نے بلی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"اس کا لباس گرد آلود تھا اور اسے فوری طور پر نہانے اور کھانے کی خواہش ہو رہی تھی لیکن اس کے علاوہ اس کے جسم پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ ہم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ صحیح سلامت گھر واپس آگئی۔"

فلپ اور لنڈا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے آنے کا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے اب مزید رکنا بیکار تھا لہٰذا وہ وہاں سے روانہ ہو گئے اور کسی نے بھی ان کے جانے کا نوٹس نہیں لیا۔

☆☆☆

اگلے روز سہ پہر میں وہ دونوں کیرن سے انٹرویو کرنے ڈین کے دفتر گئے اور اس کی غیر موجودگی میں کیرن سے بات کی۔ "تمہیں اس سے زیادہ مل سکتا تھا اگر تم تھوڑا انتظار کر لیتیں کیونکہ تم ہی ان کی تمام دولت اور جائداد کی اکلوتی وارث ہو۔ ہم تمہارے والدین سے مل کر آئے ہیں اور وہ خاصے دولت مند معلوم ہوتے ہیں۔"

"یہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ مجھے وراثت میں کچھ بھی نہ ملتا۔"

"کیوں؟ کیا تم حقِ وراثت سے محروم ہو چکی ہو؟" فلپ نے پوچھا۔

"نہیں، اگر میں ان کے مرنے کا انتظار کرتی تو مجھے کچھ نہ ملتا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں انہیں قتل کر دوں۔"

"کیا تم اس کی وضاحت کر سکو گی؟" فلپ نے کہا۔

"ہاں... یہ گھر، اس میں رکھا قیمتی سامان اور رہن سہن سب دکھاوا ہے۔ میرے والد کا بزنس تباہ ہو چکا ہے اور انہوں نے یہ مکان بمع تمام قیمتی اشیا ایک فنانس کمپنی کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ البتہ وہ تا زندگی وہاں رہتے رہیں گے۔ اس طرح ان کا بھرم قائم ہے۔ انہیں اس کے عوض بیس لاکھ پاؤنڈ ملیں گے، اگر میں نے اس میں سے آدھے لے لیے تو کیا ہوا۔ وہ کوئی ہنگامہ کھڑا کرنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے تاوان ادا کر دیا اور میں جانتی تھی کہ وہ ایسا کریں گے۔"

"اب وہ رقم کہاں ہے؟" فلپ نے پوچھا۔

"میرے بینک اکاؤنٹ میں۔ جب میں نے وہ رقم وہاں جمع کروائی تو بینک منیجر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں لیکن اس واقعے کی تشہیر نہیں ہوئی۔ لہٰذا کوئی نہیں جانتا کہ کیرن اغوا ہوئی تھی۔"

"اس مکان میں کیا ہوا تھا؟ میرا مطلب اس تباہ شدہ عمارت سے ہے؟"

کیرن طویل قامت اور چھریرے بدن کی لڑکی تھی اور دیکھنے میں طالبہ کے بجائے کاروباری شخصیت لگتی تھی۔ کلائی میں قیمتی گھڑی، سونے کا بریسلیٹ اور بدن پر قیمتی سوٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کافی خوش حال ہے۔ اس نے چند سیکنڈ کے لیے خاموشی اختیار کی پھر بولی۔ "ان کے دل میں لالچ آگیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں آسانی سے ان کے ہاتھوں بلیک میل ہو جاؤں گی۔ میں نے ان دونوں کو دس ہزار ڈالرز کی پیشکش کی تھی۔ ان کے لیے یہ ایک بڑی رقم تھی۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے زندگی میں کبھی ایک ہزار پاؤنڈ بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔ ان کا کام بہت آسان تھا اور اس میں ان کے لیے کوئی خطرہ بھی نہیں تھا۔ میں نے جو منصوبہ بنایا تھا اس میں کسی غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ ہمیں تاوان وصول کرنے کے بعد میکس کی وین میں واپس اس مکان میں جانا تھا لیکن تاوان کی رقم دیکھ کر ان کے دل میں بے ایمانی آگئی اور انہوں نے اپنے حصے میں اضافے کا مطالبہ کر دیا۔ میرے انکار کرنے پر میکس نے مجھ پر چاقو نکال لیا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے جدوجہد کی۔ میں نہیں جانتی کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا اور وہ چاقو کس طرح میکس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔"

"بڑی آسان سی بات ہے۔" فلپ نے سرد لہجے میں کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تاوان کی رقم مل جانے کے بعد تم نے ان سے جان چھڑالی۔ تم نے خود ابھی کہا ہے کہ ان کی اوقات اور حیثیت کو دیکھتے ہوئے دس ہزار پاؤنڈز بھی بہت تھے اس لیے میں نہیں سمجھتا کہ انہوں نے مزید رقم کا مطالبہ کیا ہوگا۔"

"تمہاری مرضی کہ یقین کرو یا نہیں۔ سچ وہی ہے جو میں نے بتایا۔ اس لڑکی سے بھی میری ہاتھا پائی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں اس کے سر پر ضرب آئی۔ میں یہی سمجھی کہ وہ مر چکی ہے لہٰذا میں نے اس کے گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹکا دیا تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ اس منظر میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے میں نے اس کے پیروں کے پاس کرسی رکھ کر اسے الٹا کر دیا۔"

"وہ صرف بے ہوش ہوئی تھی لیکن تم نے اسے پھانسی دے کر موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ اب بھی وقت ہے۔ میں تمہیں متنبہ کر رہا ہوں۔ اگر کوئی بات رہ گئی ہے تو بتا دو۔ ممکن ہے کہ اس کی بنیاد پر تمہیں کچھ رعایت مل جائے۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" کیرن اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں عدالت میں ہر جرم کا اعتراف کر لوں گی۔ اپنے اغوا کا ڈراما، تاوان کی وصولی اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوا۔ پھر بھی مجھے زیادہ سے زیادہ دس سال کی جیل ہوگی۔ تب تک میرے دس لاکھ پاؤنڈز دگنے ہو جائیں گے اور میں تیس سال کی عمر میں جیل سے باہر آجاؤں گی۔ مستقبل کے عیش و آرام کی خاطر میں یہ سزا برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔" فلپ اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "کیا تم نہیں جانتیں کہ تمہارا اکاؤنٹ منجمد کر دیا جائے گا اور اس پر تمہیں کوئی منافع نہیں مل سکے گا؟ بلکہ بہت ممکن ہے کہ یہ رقم ضبط کر کے تمہارے والدین کو لوٹا دی جائے۔"

یہ سن کر کیرن کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔ وہ بے چین ہوتے ہوئے بولی۔ "مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ میں نے سوچا..."

"اچھا ہوا کہ تم نے روانی میں بتا دیا کہ یہ رقم تمہارے بینک اکاؤنٹ میں موجود ہے۔ اگر تم نے دوسرے نام سے جعلی اکاؤنٹ کھول لیا ہوتا تو ہمارے لیے مشکل ہو سکتی تھی۔"

کیرن نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اسے جیل جانے سے زیادہ اپنی رقم کے ضبط ہونے کا صدمہ ہوا تھا۔

"تمہاری دوسری بات صحیح ہے کہ اس جرم میں زیادہ سے زیادہ دس سال کی سزا ہوگی جبکہ میرے خیال میں یہ بہت کم ہے لیکن شاید تمہیں کھلی جیل کی رعایت نہیں مل سکے گی۔"

کیرن کچھ نہ بولی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ذرا سی لالچ کی وجہ سے اس کا سارا کھیل بگڑ گیا۔ وہ مزید بیس ہزار پاؤنڈز دے کر ان دونوں کا منہ بند کر سکتی تھی مگر اب یہ سب کچھ سوچنا بیکار تھا۔ کاش وہ شخص جوزف اس تباہ شدہ عمارت میں نہ گیا ہوتا تو وہ لاشیں کبھی دریافت نہ ہوتیں۔

☆☆☆

جوزف اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں ایک نقشے پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا تھا جس میں ساؤتھ ڈاؤن کے علاقے میں ایک قدیم متروکہ عمارت کی نشاندہی کی گئی تھی۔ وہ جگہ برائٹن کے شمال میں واقع تھی۔ اسے وہاں جانے میں ایک دن لگتا۔ ایک دن عمارت کا جائزہ لینے میں گزر جاتا اور تیسرے دن اس کی واپسی ہو سکتی تھی۔ جوزف نے نقشہ لپیٹ کر وہیں بیٹھے بیٹھے ایک انگڑائی لی اور سوچنے لگا کہ کاش وہاں کسی لاش سے واسطہ نہ پڑ جائے کیونکہ وہ پولیس کی تفتیش سے بہت گھبراتا تھا۔

آبی قبر

شیخ ابویحییٰ

خود فریبی کبھی عذاب ہوتی ہے تو کبھی نعمتِ کمیاب... اندھیروں اور اجالوں کے اسرار میں وہ بھی ایسے ہی ایک دور سے گزر رہا تھا... کنویں کے مینڈک کی طرح، اس نے اپنی ہی ایک دنیا تخلیق کی ہوئی تھی اور وہی اس کے لیے پوری کائنات تھی... اچانک ہی اس ٹھہری ٹھہری کائنات میں ناقابلِ یقین واقعات رونما ہونے لگے، حشر ساماں کردار ابھرنے اور ڈوبنے لگے اور سب کچھ یوں تہ و بالا ہوگیا کہ وہ بوکھلا گیا... عقل و حواس کی آزمائشوں کا یہ سلسلہ جہاں جاکر تھما، وہاں وہ خود بھی حیران رہ گیا۔

حرص و طمع کے گرداب میں زیر و بم سے گزرتی ہوئی ایک سنسنی خیز کہانی

شیشے کا بھاری دروازہ زوردار انداز سے کھلا۔ ممکن تھا کہ ایک پٹ ٹوٹ ہی جاتا۔ یہ عادل آباد کے چھوٹے سے شہر کا واحد بینک تھا۔ اس کے دروازے سے اچانک ہی دو بدحواس نقاب پوش برآمد ہوئے۔ ان دونوں نے بڑے بڑے تھیلے اٹھا رکھے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پستول جبکہ دوسرے کے پاس کلاشنکوف تھی۔ تاہم ان کی حرکات سے لگتا تھا کہ بدحواس نقاب پوش مشقت کے عادی نہیں یا پھر مخصوص بناوٹ کے چرمی تھیلوں میں وزن کچھ زیادہ ہی تھا۔ دونوں لڑکھڑاتے بینک کے عین سامنے کھڑی گاڑی کی طرف بڑھے۔ گاڑی تک پہنچنے کے لیے انہیں چند سیڑھیاں اترنا تھیں۔ پستول بردار نے ہاتھ لہراتے ہوئے ہوائی فائر کرنے کا ارادہ کیا۔ شاید اس کا ساتھی یہ بھانپ چکا تھا۔ اس نے چلا کر کہا۔ ''عاشق... فائر نہیں کرنا۔''

پستول بردار نے ایک لحظے کو ٹھٹک کر اپنے ساتھی کو دیکھا اور چند لمحوں میں گاڑی تک پہنچ گیا۔ یہ ایک پرانے طرز کی وین تھی۔ ایسی وین آج بھی شہروں میں اسکول کے بچے لانے لے جانے کے کام آتی ہے۔ وین نہ صرف یہ کہ اسٹارٹ تھی بلکہ اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ دونوں نے چرمی تھیلے پچھلے حصے کی جانب پھینکے اور پھرتی سے گاڑی میں سوار ہوئے اور وین کا دروازہ بند کر دیا۔ پرانی وین کا طاقتور انجن ایک غراہٹ کے ساتھ گونجا اور وین جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔

''تم نے میرا نام کیوں لیا تھا؟'' پستول بردار اپنے ساتھی پر برس پڑا۔

''کیا ہوا؟'' ڈرائیونگ سیٹ سے بھاری سی آواز آئی۔

''آپ نے کتنا منع کیا تھا کہ کوئی کسی کا نام نہیں لے گا۔ اس نے باہر آتے ہی مجھے میرے نام سے پکارا تھا۔''

''اور تم جو فائر کرنے والے تھے، بلاضرورت... کیا تمہیں یاد نہیں رہا تھا کہ سارا کام خاموشی سے کرنا ہے؟'' کلاشنکوف والے ساتھی نے جواب دیا۔

چھوٹے شہروں میں ٹریفک جام کے مسائل نہیں ہوا کرتے... وین تیز رفتاری سے بینک سے دور ہوتی جارہی تھی۔ بمشکل صبح کے سوا نو بجے ہوں گے۔ شہر ابھی بیدار ہورہا تھا۔ مجموعی طور پر ہر جانب ایک سکون اور سکوت سا تھا۔ اچانک ایک زوردار آواز ہوئی۔ یہ رائفل کے فائر کی آواز تھی۔ ساتھ ہی عاشق کی چیخ سنائی دی۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ یہ کیسا فائر تھا؟'' ڈرائیونگ سیٹ سے متوحش آواز میں پوچھا گیا۔

''صاحب فائر... کسی نے بینک سے فائر مارا ہے۔ عاشق کو گولی لگی ہے۔''

ڈرائیور اس سے قبل ہی ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا چکا تھا۔ آگے موڑ تھا۔ وین نے نہایت تیزی سے موڑ کاٹا۔ اسی اثنا میں دوسرا فائر ہوا۔ گولی کے وین سے ٹکرانے کی زوردار آواز سنائی دی۔ وین یقیناً پرانی تھی لیکن اس کے انجن میں کچھ تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ لمحوں میں وین ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ کچھ ہی دیر میں وہ عادل آباد کو پیچھے چھوڑ چکے تھے۔

''صاحب... صاحب عاشق...'' کلاشنکوف بردار ہکلایا۔

''کیا ہوا عاشق کو؟'' آگے سے تند لہجے میں پوچھا گیا۔

''صاحب... عاشق... عاشق ختم ہوگیا۔''

''ہونہہ۔'' آگے سے آواز آئی۔ ''کچھ سمجھ میں نہیں آرہا... جب دونوں گارڈز کو تم لوگوں نے کور کرلیا تھا تو... تو یہ کون تھا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب۔'' کلاشنکوف بردار نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''اس بات کا پتا لگانا ضروری ہے کہ گولی کس نے چلائی۔'' اگلی نشست سے آواز آئی۔

''صاحب... میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہوسکتی ہے۔''

''ہوں... یہ تو انہونی ہوگئی ہے۔ تم پریشان مت ہو، ہم کچھ سوچتے ہیں۔'' کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔

''تم لوگوں نے ساری رقم بیگ میں بھرلی تھی؟'' کچھ توقف کے بعد آگے سے سوال پوچھا گیا۔

''جی ہاں... ہم نے ایک نوٹ بھی وہاں نہیں چھوڑا۔'' کلاشنکوف والے نے جواب دیا۔

''میں نے کہا تھا نا کہ یہ سب کچھ بہت آسان ہوگا اور دیکھو ہم آسانی سے نکل بھی آئے۔''

''جی ہاں... لیکن عاشق...''

''اس کا مجھے بھی افسوس ہے لیکن اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ ہاں بھئی یہی موڑ ہے نا جھیل کی طرف جانے والا؟'' آگے سے پھر پوچھا گیا۔

''جی... جی ہاں، یہی ہے۔ جب سے پکی سڑک بنی ہے یہ راستہ تو متروک ہی ہوگیا ہے۔''

''اب تو شاید ہی کوئی اس راستے سے واقف ہو۔'' گاڑی چلانے والے نے کہا۔

''جی صاحب... لوگ بہت جلد بھول جاتے ہیں۔ اکثر کا خیال ہے کہ جھیل کی اس جانب صرف جھاڑیاں یا سرکنڈے ہیں۔ اور صاحب، یہ راستہ بھی تو عاشق نے ہی بتایا تھا۔'' وہ بہانے بہانے سے عاشق کا تذکرہ نکال بیٹھتا تھا۔

سرورق کی پہلی کہانی

وین مین روڈ سے اتر کر ایک کچے راستے پر چل پڑی۔ شاید کسی زمانے میں۔۔ یہاں راستہ رہا ہوگا۔ اب تو اس کے بس آثار رہ گئے تھے۔ ہر طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ یہاں تک کہ راستے پر بھی خودرو جھاڑیاں پھوٹ آئی تھیں۔ یہ کانٹے دار جھاڑیاں کسی لمحے بھی کوئی بھی ٹائر پنکچر کر سکتی تھیں لیکن ڈرائیور اس طرح کے کسی بھی خطرے سے بے نیاز تیز رفتاری سے وین بھگائے لیے چلا جا رہا تھا۔ وین کچی سڑک پر اچھلتی کودتی دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ ہر جھٹکے کے ساتھ عاشق کی لاش دائیں بائیں یا آگے ہو جاتی۔ کلاشنکوف بردار شخص کے ہاتھ سے کلاشنکوف نہ جانے کب کی نکل کر کہاں جا پڑی تھی۔ وہ تو اپنے ساتھی کو گاڑی کے ہچکولوں سے بچانے کی فکر میں لگا تھا۔ اس کوشش میں اس کا جسم اور کپڑے بھی عاشق کے خون سے تر بتر ہوتے جا رہے تھے۔

راستے میں حائل سرکنڈے کا پودا کرخت آواز کے ساتھ ٹوٹا۔ ساتھ ہی ڈرائیور نے زوردار بریک لگائے۔ وین کو ایک جھٹکا لگا۔ کچی زمین پر ٹائر گھسٹتے ہوئے جھیل کے عین کنارے جا کر رک گئے۔ سامنے ایک خاصی بڑی جھیل تھی۔ یہ جھیل شاید عادل آباد سے بھی زیادہ قدیم تھی۔ ایک عرصے سے یہاں بارشوں کا پانی جمع ہوتا آیا تھا۔ پانی کا یہ قدرتی ذخیرہ اتنا وسیع تھا کہ آج کے عادل آباد کی تمام تر آبادی کی آبی ضروریات کے بعد بھی پانی بچ رہتا تھا اور آس پاس کی زمینوں میں کاشت کے کام آتا تھا۔

وین کے رکتے ہی ڈرائیور کود کر نیچے اترا۔ اس نے انجن بند کرنے کی زحمت گوارا نہ کی تھی۔ سناٹے میں ڈیزل انجن کی آواز ایک عجیب طرح کا ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا جھیل کے پُرسکون پانی کو بھی متاثر کر رہی ہو۔ ڈرائیور نے بڑھ کر وین کا درمیانی دروازہ کھولا۔ اس کی حرکات و سکنات میں تیزی تھی۔ وین کے اندر کا منظر بہت دل خراش تھا۔ دو لہو آلود جسم۔ ایک مردہ اور ایک نیم مردہ۔

''بیگ کہاں ہیں؟'' ڈرائیور نے نیم مردہ سے سوال پوچھا۔

وہ ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا۔ گویا گویائی ہی سلب ہو گئی ہو۔

''میں پوچھتا ہوں بیگ...'' وہ دہاڑا۔

گردن سے پیچھے کی جانب اشارہ کیا گیا۔

ڈرائیور اچک کر پائیدان پر کھڑا ہوا۔ پھر تیزی سے نیچے اترا، وین کے عقب میں پہنچ کر پچھلا دروازہ کھولا۔ بیگ ٹٹول کر دیکھے۔ بجائے اس کے کہ مخصوص ساخت کے بیگ گاڑی سے نکالتا، اس نے دروازہ بند کیا اور گھوم کر درمیانی دروازے سے وین میں داخل ہو گیا۔ وہ متلاشی نظروں سے وین کا جائزہ لے رہا تھا۔ جلد ہی اسے قدموں میں پڑی کلاشنکوف نظر آ گئی۔

اس نے بائیں ہاتھ سے کلاشنکوف اٹھائی اور دائیں ہاتھ سے بغلی ہولسٹر میں لگا پستول نکالا۔ پستول زندہ فرد کے دل پر رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔

سناٹے میں صرف ڈیزل انجن کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے تمام ہتھیار گاڑی میں پھینکے۔ وین کا دروازہ بند کیا اور ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ کلچ میں بڑے طریقے سے ایک لکڑی پھنسائی، گاڑی کو گیئر میں ڈالا اور وین سے اتر آیا۔ ہر چیز کا گویا وہ پہلے ہی انتظام کر کے چلا تھا۔ وین ایک جھٹکے سے آگے کی جانب بڑھی اور دیکھتے دیکھتے کئی فٹ نیچے جھیل کے پانیوں میں گرتی چلی گئی۔

وین کے پانی میں گرنے کا چھپاکا سرکنڈوں میں چھپے پرندوں کو چونکا گیا۔ بہت سے پرندے اڑے اور کسی جانب پرواز کر گئے۔

دو لاشیں اور رقم سے بھرے دو بیگ وین سمیت جھیل میں غرق ہوتے جا رہے تھے۔ وہ آسودہ سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وین کی غرقابی دیکھتا رہا۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر مڑا۔ اب وہ زمین پر جھکا وین کے نشانات مٹانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

☆☆☆

جونہی بینک کا دروازہ کھلا، اسلحہ بردار نقاب پوش تیزی سے گھستے چلے آئے۔ اتفاق سے ارم سامنے ہی تھی۔ نقاب پوشوں کو دیکھتے ہی اس کے حواس مختل ہو گئے۔ اس کے بدترین خدشات صحیح ثابت ہو رہے تھے۔ ارم کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس کے کیریئر کے بدترین دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ ایک نقاب پوش آن واحد میں ارم کے سر پر آن پہنچا۔ دوسرا نا معلوم کس سمت چلا گیا تھا۔ نقاب پوش نے ایک بڑی سی بندوق اٹھا رکھی تھی، غالباً کلاشنکوف۔ اس نے کلاشنکوف کی نال ارم کی کھوپڑی سے لگا دی۔ ارم کے رہے سہے حواس بھی ساتھ چھوڑنے لگے۔

ارم ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے والد ریٹائرڈ ٹیچر تھے۔ عادل آباد میں ماسٹر اختر صاحب سے ہر شخص واقف تھا۔ وہ نیک نام اور محنتی استاد تھے۔ قصبے کی کم از کم تیس فیصد آبادی ان کی شاگرد رہی ہوگی۔ ماسٹر اختر ایک قدامت پسند گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ باوجود اس کے کہ وہ سارے قصبے کو علم بانٹتے تھے لیکن ان کے خیالات جدیدیت کے حامل نہ تھے۔ یہی وجہ تھی... کہ اختر صاحب کی لڑکیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے مخالفت کا سامنا تھا۔ اختر صاحب کے پانچ بچے تھے۔ ارم ان میں سب سے بڑی تھی۔ ارم سے چھوٹی دو بہنیں اور تھیں اور پھر دو بھائی۔ ارم اپنے خاندان کی پہلی لڑکی تھی جس نے خاندانی روایات سے بغاوت کی اور ماسٹرز تک تعلیم حاصل کی۔ قصبے میں ماسٹرز تک تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیاں یوں بھی کم ہی تھیں۔ ارم کو شدید مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے تمام مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ بڑے ہی تحمل اور خوش مزاجی سے مخالفین کو رام کیا۔ پھر تو اس کی چھوٹی بہنوں کے لیے بھی کالج اور یونیورسٹی کے راستے کھل گئے۔ اختر صاحب کو اپنی بچیوں سے شکایت تو کوئی نہیں رہی پھر یہ بھی ہونے لگا کہ وہ اپنی بیٹیوں پر اور ان کی تعلیم پر ناز کرنے لگے لیکن اس کا اظہار وہ بہت ہی کم کیا کرتے تھے۔ بظاہر تو وہ اب بھی لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف ہی تھے۔ بزنس میں ماسٹرز کرنے کے بعد ارم کو اپنے ہی قصبے میں کھلنے والے واحد بینک میں ملازمت مل گئی۔ پھر یہ اس کی اعلیٰ کارکردگی تھی، قسمت تھی یا والدین کی دعائیں کہ وہ جلد ہی ترقی کر کے اس بینک کی منیجر بن گئی۔

ہر بینک منیجر کو طرح طرح کے خدشات اور خطرات نے گھیر رکھا ہوتا ہے۔ انہی میں سے ایک خطرہ بینک ڈکیتی بھی ہے۔ آج جونہی اس نے نقاب پوشوں کو بینک میں داخل ہوتے دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ کیا ہونے جا رہا ہے اور پھر جب ایک نقاب پوش نے اپنی کلاشنکوف کی نال ارم کے سر پر رکھ دی تو واقعی اس کے حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ کھڑی نہیں رہ سکے گی اور گر جائے گی۔

''فوراً ہتھیار پھینک دو۔ ورنہ یہ جان سے جائے گی۔'' نقاب پوش نے دہاڑ کر بینک کے گارڈز کو ہدایت کی۔ گارڈز کشمکش و پیچ کا شکار تھے۔ ہتھیار ان کے ہاتھوں میں تھے، ہدف سامنے لیکن وہ کوئی کارروائی کیسے کرتے؟ انہوں نے بے بسی سے ارم کی جانب دیکھا۔ وہ بے چاری بھی کیا کہتی۔

''چلو، ان سے کہو فوراً ہتھیار پھینک دیں۔'' نقاب پوش نے اس کے سر پر کلاشنکوف کی نال زور سے ماری۔

''پھینک دو... پھینک دو... فوراً پھینک دو۔'' ارم نے ہذیانی انداز میں کہا۔ اس نے دیکھا کہ دوسرا نقاب پوش الارم سسٹم کو ناکارہ بنا کر گارڈز کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس

نے تیزی سے بڑھ کر گارڈز سے ہتھیار لیے۔ کمال پھرتی سے گارڈز کے منہ پر پٹیاں باندھیں۔ ان کے ہاتھ پشت پر کر کے باندھے اور انہیں دھکیلتا ہوا باتھ روم تک لے گیا۔

''سب باہر آجاؤ... سنا نہیں تم نے سب باہر آجاؤ۔'' کلاشنکوف بردار دہاڑا۔ بینک کا تمام عملہ کاؤنٹر اور سیٹوں کے پیچھے سے نکل آیا۔ ارم ہکا بکا کھڑی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیے۔ ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ دوسری جانب سب کچھ بڑی تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔

لمحوں میں الارم سسٹم ناکارہ ہوا۔ گارڈز غیر مسلح کر کے قید کر دیے گئے اور بینک کا تمام عملہ ایک جگہ جمع کر دیا گیا۔

اچانک بینک کا داخلی دروازہ کھلا اور دو کھاتے دار داخل ہوئے۔ یہ آس پاس کے دکان دار تھے۔ ان کا معمول تھا کہ روزانہ صبح بینک میں رقم جمع کروایا کرتے تھے۔

بینک میں داخل ہوتے ہی انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ دوسرا نقاب پوش گویا اڑتا ہوا ان کے سروں پر پہنچا تھا۔ اس نے تیزی سے پستول ان کی کمر سے لگا کر انہیں بے بس کیا، پتا نہیں کہاں سے رسی نکالی، ان کے ہاتھ بھی پشت پر باندھ کر منہ پر ٹیپ لگایا اور دھکا دے کر بینک ہال کے ایک کونے میں لے جا کر گرا دیا۔

''خاموشی سے یہیں پڑے رہنا ورنہ تم دونوں تو گئے کام سے۔''

''اے... تم سب یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ والٹ کھولو جلدی۔'' اس نے واپس آ کر کہا۔ عملہ ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھے۔ ان کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ عادل آباد سرحدی علاقے کا پہلا قصبہ تھا۔ یہاں کی زندگی پُرسکون تھی۔ جرائم تو یہاں نہ ہونے کے برابر تھے۔ لوگ سالوں سے ساتھ رہ رہے تھے اور ایک دوسرے کے آباؤ اجداد سے بھی واقف تھے۔ یہاں کبھی کوئی بینک ہی نہیں تھا، نہ ہی موجودہ عملے کو اس سے قبل کبھی بینک ڈکیتی سے سابقہ پیش آیا تھا۔ اس افتاد نے سب کو حد درجے پریشان کر دیا تھا۔

''ابے آواز نہیں آئی کیا... والٹ کھولتے ہو یا تمہاری منیجر کو لڑھکا دوں۔'' کلاشنکوف بردار دہاڑا۔ عملے میں گویا چابی بھر گئی۔ دو افراد فوراً تیار ہو گئے۔

''چلیے جناب... ہم والٹ تک لے جاتے ہیں۔'' بینک کے عملے میں سے کسی نے کہا۔

"کوئی چالاکی نہیں... ورنہ..." وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

دونوں نقاب پوش اپنی پشت پر بندھے چرمی بیگ کھولنے لگے۔ دونوں بہت چوکنا تھے۔ باری باری انہوں نے بیگ جسم سے علیٰحدہ کیے۔ کھولے جانے کے بعد مخصوص ساخت کے بیگ کافی بڑے لگ رہے تھے۔ بینک کا تمام عملہ انہیں حیرت اور خوف سے دیکھے جارہا تھا۔ ارم کی حالت سب سے خستہ تھی۔ اسے تو سانس بھی اٹک اٹک کر آرہی تھی۔

اچانک کسی کی جیب میں پڑا چائنا موبائل نہایت تیز آواز میں بجنے لگا۔ موبائل کی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ نقاب پوش تو اچھل ہی پڑے۔ خدشہ یہ تھا کہ کہیں وہ اضطراری کیفیت میں گولی نہ چلا بیٹھیں۔

"اوئے... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا... چلو سب اپنے موبائل نکالو... چلو... اور سب اس تھیلے میں ہی ڈال دو... جلدی کرو۔" پستول بردار نقاب پوش جو بھاگ بھاگ کے کام کررہا تھا، بولا۔

سب نے چپ چاپ موبائل فون نکالے اور تھیلے میں ڈال دیے جس کی جیب میں پڑا موبائل بج رہا تھا، اس کا رنگ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔ موبائل مسلسل کرخت آواز میں ایک بے ہنگم سی دھن بجائے جارہا تھا۔ پستول بردار نقاب پوش جھنجلا گیا۔ وہ بڑی تیزی اور کسی حد تک بدحواسی سے سب سے موبائل لیتا ہوا تھیلے میں ڈالتا جارہا تھا۔ پھر جیسے ہی کپکپاتے ہاتھوں نے بجتا ہوا موبائل نقاب پوش کے حوالے کیا، نقاب پوش نے ایک جھٹکے سے موبائل چھینا اور سامنے والی دیوار پر مار کر پاش پاش کردیا۔

بینک میں یک دم سکوت چھا گیا۔ گہری خاموشی، غیر یقینی حالات نے سب کا ذہن ماؤف کررکھا تھا۔

"چلو جلدی کرو... وقت ضائع مت کرو... اور تم... پہلے کاؤنٹر صاف کرو۔" کلاشنکوف بردار نے کہا۔

ایک مرتبہ پھر چابی بھر گئی۔ نہایت سرعت سے اس نے کیش کاؤنٹر کے پیچھے جمپ لگائی۔ بمشکل آدھ پون منٹ میں وہ کیش کاؤنٹر اور درازیں صاف کرچکا تھا۔ پھر وہ پستول لہراتا ہوا والٹ کی جانب بڑھا۔ چابی بردار آگے آگے تھے۔

دو منٹ بعد وہ بھرا ہوا بیگ گھسیٹتا اور اس کے تسمے لپیٹتا ہوا برآمد ہوا۔ مزید دو منٹ میں دوسرا بیگ بھر گیا تھا۔ اسی اثنا میں کلاشنکوف بردار تمام افراد کو بینک ہال کے ایک کونے میں لے جاکر زمین پر بٹھا چکا تھا۔ ارم یہاں بھی سب سے آگے اور نشانے پر بٹھائی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ شاید وہ بہنے والے ان آنسوؤں سے بے خبر تھی۔ شاید سب ہی کے جسموں پر لرزہ بھی طاری تھا۔ نوٹوں سے بھرے بیگ تیار تھے۔ تمام عملہ ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ بینک کا داخلی دروازہ موٹے شیشے کا تھا۔ شیشے پر جگہ جگہ ایسا کاغذ چپکا دیا گیا تھا جو ایک جانب تو دروازے کی زینت میں اضافے کا باعث تھا اور دوسری جانب بینک کے اندر کے منظر کو چھپانے کا سبب۔ اس دروازے سے البتہ بینک کے اندر موجود افراد باہر کا منظر دیکھ سکتے تھے۔

چھوٹے علاقوں میں جگہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہوا کرتی۔ بینک کی عمارت بھی اگرچہ مین بازار میں تھی لیکن روڈ سے کچھ بلندی پر اور ایک وسیع چبوترے پر تعمیر کی گئی تھی۔ چبوترے کے بعد چند سیڑھیاں اور پھر روڈ۔ شیشے کے پار سے ایک اور صاحب سیڑھیاں چڑھتے اور بینک کی جانب بڑھتے نظر آئے۔ صبح کے وقت باقاعدگی سے بینک آنے والے تیسرے کسٹمر تھے۔ آپ بھی ایک نزدیکی دکان دار تھے اور گزشتہ دن کی تمام ترکمائی صبح دم اپنے بینک اکاؤنٹ میں منتقل کردینا گویا ان پر فرض تھا۔ عینک لگائے، چھڑی ہاتھ میں لیے، پان منہ میں دبائے چلے آرہے تھے۔ ان کا ایک معمول یہ بھی تھا کہ چند قدم چڑھ کے جیب سے پان کی نقشین ڈبیا نکالتے۔ ایک گلوری منہ میں رکھتے پھر کہیں بینک کے چبوترے پر قدم رنجہ فرماتے۔ آج بھی اس معمول میں سرِمو فرق نہیں آیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے تھیلا جھلاتے بینک میں چلے آئے۔

"بڑے میاں آرہے ہیں۔" پستول بردار نے اپنے ساتھی کو پکارا۔

"آلینے دو۔ ان کا ہی انتظار تھا۔" جواب ملا۔

جونہی وہ بینک میں داخل ہوئے، دھر لیے گئے۔ وہ تو خیر ہوئی جو نقاب پوشوں نے ان کی پونجی کی جانب توجہ نہ دی اور انہیں بھی جلد ہی دیگر افراد میں شامل کردیا۔

"اے... ابے... یعنی... یہ کیا... بھئی سنو تو۔" وہ بوکھلاہٹ میں بولتے چلے گئے اور ارم کے سامنے ہی جاکر ڈھیر ہوگئے۔ ارم نے باوجود خستہ حالی کے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

عین اسی لمحے گارڈ حضرات جنہیں ہاتھوں پر رسی باندھ کر باتھ روم میں بند کردیا گیا، شاید کسی ترکیب سے اپنے ہاتھ کھولنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اب وہ باہر آنے کے لیے زور لگارہے تھے۔ باتھ روم کا دروازہ دھڑ دھڑا کررہا تھا۔ نقاب پوشوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

"ہم نے اب تک کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے نہ ہی ہم کسی کی جان لینا چاہتے ہیں... لیکن مجبوری میں تو... چلو سب دیوار کی طرف منہ کرو..." وہ دہاڑا۔

سب روبوٹ کی طرح بے آواز دیوار کی جانب گھوم گئے۔ دونوں نقاب پوش تیزی سے بینک سے نکلتے چلے گئے۔ باتھ روم کے دروازے سے آتی آوازوں نے انہیں مزید بدحواس کردیا تھا۔

ادھر نقاب پوش بینک سے نکلے، اُدھر دھڑ سے باتھ روم کا دروازہ ٹوٹا اور قبضوں سمیت فرش پر آرہا۔ زور کی آواز ہوئی۔ دیوار کی جانب منہ کیے سب ہی افراد نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے گھوم کر آواز کی جانب دیکھا۔ دونوں گارڈز ٹوٹے ہوئے دروازے پر سے اٹھ رہے تھے۔ غالباً ان کے کندھوں کی ٹکر سے دروازہ ہی اکھڑ گیا تھا۔

"کہاں ہیں وہ خدائی خوار؟" ایک گارڈ دانت پیستے ہوئے بولا۔

ارم کے حواس اور قوتِ گویائی اب تک سلب تھی۔ اس نے انگلی سے باہر کی جانب اشارہ کیا۔ دونوں گارڈز مختلف سمتوں میں بھاگے۔ ایک دروازے کی جانب اور دوسرا گارڈ روم کی جانب۔ لمحوں میں وہ گارڈ روم سے ایک رائفل نکال لایا۔ بینک کے دروازے تک آتے آتے رائفل لوڈ بھی ہو چکی تھی۔ وہ جھپٹ کر باہر نکلا۔

"وہ... اس وین میں..." دوسرے گارڈ نے اشارہ کیا۔

گارڈ نے رائفل سیدھی کی، شست باندھی اور فائر کا دھماکا سنائی دیا۔ یہ خودکار رائفل نہیں تھی۔ دوسرے فائر کے لیے اس نے رائفل دوبارہ لوڈ کی، دوسرا دھماکا سنائی دیا... لیکن وین نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

بینک ڈکیتی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح عادل آباد میں پھیلتی چلی گئی۔ عادل آباد کی تاریخ میں یہ پہلا بڑا جرم تھا۔ لوگوں کا جمِ غفیر تھا۔ مجمع صاف کرنے میں پولیس کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بمشکل تمام قصبے کے افراد کو بینک کی عمارت سے دور کیا جاسکا۔ عادل آباد کے پُرامن حالات کے باعث یہاں پولیس کی زیادہ نفری نہیں تھی۔ جو بھی تھی، تھانہ منشی اور ایک آدھ کو چھوڑ کے سب کی سب بینک بلالی گئی تھی۔ انہوں نے بڑی مستعدی اور خوش اسلوبی سے تمام تر انتظام سنبھال لیا تھا۔ غیر متعلقہ افراد نہ صرف بینک سے باہر کردیے گئے تھے بلکہ انہیں بینک کے نزدیک بھی کھڑے نہیں ہونے دیا گیا تھا۔ اب ایس ایچ او شبیر بید کی چھڑی ہاتھ میں لیے ایک ایک کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔

بینک منیجر ارم کسی حد تک سنبھل گئی تھی۔ اس کی خود اعتمادی بھی کسی حد تک بحال ہوئی تھی۔

"واردات کوئی بھی ہو، اندر کا آدمی جب تک ملوث نہ ہو... نہیں ہوسکتی۔" ایس ایچ او نے قابلیت بگھاری۔

"ایس ایچ او صاحب! آپ دس مرتبہ یہ کلیہ ہمیں سنا چکے ہیں اگر ہم میں سے کوئی مجرم ہے تو اسے ثابت کیجیے اور مجرم کو ہتھکڑیاں لگائیں۔" ارم نے تنگ آکر کہا۔

"جی ہاں۔" بیگم ناہید نے بھی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ "آپ مجرم تو پکڑ نہیں رہے ہیں، جس بینک میں ڈاکا پڑا ہے اسی کے عملے کو ہراساں کررہے ہیں۔"

بیگم ناہید بینک میں ڈپازٹ انچارج کی اہم سیٹ پر فائز تھیں اور اچھی عمر کی خاتون تھیں۔ ان کے چار بیٹے ہی تھے اور چاروں اہم عہدوں پر فائز تھے۔

ایس ایچ او ان کی جانب گھوما اور گھورتے ہوئے... بولا۔ "مجھے کام سکھانے کی کوشش نہ کریں۔ سیدھے سیدھے بتائیں آپ کو کس پر شک ہے؟"

"شبیر صاحب! ہم سب آپ کو بتا چکے ہیں کہ ہمیں کسی پر شک نہیں۔ نہ ہی ہم یہ اندازہ کرسکے ہیں کہ ڈاکو کون تھے... اور آپ نے اب تک ایف آئی آر بھی نہیں کاٹی۔" ارم پھر بولی۔ وہ محسوس کررہی تھی کہ ان نازک حالات میں خود کو، عملے کو اور بینک کی ساکھ کو بچانے کی ذمے داری اسی کی ہے۔

"ہونہہ... میں یہی سوچ رہا ہوں کہ ایف آئی آر میں کس کس کا نام ہوگا۔" ایس ایچ او معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"کسی کا بھی نہیں... مدعی بینک منیجر ہوگا اور نامعلوم افراد کے خلاف ہوگی یہ ایف آئی آر۔" ارم بھی ترکی بہ ترکی پر اتر آئی تھی۔

"یہ تو آپ کہہ رہی ہیں نا محترمہ۔" پھر وہ چلتا ہوا دونوں گارڈز تک پہنچا۔ بینک کے عملے کو ہال میں موجود کرسیوں پر بٹھا دیا گیا تھا۔ آس پاس تھانے کے اہلکار تعینات تھے۔ ایس ایچ او شبیر کا رویہ شروع ہی سے جارحانہ تھا۔ خاص کر بینک گارڈز سے وہ بہت بُرے طریقے سے پیش آرہا تھا۔ اس نے انہیں کرسیوں پر بھی بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ وہ دونوں نزدیک ہی اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ شبیر چلتا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ ایک گارڈ کو زوردار لات ماری... وہ بے چارہ چلاتا ہوا ایک جانب گرا۔ دوسرے کو زور سے چھڑی

رسید کی۔ وہ بھی بلبلانے لگا۔ ایس ایچ او شبیر دہاڑا۔ ''بتاؤ کون تھے وہ؟''

ارم میں نہ جانے کہاں سے طاقت آ گئی۔ وہ کرسی کو دھکا مار کر تیزی سے کھڑی ہوئی۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپ کو کس نے حق دیا ہے ان پر ہاتھ اٹھانے کا؟'' وہ چیخی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم جانتی ہو تم سرکاری کام میں مداخلت کر رہی ہو۔'' ایس ایچ او آپ سے تم پر اتر آیا۔ اس کا رویہ مزید جارحانہ ہو گیا تھا۔ ایس ایچ او کو غصے میں دیکھ کر بینک کے عملے کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ لیکن ارم شعلہ جوالا بن چکی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی نزدیکی میز تک گئی۔ وہاں رکھا فون اٹھایا اور نمبر دبانا شروع کر دیے۔ جلد ہی مطلوبہ نمبر پر رابطہ ہو گیا۔

''ہیلو... السلام علیکم... جی میں عادل آباد برانچ سے منیجر ارم بول رہی ہوں... سر سے بات کرنی ہے۔ اوکے... میں ہولڈ پر ہوں... جی سر... جی سر... السلام علیکم... نہیں سر... ابھی کچھ پتا نہیں چلا... جی سر! ایک پرابلم ہو رہی ہے... جی ہاں... یہ یہاں کے ایس ایچ او صاحب ہیں۔ یہ مجرموں کا پیچھا کرنے کے بجائے یہاں بینک میں موجود ہیں اور عملے کو ہراساں کر رہے ہیں۔ یہ بینک گارڈز کے ساتھ مار پیٹ کر رہے ہیں... جی سر... جی سر... ہم چاہتے ہیں کہ سب عملے کی ضمانت قبل از گرفتاری کے کاغذات تیار ہو جائیں کیونکہ ان کی نیت ٹھیک نہیں لگتی... اوکے... اوکے سر... تھینک یو سر۔''

ایس ایچ او اور بینک کے تمام عملے سمیت ہر فرد بہ غور یہ یکطرفہ گفتگو سن رہا تھا اور اپنے اپنے طور پر نتائج نکال رہا تھا۔

ارم پُروقار انداز میں گھومی، اس کا اعتماد بحال نظر آ رہا تھا۔ اس نے سب سے پہلے ایس ایچ او کو مخاطب کیا۔ ''شبیر صاحب! بینک کا عملہ... انشورنس کا عملہ... اور بینک کے اٹارنی روانہ ہو چکے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب یہاں ہوں گے۔ اب آپ سے بینک کا وکیل ہی بات کرے گا۔ ہمیں کسی بھی قسم کی گفتگو سے روک دیا گیا ہے کیونکہ یہ بینک کی ساکھ کا بھی مسئلہ ہے۔'' پھر وہ گارڈز کی جانب متوجہ ہوئی۔

''آپ دونوں گارڈ روم میں جائیں... آپ کی سیکیورٹی کمپنی کے مالک کرنل صاحب خود یہاں آ رہے ہیں۔ ضروری عملے کے ساتھ وہ خود ہی ان سے بات کر لیں گے۔ آپ سب اپنی اپنی سیٹوں پر جائیں۔'' ارم نے سب ہی کو ہدایات دے ڈالیں اور خود گھوم کر اپنے چیمبر کی جانب چلی۔

سب ہی نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑے ہونے لگے۔

''ارم... کیا میں اپنے بیٹے سے بات کر دوں؟'' ناہید نے پوچھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ ان کے بیٹے [illegible] میں اہم عہدوں پر ہیں۔

''نہیں میم شکریہ... اس کی قطعی ضرورت نہیں۔''

''منیجر صاحبہ! آپ یہ اچھا نہیں کر رہی ہیں۔'' ایس ایچ او پھر آپ پر آ گیا لیکن اس کی دھمکیاں بند نہ ہوئیں۔ ''میں سوچ رہا ہوں، عدم تعاون پر آپ کا نام تو ضرور [illegible] ایف آئی آر میں آ جائے گا۔''

''کاش آپ کی یہ دھمکیاں ریکارڈ کی جا سکتیں۔'' [illegible] وہ کسٹمرز کی جانب متوجہ ہوئی جو قسمت سے ڈکیتی کے وقت برانچ میں موجود تھے۔ ''اگر آپ کے بیانات قلم بند ہو گئے ہوں تو آپ جا سکتے ہیں۔ آپ نہ صرف یہ کہ ہمارے معزز کسٹمرز ہیں بلکہ شہر کے بھی معروف اور عزت دار افراد ہیں۔'' بیانات ہو ہی چکے تھے۔ ایس ایچ او نے بھی ان [illegible] مخالف دیکھ کر انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ گارڈز [illegible] روم میں اور عملہ اپنی اپنی سیٹوں پر چلا گیا۔

اسی دوران میں ایس ایچ او کے موبائل پر یکے بعد دیگرے کئی فون آئے اور خود اس نے بھی کئی فون کیے۔ وہ اپنے اہلکاروں سمیت بینک کے ہال میں کھڑا تھا۔ چونکہ عملے کے موبائل تو ڈکیت لے جا ہی چکے تھے لہٰذا اب [illegible] لینڈ لائن کے ذریعے ہی ادھر اُدھر رابطہ کر رہے تھے۔ ایس ایچ او نے انہیں روک دیا۔ اس کا رویہ نرم تھا۔ پھر وہ [illegible] ڈگ بھرتا ہوا منیجر کے کمرے کی جانب بڑھا۔

ارم اپنی مخصوص گھومنے والی کرسی پر بیٹھی تھی اور اس کا رخ دیوار کی جانب تھا۔ شبیر کچھ دیر کھڑا رہا پھر اس نے کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

ارم چونکی۔ اس نے کرسی گھمائی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ایس ایچ او شبیر گڑبڑا گیا۔ ڈبڈبائی آنکھوں نے اسے بھی متاثر کیا۔

''فرمائیے۔'' ارم اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

ایس ایچ او بے تکلفی سے سامنے موجود کرسی پر ڈھے گیا۔ پھر کسی قدر توقف کے بعد بولا۔ وہ شاید بولنے سے پہلے تول رہا تھا۔

''دیکھیں مس ارم واردات تو ہوئی ہے اور عادل آباد کے لیے بڑی واردات ہے۔ اس سے جہاں آپ کے بینک کی ساکھ متاثر ہو سکتی ہے، وہیں میری کارکردگی بھی زیرِ بحث آئے گی۔ ہمیں مل جل کر کام کرنا ہوگا۔''

''شبیر صاحب! ہم میں سے کس نے تعاون سے انکار کیا ہے؟'' ارم نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ اب مجھے ذرا تفتیش کرنے دیں۔ آپ جانتی ہیں کہ شہروں میں بینک ڈکیتیوں کی وارداتیں عام ہیں۔ وہاں سے جو خبریں آتی ہیں، ان کے مطابق کتنی ہی بینک ڈکیتیوں میں گارڈز ملوث پائے گئے ہیں... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

ارم نے سر پکڑ لیا۔ ''شبیر صاحب! آپ سے خدا سمجھے... یقیناً ایسا ہے۔ بینک ڈکیتیوں میں سیکیورٹی کمپنیوں کے گارڈز شامل تھے لیکن آپ یہ تو دیکھیں کہ وہ بڑے شہروں کی باتیں ہیں۔ وہاں بندہ بندے کو نہیں جانتا۔ منیجر، گارڈ کو نہیں جانتا... گارڈ منیجر کو نہیں جانتا اور تھانے [illegible] بھی نہیں جانتے۔ اب بتائیے کیا یہاں بھی ایسا ہی ہے؟''

''میں مانتا ہوں، یہاں ایسا نہیں... لیکن...'' ایس ایچ او کہنے لگا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آپ درست خطوط پر تفتیش کریں... یہ چھوٹا علاقہ ہے۔ ہم، آپ اور یہ گارڈ اگرچہ الگ الگ اداروں میں کام کر رہے ہیں لیکن ہم سب یہیں کے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے ہی نہیں، ایک دوسرے کے باپ دادا کے بھی حالات سے واقف ہیں۔ نہ میں آپ کو کام سے روک رہی ہوں اور نہ ہی شک کرنے سے... لیکن ذرا ڈھنگ سے...''

''ٹھیک ہے، اب ذرا ان دونوں کو بلوائیے۔'' شبیر نے کہا اور اپنے ایک اہلکار کو اشارے سے اندر ہی بلوا لیا۔ وہ ایک رجسٹر اٹھائے وہیں آ گیا۔

ارم نے بیل بجائی اور دونوں گارڈز کو بلوایا۔

''تمہارا اسلحہ کہاں ہے؟'' ایس ایچ او نے سوال کیا۔

''جناب! کمپنی سے جو اسلحہ ملا تھا، وہ تو ڈاکو اپنے ساتھ لے گئے۔''

''اچھا... پھر تم نے فائر کیسے کیے تھے؟'' شبیر نے فائر کرنے والے گارڈ سے پوچھا۔

''خو، وہ ہمارا ذاتی رائفل ہے... تم جانتا ہے، ہم فوج سے ریٹائر ہے۔ ہم نے ریٹائرمنٹ کے بعد ایک رائفل خریدا تھا۔ اصل جرمن۔ اس کا لائسنس ہے ہمارے پاس...''

''تم نے ذاتی رائفل بینک میں کیوں رکھی ہے؟''

''اس کا بھی اجازت ہے ہمارے پاس... صاب! ام گریب لوگ ہے۔ فوج میں رہنے سے اسلحے کا شوق تھا... وہ پورا کیا... اب رائفل گھر پر کیا کرے گا... ادھر بینک میں لے آیا... اور دیکھو کام آیا نا۔'' گارڈ نے بیان دیا۔ ساتھ کھڑا پولیس اہلکار لکھتا جا رہا تھا۔

شبیر نے سوالیہ نگاہوں سے ارم کو دیکھا۔

''یہ درست کہہ رہا ہے۔ اس حوالے سے ضروری دستاویزات اس کی کمپنی اور بینک میں بھی موجود ہیں۔''

''میں ڈی وی آر دیکھنا چاہتا ہوں۔'' ایس ایچ او نے کہا۔

''سر! وہ تو ڈکیت پہلے ہی لے گئے۔'' دوسرے گارڈ نے کہا۔

''حیرت انگیز... انہی باتوں سے میرا شک یقین میں بدلتا ہے کہ کوئی اندر کا آدمی ضرور ملا ہوا ہے۔ صرف دو ڈاکو آتے ہیں۔ گارڈز کو غیر فعال کرتے ہیں۔ ایک ڈاکو عملے کو کور کرتا ہے اور دوسرا لمحوں میں نہ صرف یہ کہ الارم سسٹم کو ناکارہ کر دیتا ہے بلکہ ڈی وی آر بھی اٹھا لیتا ہے۔ منیجر صاحبہ کے پاس اسپیشل سیکیورٹی الارم ہے لیکن وہ ایکٹیویٹ ہی نہیں ہے... واہ! کیا حلوہ تیار کیا ہے۔'' اس نے بے ساختہ ہنستے ہوئے کہا۔ اس کے انداز پر ارم کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔

☆☆☆

فراست علی خان کانٹے دار جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا گزرتا چلا جا رہا تھا۔ یہ سفر اسے اکیلے ہی طے کرنا تھا۔ یوں تو اس دنیا میں انسان آیا بھی اکیلا ہے اور جاتا بھی اکیلا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے راستوں پر چل نکلتے ہیں جہاں وہ اکیلے ہوتے ہیں۔ وہ بھی تنہا چلا جا رہا تھا۔ تیزی اور مضبوطی سے قدم اٹھاتا۔ اگرچہ وہ ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کی دہلیز پر تھا لیکن اس کی کاٹھی کچھ ایسی تھی کہ وہ آج بھی جوانوں کی طرح چھریرا اور چاق و چوبند نظر آتا تھا۔

قدم آگے بڑھ رہے تھے لیکن ذہن ماضی کے دھندلکوں میں اترتا جا رہا تھا۔ اس نے زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ والد کے پاس ایکڑوں پر محیط وسیع رقبہ تھا۔ خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ وہ بچپن ہی سے کام نہ کرنے اور شاہ خرچی کی عادتوں میں مبتلا ہو گیا۔ وہ صرف دو بھائی تھے۔ ماں کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا۔ زمینوں کی دیکھ بھال ہمیشہ باپ اور بڑا بھائی کیا کرتے تھے۔ یہ لاڈ پیار اور ناز و نعم میں پلتا رہا اور بگڑتا گیا۔ باپ اور بھائی بہت نیک خصلت اور محنتی انسان تھے۔ وہ خود کو زمیندار نہیں کسان کہتے اور کہلواتے

تھے۔ محنت کرنے میں عار نہیں سمجھتے تھے۔ فراست نے والد کے انتقال سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا۔ والد نے اپنی زندگی ہی میں ترکہ شرعی اصولوں کے تحت تقسیم کر دیا تھا۔ اچھی بھلی جائداد تھی لیکن جائداد کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو، بے راہ روی کے آگے نہیں ٹھہر سکتی۔ فراست نے تو پھر دس برس نکالے۔ دس برس میں تمام جائداد ختم ہو گئی۔ دونوں بھائی اپنی آبائی حویلی میں ساتھ رہا کرتے تھے۔ بڑا بھائی فرمان علی خان باپ کے بعد حویلی کا مالک تھا لیکن وہ ہمیشہ کہا کرتا کہ حویلی اماں کی اور فراست کی ہے۔ ہم تو بس ان کے ساتھ رہتے ہیں۔ فراست نے شادی نہیں کی تھی۔ عیاشیوں سے فرصت ہوتی تو شادی کرتا۔ بڑے بھائی نے بھی کبھی کسی بات پر نہیں روکا ٹوکا، ہمیشہ لاڈ اور نازبرداریوں میں لگا رہا۔ فراست درست طور پر ایک بگڑا نواب تھا۔

جب تمام تر جائداد لٹ گئی تو بڑے بھائی نے ایک خطیر ماہانہ وظیفہ باندھ دیا۔ بڑے بھائی نے زمینداری کے ساتھ ساتھ فارمنگ اور تعمیرات کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ یہ تمام تر کام جدید خطوط پر کیے جا رہے تھے۔ اس کی صرف ایک ہی اولاد تھی، سارم علی خان۔ سارم بہت باصلاحیت نوجوان تھا۔ باہر ملک سے پڑھ کر آیا تھا۔ کام کاج اور کاروبار میں باپ کا دست و بازو تھا۔

ابھی سارم کی زمینداری، لائیو اسٹاک فارمنگ اور تعمیرات کے کاموں پر گرفت مضبوط بھی نہ ہوئی تھی کہ اس کے والد اور فراست کے بڑے بھائی کا بھی انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی کے انتقال کے بعد سارم نے چچا کا مقرر کردہ وظیفہ کبھی نہ روکا۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو لفافہ اسے باقاعدگی سے مل جاتا تھا۔ فراست کی بھابی اور سارم کی والدہ کو اعتراض تو دور کی بات، ان معاملات سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔

اب اس بڑی سی آبائی حویلی میں صرف تین نزدیکی رشتے دار رہا کرتے تھے۔ فراست، اس کا بھتیجا اور بھابی۔

فراست کو ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ٹھوکر نے اسے خیالات اور ماضی کی دنیا سے نکال کر حال میں پہنچا دیا۔ اس کا حال بہت ہی خوب صورت تھا۔ جھاڑیوں سے نکل کر وہ مین روڈ پر آ گیا تھا۔ سامنے ہی ایک جدید ترین سرخ رنگ کی بڑی سی جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کے ساتھ ٹکی ایک خوب صورت حسینہ جدید تراش کے سرخ لباس میں ملبوس تھی۔ گاڑی اور لباس کے آتشی رنگوں کے امتزاج .... نے اسے شعلہ جوالا بنا دیا تھا۔

فراست کو دیکھتے ہی اس نے نعرہ لگایا اور دیوانہ وار دوڑتی ہوئی اس سے چمٹ گئی۔ ”کیا رہا...؟“

”کامیابی... فراست کبھی کوئی کام ادھورا نہیں چھوڑتا... چلو گاڑی میں بیٹھو۔“

دونوں تیزی سے گاڑی تک آئے۔ لڑکی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور گاڑی کا رخ عادل آباد کی مخالف سمت شہر کی جانب ہو گیا۔

”کوئی پرابلم؟“ گاڑی چلاتے ہوئے لڑکی نے سوال کیا۔

”کہا نا کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ پلان کے عین مطابق...“

”واؤ... اب تو تم کروڑوں کے مالک ہو۔“

”ہاں جان اور تم بھی... کیا تم مجھے تھوڑا سا آرام کرنے کا موقع دو گی؟“ فراست کی ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ جلد تھک جاتا تھا۔ کسی بھی جسمانی یا ذہنی کام کے بعد وہ دس پندرہ منٹ آنکھیں بند کر کے ہلکی نیند میں چلا جاتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کے اعصاب چٹخنے لگتے اور سر میں درد ہونے لگتا تھا۔

”اوہ... یس... یس... آئی انڈر اسٹینڈ۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں ایسے ہی موقع کے لیے ایک خاص دوا لائی ہوں... لو، یہ گولیاں کھا لو اور یہ ڈرنک لو۔“

فراست نے گولیاں نگل کر لمبے لمبے گھونٹ لیے اور سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

گاڑی کی آرام دہ سیٹ اور اے سی کی ٹھنڈک نے ماحول کو خواب ناک سا بنا دیا تھا۔ ٹنڈ گلاسز کی وجہ سے روشنی بھی تیز نہیں تھی۔ فراست نے آنکھیں بند کر لیں۔

آنکھیں کھلی تھیں تو وہ شعلہ جوالا مجسم سامنے تھی۔ آنکھیں بند کیں تو وہ پھر بھی سامنے ہی تھی۔ وہ شعلوں کی حدت سے پگھلتا چلا گیا۔

☆☆☆

بارش بہت شدید تھی اور اچانک ہی شروع ہوئی تھی۔ وہ کچھ دوستوں کو تلاش کرنے کے بعد مدہوشی کے عالم میں ہی نکل آیا تھا۔ وہ بہت جیت چکا تھا اور بہت پی چکا تھا۔ اب وہ اپنے گھر عادل آباد جانا چاہتا تھا۔ صاحب خانہ نے اسے دبے لفظوں میں وہیں ٹھہرنے کی پیشکش کی لیکن فراست کا معمول تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی ڈرائیو کو ترجیح دیتا تھا۔ نزدیکی شہر سے عادل آباد کا فاصلہ اتنی ہی دیر میں طے ہوتا تھا۔ رات کافی بھیگ چکی تھی اور شدید بارش نے سب کو بھگو دیا

تھا۔ فراست کے لیے یہ باتیں اہم نہیں تھیں۔ وہ رات کو سفر کا عادی تھا اور بارش تو اسے بچپن ہی سے پسند تھی۔

وہ اپنے دوست کے گھر سے نکل کر آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ یہ شہر کا مہنگا ترین علاقہ تھا۔ یہاں تو دن میں بھی ٹریفک کم ہی ہوا کرتا تھا۔ جونہی فراست ایک سگنل پر رکا، ایک موٹر سائیکل قریب آ کر رک گئی۔ فراست نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ ایسی باتوں سے عموماً بے خبر ہی گاڑی چلایا کرتا تھا۔ اس وقت تو وہ ویسے بھی بہت موج میں تھا۔ اسے تو اس وقت ہوش آیا جب ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر گاڑی کا انجن بند کر دیا گیا۔

”چلو ساری نقدی اور موبائل نکالو...“ خوفناک لہجے میں کہا گیا۔

فراست کون سا حواسوں میں تھا۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ ”جی...“

”جی کا بچہ، آواز نہیں آ رہی کیا... نکالتا ہے یا ماروں فائر؟“

اب فراست کو پستول کی نال نظر آئی اور سمجھ میں بھی آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے لیکن کچھ کرنے کی صلاحیت یکسر مفقود ہو گئی۔

گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل ساتھ کھڑی تھی اور اس پر دو سوار موجود تھے۔ موٹر سائیکل پر سوار دوسرا شخص نیچے اترا۔

”یہ ایسے نہیں مانے گا۔“ اس نے کہا۔ فراست کو کالر سے پکڑ کر جو زوردار جھٹکا دیا تو فراست چاروں خانے چت منہ کے بل سڑک پر تھا۔ بارش زور و شور سے جاری تھی۔ نہ زیادہ دور تک کچھ سنائی دے رہا تھا نہ سجھائی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں آسمان سے چھاجوں برستا پانی ایک خاص منظر پیش کر رہا تھا۔

فراست کو سڑک پر گرا کر لٹیرا اسے چھاپ بیٹھا۔ لمحوں میں پرس، موبائل، گھڑی وغیرہ سب سے محروم کر دیا۔

”چل کھڑا ہو... بیٹھ گاڑی میں۔“ فراست افتاں و خیزاں گاڑی میں بیٹھا۔

”سیدھا نکل لے... مڑ کر مت دیکھنا۔“ لٹیروں نے خود بھاگنے کے بجائے فراست کو دوڑا دیا۔ لیکن فراست کا تو ذہن ہی ماؤف تھا۔ وہ شاید سمجھ ہی نہیں پایا۔ خاموشی سے بیٹھا رہا۔

اچانک پستول کا بھاری دستہ زور سے سر پر پڑا۔

”ابے بھاگتا ہے یا...“

سر پر چوٹ پڑتے ہی فراست کو گویا ہوش آ گیا۔ اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی اور ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ بمشکل اس نے چورنگی کراس کی ہو گی کہ ایک گاڑی زور سے ٹکرائی۔ زوردار دھماکا ہوا اور گاڑی پھر بند ہو گئی۔ فراست اس طرح کی افتادوں کا عادی نہیں تھا۔ اس کا سر زور سے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا تھا۔ پھر دروازہ کھلا اور ایک چیختی ہوئی نسوانی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

”اندھے ہو گیا... دکھتا نہیں ہے... میری نئی گاڑی برباد کر دی۔“ نسوانی آواز سن کر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔

”جی... محترمہ... بات...“

”کیا جی جی لگا رکھی ہے۔ باہر نکلو، دیکھو تم نے کیا کیا ہے۔ میں ابھی پولیس کو بلواتی ہوں۔“

فراست آہستگی سے باہر آیا۔ سامنے کھڑی گاڑی کی طرف بڑھا۔ عورت مسلسل چیخے جا رہی تھی۔ لیکن جونہی ہیڈ لائٹس کی روشنی فراست کے چہرے پر پڑی، خاتون کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

”اوہ... آپ تو زخمی ہیں۔“ فراست کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ بارش کے پانی میں سر سے بہتا خون فراست کو اپنے ہی خون میں نہلائے دے رہا تھا۔ یہ منظر ایک خاتون کے لیے یقیناً دہلا دینے والا تھا۔

فراست کو بھی اپنے سر کی چوٹ بلکہ چوٹوں کا خیال ہوا۔ خون دیکھ کر وہ بھی گھبرایا۔

”خاتون، میرا خیال ہے... مجھے پہلے اسپتال جانا چاہیے... آپ فکر نہ کریں، میں آپ کا تمام نقصان پورا کر دوں گا۔“

”ہاں... ہاں... ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ خاتون موم ہو گئی۔ ”لیکن آپ اکیلے اسپتال کیسے جائیں گے... آپ چل سکتے ہیں؟ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

”نہیں، میں عادل آباد میں رہتا ہوں اور اکیلا ہوں۔“

”اوہ... کوئی بات نہیں، گاڑی لاک کریں... میرے ساتھ آئیں... اچھا چھوڑیں، میں آپ کی گاڑی سائڈ پر لگا کر لاک کرتی ہوں۔ آپ میری گاڑی میں بیٹھیں۔“

”اوہ... نہیں شکریہ... میں...“

”میں... ویں کچھ نہیں، فوراً گاڑی میں بیٹھیں۔“ خاتون نے بڑی تیزی سے فراست کی گاڑی کو ایک جانب پارک کیا پھر دوڑتی ہوئی اپنی گاڑی .... تک آئی۔

فراست کسی قدر پس و پیش کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

معلوم نہیں نفسیاتی سبب تھا یا واقعی چوٹیں گہری آئی تھیں۔ فراست کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور پھر جب اس کی آنکھیں کھلیں تو سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ... وہ شعلہ جوالا، محشر بداماں نزدیک بیٹھی تھی۔۔۔۔۔ بارش میں بھیگے لباس نے اسے واقعی محشر بداماں بنا رکھا تھا۔

فراست کے تو چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہیے، کیسی طبیعت ہے اب...؟''

''بہتر ہوں... بس سر ذرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔''

''آپ کے سر پر دو جگہ چوٹیں ہیں، میں معافی چاہتی ہوں۔ ممکن ہے میری غلطی سے حادثہ ہوا ہو۔''

''اوہ، وہ جانے دیں... میں آپ کا تمام نقصان پورا کروں گا۔''

''وہ سب رہنے دیں... آپ کے پاس سے کوئی پرس اور کوئی موبائل نہیں ملا ورنہ ہم آپ کے گھر والوں کو ضرور خبر کر دیتے... یہ جوس لیں، اس سے کچھ توانائی آئے گی۔'' خاتون نے جوس کا ڈبا پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹرز نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں... آپ کے سر پر زخم اور چوٹ ہے لیکن دونوں بہت گہرے یا خطرناک نہیں۔ انہوں نے گھر جانے کی اجازت دے دی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' فراست اپنا سر ٹٹولتے ہوئے بولا۔ اس نے جوس ختم کیا اور آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔

''میرا ہاتھ پکڑ لیں۔'' اس آفر نے تو فراست کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔ کون کافر انکار کرتا۔ وہ آہستہ آہستہ پارکنگ تک آئے۔ بارش اب بھی جاری تھی لیکن بارش کا زور ٹوٹ گیا تھا۔

فراست کو ہر ہر قدم کی دھمک اپنے سر میں محسوس ہو رہی تھی۔

''کیا آپ کے یہاں کوئی عزیز ہیں... یا؟'' مہربان خاتون نے پوچھا۔

''نہیں یہاں میرے دوست ہیں... لیکن میں ان کے ہاں جانا نہیں چاہوں گا۔ آپ مجھے بس میری گاڑی تک پہنچا دیں۔ دراصل آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا بیتی ہے...'' پھر فراست نے کچھ دیر قبل پیش آنے والا حادثہ سنا ڈالا۔

''اوہ... مائی گاڈ... میں بھی کتنی پاگل ہوں... کو نہ جانے کیا کیا کہہ دیا۔ آئی ایم سوری... ان حالات میں اور ایسے موسم میں سفر آپ کے لیے مناسب نہیں... میرے گھر چلیں رات وہاں آرام کریں، صبح چلے جائیے گا...''

پھر خاتون نے فراست کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں... اور کار اپنے گھر ہی میں لے جا کر روکی۔ اس کا بنگلا شہر کے مہنگے علاقے میں تھا اور کافی وسیع تھا۔

''کیا آپ کے گھر والوں کو اطلاع کر دی جائے؟'' ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی خاتون نے کہا۔ فراست علی نے اب ذرا فرصت سے خاتون کی جانب دیکھا تو ہزار جان سے فدا ہو گیا۔ خاتون پینتیس برس کی ہوں گی لیکن قیامت تھیں۔

''نہیں... میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں۔'' پھر وہ ایک صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنی محسنہ کا تعارف بھی حاصل نہیں کر سکا... میرا نام فراست علی خان ہے۔ ہم عادل آباد کے بڑے زمینداروں میں سے ہیں۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے اور میں نے اب تک شادی کا جھنجٹ نہیں پالا... لہٰذا کسی کو خبر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''اوہ... ٹھیک ہے... یہ بتائیے... کافی تو پسند کریں گے ہی اس موسم میں... میں ذرا چینج کر کے اور آپ کے لیے کافی لے کر آتی ہوں۔'' وہ چلی گئی۔ وہ کیا گئی گھر کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ فراست سوچ رہا تھا کہ شاید گیٹ کھولنے والے چوکیدار اور ایک آدھ ملازم کے علاوہ یہاں کوئی نہیں رہتا۔ تو کیا اتنے بڑے گھر میں یہ بھی اکیلی ہی ہے؟ وہ سوچ رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک ملازمہ چند لوازمات کے ساتھ کافی کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ فراست نے ملازمہ کی عمر، قد کاٹھ دیکھا اور ٹھنڈی سانس لی۔ وہ بھی مالکن سے کم نہیں تھی۔

''سلام صاحب! شکر کتنی لیں گے؟''

''بس ایک چمچ۔'' فراست نے کہا۔ اتنے میں خاتون خانہ بھی آ گئیں۔ اب وہ اس دھج سے آئیں کہ زلفیں تو پہلے ہی کھلی تھیں، اب وہ شب خوابی کے لباس میں تھیں۔

''رہنے دو نذیراں... کافی میں بنا دوں گی... تم جاؤ... صاحب کے لیے کمرا درست کرو اور وہاں کوئی نائٹ سوٹ بھی رکھ دو۔''

پھر اس نے فراست کو کافی پیش کی۔ ساتھ ہی کچھ دوائیں بھی۔

''یہ درد دور کرنے والی دوائیں ہیں۔ اس میں شاید

کوئی خواب آور دوا بھی شامل ہے۔ آپ دوائیں کھائیں اور آرام کریں۔ صبح ڈرائیور آئے گا تو آپ کی گاڑی منگوالی جائے گی۔'' فراست نے دوا لی اور ایک ٹک خاتون کو دیکھنے لگا۔

دونوں نے خاموشی سے کافی پی۔ ایک غیر فطری سا سناٹا تھا جو طاری تھا۔ فراست نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''آپ کو میری وجہ سے زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔''

''کوئی ایسی خاص نہیں... اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میں بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں... لیکن میں اب تک اپنی محسنہ...''

''اوہ، فراست صاحب! مجھے اس طرح شرمندہ نہ کریں... میرا نام شہلا ہے۔ میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں۔ میں کینیڈا میں ہوتی ہوں۔ یہاں کی حکومت اور یونیورسٹی نے ایک ریسرچ کے لیے میری خدمات حاصل کی ہیں۔ میں ایک خاص پروجیکٹ پر کام کر رہی ہوں اور کچھ عرصے کے لیے یہاں ہوں۔''

''کیا آپ کا تعلق ہمارے ملک سے نہیں؟''

''میرے والدین یہیں کے ہیں لیکن میں کینیڈا میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی ہوں۔''

''گویا آپ ہماری مہمان ہیں۔''

''اس وقت تو آپ میرے مہمان ہیں۔'' شہلا نے کہا اور ہنسنے لگی۔

فراست نے محسوس کیا کہ اس کی پلکیں بوجھل ہونے لگی ہیں۔ اسے شدید نیند آ رہی تھی۔ شہلا نے بھی یہ بات محسوس کر لی۔

''میرا خیال ہے آپ کو آرام کی ضرورت ہے... نذیراں...'' اس نے ملازمہ کو آواز دی۔ نذیراں فوراً ہی حاضر ہو گئی۔ ''صاحب کو گیسٹ روم تک لے جاؤ۔'' شہلا نے کہا اور فراست اس کے پیچھے ہو لیا۔

☆☆☆

ارم کا گلا خشک ہونے لگا۔ ایک مرتبہ پھر اس کے اعصاب ساتھ چھوڑنے لگے۔ لیکن اس نے جلد ہی خود پر قابو پایا۔ ایس ایچ او شبیر ارم کی بدلتی کیفیات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''شبیر صاحب! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ بینک والے ملوث ہیں تو اسے ثابت کیجیے اور انہیں ہتھکڑیاں لگا دیجیے۔'' ارم جی کڑا کر کے بولی۔

''یہ بات میں پہلی مرتبہ نہیں سن رہا۔ بے فکر رہیں... میں یہی کرنے جا رہا ہوں۔'' پھر وہ گارڈز کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہاں خان، تم بتاؤ... الارم کیوں نہیں بجے؟''

''او صاب... ام الارم ولارم نہیں جانتا۔ ام تو صرف یہ جانتا ہے کہ ان خدائی خواروں نے ذرا بھی موقع نہیں دیا۔''

''موقع نہیں دیا... یا تمہیں کچھ کرنا ہی نہیں تھا؟''

''صاب! یہ تو خدا کو مالوم ہے۔''

''تم بتاؤ... کیوں نہ تم دونوں کو ڈیوٹی سے غفلت اور اعانتِ جرم میں پرچہ کاٹ کر اندر کر دیا جائے؟'' شبیر دوسرے گارڈ سے مخاطب ہوا۔

''صاحب! ہم کیا کر سکتے ہیں... شرمندہ ہیں کہ ہمارے ہوتے ہوئے یہ کام ہوا۔''

''یہ بناوٹی شرمندگی کسی کام کی نہیں۔ آج رات تھانے میں مہمان رہو گے تو سب سمجھ آ جائے گا۔ یہ بتاؤ اگر وہ دونوں ڈاکو تمہیں کہیں نظر آ جائیں تو انہیں پہچان لو گے؟''

''نہیں، صاحب! دونوں کے چہرے نقاب میں چھپے ہوئے تھے اور آواز سے کسی کو کیسے پکڑا جا سکتا ہے؟''

''گویا سارا انتظام پہلے کر رکھا ہے... اچھا، مجھے یہ بتاؤ ڈی وی آر کہاں فکس تھا؟'' ایس ایچ او نے پوچھا۔

''شبیر صاحب... میری بھی سن لیں۔'' ارم بولی۔

''آپ ہی کی سن رہا ہوں، فرمائیے۔''

''ڈی وی آر جانے سے کچھ نقصان نہیں ہوا۔ ریکارڈنگ محفوظ ہے اور اب بھی جاری ہے۔'' ارم نے کہا۔

''کیا مطلب؟ میں آپ کی بات سمجھ نہیں پا رہا... آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟ ڈاکو سی سی ٹی وی کی فوٹیج ریکارڈ کرنے والی ڈی وی آر نہیں لے کر گئے؟''

''یقیناً وہ لے گئے ہیں... لیکن ریکارڈنگ جاری ہے۔ ہمارے بینک میں سی سی ٹی وی کی فوٹیج ریکارڈ کرنے کا دہرا انتظام ہے۔ ایک تو ڈی وی آر یہ سامنے ہے۔ دوسرا ذریعہ کمپیوٹر مشین ہے۔ ایک کمپیوٹر چوبیس گھنٹے آن رہتا ہے اور تمام تر فوٹیج اس میں جمع ہوتی رہتی ہیں۔'' ارم نے کہا۔

''واہ... یہ کی ہے آپ نے کام کی بات... مجھے وہ چاہیے۔'' شبیر بولا۔

''بالکل مل جائے گی۔ آپ جب تک اپنی باقی کارروائیوں سے فارغ ہو جائیں، میں اس کی ایک کاپی آپ کے لیے بنوا دیتی ہوں۔''

''لیکن مجھے پورے مہینے کی فوٹیج چاہیے۔'' ایس ایچ او

بولا۔

''سوری شبیر صاحب! کمپیوٹر میں زیادہ سے زیادہ آپ کو آخری پندرہ دن کی ریکارڈنگ مل سکے گی۔ ورنہ صرف دس دن۔''

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔ آپ اس کی کاپی تیار کروائیں۔'' ایس ایچ او نے کہا اور ارم کے چیمبر سے باہر آگیا۔

اسی وقت بینک کا دروازہ کھلا اور کیمرے اور لائٹس لیے نیوز چینل والے بینک میں داخل ہوگئے۔ وہ کیا آئے ہر جانب ایک طوفانِ بدتمیزی بپا ہوگیا۔ کچھ لوگ مائک ہاتھ میں تھامے ارم کے چیمبر میں بھی داخل ہوگئے۔

''آپ کا کیا خیال ہے، ڈاکو کون ہوسکتے ہیں؟''

''آپ نے اپنا شک کس پر ظاہر کیا ہے؟''

''بینک کے عملے کے ملوث ہوئے بغیر ڈاکا نہیں پڑ سکتا... آپ کا کیا خیال ہے؟''

''عادل آباد میں کبھی کسی سنارے کو نہیں لوٹا گیا... آج اتنی بڑی اور سنگین واردات ہوگئی... کیسے؟''

ارم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جارہا تھا۔ وہ بمشکل اپنی سیٹ سے اٹھی۔

''آپ نے جواب نہیں دیا... میں پھر اپنا سوال...''

''خاموش۔'' وہ چیخی۔ ''میں اپنے بینک کی آفیشل اسپوکس مین نہیں ہوں۔ صدر دفتر سے ہمارا ضروری عملہ آرہا ہے، وہ آپ کے سوالات کے جواب دے گا۔''

''آپ منیجر ہیں... آپ ذمے دار ہیں۔ آپ کو اپنا مؤقف بتانا ہوگا۔'' ایک صحافی بولا۔

''میں آپ کی پابند نہیں ہوں۔'' ارم نے کہا اور مجمع میں سے راستہ بناتی ہوئی باہر آگئی۔ بینک کا عملہ بھی منیجر کے رویے کو دیکھتے ہوئے دم سادھے اور منہ باندھے بیٹھا رہا۔ تھک ہار کر چینل والوں نے پولیس کا رخ کیا۔

ایس ایچ او نے کمال ذہانت کا ثبوت دیا۔ خود بینک سے باہر آگیا اور باہر آکر سب چینل والوں کو باہر بلالیا۔

''سب یہاں آجائیں، میں آپ کو تفصیلات بتاتا ہوں۔'' سب کیمرے اور مائک لیے باہر کو دوڑ گئے اور ہال خالی ہوگیا۔

بینک ڈکیتی تقریباً پندرہ کروڑ کے لگ بھگ تھی۔ یہ شاید پہلی بڑی ڈکیتی تھی۔ ارم بے حد پریشان تھی۔ تاہم بینک کے متعلقہ حکام نے تمام انتظامات کردیے تھے اور اب بینک کے عملے کی گلوخلاصی ہونے والی تھی تاکہ وہ اپنے گھروں کو جا سکیں اور ایس ایچ او کے ترش جملوں سے نجات پاسکیں۔

ارم کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ کافی دیر سے اپنے چیمبر میں اکیلی تھی۔ اچانک اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سارم علی خان کھڑا تھا۔ وہ خوبرو...... جوان جسے وہ پسند کرنے لگی تھی۔ یہ بات کسی حد تک شاید بینک کے عملے نے بھی محسوس کرلی تھی۔ اگرچہ اس کا ایک تگڑا بینک بیلنس بھی تھا لیکن شاید وہ صرف رقم جمع کروانے اور نکلوانے نہیں آتا تھا۔ ارم کا تعلق ایک روایتی قدامت پسند گھرانے سے تھا۔ لہٰذا وہ ان معاملات میں بے حد احتیاط سے کام لیتی تھی۔ لیکن آج نہ جانے کیا ہوا اور سارم کو دیکھتے ہی وہ جھتے سے اکھڑ گئی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔

''تم... تم یہاں کیسے آگئے؟''

سارم اس جملے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔ سارم کی عادل آباد میں ایک حیثیت تھی۔ پھر وہ اس بینک کی چند اہم پارٹیوں میں سے ایک تھا اور پھر سب سے بڑھ کر وہ برانچ منیجر کے نسبتاً خصوصی رویے اور التفات کا حامل رہا کرتا تھا۔ بھلا کس کی مجال تھی جو اسے روکتا۔ آج بھی وہ سیدھا ارم کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا لیکن آج ارم کو نہ جانے کیا ہوا تھا۔

''ہاؤ ڈیر یو ٹو کم ہیئر... گیٹ لاسٹ۔'' وہ اتنے زور سے چیخی کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔

سارم سمیت وہاں موجود عملہ حیران رہ گیا۔ انہوں نے ارم کو کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

ادھر سارم کاٹو تو لہو نہیں کی عملی تفسیر بنا ہوا تھا۔ ایسی بے عزتی اس کی کبھی کہیں نہیں ہوئی ہوگی۔

''نکل جاؤ... یہاں سے۔'' وہ پھر چیخی اور سارم پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

سارم بینک سے یوں نکلا تھا جیسے کوئی زندگی سے نکلتا ہے۔ وہ جسے جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اپنے گھر کی عزت بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا، اس نے ایسی بے عزتی کی تھی کہ خود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ بینک سے نکلا اور ایک جانب چل پڑا۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔ بس وہ چل رہا تھا۔ بے سمت، بے منزل مسافر کی طرح۔ پیدل چلنا اس کی عادت تھی۔ وہ میلوں پیدل چلنے کا عادی تھا۔ کار،

موٹر سائیکل غرض ہر سواری موجود تھی۔ یہاں تک کہ اس کے پاس عمدہ نسل کے سدھائے ہوئے گھوڑے بھی تھے لیکن اسے پیدل چلنا پسند تھا۔ قصبے میں زیادہ تر کام وہ پیدل گھوم پھر کر ہی کیا کرتا تھا لیکن آج کا چلنا کچھ اور ہی تھا۔ وہ پتا نہیں کس احساس کے تحت چل رہا تھا۔ بے خودی تھی یا ذلت و رسوائی کا احساس یا رد کیے جانے کا خوف... بہرحال اسے کچھ نہ دکھائی دے رہا تھا نہ سمجھ آرہا تھا۔ وہ چلتا رہا، چلتا رہا۔ وہ آبادی کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا وہ ایک پلیا پر جاکر بیٹھ گیا۔ زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے جو پانی کی چھوٹی گزرگاہیں بنائی جاتی ہیں، ان میں سے ایک پر تعمیر کی گئی یہ ایک پختہ پلیا تھی۔ اس پر دونوں جانب سے آم کے درخت یوں جھک آئے تھے کہ اس پر سایہ ہوگیا تھا۔ سارم پلیا کی کلر پر بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی ارم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

کبھی اسے لگتا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ ایک بھیانک خواب کے علاوہ کچھ نہیں۔ شاید ابھی آنکھ کھل جائے گی اور سب کچھ ویسا ہی ہوگا لیکن یہ بھیانک خواب پھیلتا ہی چلا جارہا تھا۔ حقیقت کے طلسم کدے سے ٹکرا کر پاش پاش ہوا جارہا تھا۔ اکثر حقیقتیں تلخ ہوا کرتی ہیں۔ وہ بھی تلخ حقیقت سے کترا کر گزر جانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ تلخ یادوں کی زنجیر بن کر قدموں سے لپٹ جاتی تھی۔

☆☆☆

وہ رات فراست کی زندگی میں ایک نیا اور عجیب موڑ لے کر آئی تھی جس نے فراست کی پُرسکون زندگی میں تلاطم بپا کردیا تھا۔ صبح وہ دیر تک سوتا رہا۔ بیدار ہونے پر سر میں ہلکا سا درد تھا لیکن گھٹنے بھی درد کرنے لگے تھے۔ شاید یہ عمر کا تقاضا تھا۔ سیڑھیاں اترنے چڑھنے میں کبھی کبھی اس کے گھٹنے درد کرنے لگتے تھے۔ آج بھی اسے وہی درد محسوس ہورہا تھا۔

کچھ دیر بعد جب وہ اپنے کمرے سے برآمد ہوا تو خاصا بہتر محسوس کررہا تھا۔ سامنے ہی اسے ملازمہ نظر آگئی جو کچھ سامان لیے کسی جانب جارہی تھی۔ ملازمہ نے بھی اسے دیکھ لیا اور فوراً اس کی جانب آئی۔

''سر کیسی طبیعت ہے؟''

''ہاں ٹھیک ہوں... شاید بالکل ٹھیک۔''

''ناشتے میں کیا لینا پسند کریں گے؟'' نذیراں نے ادب سے پوچھا۔ وہ ناشتے کے حوالے سے ہدایات دینے لگا۔

''ٹھیک ہے سر... میں ابھی انتظام کرتی ہوں اور میڈم کو بھی خبر کرتی ہوں۔ وہ کئی مرتبہ آپ کو پوچھ چکی ہیں۔''

سردار جی

سردار جی روزانہ اپنے کچن میں جاتے اور چینی کا مرتبان کھول کر اچھی طرح اندر جھانکتے اور پھر اسے بند کرکے واپس رکھ دیتے۔

سردارنی کئی دنوں تک خاموشی سے وہ عجیب تماشا دیکھتی رہی۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ ایک دن بول ہی پڑی۔

''یہ تم روز روز مرتبان میں کیا دیکھتے ہو؟''

''اوئے پگلیا! میں اپنا علاج کررہا ہوں۔'' سردار جی نے شانِ بے نیازی سے جواب دیا۔

''یہ کیسا اور کس بات کا علاج ہے؟'' سردارنی نے تیوریوں میں بل ڈال کر پوچھا۔

''ڈاکٹر نے کہا ہے کہ روزانہ اپنی شگر چیک کرتے رہا کرو۔'' سردار جی نے ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''گھٹتی رہے یا اتنی ہی رہے تو ٹھیک ہے، بڑھ جائے تو فوراً میرے پاس چلے آنا۔''

(مرسلہ: طیب اسد، ڈی آئی خان)

حساب کتاب

ناسا ایک خلائی مشن کے لیے تین منتخب امیدواروں کے انٹرویو لے رہا تھا۔ ان میں سے کسی ایک کو ہمیشہ کے لیے مریخ پر رہ کر تحقیقی کام کرنا تھا۔ اس یک طرفہ سفر کے بہت سے امیدواروں میں سے چھانٹ کر یہی تین ماہرین بلائے گئے تھے۔

پہلا امیدوار ایک انجینئر تھا۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے سب کو متاثر کرچکا تھا۔ جب معاوضے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ ''ایک ملین ڈالر... اور میں یہ ساری رقم اپنی انجینئرنگ یونیورسٹی کو عطیہ کردوں گا۔''

دوسرا ڈاکٹر تھا۔ وہ بھی ہر اعتبار سے موزوں تھا۔ اس نے دو ملین ڈالر کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک ملین میں اپنے اہلِ خانہ کو دے دوں گا... بقیہ ایک ملین ڈالر طبی تحقیق کے لیے وقف کردوں گا۔''

تیسرا امیدوار وکیل تھا۔ اس نے انٹرویو کرنے والے سے کہا۔ ''میں تین ملین ڈالر لوں گا... ایک ملین تمہارے، ایک ملین میرے اور بقیہ ایک ملین ڈالر دے کر ہم انجینئر کو اس مشن پر بھیج دیں گے جہاں سے اسے واپس ہی نہیں آنا۔''

(مرسلہ: سید حبیب الرحمٰن، گرگری)

فراست ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔
تھوڑی ہی دیر میں شہلا وہاں موجود تھی۔ وہ بڑے تپاک سے ملی اور دیر تک اس کی طبیعت پوچھتی رہی۔ فراست کے لیے یہ سب کچھ بہت ہی نیا اور بہت ہی مختلف تھا۔ اس طرح کی اپنایت اور یہ محبت اسے دیوانہ کیے دے رہی تھی۔

''آپ کی گاڑی میں نے منگوا لی ہے۔ وہ یوں تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ظاہر ہے ٹکر کی وجہ سے تھوڑی بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے۔ اگر آپ دوپہر کا کھانا بھی ہمارے ساتھ کھانا پسند کریں تو میں ڈرائیور کو بھیج کر گاڑی بنوا دوں گی... یا... آپ چاہیں تو میرے پاس ایک چھوٹی گاڑی بھی ہے، وہ لے جائیں۔''

''دیکھتے ہیں۔'' فراست نے کہا۔

اسی دوران نذیراں آ گئی اور اس نے ناشتا..... لگنے کا اعلان کر دیا۔

ناشتے کے دوران کئی فون آئے لیکن شہلا نے مصروفیت کا عذر کر دیا۔ شہلا متواتر بولے چلے جا رہی تھی اور فراست نہ جانے کن ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔

ناشتا طویل ہوتا گیا۔ اس دوران میں شہلا نے ڈرائیور کو بلا کر گاڑیوں کی مرمت کے احکامات بھی جاری کر دیے۔ فراست کچھ کہنے کے لیے موقع کا منتظر رہا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ زندگی میں ایسے موقع کبھی کبھی ہی آتے ہیں۔ وہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ ایک غیر ملکی ریسرچ اسکالر اس پر فدا ہو رہی تھی اور پھر اسے نہ تو وقت کا احساس رہا اور نہ ہی یہ اندازہ ہو سکا کہ ناشتے کی میز سے ڈرائنگ روم اور ڈرائنگ روم سے بیڈ روم کا سفر کیسے طے ہوا۔ مرزا غالب نے کہا تھا۔ ''صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔'' ممکن ہے مرزا غالب کے لیے شام کرنا دودھ کی نہر کھودنے کے مترادف ہو لیکن فراست کو تو پتا ہی نہیں چلا کب شام ہوئی۔

شام کے احساس کے ساتھ اسے کچھ خجالت سی محسوس ہوئی لیکن شہلا... وہ تو اپنے علاوہ کسی احساس کی مہلت ہی نہیں دیتی تھی۔ رات ڈھلنے سے پہلے گاڑیاں مرمت ہو کر آ گئیں۔ ڈرائیور نے بڑی خوبی سے کام کروایا تھا اور بہت جلدی۔ فراست نے گھوم پھر کر اچھی طرح دیکھ لیا۔

گاڑی چیک کر کے وہ ڈرائنگ روم میں پہنچا تو چائے تیار تھی۔

''جلدی چائے پی لیجیے۔ سر کے زخم کی ڈریسنگ کے لیے میں نے ڈاکٹر کو گھر ہی بلوا لیا ہے۔'' شہلا نے کہا۔

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ فراست نے ابھی شام کی چائے ختم بھی نہیں کی تھی کہ ڈاکٹر آ گیا۔

ڈاکٹر نے زخم دیکھا اور پٹیاں ہٹا دیں۔ صرف ایک انگلی کے برابر پٹی سر پر چپکا دی گئی۔

''آپ خود کیسا محسوس کرتے ہیں؟'' ڈاکٹر نے نبض اور بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل فٹ۔''

''جی ہاں، آپ بالکل فٹ ہیں۔ کل یا پرسوں یہ پٹی سر سے خود ہی اتر جائے گی۔ میرے خیال میں آپ کو نہ کسی دوا کی ضرورت ہے اور نہ پٹی کی۔''

''خدا کا شکر ہے... تھینک یو ڈاکٹر۔''

''اپنا خیال رکھیں... اللہ حافظ۔''

ڈاکٹر نے کاروباری خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ دانتوں کی نمائش کی اور..... مصافحہ کرتا ہوا رخصت ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں شہلا وہیں موجود تھی۔ وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھی۔

''فراست صاحب... مجھے کچھ ضروری کام ہیں... میں دو تین گھنٹے میں واپس آؤں گی، آپ جب تک آرام کر لیں۔''

فراست اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بہت ہوا اب اسے رخصت ہو جانا چاہیے۔ ''آپ کا بہت شکریہ... میں سمجھتا ہوں... اب مجھے جانا چاہیے۔''

''بالکل غلط سمجھ رہے ہیں آپ... آپ ہی نے تو کہا تھا کہ آگے پیچھے کوئی نہیں... چلے جائیے گا اور ہاں، آج کی رات تو آپ بالکل نہیں جا سکتے۔'' شہلا نے ہاتھ اٹھا کر ایک خاص ادا سے کہا اور اسے صوفے میں دھکیلتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کھٹ کھٹ... اس کے سینڈلوں کی آواز دور ہوئی پھر تیزی سے قریب آئی۔

''فراست صاحب! میں لیب تک جا رہی ہوں، کچھ ضروری کام ہیں۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ کل بھی چھٹی کر لوں... اگر ایسا ممکن ہوا تو میں صبح سویرے آپ کے ساتھ آپ کے گاؤں چلوں گی۔ مجھے گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔''

''وہ گاؤں نہیں... شہر ہے۔'' فراست نے فوراً تصحیح کی۔ عادل آباد والوں کا عجیب مزاج تھا۔ ان کے چھوٹے سے شہر یا قصبے کو اگر کوئی گاؤں کہہ دیتا تو انہیں فوراً غصہ آ جاتا تھا۔

''جی ہاں... جی ہاں... گاؤں تو نو رفتو ہے جہاں سے ڈاکٹر شہلا آئی ہیں... میری کوشش ہے کنٹری سائڈ دیکھوں... پلیز ویٹ۔''

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے مگر میں کچھ خریداری بھی کرنا چاہتا ہوں، موبائل وغیرہ۔''

شہلا پلٹی۔ ''جسے اور جہاں فون کرنا ہو، گھر کا فون استعمال کر لیں۔ میں آؤں گی تو شاپنگ کے لیے بھی چلیں گے۔''

شہلا رات کو تقریباً دس بجے واپس آئی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہری۔ اس نے فراست کو ساتھ لیا اور دونوں شاپنگ پر چلے گئے۔

''بور تو نہیں ہوئے؟'' شہلا نے کہا۔ وہ خود ہی ڈرائیونگ کر رہی تھی۔

''نہیں، میں ٹی وی دیکھتا رہا پھر سو گیا۔''

''عادل آباد فون کر لیا...؟''

''ہاں اور تو کوئی خاص نہیں بس بھابی اور بھتیجے سارم کو... میں نے بتایا تھا نا کہ ہم تینوں ساتھ رہتے ہیں۔ ایک آدھ رات کی تو خیر ہے لیکن اگر میرا موبائل مسلسل بند ہو اور دو دن دو راتیں میں عادل آباد میں بغیر کسی اطلاع کے موجود نہیں ہوں تو میرا بھتیجا پریشان ہو جاتا ہے۔''

''میں نہیں چاہتی کہ آپ لوگ پریشان ہوں۔ سب سے پہلے موبائل ہی لیتے ہیں۔''

''لیکن میں...'' فراست نے کہنا چاہا لیکن شہلا نے اسے بولنے نہیں دیا۔

''اب اتنی غیریت بھی ٹھیک نہیں... کیا میں آپ کو ایک موبائل بھی گفٹ نہیں کر سکتی اور اگر آپ کو یہ پسند نہیں تو آج کی تمام شاپنگ قرض رہی... کل آپ کے گاؤں... اوہ... میرا مطلب ہے گھر جائیں گے تو پیسے واپس کر دیجیے گا۔''

فراست کی تو کل سے ہی بولتی بند تھی۔ ایک حسین و جمیل طرح دار کینیڈین حسینہ کے ساتھ شہر کے پوش ایریا اور بڑے بڑے مالز میں شاپنگ اور مہنگے ترین ہوٹلز میں مہنگا ڈنر... فراست تو خواب و خیال میں اڑ رہا تھا۔ وہ اس کی زندگی کی حسین ترین رات تھی۔ وہ صبح اس طرح بیدار ہوا تھا کہ گھنی سیاہ زلفیں اس کے شانے پر پریشان تھیں۔ ایسی صبح اس کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔ وہ تو دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر انہوں نے عادل آباد کا رخ کیا۔ دونوں اگرچہ فراست کی گاڑی میں ہی سفر کر رہے تھے لیکن شہلا نے واپسی کے لیے اپنی گاڑی اور ڈرائیور ساتھ

لے لیا تھا۔ تمام راستے وہ دیہی زندگی کی تعریف میں رطب اللسان رہی اور فراست گاڑی سے زیادہ خود اڑا جا رہا تھا۔ شہلا کئی مرتبہ بہانے بہانے سے اس پر لد گئی تھی۔

عادل آباد سے کچھ پہلے ایک راستہ دائیں جانب مڑ رہا تھا۔

''یہ... کیسا راستہ ہے؟'' شہلا نے سوال کیا۔

''کسی زمانے میں یہاں ہمارا فارم ہاؤس ہوا کرتا تھا۔ کچھ عمارتیں اور گودام بھی ہیں لیکن کئی سال سے اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اوہ... فارم ہاؤس... روکو گاڑی روکو... پہلے وہاں چلو...''

''وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔''

''مجھے کچھ بھی نہیں دیکھنا ہے... چلو فارم ہاؤس چلو۔''

فراست نے بادل ناخواستہ گاڑی گھمائی اور کچے پکے راستے پر ہو لیا۔

''بہت خوب صورت علاقہ ہے... کتنا پیس فل انوائرمنٹ ہے۔'' شہلا بولی۔

فراست کو یہ تمام باتیں اب زہر لگنے لگی تھیں۔ قریباً بیس منٹ کے ہچکولوں اور دھچکوں کے بعد وہ ایک اجاڑ سے فارم ہاؤس تک پہنچ گئے۔ فارم ہاؤس کی اب نشانیاں ہی باقی تھیں۔ ساتھ ہی کیٹل فارم کے آثار بھی تھے۔

امتدادِ زمانہ کی ماری، کچھ عمارتیں ابھی کھڑی تھیں۔ شہلا تمام چیزوں میں غیر معمولی دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے تفصیل سے عمارتیں دیکھیں، گودام دیکھے۔ ایک عمارت دیکھ کر تو وہ حیران رہ گئی۔ یہ بالکل جدید خطوط پر تیار کی گئی تھی اور اس میں بڑے بڑے تہ خانے بھی تھے۔

''یہ میرے مرحوم والد اور بڑے بھائی صاحب کا خیال تھا۔'' فراست نے وضاحت کی۔ ''عادل آباد کے قرب و جوار میں بے شمار خودرو جڑی بوٹیاں ایسی پائی جاتی ہیں جن کی طبی نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت ہے۔ خیال تھا کہ یہاں ان جڑی بوٹیوں اور قدرتی نباتات سے ادویات تیار کی جائیں۔ اس سلسلے میں خاصا کام ہوا تھا۔ حکیمی ادویات اور انگریزی ادویات دونوں ایک ہی جگہ بنانے کا منصوبہ تھا۔''

''اوہ... بہت ہی خوب... میں تو آپ کے والد کی فراست کی قائل ہو گئی۔'' شہلا نے کہا۔ ''میں یہاں کچھ دیر ٹھہرنا چاہتی ہوں... اف یو ڈونٹ مائنڈ۔''

فراست بھلا کیا اعتراض کرتا۔ شہلا نے دور کھڑے اپنے ڈرائیور کو بلایا۔

''جی، بی بی جی۔''

''ڈکی میں دیکھو... شاید میرا کٹ بیگ رکھا ہو۔''

''جی بی بی جی... رکھا ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا؟ میں نے تو تمہیں ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی۔''

''وہ آپ نے تو آج ہدایت نہیں کی تھی لیکن روز کی طرح میں آج صبح ہی آپ کا بیگ ڈکی میں رکھ چکا تھا... یہ تو آپ نے بعد میں بتایا کہ آپ چھٹی پر ہیں اور عادل آباد جا رہی ہے... میں نے سوچا کوئی بات نہیں، بیگ رکھا ہے تو رکھا رہنے دو۔'' ڈرائیور بولا۔

''شاباش... بہت اچھا ہوا... جاؤ اب بھاگ کر بیگ اٹھا لاؤ۔'' ڈرائیور دوڑتا ہوا گیا اور بیگ اٹھا لایا۔ عجیب ساخت کا بیگ تھا۔ شہلا نے اس میں سے عجیب طرز کے آلات اور ایک جدید طرز کا کیم کارڈر برآمد کیا اور عمارت میں گھس گئی۔ وہ مووی بنانے سے لے کر پیمائش کرنے تک...... نہ جانے کیا کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی، ڈرائیور کو آواز دی اور بیگ واپس رکھوا دیا۔ فراست کے پاس آئی اور بولی۔ ''پارٹنر... دل خوش ہو گیا۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ یہ جگہ کس کی ہے؟''

فراست کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔

''کیا مطلب کس کی ہے... میں اس جگہ کا مالک ہوں... اگر تمہیں شک ہے تو یہاں کے تپیدار سے لے کر بھنگی تک جس سے چاہے پوچھ لو۔''

''اوہ سوری... تم مائنڈ کر گئے... میں کسی اور وجہ سے پوچھ رہی تھی۔ اچھا، اب یہ بتاؤ برسوں سے یہ سب کچھ یوں ہی بیکار، بے آباد اور اجاڑ پڑا ہے؟''

''ہاں۔''

''کیا اس کا تمہیں کچھ فائدہ؟''

''دیکھو شہلا... تم یہاں کی نہیں ہو، تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ ایسی بے آباد زمینیں اور عمارتیں زمینداروں کے پاس کتنی ہوتی ہیں۔''

''گڈ... یو آر رائٹ... یو آر رائٹ... اگر تمہیں اس بیکار، اجاڑ اور بے آباد زمین اور ان عمارتوں کا دو ڈھائی لاکھ روپے ماہانہ کرایہ ملنے لگے تو...؟''

''اور وہ دو لاکھ ماہانہ کون دے گا؟'' فراست نے کہا۔

''آؤ گاڑی میں بیٹھو... سورج کی تمازت ہے، باہر گرمی بڑھتی جا رہی ہے اور تمہارے مزاج پر بھی اثر انداز ہو رہی ہے۔''

دونوں گاڑی میں بیٹھے اور عادل آباد کا رخ کیا۔

''فراست صاحب! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں ایک خاص پروجیکٹ پر کام کر رہی ہوں۔ یونیورسٹی اور حکومت کے تعاون سے ایک بڑی اہم ریسرچ ہو رہی ہے۔ روزانہ میں یونیورسٹی جاتی ہوں لیکن شہر کے حالات اور یونیورسٹی کی محدود لیب کی وجہ سے کام صحیح طور پر نہیں ہو رہا۔ میری سفارش پر حکومت کسی متبادل جگہ کی تلاش میں ہے۔ میری خواہش کے مطابق جگہ کی تعمیر میں بہت وقت لگ جائے گا... اور اب تک ایسی کوئی جگہ نہیں مل سکی ہے... آج جب میں نے آپ کی یہ جگہ دیکھی تو گویا مجھے میری مراد مل گئی۔ ایک تو یہ کہ یہ شہر سے بہت زیادہ دور نہیں ہے پھر یہاں ایک مکمل لیب بھی ہے اور رہائشی عمارتیں بھی۔ ہمیں اور کیا چاہیے... مجھے امید ہے میری سفارش پر آپ کو دو سے ڈھائی لاکھ کرایہ آرام سے مل جائے گا۔''

فراست کو یوں لگ رہا تھا کہ یہ گویا طلسمِ افراسیاب ہے۔ ایک کے بعد ایک نیا در وا ہو رہا تھا اور ایک نئی کہانی کھل رہی تھی۔

''کیا تم سنجیدہ ہو؟''

''مر جانے کی حد تک۔''

''دیکھو اگر ذاتی طور پر تمہیں یہ جگہ چاہیے تو جب تک چاہو استعمال کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

''سمجھو مجھے ہی چاہیے لیکن باقاعدہ لکھت پڑھت ہو گی اور تمہیں جو کرایہ میں نے بتایا ہے، وہ قبول بھی کرنا ہو گا۔''

فراست نے نہ تو کبھی کوئی کام کیا تھا، نہ ہی اس کی کوئی آمدنی تھی۔ اسے جو جیب خرچ ملنا شروع ہوا تو وہ سلسلہ اب تک جاری و ساری تھا۔ باپ نے اس کے نام جو جائداد کی تھی، اس کا بڑا حصہ وہ کب کا ٹھکانے لگا چکا تھا۔ اب تو بچی کھچی چیزیں ہی اس کے پاس رہ گئی تھیں۔ وہ بھی بے آباد اور بیکار تھیں۔ سارم اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ کبھی اس نے کسی چیز میں کوئی کمی محسوس ہونے نہیں دی تھی۔ یہ بہرحال دو ڈھائی لاکھ روپے مہینے کی آمدنی کے بری لگتی ہے۔ وہ سینہ پھلائے شہر اور پھر گھر میں داخل ہوا۔ فون کر کے سارم کو بھی دوپہر کے کھانے پر گھر ہی بلوا لیا تھا۔

سارم اگرچہ خود بھی لندن پلٹ تھا لیکن ڈاکٹر شہلا کی قابلیت نے اسے بھی متاثر کیا۔ نیز وہ بھی بہت خوش تھا کہ ان کا فارم ہاؤس اور ملحقہ عمارتیں... ملک کے لیے ہونے والی کسی تحقیق یا خدمت میں کام آ سکیں۔ چھوٹے سے علاقے کی متروک عمارتوں کا اتنا کرایہ ملنا بہت ہی خوش کن تھا۔ ڈاکٹر شہلا نے اپنے موبائل سے کئی فون کیے اور ڈیل زبانی کلامی پکی ہو گئی۔ وہ اگرچہ سرِشام ہی رخصت ہو گئی تھی لیکن محض تیسرے ہی دن صبح سویرے پھر آن دھمکی۔ اس مرتبہ اس کے ساتھ کئی حکومتی گاڑیاں، اہلکار اور سفید کوٹ میں ملبوس آفیسرز بھی تھے۔

ایک وکیل بھی ساتھ تھا۔ شہلا نے سارم کو بھی بلوا بھیجا۔ کرایہ نامہ دستخط ہوا۔ دستخط ہونے سے قبل شہلا نے ایک بات دوٹوک لہجے میں کی۔

''فراست صاحب اور سارم! ابھی تک ایگریمنٹ نہیں ہوا ہے۔ میں ایک بات بہت ہی دوٹوک انداز میں بتا دینا چاہتی ہوں۔ جب تک یہاں ریسرچ کا کام ہو رہا ہے، کسی غیر متعلقہ فرد کو... یہاں تک کہ آپ لوگوں کو بھی داخلے کی اجازت نہیں ہو گی۔ حکومتی اہلکار حفاظت کے لیے چاروں جانب تعینات ہوں گے۔ یہ خفیہ منصوبہ ہے۔ آپ سے بھی درخواست ہو گی کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ اگر آپ کو یہ پسند نہ ہو تو ہم اب بھی واپس جا سکتے ہیں۔''

''ارے... نہیں بھئی... یہ تو قومی خدمت ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم کسی کام آ رہے ہیں۔'' ریشہ خطمی فراست فوراً بولا۔

شہلا نے سوالیہ نظروں سے سارم کی جانب دیکھا۔

''چچا جان کی اجازت کے بعد میری کیا مجال جو منع کر سکوں۔ یہ بات قطعی درست ہے کہ ایک جانب یہ قومی خدمت بھی ہے اور دوسری جانب اچھی بھلی آمدنی۔ بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟''

''اور یہ سب تو ہمارے لیے بیکار ہی پڑا تھا۔ آپ کے کام آ رہا ہے، ہمیں خوشی ہو گی۔'' فراست نے کہا۔ غرض یہ کہ معاہدہ طے پا گیا۔

آناً فاناً تمام کام خوش اسلوبی سے طے پاتے چلے گئے۔ مین روڈ سے سڑک پختہ تو نہیں کی گئی تھی تاہم کسی حد تک ہموار ہو گئی۔ فارم ہاؤس کے گرد راتوں رات نئی اور مضبوط باڑھ تعمیر کر دی گئی۔ ملحقہ کیٹل فارم میں اعلیٰ نسل کے مویشی آ گئے۔ عمارتوں پر رنگ و روغن تو نہیں کیا گیا لیکن اہتمام سے صفائی کر دی گئی۔ اقامت گاہوں کو البتہ اندر سے بالکل نیا اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا گیا تھا۔ غرض وہاں دن رات کام ہوتا رہا۔ نامعلوم مقام سے لوگ آتے اور چلے

جاتے۔ فراست کی تو راتوں کی نیند اور دن کا چین کوئی لے گیا تھا۔ اس نے شہلا کو متعدد مرتبہ فون کیا۔ اس نے فون تو ریسیو کیا لیکن مصروفیت کا عذر کر کے ملنے سے معذرت کر لی۔ پانچویں دن جب فراست کے صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو چکا تھا تو شہلا کی کال آ گئی۔

”ہیلو... کیا حال ہیں؟“

”بالکل ٹھیک، آپ کہاں غائب ہیں؟“

”بہت مصروف تھی... اب کہیں جا کر کچھ فارغ ہوئی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ آج رات کا کھانا میرے ساتھ ہی کھائیں۔“

”کہاں...؟“

”اجی فراست صاحب! آپ مالک ہیں... فارم ہاؤسز کے بھی اور ہمارے بھی... فارم ہاؤس ہی آ جائیں۔“

فراست وہاں سرِ شام ہی پہنچ گیا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہاں کا تو نقشہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ باڑھ سے لے کر واچ ٹاور اور گشت کرتے مسلح پہرے دار... بہر حال اس نے اپنا تعارف کروایا اور شہلا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

جلد ہی اسے شہلا کی اقامت گاہ پہنچا دیا گیا۔ فوراً ہی موبائل پر شہلا کا فون بھی آ گیا۔ ”ہیلو... پہنچ گئے آپ... اچھا کیا، تھوڑا سا انتظار کریں۔ میں کام ختم کر کے قریباً ایک گھنٹے میں آتی ہوں۔“

وقت گزرتا رہا... ایک دو نہیں پورے 12 ماہ گزر گئے۔ نہ شہلا کی ریسرچ ختم ہوئی، نہ ہی فراست کی۔ وہ ہمہ وقت شہلا کے لیے ہمکتا اور تڑپتا رہتا اور شہلا مصروفیات کا عذر کر کے اسے ٹہلاتی رہتی۔ اب تو اس نے ملنا بھی کم کر دیا تھا۔ عذر وہی عدیم الفرصتی۔ اور پھر وہ دو ماہ کے لیے کینیڈا چلی گئی۔ دو کے بجائے تین ماہ بعد واپس آئی۔ شہلا نے اپنے کینیڈا قیام کے دوران ایک مرتبہ بھی فراست سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

یہ تمام عرصہ فراست کے لیے ایک بھیانک خواب تھا۔ اس کی زندگی یوں گزر رہی تھی جیسے کسی نشئی سے نشہ چھین لیا گیا ہو۔ فراست کو شہلا کی عادت نہیں لت پڑ چکی تھی۔ شہلا نے بھی ائرپورٹ پر اترتے ہی سب سے پہلا فون فراست ہی کو کیا۔

فراست بھی باوجود بڑھاپے کے شہلا سے ملنے آندھی طوفان کی طرح ائرپورٹ جا پہنچا۔ لیکن وہ اس وقت تک اپنی شہری اقامت گاہ پہنچ چکی تھی۔ فراست بھی کھنچا چلا گیا۔ وہ حسبِ سابق بڑے چاؤ سے پیش آئی۔ فراست نے البتہ رویّے میں کچھ تبدیلی محسوس کی۔ وہ فوراً ہی یہ بات زبان پر بھی لے آیا۔

”یو آر رائٹ... آئی ایم ڈپریسڈ۔“

”کیا ڈپریشن ہے؟“

”چھوڑیں... شاید میں نے آپ کو بھی بدمزہ کر دیا۔“

”نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں، مجھے بتاؤ... کیا معاملہ ہے؟“ فراست نے اصرار کیا۔

”کچھ خاص نہیں... ریسرچ میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔“

”کیا ہوتا رہتا ہے؟ کیا ہو گیا؟“

”کہا نا... کچھ خاص نہیں... ایسا ہوتا ہی ہے۔ تین ماہ کے کام کو تیرہ ماہ ہو گئے۔ رزلٹ غلط آ رہے ہیں۔ کامیابی نہیں ہو سکی۔ ہم اسی میں لگے ہیں... میں کینیڈا بھی اسی لیے گئی تھی لیکن کچھ کامیابی نہیں ہوئی۔“ شہلا نے کہا۔

”کوئی بات نہیں، آج نہیں تو کل کامیاب ہو جاؤ گی۔“

”کوئی اور بات کرو... میں اس بات سے بیزار ہو چکی ہوں۔“

”کیا بات کریں، چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔“

”باہر نہیں ایڈونچر پر...“

”ایڈونچر... کیسا ایڈونچر... کیا تم پہاڑی علاقوں میں جانا چاہتی ہو؟“ فراست نے پوچھا۔

”ٹریول ایڈونچر نہیں... رئیل ایڈونچر... سچ مچ کا۔“

”اور وہ کیا ہو گا؟“

”سوچو... میں بھی سوچتی ہوں... ایک سنسنی خیز ایڈونچر۔“ شہلا آنکھیں بند کر کے بولی۔ ”یہی میرے ڈپریشن کا علاج بھی ہے... کیا تم میرا ساتھ دو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ فراست تو پہلے ہی تیار تھا۔ ایڈونچر اور وہ بھی شہلا کے ساتھ... بھلا زندگی میں اس سے اچھی بھی کوئی بات ہو سکتی ہے۔

”سوچنے کا کام تمہارا... عمل کرنا میرا کام۔“

”نہیں، دونوں ساتھ... جب ہی تو میرے ڈپریشن کا علاج ہو گا۔“ شہلا بولی۔

”ہاں... ہاں... سوچو۔“ فراست نے رسان سے کہا۔

”سوچنا کیا... بینک ڈکیتی۔“ شہلا نے گویا دھماکا کر دیا۔

”کیا...“ فراست دم بخود رہ گیا۔ ”کیا کہا...؟“

”بس اتنا ہی دم تھا؟“ شہلا کھلکھلا کر ہنسی۔

”نہیں... ایسی بات نہیں... میں تیار ہوں...“

”بس تو ٹھیک ہے... دوبارہ سوچ لو... دیکھو... میرا خیال ہے کہ جرم ہی سب سے بڑا ایڈونچر ہے۔“

”نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں لیکن ٹھیک ہے تم کہہ رہی ہو تو ٹھیک ہی ہے۔“

”نہیں... رہنے دو...“ شہلا ٹھٹکی۔ ”میرا خیال ہے تم دلی طور پر آمادہ نہیں ہو۔“

”ایسی بات نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں... ہم ایک بڑی بینک ڈکیتی کریں گے۔“ وہ سینہ پھلا کر بولا۔

سچ بات تو یہ ہے کہ فراست کا مزاج مجرمانہ نہیں تھا۔ وہ گناہ گار ضرور تھا لیکن جرائم پیشہ نہ تھا۔

”تم جانتے ہو، میں سائنس داں ہوں... ہر کام سائنٹیفک انداز میں کرتی ہوں۔ یہ ڈکیتی بھی سائنٹیفک ہو گی۔“ شہلا نے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے... ٹھیک ہے... اب یہ سوچو، کون سا بینک؟“ فراست نے قریباً ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”بینک...“ شہلا نے سوچنے کی اداکاری کی۔ ”تمہارے گاؤں میں بھی تو... میرا مطلب ہے شہر میں بھی تو بینک ہے... بس اسے ہی لوٹ لیں گے۔“

”یعنی عادل آباد بینک ڈکیتی...“ فراست کا دم اکھڑنے لگا۔

”ہاں... سب سے بڑی اور سب سے آسان ڈکیتی۔“ شہلا کی آواز عجیب ہو گئی۔

☆☆☆

راکٹ تو واقعی راکٹ بنا ہوا تھا۔ لمحوں میں اس نے نئی موٹر سائیکل کا تالا کھولا تھا۔ اچھل کر موٹر سائیکل پر سوار ہوا۔ بیٹھتے بیٹھتے زوردار کک ماری۔ موٹر سائیکل اسٹارٹ تھی۔ وہ بلا کی رفتار سے موٹر سائیکل دوڑاتا ہوا اپنی منزل کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ انسان بعض اوقات جس چیز کو منزل قرار دیتا ہے، وہ اس کی منزل نہیں ہوتی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ منزل پر پہنچ کر پتا چلا کہ یہ تو منزل ہی نہیں ہے۔ ہمارا ایمان ہے، ہر گناہ اور ہر جرم قانون اور سزا کی منزل پر پہنچ کر ختم ہوتا ہے۔ یہاں تو انسان بچ بھی سکتا ہے لیکن خدا کی گرفت سے کون بچے گا؟ راکٹ کو زمینی خداؤں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ وہ قانون اور سزا کے خوف سے بے پروا موٹر سائیکل بھگاتا ہوا سیدھا سیٹھ رمضان کے اڈے پر پہنچا۔ لیکن یہ کیا، آج گلی میں موبائل کھڑی تھی۔ پولیس اہلکار بندوقیں سونتے کھڑے تھے۔ کیا جرم، قانون کی منزل پر آن پہنچا تھا؟

”کہیں سیٹھ رمضان کو اٹھا تو نہیں لیا گیا؟“ اس کے دماغ کے بعید ترین گوشے میں خیال ابھرا۔

اسی لمحے اسے روک لیا گیا۔ موٹر سائیکل رکتے ہی پولیس والے کا ہاتھ چل پڑا۔

”کیا نام ہے تیرا؟“ ڈانٹ کر پوچھا گیا۔

”عبدالمجید... صاحب عبدالمجید۔“ راکٹ نے اپنا درست نام فوراً دہرایا۔

”پورا نام بتا اوئے۔“ دوسرا زوردار تھپڑ پڑا اور اسے عقل آ گئی۔

”راکٹ جی... راکٹ... عبدالمجید راکٹ...“

”یہ موٹر سائیکل تیرے باپ کی ہے...؟“

اس بار کسی نے گدی ناپی... راکٹ کو چکر سا آ گیا۔ اس نے موٹر سائیکل چھوڑ دینا ہی مناسب سمجھا۔ اسٹینڈ سے لگا کر موٹر سائیکل سے اتر گیا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر گھگیایا۔

”صاحب! میں بہت غریب آدمی ہوں... آپ کو کوئی غلط فہمی...“

چٹاخ کے ساتھ ایک اور تھپڑ کی آواز آئی۔ ”غلط فہمی کے بچے... یہ تیرے باپ کی موٹر سائیکل ہے... لا کاغذات لا۔“

”وہ... سنتری صاحب... بات یہ ہے...“

”بات کے بچے... موٹر سائیکل چور کی اولاد، سالا۔“ پھر تو وہیں گلی میں کھڑے کھڑے ہی اس کی طبیعت سے دھلائی کر دی گئی۔

”ڈالو اس کو گاڑی میں۔“ کسی نے آواز لگائی۔ فوراً ہی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ اسے ہاتھوں، پیروں سے پکڑ کر اٹھایا گیا اور گاڑی میں پھینک دیا گیا۔ راکٹ کی کمر پولیس موبائل کے سخت فرش سے ٹکرائی اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

اسے سب سے زیادہ خوف اس بات سے آ رہا تھا کہ کہیں پولیس اس کا اِن کاؤنٹر نہ کر دے۔ گاڑی سائرن بجاتی ہوئی چلتی رہی اور وہ موت کے خوف سے لرزتا رہا۔

سیٹھ رمضان کا کیا ہوا... وہ تو سب کو باقاعدگی سے بھتے دیتا تھا... کیا اسے بھی اٹھا لیا گیا ہے؟ راکٹ سوچتا رہا، الجھتا رہا اور پریشان ہوتا رہا۔ پریشانی زیادہ دیر تک نہیں رہی۔ جلد ہی متعلقہ تھانہ آ گیا اور اسے مزید چند ہاتھ جھاڑ کر

لاک اپ کر دیا گیا۔ چوری شدہ نئی موٹر سائیکل کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ وہ شاید مزید چوری ہو گئی تھی، قانون کو پیاری ہو گئی تھی یا شامل تفتیش کر لی گئی تھی۔ کچھ بھی ہوا ہو، موٹر سائیکل اب اس کے اصل مالک کو ملنے کا امکان بہت ہی کم تھا۔

عبدالمجید عرف راکٹ میں بچپن ہی سے دو خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ چوری اور تیزی۔ نامعلوم کیسے وہ چیزیں چرانے کی جانب مائل ہوا اور پھر درست تربیت نہ ہونے کی بنا پر یہ عادت ختم ہونے کے بجائے پختہ ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کا ہنر اور ذریعۂ معاش بن گئی۔ دوسری عادت تیز رفتاری کی تھی۔ ہر کام وہ نہایت سرعت سے کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ بات بھی بہت جلدی کرتا تھا۔ اکثر سامنے والا سمجھ ہی نہیں پاتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ جرم کی دنیا میں بڑا ہوا تھا۔ اب صرف ایک فرد کے لیے ہفتے دو ہفتے میں ایک یا دو موٹر سائیکلیں اٹھا لیتا تھا۔ گزر بسر مناسب ہو رہی تھی کہ اچانک یہ افتاد آن پڑی۔ راکٹ کم ہی پکڑا گیا تھا۔ جب بھی پکڑا گیا، جلد ہی چھوٹ گیا تھا۔ تھانے سے آگے کورٹ کچہری کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اب بھی اس کا خیال تھا کہ ایک دو دن میں چھوٹ جائے گا۔

لاک اپ میں گرمی، حبس، بدبو اور ملزم بھرے ہوئے تھے۔ شام تک اگرچہ کچھ کھانے پینے کو نہیں ملا تھا لیکن کسی قدر صبر آ گیا تھا۔ خود بہ خود رہائی کی امید قائم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نامعلوم کیوں۔ رات کو کہیں سے بچے کھچے کھانے کی دیگ آ گئی تھی جس سے لاک اپ کے سب ہی مکینوں نے پیٹ بھر کر عمدہ بریانی کھائی اور بھیجنے والے کو خوب ہی دعائیں دیں۔

آدھی رات کے قریب ایس ایچ او نے اسے بلوایا۔ ایس ایچ او کے حکم پر اسے مزید زدوکوب کیا گیا۔

''بتا کس کے لیے کام کرتا ہے؟''

''سیٹھ رمضان کے لیے...'' راکٹ نے فوراً اگل دیا۔ وہ جانتا تھا کہ سیٹھ رمضان کا اوپر تک واسطہ ہے۔

ایک اور زوردار تھپڑ پڑا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔

''جھوٹے... سیٹھ رمضان کی تو تُو نے آڑ لے رکھی ہے... اصل میں کس کے لیے کام کرتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بتاؤ... اس کو بتاؤ... اس کی انگلیوں کے نشان بم دھماکے والی موٹر سائیکل سے ملے ہیں۔'' ایس ایچ او دہاڑا۔ ''سچ بولتا ہے یا اتاروں تیری بھی کھال...''

شہر میں جگہ جگہ بم دھماکے ہو رہے تھے۔ لوگ مر رہے تھے۔ دہشت گرد بم موٹر سائیکلوں میں نصب کر کے چھوڑ جاتے تھے اور بیسیوں لوگ جان سے جاتے تھے۔ ایس ایچ او کا یہ کہنا کہ ایسی کسی موٹر سائیکل پر راکٹ کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں، خود راکٹ کے لیے کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھا۔ راکٹ جانتا تھا کہ اس نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا لیکن ... لیکن پولیس کو کون سمجھائے؟ وہ تو یہ بھی کہہ رہے تھے کہ سیٹھ رمضان کی آڑ لے رکھی ہے۔ راکٹ اندر سے شدید گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا۔ شدید ترین خوف کی لہر نے اسے لپیٹ میں لے لیا۔ اتنا خوف زدہ تو وہ زندگی میں شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ الزام ہی ایسا تھا۔ راکٹ کی خاموشی پر پولیس نے اس کی مزید دھلائی کی۔ آخر ایس ایچ او بولا۔

''بس کرو... پرچہ کاٹو اور صبح اسے عدالت میں اور میڈیا کے سامنے پیش کر دو۔ بم دھماکوں کا اصل مجرم غیر ملکی ایجنٹ گرفتار۔ اس کے قبضے سے غیر ملکی پاسپورٹ اور دستاویزات بھی برآمد۔ دو دستی بم اور ایک خودکش جیکٹ بھی ساتھ لگا دو۔''

ایس ایچ او احکامات دے کر چلا گیا۔ اس مرتبہ اسے علیحدہ کمرے میں بند کیا گیا۔ یہاں روشنی اور ہوا کا گزر کم ہی تھا لیکن ایک پنکھا چل رہا تھا اور ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ وہ کرتا پڑتا اور کراہتا ہوا سر پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور اب تک پیش آنے والے بھیانک واقعات والزامات پر غور کرنے لگا۔

غور کیا خاک کرتا، زندگی میں کبھی غور کیا ہوتا تو شاید آج اس انجام کو نہیں پہنچتا۔ تمام رات بیٹھا وہ روتا اور لرزتا رہا۔ خداوند کریم سے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔ اسے وہ بچہ یاد آ رہا تھا جس معصوم کے سر پر پستول رکھ کر اس نے اس کے باپ سے موٹر سائیکل چھینی تھی۔ اسے وہ نئی نویلی دلہن کی معصوم التجائیں یاد آ رہی تھیں جس کے مجازی خدا سے اس نے موٹر سائیکل چھینی تھی۔ وہ توبہ کرتا رہا اور روتا رہا۔

رات کے آخری پہر دروازہ کھلا۔ دوبارہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی گئی۔ ہاتھ پشت پر باندھے گئے اور اسے آگے دھکیلا جانے لگا۔ راکٹ کا دل ڈوب گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ شاید اب کبھی وہ سورج کی روشنی نہ دیکھ سکے گا۔ دو افراد نے پکڑ کر اسے ایک آرام دہ گاڑی کی پچھلی نشست پر بٹھایا۔ یہ ایک بے آواز، سبک اور عمدہ کار تھی۔ اے سی کی ٹھنڈک فرحت کا احساس دلاتی تھی۔ دونوں جانب دو افراد بیٹھ گئے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا اور راکٹ کی تو خوف کے مارے گھگی بندھی تھی، وہ کیا بولتا، گاڑی چل پڑی۔

گاڑی بہت دیر چلی۔ یہاں تک کہ اسے کسی عمارت کے کمرے تک لے جایا گیا۔ یہاں شاید میز اور کرسیاں تھیں۔ اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ شاید نزدیک ہی ایک بہت تیز بلب روشن تھا جس کی روشنی آنکھوں پر بندھی پٹی کے باوجود محسوس ہو رہی تھی۔

کسی نے ایک جھٹکے سے اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی۔ چکاچوند روشنی پڑی۔ اس کی بینائی بحال ہونے میں کچھ وقت لگا۔ اس نے دیکھا سامنے اسے صرف ایک چہرے کے ادھورے خدوخال نظر آ رہے تھے۔ ایک توانا آدمی، گول گول شیشوں والا نظر کا چشمہ لگائے کھڑا تھا۔

''آئی ایم سوری... عبدالمجید! تمہارے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں ہوا لیکن تم ایک چھوٹا سا کام کر کے سب کچھ دوبارہ ٹھیک کر سکتے ہو... کیا تم فیصلہ کر سکو گے؟''

راکٹ کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''صاحب... میں بے قصور ہوں... میں بے قصور ہوں... میں صرف چھوٹی موٹی چیزیں یا موٹر سائیکل چراتا ہوں بس...''

وہ چہرہ پھر کسی قدر تاریکی میں ہو گیا۔ تیز بلب سامنے ہونے کی بنا پر ویسے ہی راکٹ کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں... تم معصوم ہو... تم پر غلط الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ اس سب کو بھول جاؤ... مجھے یہ بتاؤ کیا تم ایک فیصلہ کر سکو گے... ایک چھوٹا سا فیصلہ... ہمارے لیے ایک چھوٹا سا کام... ایک ڈیل کرو... یقین جانو تم آسانی سے کر سکو گے... بولو کرو گے؟''

''صاحب آپ اگر حکم دیں گے... آپ لوگ اگر ساتھ دیں گے تو... راکٹ بڑے سے بڑا کام کر سکتا ہے۔'' راکٹ سینہ پھلا کر بولا۔

''گڈ...''

''حکم کریں صاحب کیا کرنا ہے... کیا کسی کو لڑھکانا ہے؟''

''ارے نہیں... بہت چھوٹا کام ہے... بغیر کسی شور شرابے اور بغیر فائرنگ دھماکے، بغیر کسی قتل و غارت گری کے... ایک چھوٹا سا کام۔ ہر چیز تمہیں تیار ملے گی... عادل آباد جیسے چھوٹے علاقے کے بینک میں ڈاکا ڈالنا ہے۔''

☆☆☆

ارم کے لیے نہ سہی لیکن سارم کے لیے ارم سے ملنا بہت ضروری تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے التفات میں اضافہ ہوا تھا۔

عادل آباد کے قدرتی اور فطری ماحول میں پلا بڑھا وہ ایک باصلاحیت نوجوان تھا۔ نصف درجن سے زائد تو کھیلوں میں اس نے حصہ لیا۔ جس میں مارشل آرٹس، شطرنج و دیگر کھیل شامل تھے۔ قریباً ڈھائی برس اس نے لندن میں گزارے، علم و ادب اور کمپیوٹر سے لے کر پتا نہیں کیا کیا سیکھتا رہا۔ باپ بھی شوقین مزاج تھے۔ اپنی اولاد کو علوم و فنون میں بڑھتا دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ اور بڑھاوا دیتے تھے۔ سارم کی والدہ کو البتہ لندن میں تعلیم سے لے کر دیگر تمام مشاغل سخت ناپسند تھے۔ ان کا واضح موقف تھا کہ جب سارم کو نوکری ہی نہیں کرنی تو وہ گھر سے اتنی دور اجنبی دیس، اجنبی ماحول میں کیوں رہے۔ سارم کی حرکتیں عجیب تھیں اور اس کی یہ عجیب حرکتیں اس کی والدہ کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ مثلاً وہ سال میں کئی ہفتے اور کبھی تو کئی مہینے دشوار پہاڑوں یا برف زاروں میں گزارا کرتا تھا۔ باپ نے البتہ ہمیشہ اسے بڑھاوا ہی دیا تھا۔ لندن سے واپس آنے کے بعد وہ مہینوں والد کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا رہا۔ نزدیکی شہر جو کہ ان کے صوبے کا صوبائی دارالخلافہ بھی تھا، اس کا مسلسل آنا جانا رہتا تھا۔ وہاں اس کے کئی دوست بھی تھے۔ ایسے ہی ایک دوست کا اسے فون آیا۔ وہ لندن میں سارم کا کلاس فیلو رہا تھا۔ آج کل وہ ایک نجی بینک میں اہم عہدے پر تھا۔

''کیا تم کل صبح میرے دفتر آ سکتے ہو' دس بجے؟''

''ہاں... آ تو سکتا ہوں، خیریت ہے؟''

''ہاں... ہاں، سب خیریت ہے۔ یوں سمجھ لو کہ بینک کے بارے میں تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔''

''بینک... او کے... ضروری ہے؟''

''ہاں ضروری ہے۔''

''میں پہنچ جاؤں گا لیکن خدارا اپنے آفس کی بدمزہ چائے کے بجائے سامنے پٹھان کے ہوٹل کی عمدہ چائے پلوانا۔''

''او کے۔''

دوسری صبح بینک کے دفتر میں اس کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔ بینک کے چند اور اہلکار بھی موجود تھے۔ سب کا تعارف کروانے کے بعد سارم کا تعارف کروایا گیا۔

''سارم میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ ہم نے لندن سے ساتھ ہی ماسٹرز کیا تھا۔ آپ عادل آباد کے بڑے اور شاید سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ ہم عادل آباد میں اپنے بینک کی شاخ قائم کرنا چاہتے ہیں اسی سلسلے میں آج عملے کا انٹرویو ہے۔ چونکہ عادل آباد برانچ میں ایک بڑا

اکاؤنٹ سارم کا بھی ہوگا، نیز یہ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور میرے دوست ہیں تو میں نے اس انٹرویو کے موقع پر آپ کی موجودگی کو ضروری خیال کیا۔"

انٹرویو شروع ہوگیا... امیدوار آتے گئے۔ سوالات اور باتیں ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ ارم انٹرویو کے لیے آئی... ارم سادگی میں پرکاری کا شاہکار تھی، ایک حسنِ بے مثال۔ اس نے یقیناً سب کو متاثر کیا ہوگا لیکن سارم کی تو دنیا ہی تہ و بالا ہوگئی۔ ارم کی شخصیت نے اسے پہلی نظر میں ہی گرویدہ کردیا تھا۔ اس کے لاشعور نے شعور کو معطل کردیا اور پھر...

رات سارم نے اپنے بینکر دوست کو موبائل پر میسج کیا۔ "اگر ارم عادل آباد برانچ میں نہیں ہوگی تو میرا اکاؤنٹ بھی وہاں نہیں ہوگا... اور میں کسی بھی دن دفتر آکر تمہارا سر بھی توڑ دوں گا۔"

"آر یو سیریس..."

"یس، سیریس۔"

"مبارکاں... شی از اور اسسٹنٹ منیجر۔"

"تھینک یو۔"

"نو تھینک یو... شی ڈیزروڈ۔"

بینک میں پہلا اکاؤنٹ سارم کا تھا اور یہ اکاؤنٹ ارم کھول رہی تھی۔ "ڈپازٹ کتنا لکھ دوں؟" ارم نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر مدھر آواز میں پوچھا۔

"آج جتنا بھی ڈپازٹ آپ کو ملے... اس کا دگنا۔" سارم نے کہا۔

پھر سارم، بینک اور ارم روز کا معمول بن گئے۔ عادل آباد کے ماحول اور پھر دونوں کی تربیت۔ دونوں میں ایک عجیب رشتہ قائم ہوگیا تھا لیکن... کسی نے کبھی اس رشتے کا اقرار نہیں کیا تھا... کبھی کوئی بات زبان پر نہیں آئی تھی۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں لیکن...

ارم جانتی تھی کہ ایک چھوٹی سی غلطی اس کے باپ کے مان کو ختم کردے گی... سارم بھی واقف تھا اور وہ احترام کرتا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ سارم کے والد کا انتقال ہوا۔ تمام تر ذمے داریاں اس کے کاندھوں پر آگئیں۔ وقت گزرتا رہا، ارم اس برانچ کی منیجر بن گئی۔ اب بھی دونوں محتاط تھے۔ کچھ لوگوں کو تمام تر احتیاط کے باوجود یقیناً کچھ شک تھا لیکن اس موہوم شک کی دونوں کو پروا نہیں تھی۔

سارم روزانہ یا ہر دوسرے دن بینک آتا تھا۔ بظاہر وہ حساب کتاب کے لیے آتا لیکن وہ سیدھا ارم کے پاس جاتا۔ وہیں دونوں ایک ساتھ ایک ایک کپ چائے پیتے، وہیں سارم کے بینک کے معاملات بھی نمٹ جاتے۔ اس دوران میں کسی بھی کسٹمر یا اسٹاف ممبر کے آنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ دونوں کے درمیان عجیب رشتہ تھا۔ اس تمام تر عرصے میں صرف ایک مرتبہ ارم نے سارم کو ہاتھ لگایا۔ سارم اپنے والد کے انتقال کے بعد جب پہلی مرتبہ بینک آیا اور صرف ارم کے سامنے اس کی آنکھیں کسی قدر نم ہوئیں تو ارم نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا۔

"حوصلہ رکھو۔" اور پانی لینے اٹھی۔

یہ عجیب پریم کہانی تھی۔ اب سے کچھ عرصہ قبل سارم نے پہلی مرتبہ ارم کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

ارم اپنے چیمبر میں اپنی سیٹ پر تھی۔ سارم نہ جانے کس موڈ میں تھا... اس نے چائے بھی نہیں پی تھی اور جلدی میں بھی تھا۔

"بی بی جی... جلدی آپ کی چھٹی ہونے والی ہے۔"

"چھٹی... کیا مطلب؟"

"آپ ملازمت چھوڑنے والی ہیں۔"

"ہیں... وہ کیوں اور کیسے...؟" ارم حیران تھی اور کسی قدر پریشان۔ سارم نے بڑی محبت سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ کائنات جیسے ساکت ہوگئی۔ ارم کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دل دھڑکنا بھول گیا ہے یا اس کے حلق میں دھڑک رہا ہے۔

"میری امی ایک دو دن میں آپ کے گھر آنے والی ہیں۔ آپ کو اپنے گھر لانے کے لیے۔" اس نے کہا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ اس تمام ماہ و سال میں وہ بمشکل ایک یا دو مرتبہ ساتھ کہیں گئے ہوں گے۔ آج یہ ساری یادیں اسے بے طرح آرہی تھیں۔ وہ ایک چھوٹے سے شہر کی ایک دور افتادہ پلیا پر سر پکڑے ہاتھ گھٹنے پر ٹکائے منہ بسورے بیٹھا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔ ارم کا آج کا رویہ اسے دل ہی دل میں خون کے آنسو رلاتا رہا۔ پھر نہ جانے کب اسے احساس ہوا کہ وہ بے خود بیٹھا ہے۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور عادل آباد کی طرف چل پڑا۔ تمام راستے وہ سوچتا رہا اور پریشان ہوتا رہا کہ آخر کیوں؟ ارم تو کبھی کسی غیر کے ساتھ بھی اس طرح بدتمیزی سے پیش نہیں آتی تھی، سارم کے ساتھ اس نے ایسا کیوں کیا؟

وہ بوجھل قدموں اور ٹوٹے دل سے واپس آیا۔ اپنے دفتر میں داخل ہوتے ہی اسے پہلی اطلاع یہ ملی کہ شہر سے کرنل

عارف کا فون تھا۔ آپ کا موبائل بند جارہا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ جیسے ہی آپ سے رابطہ ہو، آپ کی ان سے بات کروا دی جائے۔ ان کا نمبر یہ ہے۔

سارم نے سب سے پہلے تو ٹٹول کر دیکھا کہ اس نے اپنا موبائل کہاں رکھ دیا ہے۔ موبائل اس کی پتلون کی جیب میں تھا اور نہ جانے اس نے کب آف کردیا تھا اور بھول گیا تھا۔ اس نے موبائل آن کیا اور کرنل عارف کے نمبر پنچ کرنے لگا۔

"ہیلو... السلام علیکم۔" سلسلہ ملنے پر سارم نے کہا۔

"میں..."

"سارم... عادل آباد سے سارم بول رہے ہیں؟" کرنل عارف نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہاں۔" سارم نے جواب دیا۔

"سارم! میں کرنل عارف بول رہا ہوں... آپ سے ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں... کیا یہ ممکن ہے کہ آپ یہاں آجائیں؟"

سارم سوچ میں پڑ گیا۔ طرح طرح کے اندیشے سر ابھارنے لگے۔

"اگر آپ کے لیے یہ ممکن نہ ہو تو آپ ہمیں بھی مدعو کرسکتے ہیں... لیکن مناسب یہی ہے کہ آپ تشریف لے آئیں۔"

"ٹھیک ہے... کب اور کہاں آنا ہے؟" سارم نے گہری سانس لے کر کہا۔

کرنل صاحب شہر میں ہیڈ کوارٹر کا محلِ وقوع سمجھانے لگے۔

"سارم... یہ قومی سلامتی کا مسئلہ ہے۔ جتنی جلدی آسکو اتنا ہی اچھا ہے۔" سلسلہ منقطع کرنے سے قبل کرنل عارف نے کہا۔

☆☆☆

"یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ عادل آباد کے بینک میں سیکیورٹی کے انتظامات اچھے نہیں ہوں گے... یہ ایک آسان ڈکیتی ثابت ہوگی... لیکن یہ بڑی ڈکیتی کیسے ہوگی؟" فراست علی خان نے نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔

"فراست! وقت آنے پر سب پتا چل جائے گا... مجھے ذرا کام مکمل کرلینے دو... ایک مرتبہ پھر تم عادل آباد کے دولت مند ترین انسان ہوگے۔" شہلا نے اسے مزید لالچ دیا اور فراست اپنی رہی سہی فراست بھی کھو بیٹھا۔

ایسے مواقع ہر انسان کی زندگی میں آتے ہیں۔ ایک راستہ ظلم کا، ناانصافی کا، جرم کا، گناہ کا اور بدی کا ہوتا ہے۔ دوسرا راستہ وہ ہوتا ہے جسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے۔ زر، زن اور زمین مثلث مکمل تھی۔ فراست کو خواب آنے لگے کہ وہ دوبارہ اپنی جائداد کا... آبائی جائداد کا مالک بن گیا ہے۔

شہلا نے نہایت تیز رفتاری سے کام کیا۔ وہ انتظامات مکمل کرتی چلی گئی۔ اس تمام عرصے میں اس نے فراست سے صرف ایک کام لیا تھا۔ وہ کام بھی بڑا عجیب و غریب تھا۔ قریباً مہینا بھر قبل اس نے فراست کو ایک چھوٹی سی چپٹی سی

الیکٹرانک چپ دی تھی۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ اسے سارم کے موبائل کو کھول کر ایک خاص خانے میں فٹ کرنا تھا۔ فراست کو یہ بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن ظاہر ہے وہ سوال نہیں کر سکتا تھا۔ پھر پندرہ ہی دن بعد کہا گیا کہ اب وہ سارم کا موبائل چرا کر شہلا کو لا دے۔ یہ بھی کون سا مسئلہ تھا۔ اس کام کے علاوہ اس نے بس انتظار کیا اور شہلا کو استعمال کیا۔

کل رات شہلا نے فراست کو فارم ہاؤس پر بلوا لیا۔ جب سے شہلا کینیڈا سے آئی تھی، آج وہ پہلی مرتبہ یہاں مل رہے تھے۔ اقامتی کمرے میں پہنچتے ہی فراست نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اوہ... نو... ابھی بہت کام ہے۔'' شہلا غرائی۔

آج شہلا کا رویہ اور لہجہ فراست کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ فارم ہاؤس اور اس سے ملحقہ عمارتوں کی فضا بھی اسے کچھ مختلف لگ رہی تھی لیکن وہ کسی احساس کو کوئی معنی نہیں پہنا پا رہا تھا۔

''پہلے پیٹ پوجا... پھر کام دوجا۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''نہیں... پہلے کام... غور سے سنو، کل ہمیں بینک لوٹنا ہے۔''

''کل؟'' فراست سیدھا بیٹھ گیا۔

''ہاں کل... اور تم جانتے ہو آج رات وہاں کتنی رقم ہے؟''

''نہیں۔''

''اندازہ کرو۔''

''ستر، اسّی لاکھ۔''

''نہیں، پندرہ کروڑ۔''

''کیا؟'' فراست حیرت کے مارے کھڑا ہو گیا۔ ''پندرہ کروڑ... تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟ یہاں عادل آباد میں...''

''جی ہاں یہاں... عادل آباد میں۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

''کل صبح آ جائے گا جب رقم تمہارے قبضے میں ہو گی۔'' شہلا آپ سے تم پر آ گئی تھی لیکن کسے ہوش تھا۔ فراست کی سانس پھولنے لگی۔

''پلان کیا ہے؟''

''بہت سادہ... ایک خاص وین تیار کی گئی ہے۔ تم اسے چلا پھرا کر دیکھ لو... اس کے انجن میں کچھ تبدیلیاں کر کے اسے مزید پاورفل بنایا گیا ہے۔ تمہیں صرف وہ وین ڈرائیو کرنی ہے۔ صبح یہاں سے وین لے کر جانا اور بینک کے سامنے پارک کر دینا۔ انجن اسٹارٹ رکھنا۔ دو آدمی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ راکٹ اور عاشق۔ ایک کے پاس کلاشنکوف، ایک کے پاس ٹی ٹی پستول۔ عاشق بہترین الیکٹریشن بھی رہ چکا ہے۔ مزید تربیت اسے ہم نے دے دی ہے۔ وہ لمحوں میں بینک کا الارم سسٹم ناکارہ کر دے گا۔''

''اور گارڈز؟''

''گارڈز کے پاس اتنا اچھا اسلحہ نہیں ہوتا لیکن راکٹ واقعی راکٹ ہے۔ وہ پہلے ہی انہیں غیر مسلح کر چکا ہو گا۔ تم فکر مت کرو، راکٹ کی اسپیڈ واقعی تیز ہے۔ یہ دونوں سارے کام کر کے رقم لے آئیں گے۔ تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ جب یہ گاڑی میں بیٹھ جائیں اور نوٹوں سے بھرے بیگ گاڑی میں رکھ دیں تو گاڑی پرانے راستے سے جھیل تک لے جانا۔ ان دونوں کو گولی مارنا اور گاڑی جھیل میں پھینک کر آ جانا۔'' شہلا نے ایک پستول فراست کی گود میں ڈال دیا۔

''تم پاگل ہو گئی ہو... میں ان دونوں کو مار کر اور... گاڑی جھیل میں...''

''ہاں... ہاں، یہ رقم فوج کی ہے، پندرہ کروڑ... عام افراد کو اس کا پتا نہیں ہے کہ یہاں جلد ہی ایک چھوٹی فوجی چھاؤنی تعمیر ہونے والی ہے۔ یہ سرحدی علاقہ ہے نا تو کسی وجہ سے یہ فوج اور حکومت کا فیصلہ ہے۔ یہ رقم چھوٹی چھاؤنی کی تعمیر کی ابتدائی لاگت ہے۔ اس رقم کے چوری ہوتے ہی ہر طرف تلاش کا عمل شروع ہو جائے گا۔ میں نے یہ انتظام کیا ہے کہ یہ تمام رقم واٹر پروف بیگ میں سیل بند کی جائے گی۔ پانی کا ایک قطرہ بھی اندر نہیں جا سکے گا۔ جب تلاش بند ہو جائے گی تو کچھ عرصے بعد ہم رقم نکال لیں گے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہو سکے گا۔''

''لیکن... قتل؟'' فراست ہچکچایا۔

''ڈر گئے... کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا... ہماری پوری کوشش ہے کہ بینک میں اور راستے میں کوئی حادثہ نہ ہو، نہ کوئی مرے۔ تمہیں تو بس جنگل میں... کہتے ہیں جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا... فراست نے جنگل میں دو بندوں کو مارا کس نے دیکھا۔ اور پھر تم خود ہی انہیں آبی قبر میں اتارو گے؟''

شہلا کی ذرا سی محنت سے فراست سب کچھ کرنے کو تیار ہو گیا۔

''اچھا... اچھا... ایک سوال اور... تمہیں کیسے یقین ہے کہ رقم بینک میں موجود ہے؟''

''اچھا سوال ہے... بلیک میلنگ... یہ جو بینک منیجر

ارم ہے نا، یہ اپنی اور اپنے باپ کی عزت سے بہت ڈرتی ہے۔ ہم نے اس کے لیے تمہارے بھتیجے سارم کو استعمال کیا۔ بڑا خوب صورت لڑکا ہے۔ سارم اور ارم کے درمیان ایک خاموش اور افلاطونی قسم کا رومانس جاری ہے۔''

''اچھا... کیا واقعی... یار! مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔ ارم... ماسٹر اختر صاحب کی لڑکی... بڑی پیاری بچی ہے... ہماری بہو بنے گی، واہ مزہ آ جائے گا۔ اچھا خیال ہے۔'' فراست فوراً بزرگ بن گیا۔

''ہم نے اسی تعلق کو استعمال کیا تھا۔ یاد ہو گا تم نے سارم کے موبائل میں ایک چپ لگائی تھی پھر وہ موبائل ہمیں لا دیا تھا۔ اس میں سے ہم نے کام کام کے جملے نکال کر سیاق و سباق سے ہٹا کر ارم کو سنا دیے۔ وہ جاہل تو خودکشی کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ نان سنس، اسٹوپڈ... سارا پلان ہی چوپٹ کر دیتی۔ پھر میں نے براہِ راست بات کر کے صرف اسے اس بات پر راضی کیا کہ وہ ہمیں رقم کے آنے کی درست اطلاع صرف ایک نمبر پر اور صرف ایک لفظی میسج کر کے دے گی۔''

''تو کیا... اس نے ایسا کیا؟'' فراست نے حیرت سے پوچھا۔

''کیسے نہیں کرتی؟ ارے یہ مسئلہ اس کی خودکشی سے حل ہونے والا نہیں تھا۔ اگر اس کے مرنے کے بعد بھی یہ ٹیپ عام ہو جائے تو کیا ہو گا... کیا یہ خاندان عادل آباد میں زندہ رہ سکے گا؟ ان کے خاندان کی لڑکیاں تعلیم جاری رکھ سکیں گی؟''

''ٹھیک کہتی ہو... عین ممکن ہے مسئلہ اتنا بڑھ جائے کہ عادل آباد میں لڑکیوں کا اسکول اور کالج جانا ہی بند کر دینا پڑے۔'' فراست نے کہا۔

''بس میں نے یہی اسے سمجھایا کہ اسے کچھ نہیں کرنا صرف ایک لفظ کا میسج کرنا ہے۔ آج رات کو پیر سائیں کا میلا ہے۔ عادل آباد کے افراد کی بڑی تعداد وہاں ہو گی۔ کل صبح جمعہ ہے۔ عادل آباد کی ہفتہ وار تعطیل، بازار اور دکانیں بند ہوں گی۔ بینک کھلا ہو گا اور اس کے دروازے فراست کے لیے کھلے ہوں گے۔''

''اوکے... اوکے...''

''کوئی مشکل... کوئی سوال؟''

''کوئی نہیں... بہت آسان اور سادہ پلان ہے۔''

''اور یہ تو میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں کہ میں تمہارے ساتھ ساتھ... تمہارے نزدیک ہی ہوں گی۔ یہاں تک کہ جب تم پرانے اور متروک راستے سے باہر آؤ گے تو میں تمہیں

بے وقوف

ایک عورت سے اس کی سہیلی نے کہا۔ ''تمہارے شوہر بہت عقل مند معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تو دنیا کی ہر بات جانتے ہوں گے۔''

عورت نے رازداری سے بتایا۔ ''احمق نہ بنو۔ انہیں تو شبہ بھی نہیں ہے۔''

(حمیرا اقبال، کراچی سے)

باہر ہی ملوں گی۔''

فراست کی باچھیں کھل گئیں... کھل کیا گئیں، کھلتی ہی چلی گئیں۔ باوجود کوشش کے وہ اپنا منہ بند نہیں کر پایا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھا نہیں گیا۔ بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ وہ اسی شعلہ جوالا کے ساتھ تھا۔ وہ ڈرائیو کرتی ہوئی اسے فارم ہاؤس تک لائی تھی۔ فراست کا دل ڈوب رہا تھا اور آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ابھی وہ ایک قتل کر کے آ رہا تھا۔ وہ ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچنے لگا کہ کہیں... کہیں اسے بھی... تو کیا... شہلا نے اسے جو گولیاں... وہ آگے نہیں سوچ سکا۔

فراست نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ گاڑی کے پار اسے ایک کلین شیو شخص نظر آیا۔ اس نے گاندھی جیسی گول.... عینک لگا رکھی تھی اور اس کے دانت نکلے پڑ رہے تھے۔ شہلا دروازہ کھول کر جیپ سے نیچے اتری اور اس سے جا کر لپٹ گئی۔ کسی نے اس کی جانب کا دروازہ کھولا۔ وہ لڑھک کر نیچے آ گیا۔ آخری الفاظ جو اس کے کانوں میں پہنچے، وہ شہلا کے تھے۔

''یہ اب تک ختم ہو چکا ہو گا۔ گڑھا کھدا ہوا ہے اس میں پھینک کر زمین برابر کر دو... فوراً۔''

☆☆☆

ارم گھر واپس آئی تو بہت حد تک ٹوٹ چکی تھی۔ سارے دن کی افتادوں نے تو اتنا تھکایا تھا، اصل چوٹ اسے سارم سے اور خود سے پہنچی تھی۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ سارم اس طرح اسے بلیک میل کرے گا اور بینک ڈکیتی میں ملوث ہو گا۔ اسے خود سے بھی گھن آ رہی تھی کہ وہ محض خاندان کی عزت اور ناموس کی خاطر بلیک میل ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کاش اس نے تعلیم ہی حاصل نہ کی ہوتی۔ کاش وہ گھر سے ہی نہ نکلی ہوتی۔ کاش وہ پیدا ہوتے ہی مر گئی ہوتی۔ آخر اس کا قصور کیا تھا؟ کیا سارم کو محض دو جملے کہہ دینے

پر وہ معتوب ہوجائے؟ وہ سب سے مل کر سب کو حوصلہ دیتی رہی۔ اس کے والد بہت فکر مند تھے لیکن اس نے انہیں تسلی دی کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ اندر سے وہ جتنا خوف زدہ تھی، اس کا اظہار اس کے چہرے سے نہیں ہو رہا تھا۔

جب اندھیرا پھیل گیا تو وہ چھت پر چلی گئی اور اپنی مخصوص چارپائی پر گر کر رونے لگی۔ روتے روتے نہ جانے کب وہ سو گئی۔ نامعلوم یہ خواب تھا یا حقیقت کہ اس نے سارم کی شبیہہ کو دیکھا۔ پھر سارم غائب ہوگیا... وہ اس سے شکوہ بھی نہیں کر سکی۔ بے وفائی کا، ہرجائی کا طعنہ بھی نہیں دے سکی... وہ اسے یہ بھی نہ کہہ سکی کہ ملک وقوم کی امانت لوٹ کر تمہیں کیا مل جائے گا؟ تم تو ویسے ہی بہت دولت مند ہو... اور کتنی دولت چاہیے؟

اسے تاریک سیاہ آسمان نظر آیا۔ عجیب آسمان تھا... ایک تارا بھی نہیں تھا اور اس سے عجیب تر اس سیاہ تر آسمان کا چاند تھا۔ تاریک اور سیاہ چاند... سارم بھی اس کے لیے سائبان ہی تو تھا اس کے لیے آسمان تھا... تو کیا وہ تاریک آسمان تھا؟ یا تاریک آسمان کا سیاہ چاند تھا؟

اچانک ایک فائر ہوا اور سیاہ چاند میں سے لہو رسنے لگا۔ ارم خوف زدہ ہوکر اٹھ بیٹھی۔ وہ چھت پر تھی۔ رات کافی بیت گئی تھی اور واقعی کسی نے ان کے گھر کے پاس آکر فائر کیا تھا۔ وہ سمجھ گئی۔ عادل آباد کی پُرسکون فضا میں یہ فائر... اس کے لیے تنبیہ تھا۔ اسے سارم سے مزید نفرت محسوس ہونے لگی۔

☆☆☆

شہلا عینک والے سے لپٹی لپٹی عمارت میں داخل ہوئی۔

''کیسا رہا؟'' عینک والا شخص بولا۔ وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

''پرفیکٹ... کوئی آپ کی ذہانت کو کہاں پہنچ سکتا ہے۔ ہر کام آپ کی بتائی ہوئی پلاننگ سے ہوا ہے۔''

''گڈ۔''

''لیکن مجھے بس ایک ہی شکایت ہے۔ اتنا عرصہ آپ نے مجھے اس بڈھے کھڑوس کے حوالے کیے رکھا۔''

''بات یہ نہیں... بات یہ ہے کہ کون کرتا... ٹیم میں تم سب سے زیادہ قابل بھروسا اور باصلاحیت کوئی اور ہو تو بتاؤ۔ ہم فراست کو سگنل پر روک کر موبائل چھیننے کے لیے کسی اور کو بھیج سکتے تھے۔ اس کی گاڑی کے ایکسیڈنٹ سے لے کر ہر کام کوئی اور بھی کر سکتا تھا لیکن تمہاری جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا تھا۔ تمہاری ہی وجہ سے آج ہم اس محفوظ جگہ بیٹھے ہیں... ایسا لگتا ہے کہ یہ جگہ ہمارے لیے ہی بنائی گئی تھی۔ سرحد کے قریب محفوظ اور خفیہ ٹھکانا۔ جو کارروائیاں یہاں بیٹھ کر کی گئیں، عام حالات میں ممکن ہی نہیں تھیں۔ یہ سارا کریڈٹ صرف تمہیں جاتا ہے۔''

''نو سر! آپ کے بغیر تو ہم کچھ بھی نہیں۔ آپ نہیں ہوتے آپ کی عمدہ پلاننگ نہ ہوتی تو یہاں کی ایجنسیاں ہمیں گرفتار کر ڈالتیں۔''

''اوکے... اوکے... چلو اب کچھ آرام کرتے ہیں۔''

☆☆☆

ابھی رات کے گیارہ نہیں بجے تھے۔ کچھ وقت رہتا تھا۔ ایک گاڑی تاریک سیاہ رات میں تیزی سے فارم ہاؤس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ فارم ہاؤس کی نگرانی پر موجود گارڈز ہوشیار ہوگئے۔ باس کو اطلاع کر دی گئی۔

''جو بھی ہو، اسے آنے دینا۔''

آنے والا سارم تھا۔ وہ بڑے تپاک سے گارڈ سے علیک سلیک کر رہا تھا۔

''میں فراست چچا سے ملنے آیا ہوں... ایک ضروری کام آن پڑا تھا۔''

''لیکن انہیں تو یہاں آئے ایک عرصہ ہوگیا ہے۔'' گارڈ نے حسب ہدایت جواب دیا۔

''نہیں، کل رات ہی وہ یہاں کے لیے نکلے ہیں... ڈاکٹر شہلا سے ملنے کے لیے۔'' سارم نے کہا۔

''نو سر! ڈاکٹر شہلا کو کینیڈا گئے کئی مہینے ہوگئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے... میں یہاں کے انچارج سے ملنا چاہوں گا۔'' سارم نے کہا۔

''آپ انتظار کریں۔'' گارڈ نے کہا اور اندر چلا گیا۔

سارم نے دیکھا کہ یہاں صرف تین گارڈز تھے۔ مین گیٹ خاردار تاروں اور پائپ کا بنا تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا دروازہ اور گارڈز کے لیے ملحقہ عمارت تھی۔ یہ عمارت صرف دو کمروں پر مشتمل تھی۔ شیشے کے دروازے اور کھڑکیاں بالکل شفاف تھیں۔ گویا روزانہ صبح شام ان کی صفائی کی جاتی ہوگی۔

پھر اسے اندر بلا لیا گیا۔ دو گارڈز باہر ہی رہ گئے۔ ایک آدمی اندر سے برآمد ہوا۔

''السلام علیکم! جی فرمایئے، میں یہاں کا انچارج ہوں۔''

''میں فراست چچا کی تلاش میں آیا ہوں۔''

''سارم صاحب افسوس کہ ہم اس سے قبل نہیں مل سکے۔ آپ سے مل کر اچھا لگا لیکن گارڈ نے آپ کو بتایا ہوگا کہ فراست صاحب تو یہاں آئے ہی نہیں۔''

''یہ تو اور بھی تشویش کی بات ہے۔ کل رات وہ یہیں کے لیے نکلے ہیں، ڈاکٹر شہلا سے ملنے کے لیے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو... وہ یہاں آئے تھے اور قتل ہوگئے... اب تمہاری باری ہے۔'' اندر سے عینک والا شخص برآمد ہوا اور اس نے انگریزی میں کہا۔

''مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ فراست کو جلدی ہٹا دیا... کوئی بات نہیں اب تمہاری باری ہے... دونوں چچا بھتیجے ساتھ ہی رہو۔ دنیا میں بھی تو ساتھ ہی رہے ہو۔''

سارم نے ان کی نیت بھانپ لی تھی۔ اس نے جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی چھلانگ لگائی اور کمرے میں موجود شیشے کی کھڑکی توڑتا ہوا باہر فارم ہاؤس کے ویرانے میں جا گرا۔ قریب ہی گارڈ ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتا، سارم اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ قلابازی کھاتے ہوئے نیچے گرنا اور پھر اچھل کے کھڑے ہوجانا اس کی بھرپور مشق تھی اسے۔ سارم کی تمام تر تربیت اس وقت کام آرہی تھی جب اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ لمحوں میں اس نے گارڈ کو ڈھیر کر دیا۔ اتنے میں دوسرا گارڈ اس جانب متوجہ ہوچکا تھا۔ سارم نے زمین سے پتھر اٹھایا اور تاک کر دے مارا۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور سر پر شدید ضرب آئی تھی۔

تیسرا گارڈ اس کے سر پر پہنچ گیا۔ گارڈ کو شاید فائر کرنے کی ممانعت تھی یا وہ خود کو بہت اچھا چاقو زن سمجھتا تھا، اس نے بڑھ کر چاقو سے وار کیا۔ سارم نے جھکائی دے کر سوئپ ماری۔ گارڈ کو گرایا۔ وہ خود بھی نیچے ہی تھا۔ اس کی مخصوص کک بلند ہوئی۔ گارڈ کے سر پر ایڑی کی شدید ضرب پڑی اور وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔ سارم کسی انگریزی فلم کے ہیرو کی طرح پرفارم کر رہا تھا۔ جوڈو کی تربیت اس کے کام آرہی تھی۔ ورنہ وہ کب کا کام سے گیا ہوتا۔ لمحوں میں اس نے تین گارڈز کو ناکارہ کر دیا تھا۔ یہ کارکردگی بہت ہی عمدہ تھی۔

اچانک عینک والا آدمی کھڑکی میں نظر آیا۔ گیٹ اور عمارت میں جلنے والی روشنیوں کے عکس میں بہت کچھ واضح تھا۔ یوں بھی کمرے میں تو روشنی تھی ہی۔ عینک والے کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے عینک اتار کر قریب ہی رکھی اور تالیاں بجانے لگا۔

''شاباش سارم! تم نے تو کمال ہی کر دیا۔''

پھر اس نے کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ زمین پر پیر لگتے ہی وہ دوبارہ اچھلا اور اب کی بار دونوں ٹانگیں سارم کے سینے پر پڑیں۔ سارم کو لگنے والی فلائنگ کک بھرپور تھی۔ دونوں گرے لیکن عینک والا تو یوں جمپ لگا کر کھڑا ہوگیا جیسے کسی اسپرنگ کے گدے پر گرا ہو۔ سارم کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ وہ سر جھٹکنے لگا۔

''تم ابھی بچے ہو سارم! غلط جگہ آگئے ہو۔ یہاں سے زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔''

اس کے بعد تو سارم کو مہلت ہی نہیں ملی کہ کچھ کر سکے۔ وہ اس تواتر اور تیزی سے پٹا کہ اس نے سمجھ لیا کہ اس کا آخری وقت آگیا ہے۔ وہ خود لڑائی بھڑائی کا ماہر تھا لیکن... سارم کو حسرت ہی رہی کہ ایک ہاتھ ہی مار سکے۔ وہ لہولہان ہو رہا تھا۔ مار کھانے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ ایک مرتبہ کسی نے اس سے پوچھا تھا کہ ایم ایم اے یا باکسنگ کا چیمپئن کون بن سکتا ہے؟ سارم نے جواب دیا تھا جس میں مار کھانے اور سہنے کی ہمت ہو۔

اس کی مار کھانے کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ وہ چچا کے پاس پہنچنے ہی والا تھا کہ اس کا ہاتھ چاقو پر پڑا۔ گارڈ کے ہاتھوں سے نکلا ہوا یہ چاقو سارم کی طرح خاک چاٹ رہا تھا۔

نہ جانے سارم میں کہاں سے یکدم طاقت آگئی کہ اس نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں چاقو اٹھایا، گھمایا اور قوس بناتا ہوا عینک والے کے جسم میں اتار دیا... لیکن وہ کوئی دنیا کا ماہر ترین لڑاکا تھا۔ چاقو کی محض چمک دیکھ کر اس نے پینترا بدل لیا۔ چاقو جسم میں پیوست ہونے سے بچ گیا لیکن اس کی داہنی ٹانگ لپیٹ میں آگئی۔ سارم نے شاید جان لڑا دی تھی۔ بڑے پھل کا چاقو پنڈلی چھیدتا ہوا زمین میں دھنس گیا۔ عینک والے کو زمین میں پرو گیا۔ پہلی مرتبہ اس کے منہ سے چیخ نکلی۔ بھیانک چیخ... اس چیخ نے سارم کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ وہ تیزی سے اٹھا، مقابل کا بایاں ہاتھ اس کی گرفت میں آیا اور پھر جوڈو کے ماہر نے اس کے ہاتھ کو پکڑ کر جو جھٹکا دیا تو وہ کندھے سے اتر گیا... سارم نے اسی پر بس نہ کی، اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ ڈالی۔ اب وہ خود بھی قریب ہی پڑا ہانپ رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔

سارم کو خدشہ تھا کہ وہ شخص جس نے سارم سے بطور انچارج بات کی تھی، کسی بھی وقت مزید کمک کے ساتھ آسکتا تھا۔ خاصی دیر بعد وہ اٹھنے کے قابل ہوا۔ عینک والا آدمی یا تو بے ہوش ہوگیا تھا یا بن رہا تھا۔ سارم کی قوت آہستہ آہستہ مجتمع ہونے لگی۔ اس نے چاقو پنڈلی سے نکال کر دور پھینکا۔ کسی نہ

کسی طرح عینک والے کو گھسیٹتا ہوا اپنی گاڑی تک لایا۔ اسے پچھلی سیٹ پر ٹھونسا۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور عادل آباد کی جانب گامزن ہو گیا۔ اس نے کرنل عارف کو فون ملایا اور ساری روداد سنا ڈالی۔

"اب تم کیا کر رہے ہو؟"

"گاڑی چلا رہا ہوں... وہ پچھلی سیٹ پر پڑا ہے۔ فون بند کر کے میں گاڑی روکوں گا۔ اسے بے ہوش کروں گا اور تھانے پہنچوں گا۔" ابھی سارم نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ گاڑی خالی ہو گئی ہے۔

سارم نے پلٹ کر دیکھا، پچھلا دروازہ کھلا تھا اور عینک والا غائب تھا۔ وہ یقیناً گاڑی سے کود گیا تھا۔ بڑا جگرا تھا اس کا۔

سارم نے گاڑی واپس گھمائی، کچھ ہی فاصلے پر وہ بے حرکت پڑا تھا۔ بے ہوش یا مردہ کچھ پتا نہیں تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن شام کا وقت تھا۔ یہ بینک کی چھٹی کا دن ہوتا ہے لیکن اس دن ارم کو خاص طور پر بینک آنا پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر میں کرنل عارف سارم کے ساتھ بینک میں داخل ہوئے۔ سارم کے زخموں کی ڈریسنگ ہو چکی تھی۔

سارم ہال میں ہی رک گیا۔ کرنل عارف، ارم کے پاس اس کے چیمبر میں گئے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے بتایا۔

"ہمارے ملک میں ریمنڈ ڈیوس جیسے نامعلوم کتنے بدمعاش اور بلیک واٹر جیسی نامعلوم کتنی تنظیمیں دہشت گردی کر رہی ہیں۔ ایسے ہی افراد میں سے ایک کو کل سارم نے کیفر کردار تک پہنچایا ہے۔ یہ سرحدی علاقہ ہے، یہاں ریشہ دوانیاں بہت تھیں۔ سرحد پار سے اسلحہ اور دہشت گرد آتے تھے اور کارروائیاں کرتے تھے۔" کرنل عارف آہستہ آہستہ ارم کو تمام تر صورتِ حال سے آگاہ کر رہے تھے۔ "حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ یہاں ایک چھوٹی چھاؤنی بنا دی جائے۔ اسے بیس کیمپ بنا کر فوج اور متعلقہ ادارے ان ریشہ دوانیوں کا قلع قمع کریں۔ ادھر شرپسندوں نے سارم کے چچا کو ٹریپ کر کے ان کے پرانے فارم ہاؤس کو کرائے پر حاصل کر لیا اور یہ سب کچھ ملک و قوم کی خدمت کے نام پر ہوا۔ وہ آسانی سے دھوکے میں آ گئے۔ یہ سلسلہ چلتا رہتا اگر چھاؤنی کے قیام کا فیصلہ نہ ہوتا۔ ادھر انتخابات بھی قریب تھے۔ اگر انتخابات سے قبل چھاؤنی تعمیر ہو جاتی تو انتخابات کے موقع پر بڑے پیمانے پر گڑبڑ پھیلانا ممکن نہ رہتا۔ پلان یہ کیا گیا کہ چھاؤنی تعمیر کرنے کی رقم ہی غائب کر دی جائے۔ اس طرح کچھ تاخیر ہو گی پھر اسی طرح کے مزید تاخیری حربے استعمال کر کے چھاؤنی کی تعمیر کچھ عرصے مؤخر کروا دی جاتی۔ ادھر پرانے فارم ہاؤس، اس کے تہ خانوں اور عمارتوں میں مسلسل اسلحہ سرحد پار سے لا کر جمع کیا جاتا رہا اور آگے بھیجا جاتا تھا۔ ہمیں جب اطلاعات ملیں تو یہ عینک والے صاحب غائب ہو گئے۔ اس کا نام جیمز ٹرومین ہے اور مانا ہوا ایجنٹ ہے۔ دہشت گردی اور حکومت کا تختہ پلٹانے میں اسے خاص مہارت حاصل ہے۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ یہیں فارم ہاؤس میں ہے۔ اگر ہم ذرا بھی کارروائی کرتے اور ٹرومین کو اس کارروائی کی بھنک بھی پڑ جاتی یا شبہ بھی ہو جاتا تو وہ غائب ہو جاتا اور ہمیں بہت مشکلات میں ڈال سکتا تھا۔ میں نے سارم کو بلوایا اور اپنا شبہ ظاہر کیا اور اسے اعتماد میں لے کر صرف اتنا کہا کہ کسی بھی وقت فارم ہاؤس جاؤ اور سن گن لو... اس حلیے کا بندہ نظر آئے تو فوراً مجھے بتاؤ... وہ اسی وقت رات کو وہاں جا پہنچا... اب یہ تو ہمیں بھی پتا نہیں تھا کہ ڈکیتی کی واردات میں یہ لوگ نہ صرف براہِ راست ملوث ہیں بلکہ فراست صاحب کو بھی ساتھ ہی ملا کر انہیں بھی ختم کر دیا گیا ہے۔"

"نادانستگی میں سارم نہ صرف یہ کہ خود مرتے مرتے بچا بلکہ اس نے عالمی شہرت یافتہ ایک ایجنٹ کو گرفتار کیا... یہ عالمی سطح کی کارکردگی ہے۔ تمہارے حوالے سے ایک چھوٹی سی معصوم سی بات سامنے آئی تھی لیکن وہ سارم نے خود ختم کی ہے۔" کرنل صاحب دیر تک ارم کو سمجھاتے رہے اور اس کے سوالات کے جوابات دیتے رہے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد انہوں نے پوچھا۔

"کیا تم مطمئن ہو؟"

ارم کی آنکھوں میں آنسو تھے... اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"تو بس اٹھ جاؤ... جاؤ... سارم کو اندر لے کر آؤ... اسے سوری کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے... اور ہاں، کسی کو بھیجو... چائے منگواؤ فوراً... مجھے جانا بھی ہے۔" کرنل عارف نے اسے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا۔

"جی... اچھا..." ارم گم صم سی تھی۔

"اٹھو۔" وہ زور سے بولے اور ارم تیزی سے اٹھ کر اپنے چیمبر سے چلی گئی... باہر سارم... سائبان... اس کا منتظر تھا۔

جعلی اموات

منظر امام

ہر شخص کو سفر درپیش ہوتا ہے... مگر انسانوں کے ساتھ کائنات کی چیزیں بھی سفر در سفر... رہتی ہیں... بے بہا دولت کی آمد اور پھر اس کا سفر... ہر شخص اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا... اور وہ ان کی دسترس سے مسلسل نکلتی جا رہی تھی... وہ ہر اس جگہ پہنچ رہی تھی جہاں اس کے استعمال کی اشد ضرورت تھی... مگر وہ خرچ ہونے کے بجائے منجمد تھی... اس کو حاصل کرنے کے متمنی اس کے تعاقب میں تھے... اور ان کے تعاقب میں اجل پیچھے آ رہی تھی... ایک صندوق کی گمشدگی... اس کی رکھوالی اور حفاظت کے سنگین مراحل سے دوچار کہانی کے پے در پے جھٹکے... جو سنبھلنے میں نہیں آ رہے تھے...

لالچ و ہوس کی چاہ میں سامان عبرت بن جانے والوں کا المیہ

سرورق کی دوسری کہانی

11 جولائی...

وہ ایک پہاڑی راستہ تھا۔

بیلا پور کے لوگ اسے سڑک کہا کرتے تھے جبکہ وہ ایک ایسی گزرگاہ تھی جو کچی تھی اور اب اگر کوئی گاڑی اس گزرگاہ سے گزرتی تو گرد و غبار کا ایک طوفان سا کھڑا ہو جاتا تھا۔

اس گزرگاہ کے ایک طرف گھنے جنگلات کا سلسلہ تھا۔ دوسری طرف قدیم طرز کے فارم ہاؤسز بنے ہوئے تھے۔ عام طور پر اس سڑک پر سناٹا رہتا تھا۔

کبھی کبھی کوئی گاڑی طوفان برپا کرتی ہوئی ادھر سے گزرتی تو آس پاس کے درختوں سے پرندے خوف زدہ ہو کر اڑ جایا کرتے۔

وہ ایک کھٹارا سی ویگن تھی۔ جو اس وقت اس راستے سے گزر رہی تھی۔

اس ویگن میں تین آدمی تھے۔ خالد، محمود اور افضل۔ یہ تینوں بیلا پور ہی کے رہنے والے تھے۔ یہ ویگن خالد کی تھی۔ وہ نواز کے پولٹری فارم سے مرغیاں قریبی قصبوں کو سپلائی کیا کرتا تھا۔

ویگن کے پچھلے حصے میں مرغیوں کے خالی کریٹ رکھے ہوئے تھے۔ پوری ویگن میں بو پھیلی ہوئی تھی لیکن ان تینوں کو اس کی پروا نہیں ہوتی تھی۔

محمود اور افضل عام طور پر اس کے ساتھ ہی اس کی ویگن میں چل دیا کرتے۔ اس راستے پر بہت آگے جا کر ایک قبرستان تھا۔ افضل کے باپ کی قبر اسی قبرستان میں تھی۔

افضل کو جب باپ کی قبر پر حاضری دینی ہوتی تو وہ خالد کے ساتھ ہی ہو لیتا۔ خالد راستے میں پڑتے والے قبرستان میں اسے اتار دیا کرتا اور خود آگے نواز کے پولٹری فارم کی طرف چلا جاتا۔ واپسی میں وہ افضل کو لے لیا کرتا تھا۔

محمود ان دونوں کا مشترکہ دوست تھا۔

بیلا پور میں محمود کی ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان تھی۔ جسے اس کی غیر موجودگی میں اس کی بیوی دیکھ لیا کرتی تھی۔

اس کا ایک ہی بچہ تھا۔ محمود کی تمنا تھی کہ وہ اپنے بچے کو شہر بھیج کر اعلیٰ تعلیم دلوائے۔ اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے بہت پیسوں کی ضرورت تھی اور وہ محمود کے پاس نہیں تھے۔

خالد نے اچانک بریک لگا دیے۔

افضل اور محمود ایک دوسرے سے ٹکرا کر رہ گئے۔

''ابے کیا ہو گیا؟'' افضل نے اپنی پیشانی سہلاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی پیشانی سامنے ڈیش بورڈ سے ٹکرا گئی تھی۔

''یہ دیکھ یار۔'' خالد نے سڑک کے کنارے کی طرف اشارہ کیا۔

''کیا دیکھیں؟''

''ایسا لگتا ہے کوئی گاڑی اس جگہ سے رگڑ کھاتی ہوئی درختوں کے اندر گھس گئی ہے۔'' خالد نے کہا۔

''تجھے کیسے معلوم ہوا؟''

''ابے دیکھ تو سہی۔ پودے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ گھاس کچلی ہوئی ہے۔'' خالد نے بتایا۔ ''یہ نشانی ہے کسی ایکسیڈنٹ کی۔''

''ایسی بات ہے تو خود جا کر دیکھ آ۔'' افضل نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''نہیں بھائی، مجھے تو سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' خالد نے کہا۔ ''اس جنگل میں سانپ بہت ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر تم دونوں یہیں رکو۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' محمود ویگن سے اُترنے لگا۔

''دیکھ کر جانا۔'' خالد نے کہا۔

''اطمینان رکھو، میں سانپوں سے نہیں ڈرتا۔'' محمود ہنس پڑا۔

گھاس کی پتیاں واقعی کچلی ہوئی تھیں اور وزنی ٹائروں کے نشانات بھی تھے۔ محمود انہی نشانات پر آگے بڑھتا چلا گیا۔

ابتدا میں چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں۔ پھر درخت تھے۔ جو آہستہ آہستہ گھنے ہوتے چلے گئے۔ ایک جگہ دو بڑے درختوں کے درمیان ایک وین پھنسی ہوئی تھی۔

یہ ایک ہائی رُوف جیسی گاڑی تھی۔ جس کا اگلا حصہ بُری طرح پچک گیا تھا۔ دروازہ ٹوٹ کر ایک طرف جا گرا تھا۔

ایک آدمی ٹوٹے ہوئے دروازے سے اس طرح لٹکا ہوا تھا کہ اس کا آدھا دھڑ گاڑی کے اندر تھا۔ اس شخص کا پورا جسم خون سے رنگین ہو رہا تھا۔

محمود ایک لمحے کے لیے سکتے میں رہ گیا۔ یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ حیرت انگیز اور بھیانک۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔

اسے وین کا ڈرائیور بھی دکھائی دے گیا۔ وہ اسٹیئرنگ اور سیٹ کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک چکی تھی۔

اور سب سے حیرت انگیز وہ صندوق تھا... جس کا اوپری حصہ ٹوٹ کر نہ جانے کس طرف گر گیا تھا۔ وہ صندوق خالی نہیں تھا۔

وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ پانچ پانچ ہزار اور ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں اس صندوق میں بھری ہوئی تھیں۔

محمود کے اندازے کے مطابق وہ کروڑوں کی رقم ہو سکتی تھی۔ محمود سکتے کے عالم میں ان نوٹوں کو دیکھتا رہ گیا۔

جتنے بھی نوٹ دکھائی دے رہے تھے، وہ اتنے تھے کہ ان سے نہ جانے کتنی نسلوں کا بھلا ہو سکتا تھا۔ ایک گونج سنائی دی۔ شاید سڑک کی طرف سے کوئی اسے پکار رہا تھا۔

محمود اپنے خیالات سے چونک پڑا۔

جو کچھ بھی کرنا تھا، بہت جلد کرنا تھا۔ یہ دولت اس نے دریافت کی تھی۔ اس دولت پر اسی کا حق تھا۔ اس نے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھانے کے لیے صندوق کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسی وقت آدھے دھڑ سے لٹکا ہوا شخص کلبلا اٹھا۔

محمود نے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ شخص ابھی زندہ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ وہ زندہ تھا۔ اگر وہ زندہ

رہ جاتا تو اسے اپنی وہ دولت یاد آ جاتی جسے وہ اپنے ساتھ گاڑی میں کہیں لے جا رہا تھا کہ راستے میں گاڑی حادثے کا شکار ہو گئی۔

اس کو زندہ نہیں رہنا تھا۔

محمود کو اپنے خواب بہت عزیز تھے۔ اس نے برسوں اپنی آنکھوں میں ان خوابوں کو سجائے رکھا تھا اور جب ان خوابوں کی تعبیر ملنے والی تھی تو اس شخص کو ہوش آ رہا تھا۔

وہ زخمی شخص ہلکی ہلکی کراہ کے ساتھ اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے لگا تھا۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ گرچہ اس کی آنکھیں ابھی تک بند تھیں لیکن وہ ہاسپٹل جا کر ٹھیک بھی ہو سکتا تھا۔

صحت مند ہونے کے ساتھ ہی اسے اپنی دولت بھی یاد آ جاتی۔

محمود اس شخص کی طرف متوجہ ہو گیا۔ کچھ سوچ کر اس نے آدھے دھڑ سے لٹکے ہوئے اس انسان کو ہائی روف سے باہر گھسیٹ لیا وہ اچھا خاصا وزنی تھا۔ محمود سے کہیں زیادہ صحت مند لیکن اس وقت بے بس ہو رہا تھا۔

اس شخص کو گاڑی سے کہیں دور لے جا کر پھینکنا ضروری ہو گیا تھا کہیں بھی۔ محمود کو معلوم تھا کہ اس جنگل میں زہریلے سانپوں کے ساتھ لومڑیوں اور بھیڑیوں کی بھی کثرت ہے۔

وہ اگر اس طرف آ نکلے تو پھر کچھ دیر کی بات ہوتی۔ یہ زخمی تو اپنے بچاؤ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا اور وہ جانور اس کی کہانی ختم کر دیتے۔

محمود نے پہلے سوچا کہ اس کو گھسیٹتے ہوئے دور لے جایا جائے۔ پھر خیال آیا کہ اس طرح گھسیٹے جانے سے زمین پر نشان پڑ جائیں گے اور کوئی بھی ان نشانات کے ذریعے گاڑی تک پہنچ سکتا ہے۔

☆☆☆

25 جون...

پھلجھڑی نے نیلم کو چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

پھلجھڑی کا اصل نام تو شاید اب کسی کو یاد نہیں رہا تھا۔ البتہ اس کے چھوٹے قد کی وجہ سے اسے پھلجھڑی کہا جاتا تھا۔

شیر خان نے جب اس کے سامنے یہ منصوبہ پیش کیا تو وہ بھڑک اٹھا۔

''نہیں یار وہ اب استاد سلطان ہماری بات نہیں مانے گا۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''وہ تو ویسے ہی ہم سے ناراض ہے۔ ہم نے اس کے ساتھ بھی بہت بُرا کیا تھا۔''

''یار اس کو پیسے مل تو گئے تھے۔'' شیر خان نے کہا۔ ''لیکن یہ تو دیکھو کس طرح ملے تھے۔ بے چارہ چکر لگا لگا کر تھک گیا تھا۔ ہم نے اسے اندر کرانے کی بھی کوشش کی تھی۔''

''یار وہ سب پرانی باتیں ہیں۔''

''پرانی کہاں، صرف ایک سال پہلے کی بات ہے۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''استاد سلطان کی یادداشت ویسے بھی بہت مضبوط ہے۔ وہ کم بخت کبھی کچھ نہیں بھولتا۔''

''یار پھلجھڑی، آخر تو کس دن کام آئے گا۔'' شیر خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تو نے اگر استاد کو قابو میں کر لیا تو پھر ہمارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔''

''سوچنے دے مجھے۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''پھر کچھ سوچ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''یار اپنے پاس ایک چارا ہے۔ اگر وہ پھینکا جائے تو مچھلی پھنس سکتی ہے۔''

''کس کی بات کر رہا ہے؟'' شیر خان کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''تو سمجھ گیا ہے، میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ نیلم... نیلم ہی وہ چارا ہے کہ ہم استاد سلطان کو قابو میں کر سکتے ہیں۔''

''وہ کمینہ تو اس پر بری نظر رکھتا ہے۔'' شیر خان نے کہا۔

''ظاہر ہے۔'' پھلجھڑی مسکرا دیا۔ ''وہ اس پر اچھی نظر تو رکھنے سے رہا۔ پچھلی بار نیلم ہی کی وجہ سے تو تیرا اس سے جھگڑا ہو چکا ہے۔''

''تو کیا وہ سمجھ نہیں جائے گا کہ ہم اس سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں اور نیلم کو چارا بنا رہے ہیں؟''

''یہ تو تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''یہ میرا کام ہے۔''

''لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔'' شیر خان کچھ سوچ کر بولا۔ ''نیلم اس کا نام سن کر بِدک جاتی ہے۔ وہ اس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی۔''

''اسے سمجھاؤ کسی طرح۔'' پھلجھڑی نے کہا۔

دروازے کی گھنٹی نے دونوں کو چونکا دیا۔ ''وقت کی بہت پابند ہے۔'' شیر خان مسکرا کر بولا۔ ''اسی وقت آنے کو کہا تھا اس نے۔ اور ٹھیک وقت پر آ گئی۔''

''اب تم اس سے کچھ مت کہنا۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''سب مجھ پر چھوڑ دینا۔ سارا معاملہ میں سیٹ کر دوں گا۔ تم جا کر دروازہ کھول دو۔''

شیر خان نے دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر نیلم نہیں تھی بلکہ دو پولیس والے تھے۔
ایک انسپکٹر اور اس کے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل۔ سب انسپکٹر کا نام جواد تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل فتح محمد تھا۔ یہ دونوں شیر خان اور پھلجھڑی کے لیے نئے نہیں تھے۔
شیر خان ان دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ''خیر تو ہے۔ سویرے سویرے کیسے آ ٹپکے تم دونوں؟''
''ایک گڑبڑ ہوگئی ہے شیرے۔'' سب انسپکٹر نے بتایا۔
''آؤ اندر آجاؤ۔''
دونوں پولیس والے اندر آگئے۔ پھلجھڑی کو دیکھ کر سب انسپکٹر جواد معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ ''تم بھی یہاں ہو۔ اس کا مطلب ہے کسی پروجیکٹ پر کام چل رہا ہے۔''
''نہیں بھائی، کیسا پروجیکٹ؟ کہاں کا پروجیکٹ۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''میں تو بس یونہی شیر خان سے ملنے آگیا تھا۔''
''تم دونوں کا ہر کام بس یونہی ہوا کرتا ہے اور بس یونہی چکر میں ہمیں کام دکھا جاتے ہو۔''
''یار بیکار باتیں نہ کرو۔ یہ بتاؤ آنا کیسے ہوا؟''
''میں تم دونوں کو یہ بتانے آیا تھا کہ ہمارے علاقے کا ایس ایس پی نیا آیا ہے۔ اس کو ہیڈ کوارٹر سے بھیجا گیا ہے۔ وہاں بھی اس کی ساکھ بہت زبردست تھی۔ بہت سخت مزاج کا آدمی ہے۔''
''تو اس سے ہمیں کیا لینا دینا؟'' پھلجھڑی نے پوچھا۔
''برخوردار! ہم صرف یہ بتانے آئے ہیں کہ کچھ دنوں کے لیے چپ چاپ رہنا۔ کوئی کارنامہ انجام دینے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''
''بھائی میرے، اب ہم دونوں نے خود کو بدل لیا ہے۔'' شیر خان نے کہا۔ ''اب ہم پہلے جیسے نہیں رہے۔''
''ہاں ہاں، وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' جواد مسکرا دیا۔ ''تم دونوں اب فرشتے ہوگئے ہو۔ ہر جگہ تمہاری دھوم مچی ہوئی ہے۔''
شیر خان گہری سانس لے کر رہ گیا۔
''اچھا یہ بتاؤ، وہ کہاں ہے؟'' جواد نے پوچھا۔ ''ذرا اس کا مزاج درست کرنا ہے۔''
''کس کی بات کر رہے ہو؟'' شیر خان نے پوچھا۔
''اسی حرافہ نیلم کی۔'' جواد نے کہا۔ ''اس نے ہمارے ایک دوست کے ساتھ فراڈ کیا ہے۔''
''وہ یہاں کہاں، وہ تو کچھ دنوں سے غائب ہے۔''
شیر خان نے بتایا۔ ''بتا رہی تھی کہ اسے لاہور جانا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چلی گئی ہو۔''
شیر خان جس وقت سب انسپکٹر جواد کو یہ بتا رہا تھا، نیلم اسی وقت شیر خان کے پاس آنے کے لیے اس کے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

11 جولائی...
افضل اور خالد دونوں محمود کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔
''کہاں رہ گیا جا کر۔'' افضل نے خالد سے پوچھا۔ ''بہت دیر ہوگئی۔''
''ہاں۔'' خالد نے گردن ہلائی۔ ''ہوسکتا ہے کہ جنگل میں دور تک چلا گیا ہو۔''
''عجیب بے وقوف آدمی ہے۔ جب کچھ نہیں ملا تھا تو اب تک واپس آجانا چاہیے تھا۔''
''ہوسکتا ہے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔'' خالد نے خدشہ ظاہر کیا۔
''تو چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''
''نہیں بھائی، میں سانپ وانپ سے بہت ڈرتا ہوں۔'' خالد نے کہا۔
اسی وقت سامنے سے اڑتی ہوئی دھول نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ بیلا پور کی طرف سے کوئی گاڑی آرہی تھی۔ دونوں اسے دیکھنے لگے۔
آنے والی ایک پرانی فوکسی تھی جو گرد اڑاتی ہوئی آرہی تھی۔
''ارے یہ تو تھانے دار اکرم کی گاڑی ہے۔'' افضل نے کہا۔
''ہاں، اسی کی ہے۔'' خالد جلدی سے بولا۔ ''اور سنو، اس کم بخت کو محمود کے بارے میں کچھ مت بتانا۔''
''وہ کیوں؟''
''تم کو تو معلوم ہے نا پچھلے مہینے دونوں کا کتنا جھگڑا ہو چکا ہے۔'' خالد نے کہا۔ ''یہ سالا محمود کا دشمن بنا ہوا ہے۔''
اس دوران تھانے دار کی فوکسی ان کی وین کے پاس آکر رک گئی۔ اکرم گاڑی سے اتر کر اپنی توند سنبھالتا ہوا ان دونوں کی طرف چلا آرہا تھا۔
''کیا بات ہے کیا ہوگیا۔ خیر تو ہے؟'' اکرم نے ان کے قریب آکر پوچھا۔
''ہاں ہاں سب خیریت ہے۔'' افضل نے جواب دیا۔
''تو پھر یہاں کیوں رکے ہوئے ہو؟''

''یونہی، راستے میں مجھے پیشاب کی حاجت ہونے لگی تھی۔'' خالد نے بتایا۔
''ہوں۔'' اکرم نے ایک گہری سانس لی۔ اس کی نگاہ اب تک پھیلی ہوئی جھاڑیوں کی طرف نہیں گئی تھی۔ ''اور تمہارے جگری یار کا کیا حال ہے؟''
''کس کا پوچھ رہے ہو تھانے دار صاحب۔'' افضل نے پوچھا۔
''محمود کی بات کر رہا ہوں۔'' تھانے دار غرایا۔ ''اس کو بتا دینا کہ مجھ سے بچ کر رہے۔ کسی دن اندر کروا دوں گا تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔''
اتنا کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ شاید اسے کہیں جانے کی جلدی تھی اسی لیے وہ زیادہ نہیں رکا۔ اس کی گاڑی کے نکل جانے کے بعد افضل نے کہا۔ ''ایک نمبر کا کمینہ انسان ہے۔ دیکھ لینا یہ کسی نہ کسی دن محمود کو کسی چکر میں ضرور پھنسا دے گا۔''
''ہاں یار! ویسے محمود کو بہت دیر ہوگئی ہے۔ اب تو چل کر دیکھنا ہی ہوگا۔''
''نہیں یار۔'' خالد ہچکچانے لگا۔ ''وہ خود ہی آجائے گا۔''
''آؤ یار، اب ایسا بھی کیا ڈرنا۔'' افضل نے خالد کا بازو تھام لیا۔
دونوں ٹائروں کے نشانات پر پھیلی ہوئی گھاس اور پودوں کے درمیان آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگے۔ اچانک افضل ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے کچھ دیکھ لیا تھا۔
''کیا بات ہے؟'' خالد نے پوچھا۔ ''کیوں رک گئے؟ کوئی سانپ ہے کیا؟''
''سانپ تو نہیں، کوئی بندہ پڑا ہوا ہے۔'' افضل نے بتایا۔
اب خالد نے بھی درختوں کی قطار سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے سے گڑھے کے پاس کسی کو دیکھ لیا تھا۔ کوئی آدمی ہی تھا۔
وہ دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔
وہ آدمی بری طرح زخمی تھا۔ اس کا پورا لباس خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں بند تھیں لیکن ہونٹ لرز رہے تھے۔ افضل نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کی سانسیں محسوس کرتے ہوئے بتایا۔ ''خالد یہ زندہ ہے۔''
''خدا جانے کون ہے۔ ہم کسی چکر میں نہ پھنس جائیں۔''
''پاگل ہوگئے ہو۔ ایک مرتے ہوئے آدمی کو ہماری ضرورت ہے اور ہم یونہی چھوڑ کر چلے جائیں۔''
''تو پھر کیا کریں؟''
''اگر اسے ہاسپٹل پہنچا دیں تو اس کی زندگی بچ سکتی ہے۔'' افضل نے کہا۔ ''چلو میری مدد کرو۔ اٹھاؤ اس کو۔''

☆☆☆

11 جولائی...
صندوق بہت وزنی تھا۔
محمود کی پوری کوشش تھی کہ وہ اس صندوق کو ہائی روف سے دور کسی ایسی جگہ لے جا کر چھپا دے جہاں اسے تلاش نہ کیا جاسکے۔
اب اسے اپنے دونوں ساتھیوں کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ دونوں اس کا انتظار کر کے چلے بھی جاتے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
وہ بعد میں ان سے کوئی بہانہ کر سکتا تھا۔ کوئی بھی بہانہ۔ راستے میں کوئی بھیڑیا مل گیا تھا یا سانپوں نے اس کا راستہ روک لیا تھا، کچھ بھی کہا جاسکتا تھا۔
اس وقت اصل مسئلہ تو اس صندوق کو چھپانے کا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس صندوق کو ہائی روف سے باہر لے آیا تھا۔ اب اسے گھسیٹتے ہوئے لے جانے کا مرحلہ تھا۔
اس نے صندوق کو دھکیلنا اور کھینچنا شروع کردیا۔
ایک قدم، دو قدم، دس قدم۔ کچھ فاصلے پر درختوں کا ایک گھنا جھنڈ تھا۔ یہ صندوق اس جھنڈ کے درمیان آسانی سے چھپ سکتا تھا۔
صندوق چھپانے کے بعد دوسرا کام تھا... زمین پر صندوق کے گھسیٹے جانے کے نشانات کو مٹانا۔ اس کام کے لیے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے پتے بہت کام آسکتے تھے۔
درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچتے پہنچتے اس کی سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ وہ کچھ دیر دم لینے کے لیے صندوق کے پاس ہی بیٹھ گیا۔
پھر اچانک ہی کوئی اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔
محمود نے خوف زدہ نگاہوں سے آنے والے کی طرف دیکھا۔ یہ وہی ہائی روف کا ڈرائیور تھا۔ جس کو اس نے مردہ سمجھ لیا تھا لیکن وہ زندہ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے رحم سی مسکراہٹ تھی اور اس کے ایک ہاتھ میں ایک پستول دبا ہوا تھا جس کا رخ محمود ہی کی طرف تھا۔

☆☆☆

25 جون...

شیر خان کا فلیٹ اس عمارت کی تیسری منزل پر تھا۔
اس عمارت میں لفٹ نہیں تھی اسی لیے آنے جانے کے لیے سیڑھیاں ہی استعمال کی جاتیں۔
نیلم دوسری منزل تک پہنچ چکی تھی اور تیسری منزل کے لیے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ کوئی اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔
نیلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑی بڑی مونچھوں والا شخص تھا جس کی آنکھیں بہت چمک دار تھیں۔
''اوہ۔'' نیلم نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ ''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''
''آؤ، جلدی سے میرے فلیٹ میں آجاؤ۔'' مونچھ والے نے کہا۔
اس کا فلیٹ دوسری منزل پر ہی تھا۔
نیلم جلدی سے اس کے فلیٹ میں داخل ہوگئی۔
''داور! میں آنا نہیں چاہتی تھی۔'' نیلم نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''سالا ایک نمبر کا مطلبی انسان ہے۔''
''نہیں میری جان، تم نے آکر عقل مندی کی ہے۔'' داور بھی اس کے برابر بیٹھ گیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس کے ذہن میں پھر کوئی کیڑا رینگ آیا ہو۔ میں نے اس بونے پھلجھڑی کو بھی دیکھا ہے۔''
''او گاڈ! وہ دونوں کہیں مجھے نہ دیکھ لیں۔'' نیلم کچھ پریشان ہوگئی۔ ''تم نے بھی تو اسی بلڈنگ میں فلیٹ لے لیا ہے۔ کیا شہر میں کوئی دوسری جگہ نہیں ملی تھی؟''
''یار! کیا کرتا، سلیقے کا فلیٹ سستے میں مل رہا تھا۔ میں نے فوراً لے لیا۔''
''کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے۔'' نیلم نے اندیشہ ظاہر کیا۔
''کم از کم اس وقت تو نہیں دیکھے گا۔''
''وہ کیوں؟''
''میں نے دو پولیس والوں کو اس کے فلیٹ میں جاتے ہوئے دیکھا ہے۔'' داور نے بتایا۔ ''تم سمجھ ہی گئی ہوگی کہ وہ کون ہوسکتا ہے؟''
''سب انسپکٹر جواد؟''
''ہاں وہی ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور بھی ہے۔''
''یہ جواد بھی بہت چالاک بندہ ہے۔'' نیلم نے گہری سانس لی۔ ''اس کو دس میل دور سے بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہو رہی ہے۔''
''اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا شیر خان پھر کسی چکر میں ہوگا۔'' داور نے کہا۔ ''پھلجھڑی کو بھی اسی لیے بلایا ہوگا۔''
''اب تم بتاؤ، میں اس وقت اس کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں؟''
''ضرور جاؤ۔'' داور نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''پولیس والے چلے جائیں تو پھر اس کے پاس جانا اور اس سے آگے تو تم خود جانتی ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔''
''کیوں نہیں، یہ دیکھنا ہے کہ ان کی کیا پلاننگ ہے اور تمہیں بتاتے رہنا ہے۔'' نیلم نے کہا پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''یہ بتاؤ، یہاں رہتے ہوئے کیا کبھی اس سے تمہاری مڈبھیڑ نہیں ہوئی؟''
''نہیں، تم کو تو معلوم ہوگا کہ یہاں ایک عقبی زینہ بھی ہے۔ ایمرجنسی والا۔ میں اسی سے آیا جایا کرتا ہوں۔''
نیلم، داور کے ساتھ بیٹھی تھی اور ان دونوں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پھلجھڑی اس وقت داور کے دروازے ہی پر کھڑا ہوگا۔

☆☆☆

11 جولائی...
وہ دونوں بڑی مشکلوں سے اس زخمی کو اٹھا کر وین تک لائے تھے۔
محمود کا ابھی تک کوئی پتا نہیں تھا۔ دوسری طرف اس زخمی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ انتظار کیا جاسکتا۔ اس کی حالت غیر ہوتی جارہی تھی۔
''لعنت بھیجو اس محمود پر۔'' افضل نے کہا۔ ''زندہ رہا تو خود آجائے گا۔ ہمیں اس بندے کو ہاسپٹل پہنچانا ہے۔''
سامنے سے پھر گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی۔
''لعنت ہو۔'' خالد نے شور مچایا۔ ''لگتا ہے وہ تھانے دار واپس آرہا ہے۔ اس بار وہ ضرور ہمارے پیچھے پڑ جائے گا کہ ہم ابھی تک یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ یہ زخمی کون ہے۔ ہم کہاں سے اٹھا کر لائے ہیں یا اسے کہاں لے جارہے ہیں۔ یہ پولیس والے ایسی باتوں پر پریشان کرکے رکھ دیتے ہیں۔''
''تو پھر کیا کریں؟''
''گاڑی واپس کرو۔ بیلاپور کی طرف۔ کہہ دیں گے گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ اس کو ٹھیک کرنے میں دیر لگ گئی۔''
''تو پھر جلدی کرو۔''
لیکن ان سے جلدی نہیں ہوسکی۔

وین نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا تھا۔ اس کا انجن غرا کر رہ گیا۔
''کیا مصیبت ہوگئی؟'' خالد غرایا۔ ''اس کم بخت کو بھی اسی وقت...''
تھانے دار کی فوکسی پھر ان کے سامنے آکر رک گئی۔ تھانے دار نواز فوکسی سے اتر کر ان کے پاس آگیا۔ ''اب کیا مصیبت ہوگئی؟'' اس نے پوچھا۔ ''تم لوگ ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟''
''گاڑی اسٹارٹ نہیں ہورہی نواز بھائی۔'' افضل نے بتایا۔
خالد کی ایک اور کوشش پر انجن ایک بار اور غرا کر رہ گیا۔
''سمجھ گیا۔'' تھانے دار نے اپنی گردن ہلائی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں بیلاپور کی طرف واپس جارہا ہوں۔ کسی مکینک کو بول دیتا ہوں۔ وہ آجائے گا۔ تم دونوں میرے ساتھ چلو۔''
''نہیں نواز بھائی، تم چلے جاؤ۔'' خالد نے کہا۔ ''گاڑی میں کریٹ بھرے ہوئے ہیں۔ تم کو تو معلوم ہے کہ ان علاقوں میں کتنے چور اچکے گھومتے پھرتے ہیں۔''
''ہاں، یہ تو ہے۔'' تھانے دار نواز علی اپنی فوکسی کی طرف بڑھ گیا۔
''خدا کا شکر ہے۔'' افضل نے ایک گہری سانس لی۔ ''یہ تو جان کا عذاب ہوگیا تھا۔''
''یار! اب اس زخمی سے پیچھا چھڑاؤ۔'' خالد نے کہا۔ ''اب اگر ہم اسے ہاسپٹل لے گئے تو خود پھنس جائیں گے۔ تھانے دار ہمیں دیکھ کر گیا ہے۔''
''یہ تو ہے۔'' اس بار افضل نے بھی اس سے اتفاق کیا تھا۔ ''اب یہی ہوسکتا ہے۔''
دونوں زخمی کی طرف متوجہ ہوئے۔
''خدا کی پناہ۔'' افضل خوف زدہ ہوکر چلّایا۔ ''یہ تو مر چکا ہے۔''
''کیا؟'' خالد بوکھلا اٹھا۔
''ہاں، دیکھو اس کا پورا بدن ٹھنڈا ہورہا ہے۔''

☆☆☆

11 جولائی...
محمود کے سامنے کھڑا ہوا آدمی خون خوار نگاہوں سے محمود کی طرف دیکھ رہا تھا۔
اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کا رخ محمود ہی کی طرف تھا۔ کسی بھی وقت اس کی انگلی ٹریگر کو دبا سکتی تھی اور محمود کی کہانی ختم ہوجاتی۔
سڑک پر کھڑے ہوئے اس کے ساتھیوں کو پتا بھی نہیں چلتا کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔
وہ آدمی خود بھی زخمی تھا۔ اس کے چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ وہ آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔ اس کے باوجود اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔
محمود کا ہاتھ آہستہ آہستہ صندوق کے پاس رکھے ہوئے ایک پتھر کی طرف رینگتا جارہا تھا۔ اس آدمی نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے ٹریگر دبا ہی دیا۔
ہلکی سی کھٹک کی آواز... یا تو چیمبر میں گولی نہیں تھی یا اس کے پستول میں کوئی خرابی ہوگئی تھی۔ اسی وقت محمود کا ہاتھ چلا اور وہ بڑا سا پتھر اس شخص کے سر کو پھاڑتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔
وہ ایک کریہہ چیخ کے ساتھ ایک طرف الٹ گیا۔
اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر ایک طرف جا گرا۔
محمود نے پستول اٹھانے میں دیر نہیں لگائی تھی لیکن اب اس شخص کے لیے پستول وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں تھی۔
وہ نیم ذبح مرغ کی طرح تڑپ رہا تھا۔ محمود سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد اس شخص کا تڑپنا کم ہوتا چلا گیا۔
اس کے ہاتھ پیر اب ساکت ہوگئے تھے اور یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ مرچکا ہے۔
کچھ دیر تک محمود کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا ہوچکا ہے۔
اس نے تو زندگی میں کبھی کسی پرندے کو بھی نہیں مارا تھا اور اب اس کے ہاتھوں ایک خون ہوچکا تھا۔
وہ آدمی چند لمحے پہلے اس کے سامنے جیتا جاگتا کھڑا تھا۔ لیکن اب مرچکا تھا۔
محمود کے پھینکے ہوئے پتھر نے اس کا کام تمام کردیا تھا۔
محمود کے ہاتھوں ایک خون ہوگیا تھا۔
اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسی جگہ اسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ ایک طرف نہ جانے کتنے نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق اور دوسری طرف ایک لاش۔
ذہن پر چھائی ہوئی دھند جب صاف ہوئی تو اس نے صندوق کو دوبارہ کھینچنا شروع کردیا۔ درختوں کا جھنڈ اب چند ہی گز کے فاصلے پر تھا۔

اس نے جھنڈ کے درمیان صندوق کو ایک جگہ چھپا کر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور پودے اکھٹے کر کے اس صندوق کو پوری طرح چھپا دیا۔

صندوق تو سرسری طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن ڈرائیور کی لاش سامنے پڑی ہوئی تھی۔ اسے چھپانا بہت ضروری تھا۔

اس کے پاس ایسا کوئی اوزار بھی نہیں تھا جس کی مدد سے وہ اس لاش کو دفن کرنے کے لیے گڑھا کھود سکتا۔

اس کے آس پاس درختوں کی خشک لکڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ انہی کو اپنا اوزار بنا سکتا تھا۔ اس لیے ایک نکیلی شاخ اٹھائی اور گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔

اس جنگل میں آنے کے بعد جو کچھ بھی تھا، وہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ اس نے پہلی بار کوئی ایکسیڈنٹ دیکھا تھا۔ پہلی بار اتنے ڈھیر سے نوٹ دکھائی دیے تھے۔

اور پہلی بار اس کے ہاتھ سے کسی کا قتل ہوا تھا۔

لیکن وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ وہ اگر اسے نہیں مارتا تو وہ اسے مار دیتا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔ بس ایک لمحے کی دیر تھی۔

لہٰذا اس نے جو کیا، وہ غلط نہیں کیا۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے کیا تھا اور یہ ہر انسان کا حق ہے لیکن اب اس کی لاش کا کیا کیا جائے۔

وہ لاش درختوں کے جھنڈ کے پاس پڑی تھی اور جھنڈ میں وہ صندوق تھا جس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ وہ ذرا سی دیر میں اچھا خاصا گڑھا کھود چکا تھا لیکن ابھی بھی بہت کام باقی تھا۔ اتنی لمبی چوڑی لاش کے لیے گڑھا بھی بڑا ہونا چاہیے تھا۔

اس پر ایک جنون سا سوار تھا۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ اس سے کچھ فاصلے پر درختوں کے پار اس کے دو دوست اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔

☆☆☆

25 جون...

سب انسپکٹر جواد، شیر خان کی جان کو اٹک گیا تھا۔

نہ جانے کس طرح بہانے کر کے شیر خان نے اسے بھیج دیا تھا لیکن اسے اندازہ تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ کچھ بھی کہہ لو۔ پولیس والے مطمئن نہیں ہوتے۔

بہرحال، اب یہ وقت ایسی باتوں پر دھیان دینے کا نہیں تھا۔ وقت کم رہ گیا تھا اور کام بہت تھا۔ ''یار! خدا کے واسطے اس کم بخت سلطان کو بلا کر لے آ۔''

''یار! میں تو جا ہی رہا تھا۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''اچانک پولیس والا آٹپکا۔ اب نکل رہا ہوں۔''

''ہوشیاری سے جانا۔ ایسا نہ ہو وہ سالے گیٹ پر ہی گھات لگائے بیٹھے ہوں۔''

''اس کی تم فکر نہ کرو۔''

پھلجھڑی فلیٹ سے باہر آگیا۔ کوریڈور میں کوئی نہیں تھا۔ سیڑھیاں بھی خالی تھیں۔ گیٹ پر بھی کوئی نہیں تھا لیکن گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے چوکیدار نے اسے آواز دے لی تھی۔ ''صاحب! ذرا بات سنو۔''

پھلجھڑی رک گیا۔ چوکیدار اس کے پاس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موبائل تھا۔ ''صاحب! ہم ایماندار آدمی ہے۔ ہم کسی کا مال اپنے پاس نہیں رکھتا۔''

''بات کیا ہے؟''

''یہ موبائل میم صاحب کا ہے۔ ادھر گیٹ کے پاس گر گیا تھا۔ اس کو تو پتا بھی نہیں چلا۔ ہم امانت سمجھ کر اٹھا کر اپنے پاس رکھ لیا۔''

''بہت اچھا کیا تم نے۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''لیکن میم صاحب کب آیا تھا؟''

''ابھی تو آیا تھا صاحب! سیڑھی سے اوپر گیا ہے۔'' چوکیدار نے بتایا۔

پھلجھڑی الجھ کر رہ گیا۔ نیلم آئی تھی۔ سیڑھیوں کے راستے اوپر گئی تو پھر شیر خان کے فلیٹ میں کیوں نہیں پہنچی۔ راستے میں کہاں رہ گئی؟

اس بلڈنگ میں شیر خان کے فلیٹ کے علاوہ وہ اور کہاں جا سکتی تھی۔ کس کے پاس جا سکتی تھی؟ لیکن اسے اپنی اس الجھن کا اظہار چوکیدار سے تو نہیں کرنا تھا۔ ''ٹھیک ہے خان صاحب! تمہارا شکریہ۔ میں اسے یہ موبائل پہنچا دوں گا۔'' موبائل لے کر وہ باہر جانے کے بجائے سیڑھیوں کی طرف واپس آگیا۔

ہر منزل پر دو دو فلیٹس بنے ہوئے تھے۔ وہ پہلی منزل پر آ کر رک گیا۔ اس نے بہت احتیاط سے ایک دروازے سے کان لگا دیے۔ اندر سے بچوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

سامنے والے دوسرے فلیٹ میں ٹی وی چل رہا تھا۔ اس میں صرف ٹی وی کی آواز تھی۔ وہ دوسری منزل پر آگیا۔ دوسری منزل کے ایک فلیٹ سے جھگڑے کی آوازیں آرہی تھیں۔

ایک عورت اور ایک مرد کی آوازیں۔ اور یہ دونوں میاں بیوی ہو سکتے تھے۔ ان کی آوازیں اور ان کا اسٹائل بتا

رہا تھا کہ وہ میاں بیوی ہی ہو سکتے ہیں۔ بہت گھریلو قسم کی باتیں تھیں۔

لیکن دوسرا فلیٹ۔ اس کے برابر والے فلیٹ سے جو آواز آرہی تھی۔ وہ ایک عورت کی تھی اور وہ عورت نیلم کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر ایک مرد کی آواز آئی۔ بہت دھیمی سی آواز تھی لیکن پھلجھڑی نے وہ آواز بھی پہچان لی تھی۔ وہ داور کی آواز تھی۔

داور جو شیر خان اور پھلجھڑی کا مخالف تھا۔ جس نے ان دونوں کو کئی بار نقصان پہنچایا تھا۔ یہ سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔

ان کے درمیان اختلافات کئی برسوں پہلے شروع ہوئے تھے اور یہ سلسلہ ابھی تک چل رہا تھا لیکن یہ نیلم یہاں کیا کر رہی تھی؟

ایک طرف تو اس کے تعلقات شیر خان سے تھے اور دوسری طرف وہ داور کے پاس تھی۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ ڈبل کراس کر رہی ہے۔

پھلجھڑی دروازے سے ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ دو فلیٹوں کے درمیان اتنی جگہ بھی نہیں تھی کہ وہ کہیں چھپ سکے۔ اسی لیے اسے دوبارہ سیڑھیوں پر آنا پڑا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد داور کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور نیلم باہر آگئی۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر تیسری منزل پر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی کہ پھلجھڑی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

صرف ایک لمحہ۔ صرف ایک لمحے کے لیے نیلم کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا پھر وہ نڈھال ہو کر ایک طرف کھسکتی چلی گئی۔

پھلجھڑی نے اپنے بازوؤں کے سہارے سے اس کو سنبھال لیا تھا۔ ورنہ وہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھک جاتی۔ نیلم نے بہت مضبوطی سے پھلجھڑی کا ہاتھ تھام لیا۔ ''خدا کے لیے مار دو اس کو۔ زندہ نہیں رہنے دو۔ تم کو میری قسم مار دو اس کو۔''

''کیا ہوا ہے تمہیں؟'' پھلجھڑی نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو؟''

''وہ داور۔'' نیلم کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''وہ سیڑھیوں پر مل گیا تھا۔ وہ گن پوائنٹ پر مجھے اپنے فلیٹ میں لے گیا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اس نے بھی اسی بلڈنگ میں فلیٹ لے رکھا ہے۔''

''اوہ۔'' پھلجھڑی نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں بھی تمہیں اس کے فلیٹ سے نکلتے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ مار دو اس کم بخت کو۔''

''اچھا اچھا اس وقت ہوش میں آؤ۔ سنبھالو خود کو۔'' پھلجھڑی نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''تم آؤ، میرے ساتھ چلو۔ کچھ دیر کے لیے یہاں سے ہٹ جاؤ۔''

نیلم نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ پھلجھڑی کو اچانک سامنے دیکھ کر وہ بری طرح نروس ہو گئی تھی اور اب اسے فون کر کے داور کو ساری سچویشن بتانی تھی۔

☆☆☆

25 جون...

پھلجھڑی، نیلم کو لے کر ایک ہوٹل میں آگیا تھا۔

اس لڑکی پر شروع سے اس کی نظر تھی۔ چٹاخ پٹاخ سی یہ لڑکی پھلجھڑی کو بہت پسند تھی۔ اس کا حسن اگر قاتلانہ تھا تو ادائیں ظالمانہ تھیں۔

لیکن مصیبت یہ تھی کہ وہ شیر خان کی محبوبہ تھی اور اس کے اشاروں پر ناچتی تھی۔ نیلم، پھلجھڑی کا بھی بہت لحاظ کرتی تھی۔

پھلجھڑی، شیر خان کی طرح جنگلی اور درندہ نہیں تھا۔

''نیلم! شیر خان تم سے ایک کام لینا چاہتا ہے۔'' پھلجھڑی نے بتایا۔ ''اس کا خیال ہے کہ یہ کام سوائے تمہارے اور کوئی نہیں کر سکتا۔''

''کوئی بڑا منصوبہ ہوگا؟''

''ہاں، وہ استاد سلطان سے کام لینا چاہتا ہے۔'' پھلجھڑی نے کہا۔ ''اور تم جانتی ہو کہ استاد سلطان تمہاری ایک نگاہ کا محتاج رہتا ہے۔''

''سمجھ گئی اور شیر خان یہ چاہتا ہے کہ میں اس کے کام کے لیے قربانی کی بکری بن جاؤں۔''

''ایسا ہی سمجھ لو اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم کو صرف میں ہی اس کام کے لیے راضی کر سکتا ہوں اس لیے اس نے تمہارے لیے میری ڈیوٹی لگائی ہے۔''

''لیکن سلطان اس بار شاید اس کے جھانسے میں نہیں آئے...'' نیلم نے کہا۔ ''شیر خان اسے دھوکا دے چکا ہے۔''

''اسی لیے تو وہ تمہاری مدد لے رہا ہے۔''

''بہت مشکل ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ''سلطان نہیں مانے گا۔''

''لیکن تم اسے مناؤ گی۔ شیر خان کے لیے نہیں بلکہ

اپنے لیے اور میرے لیے...“

”کیا مطلب؟“ نیلم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ شیر خان سے چھٹکارا حاصل کرو۔ کیا تم یہ نہیں چاہتیں کہ خود تمہارے پاس لاکھوں روپے ہوں تاکہ تم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکو؟“

نیلم کی آنکھوں میں خواب سجنے لگے۔

”تو پھر کیا چاہتے ہو تم؟“ نیلم نے پوچھا۔

”تم کسی طرح استاد سلطان کو اس کام کے لیے راضی کرلو۔“ پھلجھڑی نے بتایا۔ ”میرے ذہن میں پوری پلاننگ ہے۔ بظاہر تم یہ کام شیر خان کے لیے کرو گی لیکن اصل میں اپنے اور میرے لیے کرو گی۔ کیونکہ میں تمہیں راستہ دکھا رہا ہوں۔ میں تمہارے لیے نکلنے کا بندوبست کر دوں گا۔ پھر تم اپنی مرضی کی زندگی گزارتی رہنا۔“

”اور شیر خان کا کیا ہوگا؟“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“ پھلجھڑی نے کہا۔ ”اس کا بندوبست کرنا میرا کام ہے۔ تم یہ اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ صرف طاقت ہے۔ اس میں ذہانت نام کی کوئی چیز نہیں ہے جبکہ اس کا دماغ میں ہوں۔“

”ہاں، یہ تو میں جانتی ہوں۔“ نیلم نے اپنی گردن ہلائی۔

”تو پھر ابھی چلو میرے ساتھ۔“

”کہاں؟“ نیلم نے پوچھا۔

”استاد سلطان کے پاس، وہ تمہیں دیکھ کر نہال ہو جائے گا۔“ پھلجھڑی ایک آنکھ دبا کر بولا۔

”تم مرد بہت بدمعاش ہوتے ہو۔“ نیلم جھینپ کر بولی۔ ”عورت سے کام نکلوانا اچھی طرح جانتے ہو۔“

”بس اب اٹھ جاؤ۔“ پھلجھڑی نے کہا۔ ”استاد اس وقت اپنے اڈے ہی پر ہوگا۔“

استاد کا اڈا ایک گیرج تھا۔

یہ گیرج بھی شہر کے ایک دور افتادہ علاقے میں بنایا گیا تھا۔ اس کے گیرج میں بہت کم گاڑیاں مرمت کے لیے آیا کرتیں لیکن استاد کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کا کام کسی اور انداز سے چلا کرتا تھا۔ اس کے اور بھی کئی دھندے تھے۔

وہ پھلجھڑی کو دیکھ کر بدک تو گیا لیکن اس کے ساتھ نیلم کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل اٹھیں۔ پھر بھی اس نے یہی ظاہر کیا جیسے وہ ان دونوں کے خلاف بھرا بیٹھا ہو۔ ”اب کیا لینے آئے ہو تم دونوں؟“ وہ غصے سے بولا۔ ”مجھے دھوکا دیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟“

”استاد جی۔“ نیلم نے اپنی آواز میں مٹھاس اور لچک پیدا کی۔ ”جو کچھ ہوا، وہ تم بھی جانتے ہو کہ ہم اس شیر خان کے سامنے مجبور ہو گئے تھے۔ تمہیں بھی معلوم ہے کہ وہ کیسا آدمی ہے۔ وہ کسی کا لحاظ کرنا نہیں جانتا۔ ذرا سی بات پر گولیاں برسانے لگتا ہے۔“

”جانتا ہوں میں، لیکن تمہیں اتنا تو کرنا چاہیے کہ مجھے خبردار کر دیتے۔ میں اس کی طرف سے ہوشیار ہو جاتا۔“

”ہمیں موقع ہی نہیں ملا تھا استاد۔“ پھلجھڑی نے کہا۔ ”ورنہ یہ نیلم تو تمہارے لیے پریشان ہو رہی تھی۔“

”ہاں استاد جی! مجھے صرف تمہاری فکر تھی کہ تم خدا جانے کیا سوچ رہے ہو گے۔“ نیلم اٹھلا کر بولی۔ ”شیر خان سے میرا خوف کا رشتہ ہے۔ یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

”خیر خیر، یہ بتاؤ اب کیسے آنا ہوا؟“ استاد نے پوچھا۔

”اب یہ پوری کہانی تو نیلم ہی بتائے گی۔“ پھلجھڑی نے کہا۔ ”میں تو چلتا ہوں۔ وہ کم بخت میرے انتظار میں ہو گا۔ وہ ہر بات میں شک کرتا ہے۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ نیلم نے اس کی طرف دیکھا۔ ”اور میری طرف سے پیغام دے دینا کہ میں استاد سلطان کے پاس پہنچ چکی ہوں اور میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔“

پھلجھڑی معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا باہر چلا گیا۔

نیلم بھی معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

اسے کام شیر خان کے لیے کرنا تھا۔ صرف دکھانے کے لیے۔ جبکہ پھلجھڑی یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی اصل ہمدردیاں صرف اور صرف داور کے لیے ہیں۔

استاد سلطان کو داور کے لیے راستے پر لانا تھا۔ شیر خان یا پھلجھڑی کے لیے نہیں۔

☆☆☆

25 جون...

استاد سلطان نے جب نیلم کی صاف صاف باتیں سنیں تو چکرا کر رہ گیا۔

نیلم نے اس سے کہا تھا۔ ”استاد! اصل بات یہ ہے کہ ایک انار اور سو بیمار والی کہانی چل رہی ہے۔ سب کے سب میرے چکر میں ہیں۔ شیر خان، پھلجھڑی اور خود تم۔ میری بات خاموشی سے سنتے رہو۔ میں بھی کوئی فرشتہ نہیں رہی۔ مجھے بھی برباد کر دیا گیا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے اپنا کھلونا بنانا

چاہتے ہو اور میں اس کے لیے تیار ہوں... کیونکہ یہ معاملہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کا ہے۔ جب سب ہی سودے بازی کر رہے ہیں تو میں کیوں نہ کروں۔ میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں، بشرطیکہ تم میرا ساتھ دو۔“

استاد سلطان کے لیے اتنا ہی بہت تھا کہ نیلم جیسی طرح دار لڑکی کچھ ہی دنوں یا دیر کے لیے سہی اس کا دل بہلانے کو تیار ہو گئی تھی۔

”بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو؟“ استاد نے پوچھا۔

اس وقت اس کی سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ ویسے بھی وہ پچاس اور پچپن کے درمیان ایک لاغر قسم کا انسان تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغوں نے اسے اور بھی بدنما کر دیا تھا۔

اس کے باوجود مجرموں کی دنیا میں اس کی ساکھ بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کام کا ماہر تھا اسی لیے اسے استاد کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ وہ استاد سلطان کہلاتا تھا۔

اس کے نخرے اٹھائے جاتے، اس کی خاطر مدارات ہوتی۔ اس کی ہر بات مانی جاتی۔ شیر خان پہلے بھی کئی بار اس سے کام لے چکا تھا۔

لیکن پچھلی بار شیر خان نے اسے ایک دھوکا دیا تھا اس لیے اس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اب شیر خان کے لیے کام نہیں کرے گا۔

لیکن اس کو منانے کے لیے نیلم اس کے پاس چلی آئی تھی۔

اور نیلم اب خود بھی شیر خان کو دھوکا دینا چاہتی تھی۔ اس نے استاد سلطان کی بات مان لینے کا اقرار کر لیا تھا۔ سارے معاملات طے ہو گئے تھے۔ اب ان دونوں کو شیر خان کے پاس جانا تھا۔

استاد سلطان کو دیکھتے ہی شیر خان لپک کر اٹھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے پھلجھڑی پھر نیلم کو تھپکی دی۔ ”میری جان! میں جانتا تھا کہ یہ کام تمہارے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔“

”بس، تم اسی طرح میرا امتحان لیتے رہو۔“ نیلم ایک ادا سے بولی۔

”اب تمہارا کیا امتحان لینا۔“ شیر خان مسکرا دیا۔ ”تم تو پہلے ہی امتحان میں پاس ہو چکی ہو۔“

”وہ کس طرح؟“

”اپنے استاد سلطان کو اپنے ساتھ لا کر۔“

”لیکن استاد تو تمہیں معاف کرنے کو تیار نہیں ہے۔“

”تم سفارش کر دو گی تو مان ہی جائیں گے۔“ شیر خان نے کہا۔

”استاد!“ نیلم نے استاد سلطان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیا خیال ہے، معاف کر دیں اس بندے کو؟“

”اب تم نے سفارش کر دی ہے تو بات تو ماننی ہی ہو گی۔“

”یہ بات ہوئی نا۔“ شیر خان اچھل پڑا۔ ”بس اب جلدی سے پہلے پارٹی ہو جائے۔ اس کے بعد آگے کی بات ہو گی۔“

”تم لوگ معاملے کی بات کرو۔ میں پارٹی کا بندوبست کر کے آتا ہوں۔“ پھلجھڑی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”یار! یہ بات تمہارے سامنے کرنی ہے۔“ شیر خان نے کہا۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم خود سمجھ دار ہو اور یہ کوئی نیا معاملہ تو نہیں ہے۔ بات کرو، میں آتا ہوں۔“

”جلدی واپس آنا۔“ نیلم نے اس کی طرف دیکھا۔

☆☆☆

25 جون...

داور نے اپنی زندگی شاندار بنانے کی بہت کوشش کی تھی۔

اس نے کئی بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالا لیکن اس کی قسمت نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ وہ اور شیر خان پہلے ایک ساتھ ہی ہوا کرتے تھے لیکن پھر دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شیر خان کاروبار میں دھوکے دینے لگا تھا اور دوسری وجہ نیلم تھی۔ شیر خان نے نیلم کو کس طرح قریب کیا تھا۔ یہ راز آج تک داور کو معلوم نہیں ہو پایا تھا۔

نیلم کو اس نے پہلے ہی دن سے پسند کر لیا تھا۔

یہ لڑکی اس کے کام کی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ شیر خان کے ساتھ منسلک تھی۔

پھر یہ ہوا کہ نیلم بھی داور کو پسند کرنے لگی لیکن شیر خان سے چھپ کر دونوں ملاقاتیں کیا کرتے۔ ایک دن یہ راز شیر خان پر ظاہر ہو ہی گیا لیکن اس انداز سے ظاہر ہوا تھا جیسے صرف داور ہی نیلم میں دلچسپی لے رہا ہے اور نیلم کو داور سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

ان ہی وجوہات پر دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا اور دونوں کی راہیں الگ ہو گئیں۔

شیر خان کے ساتھ پھلجھڑی رہ گیا تھا۔ جو ایک ذہین اور مکار انسان تھا۔ شیر خان کے جرائم کی پلاننگ وہی کیا کرتا تھا۔

داور نے شیر خان سے الگ ہو کر اپنا گروپ بنا لیا تھا۔ لیکن ابھی تک اسے کوئی بڑی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

وہ شیر خان کی کامیابیاں دیکھ دیکھ کر آگ بگولہ ہوا کرتا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ کسی بھی دن وہ شیر خان سے اس کی زیادتیوں کا ضرور بدلہ لے گا۔

نیلم سے اس کی ملاقاتیں جاری تھیں۔ نیلم اسے شیر خان کی کامیاب وارداتوں کے بارے میں بتا دیا کرتی۔ شیر خان سے بدلہ لینے کے لیے اس نے ایک بہت بڑا خطرہ بھی مول لے لیا تھا۔

اس نے اسی بلڈنگ میں ایک فلیٹ حاصل کر لیا تھا جس میں شیر خان کی رہائش تھی۔

اس کا منصوبہ ایسا تھا کہ اسے شیر خان کو ٹھکانے لگانے کے لیے زیادہ محنت بھی نہیں کرنی پڑتی۔

شیر خان کا فلیٹ اس کے فلیٹ کے بالکل اوپر تھا۔ اس کا بیڈ روم اس کے بیڈ روم کے بالکل اوپر ہی ہو سکتا تھا۔ غسل خانے سے ایک پائپ لائن اوپر کی طرف چلی گئی تھی۔

اسے صرف اتنا کرنا تھا کہ اپنے غسل خانے کی پائپ لائن کے ذریعے رات کے وقت شیر خان کی خواب گاہ میں داخل ہو اور اس کا کام کر کے واپس اپنے فلیٹ میں آجائے۔

شیر خان جیسے لوگوں کے بے شمار دشمن ہوا کرتے ہیں۔ یہی خیال کیا جاتا کہ یہ کارروائی باہر کے کسی آدمی کی ہے۔ اس کا ارادہ اسی رات اپنی کارروائی کا تھا لیکن نیلم سے ملنے کے بعد اس نے فی الحال اپنا ارادہ مؤخر کر دیا تھا۔

شیر خان کسی منصوبے پر کام کرنے والا تھا۔ ابھی نیلم کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ شیر خان کی کیا پلاننگ ہے اس لیے داور نے اس سے کہا تھا کہ وہ شیر خان کی ایکٹیویٹی پر نظر رکھے اور داور کو پلاننگ سے آگاہ کرتی رہے۔ اسے داور پر اس وقت ہاتھ ڈالنا تھا جب وہ اپنی پلاننگ میں کامیاب ہو چکا ہو۔

داور کو یہ اندازہ تھا کہ شیر خان کی زیادہ تر کامیابیاں پھلجھڑی کی وجہ سے ہیں۔ وہ شیر خان کا دماغ تھا۔ اگر وہ شیر خان کا ساتھ چھوڑ جائے تو شیر خان ادھورا رہ جاتا۔

لیکن کیسے؟

شاید قسمت اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئی تھی۔

دروازے کی گھنٹی پر جب اس نے دروازہ کھولا تو پھلجھڑی اس کے دروازے پر ایک دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔

☆☆☆

25 جون...

استاد سلطان اور نیلم دونوں ہی یہ اسکیم سن کر حیران رہ گئے۔

"یہ بہت بڑا رسک ہے شیر خان۔" سلطان نے کہا۔ "ہم نے ابھی تک چھوٹے موٹے کام کیے ہیں اور تم جو بتا رہے ہو وہ کروڑوں کا معاملہ ہے۔"

"اسی لیے تو یہ کم از کم میرا آخری کام ہوگا۔ اس کے بعد میں دو نمبر کے کام ہی چھوڑ دوں گا۔ تم دونوں بھی اپنے اپنے بندے لے کر الگ ہو جانا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن مجھے دس پندرہ دنوں کے لیے اپنے گیرج سے غائب رہنا پڑے گا۔"

"اس نقصان کی پروا مت کرو۔ میں تمہیں ایڈوانس میں بہت کچھ دے رہا ہوں۔" شیر خان نے کہا۔

"لیکن اتنے دنوں تک جو غائب رہوں گا اس کا کیا ہوگا؟"

"کوئی بھی بہانہ کر دینا۔ کہیں بھی جا رہے ہو۔ تمہارے شاگرد گیرج کو سنبھال لیں گے۔"

"اور تیاری کہاں کرنی ہوگی؟" سلطان نے پوچھا۔

"میں نے اس کام کے لیے ہاکس بے کے ساحل پر ایک ہٹ لے لیا ہے۔" شیر خان نے بتایا۔ "وہ پندرہ دنوں تک تمہارے استعمال میں رہے گا اور تمہاری خدمت کے لیے نیلم بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔"

استاد سلطان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ منزل قریب آ گئی تھی لیکن اس نے بے تابی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے برعکس برا سا منہ بنا کر بولا۔ "وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ایسا نہ ہو کہ پچھلی بار کی طرح دھوکا ہو جائے؟"

"چلو اس بار میں گارنٹی لے رہی ہوں۔" نیلم نے کہا۔ "اب تو کام کر دو گے نا؟"

استاد سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے رضامندی کے طور پر اپنی گردن اثبات میں ہلا دی۔

☆☆☆

25 جون

پھلجھڑی اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے داور کے فلیٹ میں داخل ہوا تھا۔

"دیکھ لو میں خالی ہاتھ ہوں۔" اس نے کہا۔

"ایسی بات مت کرو۔" داور نے اس کا ہاتھ تھام

لیا۔ "تم پر تو ہمیشہ سے بھروسا رہا ہے۔ البتہ اس ذلیل پر بھروسا نہیں ہے۔"

"اسی لیے تو اس ذلیل کو برباد کرنے کا ارادہ لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔" پھلجھڑی نے کہا۔

"آؤ بیٹھو۔ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔"

دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ "کچھ بناؤں؟" داور نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، ابھی ہم ضروری باتیں کر لیں۔" پھلجھڑی نے کہا۔ "داور، تم کو شاید اندازہ ہو گیا ہو کہ داور کا دماغ، میں ہوں میں ہی اسے راستے بتایا کرتا ہوں۔"

اسی لیے تو میں بھی حیران ہوا کرتا ہوں کہ تم جیسا آدمی چاہے تو اکیلا بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔ تمہیں شیر خان کے ساتھ کی کیا ضرورت ہے؟"

"اس کی صرف ایک ہی وجہ ہے کہ میرے پاس ذرائع نہیں۔" پھلجھڑی نے بتایا۔ "اور ان کاموں کے لیے بہت اسباب کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ بہت کچھ شیر خان کے پاس ہے۔ اس کے پاس بندے بھی ہیں جبکہ میں اکیلا ہوں۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"اسی لیے تو آیا ہوں تمہارے پاس کہ تم ایک دلیر انسان ہو اور اپنے ذرائع بھی رکھتے ہو۔"

"تو پھر ڈن۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے اور ہاں، میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ تم کو اس فلیٹ کا کیسے پتا چلا؟"

"میں نے نیلم کو تمہارے فلیٹ سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔" پھلجھڑی نے بتایا۔ "ویسے تم نے اس بلڈنگ میں فلیٹ لے کر خطرہ مول لیا ہے۔"

"پھلجھڑی! شیر خان کو نیچا دکھانے کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"تو پھر یہ بھی سن لو کہ نیلم بھی ہمارے ساتھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھ سے پہلے یہ بات تم کو معلوم ہو گئی ہوگی۔"

"یہ تو ہے۔" داور مسکرا دیا۔ "چلو اب بتاؤ۔ کیا پلاننگ ہے تمہارے شیر خان کی؟"

"وہ استاد سلطان سے کام لے رہا ہے اور تم کو اندازہ ہوگا کہ استاد کیا کام کر سکتا ہے۔"

"ہاں، یہ تو میں جانتا ہوں، لیکن یہ کام کہاں ہوگا؟"

"میرا اندازہ ہے کہ ہاکس بے والے ہٹ پر۔" پھلجھڑی نے بتایا۔ "وہاں یہ کام بہت سکون سے ہو سکتا ہے۔"

"اور مجھے کیا کرنا ہوگا؟" داور نے پوچھا۔

"صاف ظاہر ہے۔ کام ہوتے ہی میں تمہیں اشارہ دوں گا اور تم اپنے آدمیوں کو لے کر پہنچ جانا۔"

"ٹھیک ہے اتنے دنوں تک کے لیے میں تمہارے شیر خان کو زندہ رہنے دیتا ہوں، ورنہ..."

☆☆☆

27 جون...

ہاکس بے والے ہٹ میں کام کا آغاز ہو گیا تھا۔

ضرورت کا ہر سامان اس ہٹ میں انتہائی رازداری کے ساتھ پہنچا دیا گیا تھا۔ نیلم بھی استاد سلطان کے ساتھ تھی۔

پھلجھڑی کو شیر خان کی یہ حرکت بھی بہت ناگوار گزری تھی۔ اس نے نیلم سے جب اس معاملے پر بات کی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جب دریا میں چھلانگ لگا ہی دی ہے تو پھر بھیگنے کا کیا ڈر۔"

"پھر بھی یار، اچھا نہیں لگتا۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" نیلم نے اس کی ناک کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "کام نکل جائے تو پھر میں اس استاد کی ساری استادی بھلا دوں گی۔"

"اس کم بخت نے بھی تو اتنا وقت مانگ لیا ہے پندرہ دن۔"

"فکر مت کرو۔ جہاں اتنی زندگی گزار دی ہے تو یہ پندرہ دن بھی گزر ہی جائیں گے۔ اس کے بعد پھر ہم کو تو یہاں نہیں رہنا ہے۔"

"ایک بات بتاؤ۔" پھلجھڑی نے پوچھا۔ "کام ختم ہو جانے کے بعد دو آدمی ہمارے دشمن ہو جائیں گے۔ شیر خان اور داور۔ کیا ہم ان دونوں سے نمٹ سکیں گے؟"

"بہت آسانی سے۔" نیلم نے کہا۔ "میں یونہی تمہارا ساتھ نہیں دے رہی۔ ان لوگوں کے ساتھ رہ رہ کر میں نے بہت کچھ سیکھ لیا ہے۔ ان دونوں کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ ان کے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔"

"مجھے نہیں بتاؤ گی؟"

"ابھی نہیں، پہلے کام ہو جانے دو۔"

"تو پھر تمہیں کب جانا ہے۔" پھلجھڑی نے پوچھا۔

"کل، سے کام شروع ہو جائے گا۔"

"لیکن شیر خان تو ہر وقت سر پر سوار رہے گا۔"

"نہیں، وہ صرف کچھ دیر کے لیے کام کی رفتار دیکھنے کے لیے آیا کرے گا۔" نیلم نے بتایا۔ "اس کے بعد میں اور استاد اس ہٹ میں اکیلے رہ جائیں گے۔"

”میں پھر کہہ رہا ہوں کہ اپنا خیال رکھنا۔“

پھلجھڑی کو رخصت کر دینے کے بعد نیلم نے موبائل پر کسی کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کسی کی کھلتی ہوئی آواز آئی۔ ”نیلم! مائی گاڈ یہ تم ہو۔ میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔“

”ہاں رضوان! یہ میں ہوں اور تمہیں فون کر رہی ہوں۔ کیونکہ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ ہر حال میں۔“

”کہاں آجاؤں؟“ رضوان نام کے اس نوجوان نے بے تابی سے پوچھا۔

نیلم نے اسے پتا بتاتے ہوئے سمجھا دیا کہ بہت ہوشیاری سے کام لینا ہے اور کسی کو بھی اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہیں بتانا ہے۔

آدھے گھنٹے کے بعد ہی دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔

”رضوان میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو گے۔“ نیلم نے کہا۔ ”لیکن کیا تم میری مجبوریاں سمجھ سکتے ہو؟ اگر یہ سمجھتے ہو کہ شیر خان کے پاس میں اپنی مرضی سے گئی تھی تو یہ تمہاری بھول ہے مجھے باقاعدہ پہنچایا گیا تھا۔ پھر جب میں نے یہ دیکھا کہ میں ایک دلدل میں پھنس چکی ہوں اور جب نکلنے کی کوشش کرتی ہوں تو مزید گہرائی میں چلی جاتی ہوں اس لیے میں نے سمجھوتا کر لیا۔“

”تم نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس قسم کا سمجھوتا تمہیں کتنا ذلیل کر دے گا؟“ رضوان نے کہا۔

”بہت سوچا میں نے لیکن یقین کرو یہ سمجھوتا میرے جسم نے کیا تھا، میری روح نے نہیں۔“ نیلم نے گہری سانس لی۔ ”میری روح آج بھی پاکیزہ ہے۔ میں مجبوراً شیر خان اور ان جیسے دوسروں کا ساتھ دیتی ہوں۔ ورنہ میں آج بھی صرف تمہارے لیے ہوں۔“

”اور میں اسی طرح تمہاری باتوں پر اپنی زندگی گزار دوں۔“

”نہیں، اب نہیں۔ اب تو موقع آیا ہے کہ میں شیر خان سے نہ صرف بدلہ لے سکوں بلکہ اپنی زندگی بھر کی محرومی اور پریشانی کا بھی خاتمہ کر سکوں۔“

”وہ کس طرح؟“

”اس کے لیے تمہیں ہمت کرنی ہوگی۔“ نیلم نے بتایا۔ ”ایک ایسا قدم اٹھانا ہوگا جو شاید تم نے پہلے کبھی نہیں اٹھایا ہوگا لیکن زندگی بدلنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔“

”وہ کون سا؟“

”اس یقین اور اعتماد کے ساتھ بتا رہی ہوں کہ تم اگر ساتھ نہ بھی دو تو کسی سے ذکر نہیں کرو گے۔“

”بتاؤ تو سہی۔“

”کچھ بڑے لوگوں کو مارنا ہوگا۔“ نیلم نے بتایا۔

”کیا مطلب؟“ رضوان چونک پڑا۔ ”بڑے لوگوں کو مارنا ہوگا۔ کون بڑے لوگ؟“

”ایک تو شیر خان ہی سمجھ لو۔“ نیلم نے کہا۔ ”دوسرا داور ہے۔ ان کے علاوہ ایک دو اور ہیں۔“

”تم تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے وہ معمولی جانور ہیں۔ جنہیں ایک جگہ باندھ دیا گیا ہے کہ جاؤ سب کو گولی مار دو۔“

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ نیلم مسکرا دی۔ ”وہ سب ایک جگہ جمع ہونے والے ہیں۔ تم اچانک داخل ہو گے۔ تمہارے ہاتھ میں پستول ہوگا اور تم دھڑا دھڑ گولیاں چلا کر سب کو ڈھیر کر دو گے۔“

”واہ، اور ان خطرناک آدمیوں میں سے کوئی مجھ پر حملہ نہیں کرے گا؟“

”نہیں، وہ سب نہتے ہوں گے۔ ان کے نہتے ہونے کی گارنٹی میں لیتی ہوں۔“ نیلم نے کہا۔ ”میں یہ کبھی نہیں چاہوں گی کہ تم پر ایک خراش بھی آئے کیونکہ میرے نزدیک تمہاری اہمیت کچھ اور ہے۔“

”تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔“

”سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کروڑوں کا معاملہ ہے رضوان! اس کے بعد زندگی بھر عیش کرتے رہنا۔“

”کیا گولیوں کی آوازیں نہیں گونجیں گی؟“

”گونجنے دو۔ کوئی اس طرف نہیں آئے گا۔ وہ ایک ویران علاقہ ہے۔ ہاکس بے کا ایک ہٹ۔ جس کے آس پاس کوئی دوسرا ہٹ نہیں ہے۔“

رضوان پھر سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے رضامندی ظاہر کر دی۔

☆☆☆

15 جون......2 جولائی

نیلم نے داور کو بھی یہی کہانی سنائی تھی۔

داور اس کی کارکردگی سے بہت خوش ہو رہا تھا۔ نیلم نے اسے شیر خان کے منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔

”یہ بات ہوئی نا۔“ داور اچھل پڑا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس بار شیر خان کروڑوں کا گیم کھیل رہا ہے۔“

”ہاں، اور اس کے بعد وہ سارے دھندے چھوڑ

ے گا۔“

”سنو، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ استاد سلطان سے ہم کام لے لیں۔ وہ ہمارے لیے کام کرے۔“

”نہیں، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔“ نیلم نے کہا۔ ”استاد صرف اور صرف شیر خان کے لیے کام کرتا ہے۔ تم چاہے اس کے راستے میں سونے کی اینٹیں بھی بچھا دو۔ وہ نہیں مانے گا۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟“

”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اس وقت چھاپا مارنا ہے جب کام ختم ہو چکا ہو۔ مال تیار ہو۔ اس وقت تم اکیلے وہاں پہنچ جانا۔“

”کیوں اکیلے کیوں؟“ داور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”وہ تو اپنے آدمیوں کے ساتھ ہوگا اور میں اکیلا جا کر پھنس جاؤں؟“

”کوئی نہیں ہوگا اس کے ساتھ۔“ نیلم نے بتایا۔ ”ایسے معاملات میں وہ کسی پر بھروسا نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ صرف پھلجھڑی ہوگا۔ میں ہوں گی اور خود استاد سلطان ہوگا۔“

”اور میں اکیلا ہوں گا؟“

”بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ نیلم نے کہا۔ ”کام ختم ہونے کی خوشی میں شراب کی بوتلیں کھلیں گی اور ان بوتلوں میں خواب آور دوا شامل ہوگی۔ میرا مطلب سمجھ گئے نا؟“

”ہاں اب سمجھ گیا۔“ داور مسکرا دیا۔ ”یہ تمہارا کارنامہ ہوگا۔“

”ظاہر ہے، اس کے بعد تمہارا کام تو آسان ہو ہی جائے گا۔“ نیلم نے کہا۔ ”تم سب کو ٹھکانے لگا سکتے ہو۔“

”استاد کو بھی؟“

”یقیناً۔“ نیلم معنی خیز انداز میں بولی۔ ”کیونکہ اس سے دوبارہ کام تو نہیں لینا ہے۔ یہ اس کی بھی زندگی کا آخری کام ہونا چاہیے۔ بے چارہ بہت کام کر چکا۔ کچھ آرام بھی کرے گا۔“

”تم واقعی ایک خطرناک عورت ہو نیلم۔“

”خطرناک نہیں تھی، بنا دی گئی ہوں۔ میں تو ایک معصوم سی لڑکی تھی۔ اپنی پڑھائی سے غرض رکھنے والی۔ مجھے برباد کرنے اور اس راہ پر لانے والا کون ہے۔ ظاہر ہے شیر خان۔ تو کیا یہ میرا حق نہیں ہے کہ میں اپنی زندگی بھر کی توہین کا بدلہ لے سکوں؟“

”کیوں نہیں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اس میں سے آدھا تمہارا ہوگا۔“

”مجھے اس کا لالچ نہیں ہے۔ مجھے تو اپنی آگ بجھانی ہے۔ میں نے اس موقع کا بہت انتظار کیا ہے۔“

☆☆☆

9 جولائی...

ان سبھوں کے لیے تو جولائی کی تاریخ بہت ہنگامہ خیز ثابت ہوئی تھی۔

کام ختم ہو گیا۔ استاد سلطان نے شاید اپنی زندگی کا سب سے بے مثال کارنامہ انجام دیا تھا۔ جس وقت اس نے اپنا کام مکمل کیا، اس وقت شیر خان، پھلجھڑی اور نیلم تینوں ہی ہاکس بے کے ہٹ میں موجود تھے۔ سب کے سب پاگلوں کی طرح ہنس رہے تھے۔ اچھل رہے تھے۔ ان کے سامنے کروڑوں کے نوٹ تھے۔ تازہ تازہ سوندھی سوندھی مہک دیتے ہوئے۔

یہ اتنی دولت تھی کہ وہ سب کے سب بڑے آرام اور عیش کے ساتھ اپنی زندگی گزار سکتے تھے۔ انہیں کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

استاد سلطان نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ وہ اس ملک کا بے مثال فنکار تھا۔ شیر خان بار بار اس کا ہاتھ چوم رہا تھا۔ اس کی تعریف کر رہا تھا۔

”دیکھو، اب ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔“ شیر خان نے کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ جوش میں آکر ہم دونوں ہاتھوں سے دولت لٹانے لگیں اور پکڑ لیے جائیں۔“

”کم از کم چھ مہینے۔“ پھلجھڑی نے کہا۔

”نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ استاد سلطان بول پڑا۔ ”ایسی احتیاط اس وقت کی جاتی ہے جب ہم نے کہیں ڈاکا ڈالا ہو۔ کسی بینک کو لوٹا ہو۔ یہ نوٹ تو ہم نے پروڈیوس کیے ہیں۔ اسی لیے ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ ہم انہیں استعمال کر سکتے ہیں لیکن ایک ساتھ نہیں۔ تھوڑا تھوڑا۔ اور وہ بھی ایک شہر میں نہیں۔ بلکہ ملک کے مختلف شہروں میں، تاکہ کسی کو کوئی اندازہ نہ ہو۔“

”تمہارے حساب سے کتنے نوٹ بن گئے ہوں گے؟“ شیر خان نے پوچھا۔

”کم از کم دس کروڑ۔“ سلطان نے بتایا۔

”دس کروڑ؟“ شیر خان کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”بہت زبردست، تم نے آج وہ کام دکھایا ہے کہ اب اور کسی کام کی ضرورت نہیں رہی۔“

”لیکن ایسا ہوتا کہاں ہے۔“ سلطان مسکرا دیا۔

"انسان کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ کچھ دنوں کے بعد تم پھر یہی کہو گے کہ بس آخری بار۔ آخری بار کچھ اور نوٹ چھاپ دو۔ اس کے بعد ہمیشہ کے لیے چھٹی۔"

"نہیں، اب ایسا نہیں ہوگا۔" شیر خان نے کہا۔ "میں اپنے آپ سے عہد کر چکا ہوں کہ ایسا اب نہیں ہوگا۔"

"میری تو نگاہیں نہیں ہٹ رہیں۔" پھلجھڑی نے ایک گہری سانس لی۔ "جی چاہتا ہے کہ بس ان نوٹوں کو دیکھتا ہی رہوں۔"

"ہمارے پاس دیکھتے رہنے کا وقت نہیں ہے۔" شیر خان نے کہا۔ "اب جلدی جلدی صندوق میں پیک کر دو۔ وہ دونوں آنے ہی والے ہوں گے۔"

شیر خان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ان نوٹوں کو کراچی میں استعمال نہیں کرے گا بلکہ یہ نوٹ وین میں ڈال کر پہلے لاہور پھر اسلام آباد اور پنڈی وغیرہ پہنچا دیے جائیں گے۔

اس نے نوٹ لے جانے کے لیے جن دو آدمیوں کا انتخاب کیا تھا، وہ اس کے پرانے جاں نثار تھے۔ اس کے ہر حکم پر اپنی جان دینے والے۔ سکندر اور اکرم۔

یہ نوٹ ہزار اور پانچ ہزار کے نوٹوں کی شکلوں میں تھے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی ابھی اسٹیٹ بینک سے نکل کر انہی کے پاس آگئے ہوں۔

استاد سلطان واقعی ایک باکمال فنکار تھا۔

سارے نوٹ لکڑی کے ایک صندوق میں بھر دیے گئے۔ اس وقت نیلم ایک ٹرے میں گلاس اور شراب کی ایک بوتل لے کر اندر آگئی تھی۔

اس عظیم کامیابی پر اب انہیں جشن منانا تھا۔

☆☆☆

9 جولائی...

نیلم کے کہنے پر داور اکیلا آ تو گیا تھا لیکن وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ بے دریغ ہٹ میں داخل ہو جاتا۔ اس کا بھرا ہوا پستول اس کی جیب میں تھا اور وہ کسی بھی وقت اسے استعمال کرنے کی پوزیشن میں بھی تھا۔ وہ ہٹ سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے درمیان چھپ گیا تھا۔ وہ پہلے حالات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ نیلم کی طرف سے سگنل ملتے ہی وہ ہٹ میں داخل ہو جاتا۔

نیلم نے اس سے کہا تھا کہ وہ شراب کی بوتل میں خواب آور دوا ملا دے گی۔ اس کے بعد اس کا کام آسان ہو جائے گا۔ پھر کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔

اچانک اس کی چھٹی حس نے اسے کسی اور کی موجودگی کا احساس دلا دیا۔

کوئی اور اس کے قریب بہت قریب تھا۔

داور اس قسم کے کھیل کئی دفعہ کھیل چکا تھا۔ اس کے لیے اس قسم کی آنکھ مچولی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے آواز پیدا کیے بغیر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا چلا آیا۔

وہ جھاڑیوں سے باہر نکل آیا تھا۔

برابر ہی میں جھاڑیوں کا ایک اور سلسلہ تھا اور ایک شخص اپنے ماحول اور اردگرد سے بے خبر ہٹ کی طرف نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔

داور نے اپنا پستول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سانپ کی طرح رینگتا ہوا اس شخص کی پشت پر پہنچ گیا۔ اس نے پستول اس شخص کی گردن سے لگا دی تھی۔ "خبردار ہلنا نہیں۔" وہ پھنکارا۔

اس شخص نے خوفزدہ ہو کر مڑ کر داور کی طرف دیکھا۔ داور اسے دیکھ کر الجھ گیا تھا۔ وہ اس شخص کو جانتا تھا۔ اسے کئی بار نیلم کے ساتھ بھی دیکھ چکا تھا۔

"تم!" اس نے حیرت سے پوچھا "تم کو شاید میں جانتا ہوں۔"

"ہاں داور بھائی۔" رضوان نے ایک گہری سانس لی۔ "میں بھی آپ کو جانتا ہوں۔ مجھے نیلم نے آپ کی مدد کے لیے بلایا تھا۔" رضوان کو ایک بہانہ سوجھ گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو... تم میری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"مجھے نہیں معلوم، اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ میں یہاں پہنچ جاؤں۔" رضوان نے کہا۔ "اندر ہٹ میں کچھ لوگ موجود ہیں۔ پر تم بھی یہاں آؤ گے اور تمہیں شاید ایک دو آدمیوں کی ضرورت پڑ جائے۔"

بہت ہی بھونڈا بہانہ تھا۔ داور سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ نیلم کیا کھیل کھیل رہی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کی ہر بات غلط ہو لیکن وہ ابھی اس بارے میں کچھ سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ کسی گاڑی کی آواز آنے لگی۔

دونوں ہی اپنی اپنی جگہ چونکنے ہو گئے تھے۔ ایک وین ہٹ کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ داور بلبلا کر رہ گیا۔

وہ دونوں بھی اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ ان دونوں کو جانتا تھا۔ اکرم اور سکندر، شیر خان کے خاص آدمیوں میں سے تھے۔

کھیل تو شروع ہو چکا تھا لیکن جو بھی ہو رہا تھا وہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

☆☆☆

9 جولائی...

پھلجھڑی نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ شیر خان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں، ابھی ہمیں کچھ نہیں پینا۔" اس نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"اس وقت ہمیں پورے ہوش و حواس کی ضرورت ہے۔" وہ سب کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میں نہیں چاہتا کہ یہ شراب عین وقت پر کام خراب کر دے۔"

"لیکن ہم تو کبھی آؤٹ نہیں ہوئے۔" پھلجھڑی نے کہا۔

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ اگر پہلے آؤٹ نہیں ہوئے تو آج بھی نہیں ہوں گے۔" شیر خان نے کہا۔ "کام بالکل ختم ہو جائے تو اس کے بعد چاہے دن رات شراب میں ڈوبے رہنا، کوئی منع نہیں کرے گا۔"

"شیر خان ٹھیک کہتا ہے پھلجھڑی۔" استاد سلطان بھی بول پڑا۔ "اگر ہم نے اس وقت نہیں پی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔"

شیر خان نے نیلم کی طرف دیکھا۔ "اس وقت یہ سب اٹھا کر اندر رکھ دو۔ وہ دونوں بھی آنے والے ہیں۔ شراب دیکھ کر پھیل جائیں گے۔"

نیلم کے تاثرات کچھ عجیب ہو گئے تھے۔

وہ ٹرے اٹھا کر کچن میں لے آئی۔ شیر خان نے اس کی ساری اسکیم پر پانی پھیر دیا تھا۔ وہ بہت تیزی سے سوچ رہی تھی۔

اس نے داور اور رضوان کو بھی بلوا لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شیر خان، پھلجھڑی اور سلطان شراب پی کر مدہوش ہو جائیں گے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا تھا۔

اب جو کچھ بھی کرنا تھا، بہت تیز رفتاری سے کرنا تھا۔ سب سے پہلے داور کو اس خطرے سے آگاہ کرنا تھا پھر کسی طرح رضوان کو روکنا تھا۔

کیبن کی کھڑکی ہٹ سے باہر کی طرف کھلتی تھی۔ نیلم کے پاس سوچنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ صرف فیصلہ کرنا اور اس پر عمل کرنا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ کھڑکی سے باہر تھی۔ باہر آتے ہی اس نے جھاڑیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ اسی وقت شیر خان کے آدمی وین لے کر پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

9 جولائی...

صندوق پیک ہو چکا تھا۔

شیر خان کے دونوں خاص آدمی بھی پہنچ چکے تھے۔

وہ دونوں شیر خان کے روبوٹ تھے۔ شیر خان نے جو حکم دے دیا۔ بس اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کر لیا۔ کوئی سوال نہیں۔ کوئی تجسس نہیں۔ کوئی حیرت نہیں۔

"تم دونوں کو یہ صندوق بہت احتیاط کے ساتھ لاہور کے جوہر ٹاؤن والے اڈے پر پہنچانا ہے۔"

"پہنچا دیں گے باس۔"

"دیکھو، میں پھر کہہ رہا ہوں بہت احتیاط سے۔"

"پہلے بھی تو تمہارے لیے بہت کچھ یہاں سے وہاں کرتے رہے ہیں باس۔" سکندر نے کہا۔ "کبھی کوئی شکایت ہوئی؟"

"اسی لیے تو تم دونوں پر بھروسا کرتا ہوں، مجھے ناز ہے تم دونوں پر۔"

"ہم تو حکم کے غلام ہیں باس۔"

"یہ لو راستے کے اخراجات کے لیے۔" شیر خان نے نوٹوں کی ایک گڈی سکندر کی طرف بڑھا دی۔

"وہاں پہنچا کر پھر کیا کرنا ہے باس؟" اکرم نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، تم دونوں وہیں رہنا۔" شیر خان نے کہا۔ "پھر ہم بھی آجائیں گے۔ اس کے بعد اصل کام شروع ہو گا۔"

"تو پھر ہم روانہ ہو جائیں؟"

"ہاں، اس صندوق کو اٹھا کر وین میں رکھ دو۔" شیر خان نے کہا۔

☆☆☆

9 جولائی...

نیلم، داور اور رضوان کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

پتا نہیں کیا ہونے لگا تھا۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہی ہونے لگا تھا کہ عین وقت پر شیر خان کا دماغ خراب ہو گیا۔ اس نے شراب کو ہاتھ لگانے سے منع کر دیا تھا۔

اس ایک ذرا سی حرکت نے سارا کام خراب کر دیا تھا۔ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر اسے ایک ذہنی جھٹکا تو لگا تھا لیکن اس نے خود کو سنبھال بھی لیا تھا۔

"نیلم! تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم نے اس بندے کو بھی میری مدد کے لیے بلا رکھا ہے۔" داور نے کہا۔

سارا معاملہ نیلم کی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ ایک ادا کے ساتھ بولی۔ ''تمہارا کیا خیال تھا کہ میں تمہیں اکیلے بلا کر تمہاری زندگی سے کھیلتی۔ یہ رضوان میرا خاص دوست ہے۔ اس نے میری بات مانی اور بغیر کسی لالچ کے یہاں تک آگیا ہے۔ اب ہم تین ہو گئے ہیں۔''

''تو پھر کیا خیال ہے۔ کام شروع کر دیں؟''

''ابھی نہیں، شیر خان کے دو خاص آدمی بھی پہنچ چکے ہیں۔ سارا مال لاہور پہنچایا جارہا ہے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ تم دونوں ان کی گاڑی کا پیچھا شروع کر دینا اور راستے میں ان دونوں کو مار کر مال اپنے قبضے میں لے لینا۔''

''اور وہ دونوں، میرا مطلب ہے شیر خان اور پھلجھڑی... وہ بھی تو ساتھ ہوں گے۔''

''وہ ساتھ نہیں ہوں گے۔ پروگرام کے مطابق دونوں چار پانچ گھنٹوں کے وقفے کے بعد اسی راستے سے دوسری گاڑی میں روانہ ہوں گے۔''

''اور ہم دونوں کیا کریں؟'' رضوان نے پوچھا۔

''تم دونوں پہلی گاڑی کے روانہ ہوتے ہی ان کا پیچھا شروع کر دینا۔'' نیلم نے بتایا۔ ''ان کا پورا روٹ میرے علم میں ہے۔ وہ بیلا پور کے راستے سے جائیں گے۔ اس راستے پر چیکنگ وغیرہ کا خطرہ بھی نہیں ہوتا۔ اب اس بات کا یقین دلا دو کہ تم دونوں ایک دوسرے پر بھروسا کرنے لگے ہو؟''

''بھروسا تو کرنا ہی ہوگا۔'' داور نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیونکہ ہمارے درمیان تم ہو۔''

☆☆☆

زخمی مر چکا تھا۔

''اب اس کی لاش کا کیا کریں؟'' خالد نے کہا۔ ''اگر ہم لاش کے ساتھ پکڑے جاتے ہیں تو وہ تھانے دار ہمیں سیدھا جیل بھجوا دے گا۔''

''اب یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اس لاش کو گاڑی سے اتار کر جنگل میں ڈال دیں۔'' افضل نے کہا۔ ''ہمارے ہاتھ صاف ہیں۔ ہم نے اس بے چارے کے ساتھ کچھ نہیں کیا ہے۔ خدا اس کے لیے ہمیں سزا نہیں دے گا۔''

خالد نے بھی اس کی بات سے اتفاق کر لیا تھا۔

جس وقت انہوں نے لاش کو وین میں ٹھونسا تھا، اس وقت اس کی ہڈیاں اتنی سخت نہیں ہوئی تھیں لیکن اب وین سے اتارنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔

بڑی مشکلوں سے انہوں نے وہ لاش نیچے اتاری تھی۔ ٹھیک اسی وقت تھانے دار نواز کسی جن کی طرح ان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

دونوں بُری طرح بوکھلا کر رہ گئے۔

''بہت چالاک بنتے ہو تم دونوں؟'' تھانے دار نواز نے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے اسی لیے تمہارے سامنے چلا تو گیا تھا لیکن گاڑی دور کھڑی کر کے درختوں کے درمیان پیدل چلتا ہوا تمہارے سر پر آگیا ہوں۔ بتاؤ کون ہے یہ۔ کس کا خون کر دیا ہے تم دونوں نے؟''

''نواز بھائی! ہم نہیں جانتے کہ یہ کون ہے۔'' افضل جلدی سے بولا۔

''اور بے چارے کا خون بھی کر دیا۔ مار دیا اس کو؟''

''نہیں، ہم نے اسے نہیں مارا۔'' خالد نے کہا۔ ''ہم تو اس بے چارے کو ہاسپٹل لے جارہے تھے۔''

''ہاسپٹل لے جارہے تھے یا جنگل میں پھینکنے جارہے تھے؟''

''نہیں نواز بھائی تم یقین کرو۔'' افضل نے کہا۔ ''یہ لاش ہمیں جنگل سے ملی تھی بلکہ یہ اس وقت زندہ تھا۔ ہم نے اسے اٹھا کر اپنی وین میں ڈال لیا تھا۔''

''ہم نے یہ سوچا تھا کہ ہم اسے ہاسپٹل لے جائیں گے۔'' خالد نے بات آگے بڑھائی۔ ''لیکن اس کے مرنے کے بعد ہم نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ہم نے یہ سوچا کہ ایسا نہ ہو کہ الٹا ہم ہی پھنس جائیں اسی لیے اسے جنگل میں پھینکنے کا ارادہ کر لیا تھا کہ اچانک تم آنکلے۔ بس اتنی سی کہانی ہے نواز بھائی۔''

''یہ کہانی بس اتنی سی نہیں ہے۔'' تھانے دار نواز مسکرایا۔ ''مجھے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔ یہ لاش جنگل میں کہاں سے آئی؟''

''یہ دیکھو۔'' افضل نے کچلی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''شاید کسی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ یہ مرنے والا شاید اس گاڑی میں تھا جو کسی طرح گاڑی سے نکل کر باہر آگیا ہوگا۔''

''ہوں۔'' نواز نے ایک گہری سانس لی۔ ''لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے لیکن اگر کوئی گاڑی نہیں ملی تو تم دونوں کو میں نہیں چھوڑوں گا۔ مجبوراً تمہارے خلاف کارروائی کرنی پڑے گی۔ چلو، دونوں چلو ہمارے ساتھ۔''

☆☆☆

11 جولائی...

اب گڑھا اتنا ہو گیا تھا کہ وہ لاش اس میں دبائی جا سکتی

تھی۔

محمود کا پورا بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک چھوٹی سی دکان چلانا اور بات ہے اور کسی لاش کو دفن کرنے کے لیے گڑھا کھودنا اور بات تھی۔

اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنی مشقت نہیں کی تھی۔

اس نے لاش کو گڑھے میں ڈالنے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ قدموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کوئی اسی طرف آرہا تھا۔

''او خدا!'' وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ آنے والے خالد اور افضل ہی ہو سکتے تھے۔

محمود کے لیے درختوں کے اس جھنڈ کے علاوہ چھپنے کی اور کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ اس لاش کے ساتھ ان کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔

اس کا مقصد تھا نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق۔ اس کے بعد تین حصے۔ نہیں، یہ ساری اس کی محنت تھی۔ وہ کسی اور کو اس میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے اس ڈرائیور کا پستول اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا اور درختوں کے جھنڈ کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ ٹھیک وقت پر اپنے آپ کو چھپا لینے میں کامیاب ہوا تھا کیونکہ اسی وقت وہ اس لاش کے پاس پہنچ چکے تھے۔

اور لاش کے پاس پہنچنے والے خالد اور افضل نہیں تھے بلکہ کوئی اور تھے۔

ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ ایک لانبے قد کا باڈی بلڈر ٹائپ کا تھا جبکہ دوسرا پستہ قد لیکن گٹھے ہوئے بدن کا تھا۔

دونوں سڑک کی طرف سے نہیں بلکہ دوسری سمت سے اس طرف آئے تھے۔

دونوں اس لاش کو دیکھتے رہے۔ پھر ایک نے لاش کے پاس آکر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اس کی سانسیں چیک کر رہا تھا پھر اس نے اعلان کیا۔ ''یار! یہ مر چکا ہے۔ کسی نے مار دیا ہے اس کو۔''

''کس نے؟'' پستہ قد بھی جلدی سے لاش کے پاس آگیا۔

''اب یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا ضرور اندازہ ہے کہ جس نے وہ صندوق غائب کیا ہے، اسی نے اکرم کا خون کیا ہے۔''

''تو پھر سکندر کہاں ہے؟'' پستہ قد نے سوال کیا۔ ''وہ بھی تو اس کے ساتھ تھا۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ راستے میں کہیں اتر گیا ہو۔'' لانبے قد والے نے خیال ظاہر کیا۔

''نہیں، مال پہنچائے بغیر وہ کہیں نہیں اتر سکتا تھا۔'' پستہ قد نے کہا۔ ''وہ بہت ذمے دار بندہ ہے۔''

''تو پھر اس کی لاش دیکھنے کے لیے بھی تیار ہو جاؤ۔ اس کی لاش بھی کہیں آس پاس ہی ہوگی۔''

☆☆☆

11 جولائی...

افضل، خالد اور نواز گاڑی کے پہیوں اور کچلی ہوئی گھاس کے نشانات کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ افضل اور خالد آگے آگے چل رہے تھے۔ تھانے دار نواز ان کے پیچھے تھا۔

ایک جگہ انہیں حادثہ شدہ ہائی روف نظر آ ہی گئی تھی۔ اس کا ایک دروازہ اس کے قریب ہی ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ آس پاس ایسے نشانات تھے جن سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ شاید یہاں سے کسی وزنی چیز کو گھسیٹتے ہوئے لے جایا گیا ہے۔

تینوں اس گاڑی کے پاس آکر رک گئے۔

''کیا ہے؟'' نواز نے پوچھا۔

''یہ وہی گاڑی ہو سکتی ہے جس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔'' افضل نے کہا۔ ''لیکن اب ہمیں محمود کی فکر ہو گئی ہے۔ وہ کہاں چلا گیا؟''

''محمود، کون محمود؟'' نواز چونک پڑا۔

''وہی اپنا دکاندار محمود۔'' خالد نے بتایا۔

''کیا وہ بھی تم دونوں کے ساتھ...''

''جی ہاں، وہ یہ دیکھنے کے لیے جنگل میں گھسا تھا کہ ایکسیڈنٹ کس کا ہوا ہے لیکن وہ پھر واپس نہیں آیا۔ ہم دراصل اسی کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔''

''یہ بات تم دونوں نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟'' نواز غرایا۔ ''کہانی کچھ اور لگتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ صاف صاف بتا دو۔''

''ہم نے صاف صاف بتا دیا ہے۔'' افضل نے کہا۔ ''تم کو یقین نہیں ہے تو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''

اس نے پھر کچھ نہیں کہا۔

وہ تینوں آگے بڑھتے چلے گئے۔ اب وہ جہاں سے گزر رہے تھے وہاں بھی ایسے نشانات تھے جیسے کسی وزنی چیز کو گھسیٹ کر لے جایا گیا ہو۔

''یا تو یہاں سے کسی لاش کو گھسیٹا گیا ہے یا کوئی اور وزنی چیز ہے۔'' نواز نے نشانات کا معائنہ کرتے ہوئے

کہا۔

"کہیں کسی نے محمود کو تو نہیں مار دیا۔" خالد نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے۔" نواز نے گردن ہلائی۔ "لیکن کون ہو سکتا ہے؟"

اچانک گولیوں کی آوازوں سے پورا جنگل گونج اٹھا۔ دو گولیاں چلائی گئی تھیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوا تھا جیسے ہر طرف سے گولیاں برس گئی ہوں۔

نہ جانے کتنے پرندے پھڑپھڑاتے ہوئے فضا میں پرواز کر گئے تھے۔

☆☆☆

11 جولائی...

محمود کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا اور اس کی نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ ایسی جگہ چھپا تھا جہاں وہ دونوں اسے دیکھ نہیں پا رہے تھے لیکن کب تک۔ وہ کچھ اور آگے درختوں کے جھنڈ کی طرف آتے تو محمود ان کو دکھائی دے جاتا۔

وہ دونوں خطرناک معلوم ہو رہے تھے۔ محمود کو اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ گاڑی میں نوٹوں کا صندوق لے کر آنے والے وہ دونوں انہی کے ساتھی تھے۔

اور یہ نوٹ وہ کسی واردات کے نتیجے میں لے کر آئے تھے لیکن بدقسمتی سے گاڑی کا حادثہ ہو گیا اور وہ دونوں مارے گئے۔

ان میں سے ایک کی موت تو خود اس کے ہاتھ سے ہوئی تھی جس کو اس نے پتھر مار کر ہلاک کر دیا تھا اور دوسرا بھی شاید اسی کے ہاتھوں مرا ہوگا۔ کیونکہ اس کی حالت بہت مخدوش ہو رہی تھی اور وہ اسے جنگل میں بھیڑیوں کے رحم و کرم پر پھینک کر آ گیا تھا۔

دونوں درختوں کے جھنڈ کے پاس آ کر رک گئے۔

محمود کے ہاتھ میں وہی پستول تھا جو اس ڈرائیور کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ پستول اٹھایا۔ اسی وقت دو گولیاں چلیں اور وہ دونوں دردناک چیخ کے ساتھ ایک طرف الٹ گئے۔

لیکن یہ گولیاں محمود نے نہیں چلائی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کا ٹریگر تو اسی طرح رہا تھا۔ پھر کیا ہوا تھا ان دونوں کے ساتھ؟

درختوں کے درمیان سے دو اور آدمی نکل کر سامنے آ گئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے۔ یہ گولیاں ان دونوں ہی نے چلائی تھیں۔

نئے آنے والے بھی کم خطرناک نہیں معلوم ہو رہے تھے بلکہ یہ زیادہ ہی خوں خوار تھے کہ انہوں نے بغیر کسی تکلف کے دو آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

ان میں سے ایک کڑیل مونچھوں والا تھا جبکہ دوسرا کلین شیو تھا۔ دونوں نے گھیر دار شلواریں اور کرتے پہن رکھے تھے۔

وہ مرنے والوں کی لاشوں کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں بہت ہی چوکنا دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ دونوں تو گئے۔" مونچھ والے نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"تو پھر وہ صندوق بھی ان کے پاس ہی ہونا چاہیے۔" دوسرا بولا۔

"لیکن ہم تو گاڑی کی تلاشی بھی لے چکے ہیں۔"

"لگتا ہے دونوں نے اس صندوق کو درختوں کے درمیان چھپا دیا ہے۔" مونچھوں والے نے کہا۔ "اور دونوں مطمئن ہو کر واپس جا رہے تھے کہ کچھ دنوں کے بعد صندوق اٹھا کر لے جائیں گے۔"

اچانک کلین شیو کی نگاہ گاڑی کے ڈرائیور کی لاش پر گئی۔ جسے وہ دونوں اس لیے نہیں دیکھ پائے تھے کہ وہ مٹی کے ڈھیر کے پیچھے چھپی ہوئی تھی۔

"یہ دیکھو۔" کلین شیو نے اشارہ کیا۔ "یہ تو اکرم ہے نا؟"

"ہاں، یہ وہی ہے۔" مونچھوں والے نے تصدیق کی۔ "لیکن اسے کس نے مار دیا؟"

"شاید آپس میں اختلاف ہو گیا ہوگا۔" کلین شیو نے کہا۔ "اور یہ دیکھو، اس کو دفن کرنے کے لیے باقاعدہ گڑھا بھی کھودا جا رہا تھا۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی تیسرا بھی ہو۔" مونچھ والے نے کہا۔ "یہ مرنے والا بندہ تو ان کے بہت کام کا تھا۔ اسے کیوں مارنے لگے؟"

"پیسا چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔" کلین شیو معنی خیز انداز میں بولا۔ "انسان اس کے لیے سب کچھ کر گزرتا ہے۔"

"چلو اس پر بعد میں سوچیں گے۔ پہلے وہ صندوق تو مل جائے۔"

"میرا اندازہ ہے کہ وہ صندوق ان درختوں کے درمیان چھپایا گیا ہے۔" اس نے اس طرف اشارہ کیا جہاں محمود چھپا ہوا تھا۔

☆☆☆

11 جولائی...

ان تینوں نے ان دونوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھا تھا۔

دو آدمی ان کے سامنے ذرا سی دیر میں قتل ہو گئے تھے۔

پھر دو آدمی ایک طرف سے نکلے اور لاشوں کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی آپس کی باتوں سے یہ اندازہ ہو گیا کہ معاملہ بہت سنجیدہ اور خطرناک ہے۔

بار بار کسی صندوق کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایسی باتیں ہو رہی تھیں جیسے یہ کئی گروپ ہیں جو آپس میں جھگڑا کر بیٹھے ہیں اور کسی ایک گروپ نے نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق کہیں چھپا کر رکھ دیا ہے۔

"معاملہ بہت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔" نواز نے سرگوشی کی۔

"نواز بھائی! ہمارے سامنے دو قاتل کھڑے ہیں۔" افضل نے کہا۔ "تم پولیس والے ہو۔ قانون کے محافظ... ان کو پکڑ کیوں نہیں لیتے؟"

"بے وقوف، یہ کوئی خرگوش نہیں ہیں جن کو جا کر پکڑ لوں۔ دونوں درندے معلوم ہوتے ہیں۔" نواز نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "دونوں کے پاس اسلحہ ہے جبکہ میرے پاس اس وقت سرکاری رائفل بھی نہیں ہے۔"

"وہ دیکھو، دونوں درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھ رہے ہیں، کہیں وہاں محمود تو چھپا ہوا نہیں ہے۔" خالد نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"ہو سکتا ہے۔" افضل دھیرے سے بولا۔ "خدا جانے یہ کیا چکر شروع ہو گیا ہے؟"

پھر دو گولیاں چلیں۔

دو فائر اور دو لاشیں۔ یہ گولیاں درختوں کے جھنڈ کی طرف سے چلائی گئی تھیں۔ مونچھوں والا اور اس کا ساتھی ایک بھیانک چیخ کے ساتھ ڈھیر ہو گئے تھے۔

☆☆☆

11 جولائی...

محمود ان دونوں کو درختوں کی طرف آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں اس کے پاس پہنچ جاتے اور اس کا کھیل ختم ہو جاتا۔ اس کے خواب بکھر جاتے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا۔

وہ نوٹوں سے بھرا ہوا صندوق اس کے ہاتھ سے نکل جاتا۔ انہوں نے نوٹوں کے لیے دو آدمیوں کا خون کیا۔ اب دو اور سہی۔

کیا فرق پڑنے والا تھا۔ یہ دونوں بھی تو اس کو مارنے ہی کے ارادے سے آ رہے ہوں گے۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔

بس ایک لمحہ تھا۔ وہ دعا مانگ رہا تھا کہ کاش وہ دونوں واپس چلے جائیں۔ درختوں کی طرف نہ آئیں لیکن ایسی دعائیں اتنی جلدی کہاں قبول ہوتی ہیں۔ وہ دونوں بڑھتے ہی آ رہے تھے پھر محمود کے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ ان دونوں کو راستے سے ہٹا دے اور اس نے راستے سے ہٹا دیا۔

اسلحے کے ذریعے موت کتنی جلدی مسلط ہو جاتی ہے۔ اس کا تجربہ اسے آج ہی ہوا تھا۔ ایک ذرا سا اشارہ اور دو جیتے جاگتے انسان لاش بن گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں۔

ان دونوں کو مارنے کے بعد اس کی کیفیت عجیب ہو گئی تھی۔ اس کا ذہن جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ یہ سب بھی کر سکتا ہے۔

اس کی آنکھوں کے آگے دھند چھا رہی تھی۔ اب وہ پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔ اس کا پورا جسم ٹھنڈے پسینے میں شرابور ہو گیا۔

وہ شاید بے ہوش ہونے والا تھا۔

اس نے چار آدمیوں کا خون کر دیا تھا۔ چاہے کوئی بھی وجہ ہو۔ اگر قانون کے ہاتھ اس تک پہنچ گئے تو وہ کیا کہانی سنا سکے گا۔

اب اس کی تعریف یہی تھی کہ وہ بیلا پور کا ایک عام سا سیدھا سادا دکاندار نہیں رہا تھا بلکہ وہ خونی ہو گیا تھا۔ ایک بے رحم قاتل۔

گولیاں کھانے والے وہ دونوں بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ جنگل میں اب سناٹا تھا۔ مکمل سناٹا۔ اس سناٹے میں سوائے پرندوں کی آوازوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ آہستہ آہستہ اپنے آپ میں آتا جا رہا تھا۔

اس کی آنکھوں کے آگے آئی ہوئی دھند صاف ہونے لگی تھی۔ اس کا ذہن دوبارہ سوچنے لگا تھا۔ اس نے جو قتل کیے ہیں اس کا گواہ کون تھا؟

کوئی بھی نہیں۔ اس جنگل میں اسے کون دیکھنے والا تھا۔ اور نوٹوں سے بھرا ہوا وہ صندوق بھی محفوظ تھا۔ وہ آہستہ آہستہ درختوں کے جھنڈ سے باہر آ گیا۔

وہ ان دونوں کی لاشوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں مر چکے تھے۔ اس کی چلائی ہوئی گولیوں نے بالکل صحیح نشانے لیے تھے۔

دونوں کے سینوں میں سوراخ ہو چکے تھے۔

پورے بیلا پور میں اس جیسا نشانے باز کوئی نہیں تھا۔ اس کا باپ کسی زمانے میں فوج میں رہ چکا تھا۔ اسی نے اپنے بیٹے کو نشانے بازی کی تربیت دی تھی۔ وہی تربیت اس وقت کام آ گئی تھی۔

اس نے لاشوں کو قریب سے دیکھنے کے لیے قدم بڑھایا اور اسی وقت تین آدمی اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ خالد، افضل اور تھانے دار نواز تھے۔

☆☆☆

11 جولائی...

وہ تینوں سکتے کے عالم میں کھڑے ہی رہ گئے۔

ان کے سامنے دو آدمی گولیوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک دونوں جیتے جاگتے انسان تھے لیکن درختوں کی طرف سے آئی ہوئی گولیوں نے دونوں کو خاک اور خون میں نہلا دیا تھا۔

پھر انہوں نے ایک شخص کو درختوں کے جھنڈ سے باہر آتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔ اور وہ بہت احتیاط سے جیسے پھونک پھونک کر قدم بڑھا رہا تھا۔

''میرے خدا! یہ تو محمود ہے۔'' افضل نے ایک گہری سانس لی۔

''اور اس نے دو آدمیوں کا خون بھی کیا ہے۔'' تھانے دار نے کہا۔

''یار ہر جگہ تھانے داری مت کیا کرو۔'' خالد جھنجلا کر بولا۔ ''تم نے دیکھا نہیں۔ وہ دونوں بھی اسے مارنے ہی کے ارادے سے آگے جا رہے تھے۔ اگر وہ نہیں مارتا تو وہ اسے مار دیتے۔''

''اب چلو اس کے پاس۔'' افضل نے کہا۔ ''دیکھیں تو سہی، کیا معاملہ ہے۔''

اس طرح وہ تینوں محمود کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

محمود انہیں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔ ''میں نے مار دیا ہے ان دونوں کو۔ دیکھو مار دیا ہے دونوں کو۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولے جا رہا تھا۔ ''اگر میں نہیں مارتا تو یہ مجھے مار دیتے۔''

''ہاں ہاں، فکر مت کرو۔'' نواز نے تسلی دینے والے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ ہم نے دیکھ لیا ہے۔ وہ دونوں درختوں کی طرف جا رہے تھے جہاں تم چھپے ہوئے تھے۔''

''ہاں۔'' محمود نے گردن ہلائی۔ ''مجھے مارنے کے لیے آ رہے تھے۔''

''لیکن بھائی یہ کہانی کیا ہے؟'' خالد نے پوچھا۔ ''تم تو ایکسیڈنٹ والی گاڑی کو دیکھنے جنگل کی طرف آئے تھے۔ پھر یہ کیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ لاشیں کیوں گرنے لگیں۔ یہ تمہارے دشمن کیوں ہو گئے؟''

''ہوا یہ کہ میں جنگ میں گھستا چلا آیا۔'' محمود نے کہا۔ ''ایک جگہ ایک ہائی روف دکھائی دی جس کا بری طرح ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس ہائی روف کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک بندہ پھنسا ہوا تھا۔ میں نے سمجھا کہ وہ مر چکا ہے لیکن وہ زندہ تھا۔''

''کیا اس میں صرف ایک ہی آدمی تھا؟'' نواز نے پوچھا۔

''ہاں بھائی، صرف ایک آدمی۔'' محمود نے بتایا۔

''پھر کیا ہوا؟''

''میں نے جائزہ لینا شروع کیا کہ اس بے چارے کو اگر مدد کی ضرورت ہو تو اس کی مدد کر سکوں۔'' محمود نے بتایا۔ ''میں نے تم دونوں کو آوازیں بھی دی تھیں لیکن شاید تم تک میری آواز نہیں پہنچی۔''

''تم خود کیوں نہیں آ گئے میرے پاس؟'' افضل نے پوچھا۔

''میں آنے والا تھا لیکن میں نے دو آدمیوں کی آوازیں سنیں۔ میں نے دیکھا کہ کچھ فاصلے سے دو آدمی چلے آ رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں پستول ہیں۔ تم لوگ تو جانتے ہو کہ میں ایسے معاملات میں کتنا ڈرپوک ہوں۔ کتنا ڈر لگتا ہے۔ اس لیے میں نے درختوں کے جھنڈ میں جا کر اپنے آپ کو چھپا لیا۔''

''تو پھر تمہارے پاس پستول کہاں سے آ گیا؟'' تھانے دار نواز نے پوچھا۔

''پستول اسی آدمی کے برابر کی سیٹ پر رکھا ہوا تھا۔'' محمود نے خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں نے وہی اٹھا لیا تھا۔ کیونکہ مجھے ان دونوں سے بہت ڈر لگ رہا تھا۔''

''پھر وہ دونوں تمہیں تلاش کرتے ہوئے درختوں کی طرف آ گئے؟'' افضل نے کہا۔

''ہاں یار! میری تو بری حالت ہو رہی تھی۔ دونوں

کے پاس پستول تھے۔ پھر جب وہ درختوں کی طرف بڑھنے لگے تو میں نے خوف زدہ ہو کر گولیاں چلا دیں اور دونوں ہی مر گئے۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی پھر میں ان دونوں کی لاشوں کو دیکھنے کے لیے درختوں سے نکلا اور تم لوگ آ گئے۔"

"اس ہائی روف میں کیا تھا؟" نواز نے پوچھا۔

"اس میں کیا ہوگا، کچھ بھی نہیں تھا۔" محمود نے بتایا۔

"یار! یہ کہانی ہضم نہیں ہو رہی۔" نواز نے کہا۔ "یہ بندے کسی صندوق کا ذکر کر رہے تھے جو اسی گاڑی میں رکھا ہوا تھا۔ یہ سب مجرم تھے۔ وہ دونوں بھی جو پہلے مر گئے۔ دیکھو، ذرا سی دیر میں ہم نے چھ لاشیں دیکھ لی ہیں۔"

"چھ لاشیں؟" محمود چونک پڑا۔ "کون سی چھ لاشیں؟"

"ایک وہ زخمی بندہ جس کو خالد اور افضل جنگل سے اٹھا کر اپنی گاڑی میں لے آئے تھے۔ ان کا ارادہ اسے ہاسپٹل پہنچانے کا تھا لیکن وہ کچھ دیر بعد مر گیا۔ ایک لاش تو اس کی ہو گئی۔ پھر ہم جب یہاں آئے تو ہم نے ایک اور لاش دیکھی۔ یہ شاید وہی بندہ تھا جو ہائی روف میں پھنسا ہوا تھا۔ جس کو تم نے مردہ سمجھ لیا ہوگا لیکن وہ زندہ تھا۔"

محمود الجھی ہوئی خوف زدہ نگاہوں سے نواز کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے طور پر کہانی بنانے کی کوشش کی تھی لیکن کہانی بن نہیں پائی تھی۔

"پھر یہ ہوا کہ اس گاڑی اور ان بندوں کی تلاش میں دو اور آدمی آ گئے۔" نواز نے بات آگے بڑھائی۔ "ان کو بھی کسی چیز کی تلاش تھی۔ وہ آپس میں ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ پھر اچانک دو آدمی اور آ گئے اور انہوں نے پہلے آنے والوں کو مار دیا۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسا خون خرابا کیوں شروع ہو گیا؟" محمود بڑبڑایا۔

"سیدھی سی بات ہے۔ کوئی بہت ہی قیمتی چیز ہوگی جس کے لیے اتنے خون بہائے گئے ہیں۔" نواز نے کہا۔ "پھر ان دونوں کو تم نے ٹھکانے لگا دیا۔ اس طرح چھ لاشیں ہو گئیں۔ میں بیلا پور میں پانچ برسوں سے ڈیوٹی دے رہا ہوں لیکن ایک ساتھ اتنی لاشیں کبھی نہیں دیکھیں۔"

"یار! یہ بتاؤ اب ہمارے یار کا کیا ہوگا؟" خالد نے پوچھا۔

"ہونا کیا ہے اس نے دو آدمیوں کا خون کیا ہے۔ چاہے اپنی موت کے خوف سے سہی۔ لیکن اسے عدالت میں تو جانا ہی ہوگا۔ قانون کا سامنا تو کرنا ہی ہوگا۔ وہاں سے جو بھی فیصلہ ہو لیکن اس سے پہلے درختوں کے اس جھنڈ کا جائزہ لینا ہوگا۔ یہ جو اتنا خون بہہ چکا ہے تو اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی کہانی تو ضرور ہوگی۔" پھر اس نے محمود کی طرف دیکھا۔ "میرے دوست مجھے اپنے محکمے کو پوری رپورٹ تو دینی ہوگی نا، کیوں؟"

اس نے درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ صرف ایک لمحہ، محمود کے پاس صرف ایک لمحہ تھا۔ آر یا پار۔ ورنہ اب تک کی ساری کہانی بے معنی ہو کر رہ جاتی۔

نواز درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ چکا تھا۔

صرف ایک لمحہ اور دوسرے ہی لمحے وہ بھی ایک لاش بن کر زمین پر گر چکا تھا۔ محمود نے اس کی پشت میں یکے بعد دیگرے دو گولیاں اتار دی تھیں۔

☆☆☆

11 جولائی...

درختوں سے پرندے ایک بار پھر شور مچاتے ہوئے پرواز کرنے لگے۔

جنگل کا سناٹا نواز کی چیخوں اور گولیوں کی آوازوں سے بکھر کر رہ گیا تھا۔ نواز کی لاش کے پاس بیٹھ کر محمود نے رونا شروع کر دیا تھا۔

خالد اور افضل سکتے کے عالم میں کھڑے تھے۔

ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ اس جنگل میں تو جیسے لاشیں برسنے لگی تھیں۔ ہر طرف خون ہی خون۔ پہلے چھ لاشیں تھیں۔ اب ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔

محمود نے نواز کو مارنے کے بعد پستول ایک طرف پھینک دیا تھا اور نواز کی لاش کے پاس بیٹھ کر روئے جا رہا تھا۔

"کیا کیا تم نے بے وقوف۔" افضل نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ "اپنے ہی ساتھی کو مار دیا۔ ایک پولیس والے کا خون کر دیا تو نے؟"

"افضل بھائی! میں پاگل ہو رہا ہوں پاگل۔" محمود اپنے بال نوچنے لگا۔ "میں نے ذرا سی دیر میں کئی لوگوں کو مار دیا ہے۔ وہ منحوس دولت ہے۔ بہت منحوس ہے۔ میں نے کبھی چڑیا کا بچہ بھی نہیں مارا ہوگا۔ لیکن آج... آج میں نے چار پانچ خون کر دیے ہیں۔ وہ دولت ہی منحوس ہے۔ آگ لگا دو اس کو۔ ورنہ وہ سب کو مار دے گی۔ سب مر جائیں گے۔"

"کس دولت کی بات کر رہا ہے؟" خالد نے پوچھا۔

"وہی جو صندوق میں بند ہے۔ جسے میں گاڑی سے اٹھا کر یہاں تک لایا تھا۔ جسے میں نے درختوں کے درمیان چھپا دیا ہے۔"

"او خدا!" افضل نے ایک گہری سانس لی۔ "چلو دکھاؤ۔ کہاں ہے وہ صندوق۔"

صندوق میں رکھی دولت دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔ پانچ پانچ ہزار اور ہزار ہزار کے نوٹوں سے وہ صندوق بھرا ہوا تھا۔

"خدایا! یہ تو کروڑوں روپے معلوم ہوتے ہیں۔" خالد نے کہا۔ "میں نے کبھی زندگی میں اتنی دولت نہیں دیکھی۔"

"اس دولت کو ہاتھ مت لگانا۔" محمود نے کہا۔ "یہ منحوس ہے۔ یہ خونی ہے۔ اس کو حکومت کے حوالے کر دو۔ اور مجھے تھانے لے جاؤ۔ میں نے کئی لوگوں کا خون کیا ہے۔ خونی ہوں میں۔ میری سزا پھانسی ہے۔ مجھے پھانسی ہونی چاہیے۔"

"دیکھو محمود! تم نے جو کچھ بھی کیا اپنی جان بچانے کے لیے کیا ہے۔" افضل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں، میں نے دولت کے لالچ میں کیا ہے۔"

"یہ تو فطری سی بات ہے۔ کون ہے جو دولت سے پیار نہیں کرتا۔ تمہاری بھی اپنی خواہشیں ہوں گی۔ ارمان ہوں گے۔ تم اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے ہو تو اس کے لیے دولت کی ضرورت ہوگی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" محمود نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"گول کر جاؤ۔ بھول جاؤ جو کچھ ہوا ہے۔" افضل نے کہا۔ "یہ ویران جنگل ہے۔ سمجھ لو کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ کیوں خالد؟" اس نے تائیدی نگاہوں سے خالد کی طرف دیکھا۔

"ہاں یار!" خالد نے گردن ہلائی۔ اس کی آنکھوں میں بھی چمک آ گئی تھی۔ "افضل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ زندگی بنا اپنی۔ اور ساتھ ساتھ ہم دونوں کی۔ ہم بھی تو ابھی تک خوار ہی ہو رہے ہیں۔"

"اس صندوق کا کیا ہوگا؟"

"ہونا کیا ہے۔ اسے اٹھا کر گاڑی میں رکھ دیتے ہیں۔" افضل نے کہا۔ "بعد میں گنتی کر کے اپنا اپنا حصہ الگ کر لیں گے۔"

"بلکہ تیرا حصہ کچھ زیادہ ہوگا۔" خالد ہنس کر بولا۔ "کیونکہ ساری محنت تو تیری ہے۔"

☆☆☆

11 جولائی...

ایک بار پھر یہ سفر شروع ہو گیا تھا۔

اب یہ سفر آگے کی طرف نہیں تھا بلکہ وہ بیلا پور کی طرف واپس جا رہے تھے۔

ان کا منصوبہ یہ تھا کہ خالد پوری ایمانداری کے ساتھ اس صندوق کو اپنی دکان کے پچھلے کمرے میں چھپا کر رکھ دے گا۔ اس کمرے میں دنیا بھر کی چیزیں ٹھنسی رہتی تھیں۔

پھر تینوں وہیں بیٹھ کر رقم کی گنتی کریں گے۔ محمود کا حصہ پچاس فیصد ہو گا۔ کیونکہ یہ سارا کارنامہ اسی کا تھا اور وہ دونوں پچیس پچیس فیصد رکھ لیں گے۔

انہیں یقین تھا کہ یہ پچیس فیصد بھی لاکھوں ہی میں ہو گا۔

واپسی کا سفر اور بھی پُرجوش ثابت ہو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جو اتنی لاشیں دیکھی تھیں۔ نوٹوں کی چکا چوند نے اس منظر کے تاثرات گم کر دیے تھے۔

دولت چیز ہی ایسی ہوتی ہے۔

وہ تینوں ترنگ میں تھے۔ گا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔

آئندہ کی شاندار زندگی کے منصوبے بنا رہے تھے۔

ان تینوں نے مشترکہ طور پر یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یہ رقم بیلا پور میں خرچ نہیں کریں گے تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو جائے۔

وہ بیلا پور میں اپنی بدحالی کا رونا روتے ہوئے آہستہ آہستہ کسی بڑے شہر کی طرف منتقل ہو جائیں گے۔ جہاں وہ نئی زندگی کی شاندار ابتدا کر سکیں گے۔

سب سے پہلے افضل جائے گا پھر محمود اور آخری میں خالد اپنی مرغیوں کا کاروبار ختم کر کے شہر آ جائے گا۔

''یار! ذرا گاڑی روک دے۔'' محمود نے اچانک کہا۔

''کیوں؟''

''سمجھا کر یار! بہت زور کا آ رہا ہے۔ کسی جھاڑی میں چلا جاؤں گا۔''

وہ دونوں ہنس پڑے۔ خالد نے گاڑی ایک کنارے لگا دی تھی۔

محمود گاڑی سے اتر کر چار قدم آگے چلا پھر اچانک مڑ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اب بھی ایک پستول چمک رہا تھا۔

''یہ... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' افضل نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

''تم لوگوں نے کیا مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے؟''

محمود کے ہونٹوں پر ایک بے رحمانہ مسکراہٹ تھی۔ ''ساری محنت میری ہے۔ سب کچھ میں نے کیا ہے۔ اس دولت کے لیے میں کئی بندوں کا خون بھی کر چکا ہوں اور پچیس فیصد تم لے جاؤ۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔''

''ارے بھائی، چلو سب تم ہی رکھ لینا۔'' خالد منمنا کر بولا۔ ''ہمیں نہیں چاہیے تمہاری دولت۔''

''سوری یار! میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔'' محمود نے کہا۔ ''خدا حافظ۔''

دو اور گولیاں۔

خالد اور افضل بھی لاشوں کی صورت میں تبدیل ہو چکے تھے۔ محمود نے دونوں کی لاشیں گھسیٹ کر ایک طرف پھینک دیں۔

گاڑی ایک بار پھر جا رہی تھی لیکن اب اس کا رخ بیلا پور کی طرف نہیں تھا۔

☆☆☆

''ہاں بھائی! کیا رپورٹ ہے؟'' ایس ایس پی نے ایس پی سے دریافت کیا۔

''سر! لگتا ہے جعلی نوٹ بنانے والوں کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا۔'' ایس پی نے بتایا۔ ''بیلا پور کے جنگل کے پاس کئی لاشیں ملی ہیں۔ ان میں سے ایک لاش بیلا پور کے تھانے دار کی بھی ہے۔''

''اوہ، یہ تو الجھا ہوا معاملہ ہے۔''

''یس سر۔''

''اور اس صندوق کا کیا ہوا۔ جس میں نوٹ رکھے گئے تھے؟''

''اس کا سراغ نہیں مل سکا ہے سر۔ لیکن امید ہے کہ بہت جلد وہ بندہ بھی پکڑا جائے گا۔ جس کے پاس وہ نوٹ ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''ہم نے اس کاریگر کو پکڑ لیا ہے سر جو یہ نوٹ بنایا کرتا ہے۔'' ایس پی نے بتایا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ اس بار اس نے جو نوٹ بنائے ہیں جان بوجھ کر ایک غلطی کر دی تھی اس لیے وہ نوٹ ایسے بنے ہیں کہ جاننے والا ذرا سی دیر میں انہیں جانچ سکتا ہے۔''

''چلو، یہ مسئلہ تو سلجھ جائے گا۔'' ایس ایس پی نے گہری سانس لی۔ ''اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بندہ کون ہے جو یہ جعلی نوٹ اپنے ساتھ لے گیا ہے۔''